
خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ
خواتین ڈائجسٹ
جون 2015

خواتین ڈائجسٹ

خط و کتابت کا پتہ

خواتین ڈائجسٹ

37- اردو بازار کراچی

MEMBER APNS CPNE





زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)	700 روپے
ایشیائی ممالک	5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا	6000 روپے

جون 2015
جلد 43 شمارہ 2
قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ خواتین ڈائجسٹ، 37 - اردو بازار، کراچی۔

پبلشر آزر ریاض نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: بی 91، بلاک W، نارتھ ناظم آباد، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 92-21-32766872
Email: info@khawateendigest.com Website www.khawateendigest.com

مُدیر

کچھ سُنیے

خواتین ڈائجسٹ کا جون کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

دُنیا جتنی آگے بڑھی ہے، انسان نے کتنی بھی ترقی کی ہے، انسان کا مقصود و منتہیٰ مادی آرام و آسائش اور مادی سہولتوں کا حصول رہا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو ذہنی اور فکری سطح پر انسان میں زیادہ تبدیلی نہیں آئی ہے۔ تمام تر سائنسی ترقی اور ایجادات کے باوجود انسان مایوسی، منافرت اور خود غرضی کی دُنیا میں بھٹک رہا ہے۔ عہد حاضر کی بھاگتی دوڑتی دُنیا کا ساتھ دینے کی کوشش نے جو افراتفری کی فضا پیدا کی ہے اس میں سوچنے اور اپنے اندر کی حالت کو بہتر بنانے کا عمل غائب ہو چکا ہے۔

اقتدار، اختیار، دولت، زندگی کو بہتر بنانے کی خواہش غلط نہیں۔ یہ زندگی کا لازمی حصہ ہیں لیکن اس کے لیے درست راہ کا انتخاب بہت ضروری ہے۔

اچھی سوچیں ہیں، رویوں میں نیکی، دیانت اور سچائی ۔۔۔ سچ وہ ہے جو ہر تعصب سے بالاتر ہو۔ کسی سے نفرت یا کسی کو کم تر یا حقیر سمجھ کر رویوں کا تعین ناانصافی تک لے جاتا ہے۔

راست۔ رویے ہی زندگی کو کامیابی کی شاہراہ تک لے جاتے ہیں اور خود آگہی سے خدا آگہی کی منزل تک پہنچاتے ہیں۔ حقیقی خوشی کے لیے اندر کا اطمینان اور سکون قلب کے لیے روحانی ترقی بہت ضروری ہے۔

روزہ ایک ایسی عبادت ہے جو نہ صرف ہماری جسمانی صحت کو بہتر کرتا ہے بلکہ انسان کو روحانی بلندی پر بھی لے جا سکتا ہے۔

جون کے مہینے میں رمضان المبارک کا آغاز ہو رہا ہے۔ یہ وہ مہینہ ہے جو اپنے ساتھ رحمتوں اور برکتوں کے خزانے لاتا ہے۔ اس مہینے میں معمولاتِ زندگی بدل جاتے ہیں۔ کھانے پینے اور سونے کے اوقات میں تبدیلی آجاتی ہے۔ کوشش کریں کہ تبدیلی آپ کے اندر بھی آئے۔

غصہ، طبیعت کی سختی، بخیلی، بدگمانی، حسد اور ہر قسم کا تعصب وہ بدصورت رویے ہیں جو زندگی کا حسن چھین لیتے ہیں۔ نہ صرف دوسروں کی بلکہ انسان کی اپنی زندگی کی خوبصورتی کو بھی ختم کر دیتے ہیں۔

خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں رمضان المبارک کی برکتوں والی ساعتیں نصیب ہو رہی ہیں۔ ہمیں نیکیاں کمانے اور مغفرت حاصل کرنے کا موقع نصیب ہو رہا ہے۔ وقت کی رفتار تیز تر ہے اور مہلت عمل بہت کم۔ زندگی کی یہ مختصر ساعتیں ہمیشگی زندگی کے لیے فیصلہ کن ہوں گی۔

رمضان المبارک کی ان قیمتی ساعتوں میں رب سے اپنے لیے اور دوسروں کے لیے بہتری اور بھلائی مانگیں۔ ہمیں بھی اپنی قیمتی دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

اس شمارے میں،

- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول ۔ عہد الست،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول ۔ نمل،
- نبیلہ ابر راجہ کا مکمل ناول ۔ سیکھا ہے میں نے جینا،
- آسیہ رزاقی کا ناولٹ ۔ رنگِ حنا،
- قرۃ العین خرم ہاشمی، کنیز نبوی، شازیہ جمال طارق،
- ماہ جبیں ریحان اور فرواخان کے افسانے،
- عمیرہ احمد اور عفت سحر طاہر کے ناول،
- باصلاحیت فنکارہ نازلی نصر سے ملاقات،
- ٹی وی فنکار علی رحمٰن سے باتیں،
- کرن کرن روشنی ۔ احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں اور مصنفین کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

خواتین ڈائجسٹ کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے ضرور لکھ بھیجیے گا۔

قرآن پاک زندگی گزارنے کے لیے ایک لائحہ عمل ہے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قرآن پاک کی عملی تشریح ہے۔ قرآن اور حدیث دین اسلام کی بنیاد ہیں اور یہ دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ قرآن مجید دین کا اصل ہے اور حدیث شریف اس کی تشریح ہے۔

پوری امت مسلمہ اس پر متفق ہے کہ حدیث کے بغیر اسلامی زندگی نامکمل اور ادھوری ہے' اس لیے ان دونوں کو دین میں حجت اور دلیل قرار دیا گیا۔ اسلام اور قرآن کو سمجھنے کے لیے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کا مطالعہ کرنا اور ان کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

کتب احادیث میں صحاح ستہ یعنی صحیح بخاری' صحیح مسلم' سنن ابوداؤد' سنن نسائی' جامع ترمذی اور موطا مالک کو جو مقام حاصل ہے' وہ کسی سے مخفی نہیں۔

ہم جو احادیث شائع کر رہے ہیں' وہ ہم نے ان ہی چھ مستند کتابوں سے لی ہیں۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث کے ساتھ ہم اس سلسلے میں صحابہ کرام اور بزرگان دین کے سبق آموز واقعات بھی شائع کریں گے۔

کرن کرن روشنی

ادارہ

دعاؤں کے احکام و آداب

دعا کرنے کا حکم' اس کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور تمہارے رب نے کہا کہ مجھے پکارو میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا۔" (غافر۔6)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"تم اپنے رب کو گڑگڑاتے ہوئے اور پوشیدہ طریقے سے پکارو' بے شک اللہ تعالیٰ حد سے تجاوز کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا۔" (الاعراف۔55)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور جب مجھ سے میرے بندے میری بابت پوچھیں تو (بتلا دے کہ) میں قریب ہوں۔ میں پکارنے والے کی پکار کو قبول کرتا ہوں جب بھی وہ مجھے پکارے۔" (البقرہ۔186)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور کون ہے جو لاچار کی پکار کو جب وہ پکارے' قبول کرتا اور برائی کو دور کرتا ہے۔" (سورہ نمل۔62)

فائدہ آیات :

دعا بھی عبادت کی ایک قسم بلکہ اس کی روح اور مغز ہے' اس لیے دعا بھی صرف اللہ ہی سے کی جائے۔ مذکورہ آیات میں اسی امر کی تاکید کی گئی ہے کہ دعا میں قبول کرنے والا صرف ایک اللہ ہے' تم اسی سے دعا میں کرو۔ کسی اور سے دعا کرو گے تو یہ گویا اس کی عبادت ہو گی' جو شرک ہے' علاوہ ازیں جو فوت شدہ ہوئے کسی کی فریاد سننے پر بھی قادر نہیں' وہ بھلا مدد کیا کریں گے۔ اس لیے عبادت کی یہ قسم دعا صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔

عبادت

حضرت نعمان بن بشیر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "دعا عبادت

ہی ہے۔" (اسے ابوداؤد اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور امام ترمذی فرماتے ہیں: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : دعا کیا ہے؟ اپنی عاجزی و بے چارگی کا اظہار۔ اللہ کی قدرت و طاقت کے سامنے اپنی کمزوری، پستی و فروتنی اور ذلت کا اظہار ہی عبادت کی اصل روح ہے۔ اس لیے دعا کو بھی عین عبادت قرار دیا گیا ہے اور اسی لیے یہ بھی صرف اللہ ہی کا حق ہے، اس کے سوا کسی اور سے دعا کرنی جائز نہیں۔

جامع دعا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جامع دعاؤں کو پسند فرماتے تھے اور ان کے ماسوا کو چھوڑ دیتے تھے۔ (اسے ابوداؤد نے عمدہ سند کے ساتھ روایت کیا ہے۔)

فائدہ :

جامع دعا کا مطلب ہے: الفاظ تھوڑے ہوں اور مفہوم بہت وسیع۔ اس لیے اپنے الفاظ میں دعا کرنے کے بجائے زیادہ پسندیدہ بات یہ ہے کہ مسنون الفاظ میں دعائیں کی جائیں اس لیے کہ ایک تو وہ نہایت جامع ہیں اور دوسرے رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے الفاظ ہیں، جو تاثیر اور برکت کے لحاظ سے بے مثل ہیں۔

بہترین دعا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر دعا یہ ہوتی تھی۔

اَللّٰهُمَّ آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ

"اے اللہ! تو ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر اور آخرت میں بھی بھلائی عطا کر اور ہمیں آگ کے عذاب سے بچا۔" (بخاری و مسلم)

مسلم نے اپنی روایت میں یہ زیادہ بیان کیا ہے اور حضرت انس جب کوئی دعا کرتے تو ان ہی الفاظ میں دعا کرتے۔ اور جب کوئی (خاص قسم کی) دعا فرماتے، تب بھی وہ اس میں اس کو شامل کر کے دعا کرتے۔

فوائد و مسائل :

1۔ دنیا میں بھلائی دے، یعنی اعمال خیر کی توفیق دے۔ اس میں گویا یہ ترغیب ہے کہ اہل ایمان کو دنیا میں بھی محض دنیا نہیں بلکہ بھلائی طلب کرنی چاہیے۔ جس کا مطلب ہے کہ دنیا بھی اس طرح دے کہ وہ بھلائی ثابت ہو اور آخرت میں بھلائی دے کا مطلب ہے: دنیا میں کی گئی نیکیوں کا حسن صلہ، یعنی جنت عطا فرما۔

2۔ یہ بڑی ہی جامع دعا ہے۔ حج و عمرے میں طواف کے دوران رکن یمانی اور حجر اسود کے درمیان یہ دعا پڑھنا مسنون ہے۔ لوگ طواف کے ہر چکر میں خود ساختہ الگ الگ دعائیں پڑھتے ہیں، جو صحیح نہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے صرف ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ کا مذکورہ طریق سے پڑھنا ثابت ہے۔ اس لیے اس کے علاوہ دعائیں نہ پڑھی جائیں۔ البتہ اپنی حاجات کے مطابق اپنی زبان میں اللہ سے دعائیں کریں، بالخصوص ملتزم سے چمٹ کر خوب دعائیں کریں۔

دعا

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا مانگا کرتے تھے۔

اَللّٰهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ الْهُدٰى وَالتُّقٰى وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰى

"اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت، پرہیزگاری، پاک دامنی اور تونگری (بے نیازی) کا سوال کرتا ہوں۔" (مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ ہدایت سے مراد خیر کی طرف رہنمائی ہے، جس کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے۔ علاوہ ازیں خیر کی توفیق اور اس پر استقامت بھی ہدایت کے مفہوم میں شامل ہے۔

2۔ اللہ کے حکموں کو بجالانا اور اس کی منع کردہ باتوں سے بچنا تقویٰ ہے۔ تقویٰ کی ضرورت بھی محتاج وضاحت نہیں۔

3۔ عفاف گناہوں سے بچنے کو بھی کہتے ہیں اور لوگوں سے سوال نہ کرنے کو بھی۔

4۔ غنا (تونگری) کا مطلب ہے' لوگوں سے بے نیاز ہو جانا اور ساری امیدیں صرف ایک اللہ سے وابستہ کرنا۔ اس دعا میں بھی بڑی جامعیت ہے۔

دعا

حضرت طارق بن اشیم رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آدمی جب اسلام قبول کرتا تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم اسے نماز سکھلاتے' پھر اسے حکم دیتے کہ وہ ان کلمات کے ساتھ دعا کرے:

اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِی، وَارْحَمْنِی وَاھْدِنِی وَعَافِنِی وَارْزُقْنِی

"اے اللہ! مجھے بخش دے' مجھ پر رحم فرما' مجھے ہدایت دے' مجھے عافیت عطا کر اور مجھے روزی دے۔" (مسلم)

استقامت کی دعا

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا پڑھی ہے۔

اَللّٰھُمَّ مُصَرِّفَ الْقُلُوْبِ صَرِّفْ قُلُوْبَنَا عَلٰی طَاعَتِکَ

"اے اللہ! دلوں کے پھیرنے والے' ہمارے دلوں کو اپنی اطاعت کی طرف پھیر دے۔" (مسلم)

فائدہ :

یہ دعا بڑی اہم ہے کیونکہ اس میں نیکی پر استقامت کی دعا ہے۔ انسان کا دل موج حوادث کی زد میں رہتا ہے اور اس کے تھپیڑے اس کو ادھر اُدھر پھیرتے رہتے ہیں۔ اگر اللہ کی توفیق اور اس کی مدد شامل حال نہ ہو تو بہت سے موقعوں پر انسان کا دل کج ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس میں اللہ سے دعا کی گئی ہے کہ دل کو کجی سے اور برائی کی طرف پھرنے سے محفوظ رکھے اور اسے صرف اپنی طرف پھیرے رکھے' کہ دلوں کے پھیرنے کی ساری طاقت صرف اللہ کے پاس ہے۔

تاکید

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے'

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تم محنت مشقت کی سختی سے بدبختی کے آلینے سے' برے فیصلے سے اور دشمنوں کے خوش ہونے سے پناہ مانگو۔" (بخاری و مسلم)

ایک اور روایت میں ہے حضرت سفیان نے کہا۔ "مجھے شک ہے کہ میں نے ان میں سے ایک بات زیادہ بیان کی ہے (معلوم نہیں وہ کون سی ہے۔)

فوائد و مسائل :

1۔ انسان کو ایسی تکلیف و مشقت پہنچے جو انسان کے لیے ناقابل برداشت ہو اور وہ اسے ٹالنے پر بھی قادر نہ ہو' وہ جھد البلاء ہے۔ بعض لوگوں نے قلت مال اور کثرت عیال کو اس کا مصداق قرار دیا ہے' لیکن حافظ ابن حجر رضی اللہ عنہ نے کہا ہے کہ یہ جھد البلاء کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت ہے۔

2۔ شقاء سعادت کی ضد ہے' یعنی بدبختی کے لائق ہونے سے پناہ۔ اللہ کا تو کوئی فیصلہ برا نہیں ہوتا۔ تاہم بعض فیصلوں سے انسان کو نقصان اور بعض سے نفع پہنچتا ہے' گویا انسانوں کے اعتبار سے اللہ کے فیصلوں میں حسن اور برائی کا پہلو آجاتا ہے۔ مطلب یہ ہوگا' اپنے ایسے فیصلوں سے محفوظ رکھ جن میں ہمارے لیے نقصان کے پہلو ہوں۔

3۔ شماتت' دشمن کے خوش ہونے کہتے ہیں' ہمیں ایسے المناک حوادث سے دوچار نہ فرمانا کہ جن سے ہمارے دشمن خوشی محسوس کریں۔

4۔ اس روایت میں ایک جملہ راوی حضرت سفیان

کا اضافہ ہے اور آخری عمر میں انھیں یاد نہیں رہا تھا کہ وہ کون سا ہے۔ لیکن دوسری روایات سے معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ آخری جملہ شماتۃ الاعداء ہی ہے۔

5۔ اس میں راویان حدیث کی امانت و دیانت کا بھی بیان ہے کہ حدیث میں ایک دعائیہ جملہ اپنی طرف سے بڑھا دیا تو اس کی بھی وضاحت کر دی۔

فائدہ:

اس دعا میں بھی بڑی جامعیت ہے، جس میں دین، دنیا اور آخرت تینوں کے لیے اصلاح کی دعا ہے۔

دعا

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا "یہ دعا پڑھا کر

اَللّٰھُمَّ اھْدِنِیْ وَسَدِّدْنِیْ

"اے اللہ! مجھے ہدایت دے اور مجھے سیدھا رکھ۔"

"اے اللہ! میں تجھ سے ہدایت اور استقامت و میانہ روی کا سوال کرتا ہوں۔" (مسلم)

فائدہ:

سداد کے معنی درستی کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر عمل درست طریقے، یعنی سنت کے مطابق کرنے کی توفیق دے۔ شارحین حدیث نے اس کے معنی استقامت اور قصد (میانہ روی) کے کیے ہیں۔ دونوں معنی اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحیح ہیں۔

دعا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ دعا کیا کرتے تھے۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنَ الْعَجْزِ وَالْکَسَلِ وَالْجُبْنِ وَالْھَرَمِ، وَالْبُخْلِ، وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ عَذَابِ الْقَبْرِ، وَاَعُوْذُبِکَ مِنْ فِتْنَۃِ الْمَحْیَا وَالْمَمَاتِ۔

"اے اللہ! میں تیرے ذریعے سے پناہ طلب کرتا ہوں (خیر کے کاموں میں) عاجز رہ جانے سے (طاقت کے باوجود) سستی سے، بزدلی، زیادہ بڑھاپے اور بخل سے اور میں تیری پناہ مانگتا ہوں قبر کے عذاب سے اور پناہ مانگتا ہوں زندگی اور موت کے فتنے سے۔"

ایک اور روایت میں ہے (میں پناہ مانگتا ہوں) قرض کے بوجھ اور مردوں کے ظلم سے۔" (مسلم)

نماز کی دعا

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے کوئی ایسی دعا بتلائیں جو میں اپنی نماز میں مانگا کروں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "یہ پڑھا کرو۔

اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ ظَلَمْتُ نَفْسِیْ ظُلْمًا کَثِیْرًا، وَلَا یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ اِلَّا اَنْتَ، فَاغْفِرْلِیْ مَغْفِرَۃً مِّنْ عِنْدِکَ وَارْحَمْنِیْ، اِنَّکَ اَنْتَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ،

"اے اللہ! میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا ہے اور گناہوں کو تیرے سوا کوئی معاف کرنے والا نہیں، پس تو اپنی خاص مغفرت سے مجھے بخش دے اور مجھ پر رحمت فرما، بے شک تو بہت بخشنے والا، نہایت مہربان ہے۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ:

یہ دعا نماز میں درود شریف کے بعد سلام پھیرنے سے قبل پڑھی جائے۔ علاوہ ازیں دیگر اوقات کی دعاؤں میں بھی پڑھی جا سکتی ہے۔

عافیت کا سوال

حضرت ابوالفضل عباس ابن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے کہا۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسی چیز سکھلائیں جس کا میں اللہ تعالیٰ سے سوال کروں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "اللہ سے عافیت کا سوال کرو۔"

چنانچہ میں چند دن ٹھہر کر پھر حاضر ہوا اور عرض کیا۔

"اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی ایسی چیز بتلائیں جو میں اللہ تعالیٰ سے مانگوں۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا۔

"اے عباس اے رسول "اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" کے چچا! اللہ سے دنیا اور آخرت میں عافیت مانگو۔"

اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فائدہ : عافیت کی دعا میں دین و دنیا کی سلامتی شامل ہے۔ اس اعتبار سے یہ بھی نہایت ہی جامع دعا ہے۔

اکثر دعا

حضرت شہر بن حوشب بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا۔

"اے ام المومنین! جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ کے پاس ہوتے تو آپ کی اکثر دعا کون سی ہوتی تھی؟"

انہوں نے جواب دیا۔ آپ کی اکثر دعا یہ ہوتی تھی۔

(اَللّٰھُمَّ یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوْبِ ثَبِّتْ قَلْبِیْ عَلٰی دِیْنِکَ)

"اے دلوں کے پھیرنے والے! میرے دل کو اپنے دین پر ثابت قدم رکھ۔" (اس حدیث کو امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے، یہ حدیث حسن ہے۔)

فائدہ : دین پر ثابت قدمی 'اولوالعزم لوگوں کا کام ہے۔ جو اللہ کی توفیق کے بغیر ممکن نہیں۔ زندگی میں بہت سے موڑ آتے ہیں کہ انسان دین کے معاملے میں تساہل 'غفلت یا اعراض کا شکار ہو جاتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے تو یہ دعائے استقامت بڑی ہی اہمیت کی حامل ہے اور بڑی کثرت سے یہ دعا ان کو کرنی چاہیے بلکہ کرتے رہنا چاہیے۔

دعا

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے '

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

یاذالجلال والاکرام کا خوب اہتمام کرو۔"

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور نسائی نے اسے ربیعہ بن عامر صحابی سے روایت کیا ہے۔)

شب قدر میں قیام

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "جس شخص نے ایمان کے ساتھ ثواب کی نیت سے شب قدر میں قیام کیا (اللہ کی عبادت کی) اس کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ : قیام کا مطلب ہے : اس رات کو اپنی طاقت کے مطابق جاگ کر اللہ کی عبادت کی 'نوافل پڑھے 'توبہ و استغفار اور دعا و مناجات کی۔ بالخصوص عشاء اور فجر کی نماز باجماعت ادا کی تو امید ہے کہ اس سے انسان کو اس کی فضیلت حاصل ہو جائے گی۔

تاکید

حضرت انس رضی اللہ عنہا سے روایت ہے ' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"میں نے تمہیں مسواک کے بارے میں بہت تاکید کی ہے۔" (بخاری)

پہلا کام

حضرت شریح بن ہانی بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا "جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لاتے تو سب سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟"

حضرت عائشہ نے جواب دیا "مسواک فرماتے تھے۔ (مسلم)

نسخہ کتے کے کاٹنے کا

انشا جی

ایک اخبار میں بھونکتے کتے سے بچنے کا نسخہ شائع ہوا ہے لکھا ہے۔

"اگر آدمی ساکت کھڑا ہو جائے' بازو اور ہاتھ نیچے کی طرف سیدھے کر لے اور دوسری طرف دیکھنے لگے تو بھونکتا ہوا کتا کچھ دیر کے بعد خاموش ہو جائے گا اور پھر وہاں سے چلا جائے گا۔"

اخبار نے یہ نہیں کہا کہ یہ نسخہ کہاں سے لیا گیا ہے' اوپر فقط "جدید طبی تحقیق" کا عنوان دیا گیا ہے' یہ بھی مذکورہ نہیں آیا کتوں کو بھی مطلع کر دیا گیا ہے کہ ان پر اس ضابطہ اخلاق کی پابندی ضروری ہے یہ اعتراض بھی کچھ لوگ کریں گے کہ اگر انسان حسب ہدایت بھیگی بلی بن کر منہ دوسری طرف کر کے کھڑا ہو جائے اور کتا اس کی ٹانگ لے جائے تو ایڈیٹر اخبار ہذا کس حد تک ذمہ دار ہو گا' ہمارے نزدیک تو یہ اعتراض بے محل اور لاواجب ہے' بھونکنا الگ فعل ہے اور کاٹنا الگ' کتا کاٹ لے تو سیدھا اسپتال جا کر چودہ انجکشن پیٹ میں لگوائیے اور مزے کیجیے' اصل کوفت تو کتے کی عف عف سے ہوتی ہے اور اس کے لیے یہ نسخہ مجرب ہے۔

٭٭٭

ان امور میں اصل مشکل اس وقت پیش آتی ہے جب کتے کو معلوم نہ ہو کہ اسے اخبار میں چھپی ہوئی ہدایت کی پابندی کرنی ہے یعنی کوئی شخص بازو لٹکا کر دوسری طرف منہ کر لے تو اسے بھو دیا کر کھسک جانا چاہیے کیونکہ بعض کتے ناخواندہ ہوتے ہیں' یا اخبار نہیں پڑھتے یا جان بوجھ کر بات ٹال جاتے ہیں۔

پچھلے دنوں ایک مشہور ہوٹل کے لاؤنج میں ایک کتے کو استراحت کرتے پایا گیا' منیجر صاحب بہت خفا ہوئے' اسے کان سے پکڑ کر دروازے پر لے گئے جہاں موٹے موٹے لفظوں میں صاف لکھا ہوا تھا کہ۔

"جن کتوں کے ساتھ ان کا مالک نہ ہو ان کا ہوٹل آنا منع ہے۔"

بہ نظر احتیاط ہم لوگوں کو مشورہ دیں گے کہ وہ اس اخبار کا شمارہ ہمیشہ اپنے ساتھ رکھیں' جس میں یہ ترکیب درج ہے' اگر کوئی کتا بھونکنے سے باز نہ آئے بلکہ کاٹنے پر اتر آئے تو جدید طبی تحقیق والا صفحہ اس کے سامنے کر دیں پھر بھی باز نہ آئے تو ڈنڈے سے اس کی خبر لیں۔

یہ ڈنڈے سے خبر لینے کی ہدایت ہماری طرف سے ہے' احباب مذکورہ کی ذمہ داری نہیں' ہماری طبی تحقیق اتنی جدید نہ سہی تاہم مجرب ضرور ہے' ڈنڈا بڑی کار آمد چیز ہے اور بہت سے نسخوں میں پڑتا ہے' پرانے زمانے میں اسے تنبیہ الغافلین کہتے تھے اور شاگرد اس کو احترام کی نظر سے دیکھتے تھے' کچھ مدت ہوئی ہم نے ایک کارٹون دیکھا کہ ایک استاد اپنے شاگرد رشید کو ایک موٹی سی کتاب سے دھڑا دھڑ پیٹ رہا ہے' کتاب کا نام بھی نظر آ رہا تھا' "دی چائلڈ سائیکلوجی" یعنی بچوں کی نفسیات۔

ایک زمانے میں اخباروں سے صرف خبروں کا کام لیا جاتا تھا یا پھر لوگ سیاسی رہنمائی کے لیے انہیں پڑھتے تھے۔ آج تو اخبار زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہیں' سیٹھ اس میں منڈیوں کے بھاؤ پڑھتا ہے' بڑے میاں ضرورت رشتہ کے اشتہارات ملاحظہ کرتے ہیں اور آہیں بھرتے ہیں' عزیز طالب علم فلم کے صفحات پر نظر لگاتا ہے اور



علم کی دولت نایاب ہوتا ہے' بی بی اس میں ہنڈیا بھوننے کے نسخے ڈھونڈتی ہے اور بعض لوگوں نے اخباری نسخے دیکھ کر مطب کھول لیے ہیں' پچھلے دنوں عورتوں کے ایک اخبار میں ایک بی بی نے لکھ دیا تھا کہ پریشر ککر تو منگا ہوتا ہے اسے خریدنے کی ضرورت نہیں' یہ کام بخوبی ڈالڈا کے خالی ڈبے سے لیا جاسکتا ہے' کفایت شعار بیبیوں نے یہ نسخہ آزمایا' نتیجہ یہ ہوا کہ کئی زخمی ہوئیں اور ایک آدھ بی بی تو مرتے مرتے بچی' ایسے نسخوں میں عمل کرتے ہوئے وہ حکایت نہ بھولنی چاہیے کہ ایک صاحب کی بھینس کو اپھارہ ہوگیا تھا' وہ ایک جہاں دیدہ بزرگ کے پاس دوڑے دوڑے گئے کہ۔

"پار سال آپ کی بھینس کو بھی تو اپھارہ ہوا تھا" آپ نے کیا دوا دی تھی۔" ان بزرگ نے کہا۔

"سیر بھر سوڈا کاسٹک پانی میں گھول کر پلادیا تھا۔"

وہ شخص گیا اور یہ نسخہ آزمایا بھینس اسے نوش جان کرتے ہی مرگئی' وہ شخص پھر ان بزرگ کے پاس آیا اور شکایت کی کہ "حضور میری بھینس تو یہ نسخہ استعمال کرتے ہی مرگئی۔"

"بھئی مر تو میری بھینس بھی گئی تھی۔" ان بزرگ نے نہایت حلم اور متانت سے فرمایا۔

☼ ☼ ☼

ہم دس بارہ روز فلو میں مبتلا رہے اور بستر سے نہ اٹھ سکے اس میں بھی کچھ دخل جدید طبی تحقیق کو ہے۔

ایک صاحب روحانی اور نفسیاتی علاج کرتے ہیں' انہوں نے ہدایت کی کہ اپنے دل میں یہ سمجھ لو کہ تمہیں فلو وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے' سب وہم ہے' ہم نے اس نسخے پر عمل کیا' بلکہ اگر کوئی کہتا تھا "میاں دوا کرو' تمہاری کھانسی تو خطرناک معلوم ہوتی ہے۔"

تو ہم یہی جواب دیتے تھے کہ "میاں ہوش کی دوا کرو' کون سی کھانسی؟ کیسی کھانسی؟" ان کا علاج ختم ہوا تو دوسرے کرم فرما نے ایک اخبار میں سے دیکھ کے بتایا کہ۔

"دو دن کا مکمل فاقہ کرو اور پیاز کی گٹھی سونگھتے رہو۔"

اب ہم نے یہ عمل کیا' اتفاق سے نقوی کلینک والے ڈاکٹر نقوی صاحب نے دیکھ لیا اور کہا۔

"میاں کیوں پاگل ہورہے ہو' اخبار والے ہو کر بھی اخبار کی باتوں پر یقین کرتے ہو' یہ لو کیپسول اور یہ رہا مکسچر۔"

خیر اللہ نے صحت دی ہم نے ان نفسیاتی معالج کو پکڑا کہ۔

"حضرت' ہم تو ڈاکٹری دوا سے ٹھیک ہوئے" آپ کو پچھلے دنوں فلو ہوا تھا' آپ کیسے نفسیاتی علاج سے ٹھیک ہوگئے۔" ہنس کے بولے۔

"میاں میں بھی ڈاکٹر ہی کی دوا سے ٹھیک ہوا تھا۔"

☼

میرے روز و شب تھے بندھے ہوئے موسموں کے مزاج سے
کبھی ایک لمحہ بھی سال تھا، کبھی سال پل میں گزر گیا

آپ کی محبتوں کے ساتھ ایک اور سال کا سفر تمام ہوا۔

43 برسوں پر محیط یہ سفر جتنا مشکل تھا، اتنا ہی آسان بھی تھا کہ اس سفر میں لگن اور شوق شامل تھا جس نے تھکنے نہیں دیا۔

گردش ماہ و سال کی نیرنگیوں میں کئی راستوں سے گزرے، کئی اتار چڑھاؤ دیکھے لیکن قافلۂ شوق رکنے نہیں پایا، وہ شوق، وہ جستجو، وہ تلاش آج بھی جاری ہے۔

اس طویل سفر میں ہماری مصنفین نے ہمارا بھرپور ساتھ دیا۔ ان کی سوچ اور فکر کے رنگ لفظوں میں ڈھلے تو ان میں زندگی کے سارے منظر سمٹ آئے۔ ان کی تحریروں میں عہد حاضر کی کرب ناک حقیقتوں کی آگہی کے ساتھ ساتھ شگفتگی، دل آویزی اور خوابوں کے دلکش رنگ بھی شامل تھے انہوں نے اپنی تحریروں کے ذریعے لاکھوں قارئین کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کی، ان کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کیے یہی وجہ ہے کہ خواتین ڈائجسٹ کے ذریعے مصنفین کو اپنی پہچان کے ساتھ ساتھ قارئین کی بے پایاں محبت و تحسین بھی ملی۔

فطری بات ہے، ہم جن کو پسند کرتے ہیں جن سے لگاؤ رکھتے ہیں ان کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جاننا چاہتے ہیں، ہماری قارئین بھی مصنفین کے بارے میں ان کی ذات کے حوالے سے جاننا چاہتی ہیں۔

سالگرہ نمبر کے موقع پر ہم نے مصنفین سے سروے ترتیب دیا ہے، سوالات یہ ہیں۔

1. لکھنے کی صلاحیت اور شوق وراثت میں منتقل ہوا؟ یا صرف آپ کو قدرت نے تخلیقی صلاحیت عطا کی۔ گھر میں آپ کے علاوہ کسی اور بہن بھائی کو بھی لکھنے کا شوق تھا؟
2. آپ کے گھر والے، خاندان والے آپ کی کہانیاں پڑھتے ہیں؟ ان کی آپ کی تحریروں کے بارے میں کیا رائے ہے۔
3. آپ کی کوئی ایسی کہانی جسے لکھ کر آپ کو اطمینان محسوس ہوا ہو۔ اب تک جو لکھا ہے، اپنی کون سی تحریر زیادہ پسند ہے؟
4. اپنے علاوہ کن مصنفین کی تحریریں شوق سے پڑھتی ہیں؟
5. اپنی پسند کا کوئی شعر یا اقتباس، ہماری قارئین کے لیے لکھیں۔

آیئے دیکھتے ہیں مصنفین نے ان کے کیا جوابات دیے ہیں۔

حرفِ سادہ کو دیا اعجاز کا رنگ

امت الصبور

کنیز نبوی

1 کچھ کرنے کے شوق نے لکھوایا اور کچھ قدرت نے صلاحیت سے نوازا کہ مفر ممکن نہ رہا، سو کتھارسس و تلاش ذات کا سفر جاری و ساری ہے، بڑی بہن کو شوق تھا ایک دو کہانیوں کے بعد ماند پڑ گیا، سرے سے لکھنا ہی چھوڑ دیا، چھوٹی بہنوں کو بھی شوق تھا، صائقہ نے بھی ایک دو افسانوں کے بعد لکھنا ہی چھوڑ دیا۔

اک میں ہوں کہ اس راہ میں ابھی تک خالی ہاتھ ہی

سہی مگر کھڑی ہوں گور بچا زو سدرۃ المنتہی ہے جو کہ ماشاء اللہ سے کے پر سے کالے کرتی جارہی ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ میری سدرہ اور صائقہ کی ملتی جلتی رائٹنگ اور ایک ہی ایڈریس نے کافی الجھاؤ اور کنفیوژن پیدا کیا' بڑے دلچسپ قصے ہیں' مگر پھر بھی سہی۔

2 بہنیں "زنز" بھابھیاں 'بھتیجیاں سب پڑھتی ہیں رائے ذرا کم دیتی ہیں۔ پوچھتی میں نہیں ہوں تی وہ نہیں 'شاید مجھ سے ڈرتی ہیں۔ یا ہو سکتا ہے ان کو پسند ہی نہ آتی ہوں میری تحریریں۔

3 جو بھی لکھا اس پر اطمینان ہی ہوا ہے۔ مگر "آتش عشق" بہت دل سے لکھی اور اب جو ناول لکھوں گی وہ بھی خوب دل لگا کر لکھوں گی ان شاء اللہ:۔

"کلیوں کا نوحہ" پورا افسانہ پسند ہے 'انا الموجود' کا احساس جاں فزا' جیجی کی باتیں' جانب علی شاہ کے عشق کی صداقت' سند صیا شاہ کا پچھتاوا' ماروی اور موول کا مقصد حیت اور حیا منتظر کی بے لوث محبت' نقش قدم کی مونسلی پلی کا ادراک' سب پسند ہیں۔

ویسے تو تحقیق کار کو اپنی ہر تحقیق سے پیار ہی ہوتا ہے۔ امتل یہ سوال کرکے ہمارا امتحان نہ لیا کریں۔ ساری کہانیاں گنگنانے لگتی ہیں' سارے خوب صورت سین تحقیق کی سطح پر پھر سے تیرنے لگتے ہیں۔

4 اک دور تھا' جب کہنی سنی سے بیوٹی بکس تک سارا ڈائجسٹ بغیر ڈکار کے دو دن میں چٹ کر جاتے تھے۔ قسط وار چھوڑ کر' یہ ہمیشہ سے کمزوری رہی کہ

انتظار نہیں ہوتا تھا۔ اور نتیجتاً" طویل تحاریر کمی ہی پڑھیں کہ جمع کرکے پڑھوں گی' مگر لوگوں نے ہماری فیاضی کا ناجائز فائدہ اٹھایا۔ پرچے پڑھنے کے بعد کم کم ہی دستیاب ہوتے' ایک پرچہ بیسیوں پڑھنے والے' سو ایسا تو ہونا ہی تھا۔

ہاں البتہ کلاسک ادب میں بانو قدسیہ 'راجہ گدھ' قرۃ العین حیدر کو خوب پڑھا' امر جلیل' نور الہدی شاہ' قمر شہباز' آغا سلیم' سندھی ادب میں' عبداللہ حسین کی اداس نسلیں' مظہر الاسلام کے خوب صورت الفاظ' مفتی جی کے تصوفانہ رنگ' تارڑ' عصمت چغتائی بہت بڑی لسٹ ہے۔ جن کو پڑھا مگر یہ آج سے 5 سال پہلے کی بات ہے' اب تو سب کچھ بھول بھال گئی۔

یاد ہے تو صرف' شگفتہ نوی' وفا نوی' ان کی شرارتیں' ان کا کھانا' ان کی صحت' ہاں خواہش ہے کہ سائرہ رضا اور سمیرا حمید کو پڑھوں' تنزیلہ کا عہد الست اور عمیرہ احمد کا آب حیات پڑھوں' آپا رفعت ناہید سجاد کا ناول 'چراغ آخر شب' اور آپا غزالہ نگار اور کرن کی کوئی نئی تحریر پڑھوں۔

5 شاہ لطیف سدا حیات شاعر' واہ کیا کہنے میرے روحانی مرشد بھٹائی سرکار کے۔

نبھائی' کھاں ڈینہہ' سکھ مینجا سپرین
سڑے سارو ڈینہہ' باہر یاپا نہ نکرے آوی
(جلتی بھٹی سے عشق 'سیکھو میرے محبوب جلے
سڑے سارا دن' باہر بھاپ تک نہ نکلے۔)
لور سہت بھیا سپرین' کسہت کیم کریو
تھورے گھٹے ڈینہہ' مانھو وجن مروں
نسس قرب کریو' جسیں جیئرا آھیو جھان
میں
(سچ و محبت کے پیامبر محبوب' جھوٹ دغا و فریب سے بچ' تھوڑے بہت دنوں میں لوگ مرجاتے ہیں بس تب تک قرب و محبت کو عام کرو' جب تک زندہ ہو جہان میں)

قرۃ العین خرم ہاشمی

چل میرے دل چلیں
شام کے راگ پر
رقص سادہ کریں
خوشبوؤں سے

سخن کا ارادہ کریں۔!

اور آج ہم بھی اس شہر گل کے خوشبوؤں جیسے لوگوں سے مخاطب ہونے جارہے ہیں۔ سب سے پہلے ادارہ خواتین ڈائجسٹ کو بنانے، سجانے اور سنوارنے والوں کو کامیابی کا ایک اور سال مبارک ہو۔

اور میرے جیسے نئے لکھنے والے رائٹرز کو لفظوں کے اس طلسماتی جہاں میں شامل کرنے کے لیے بہت شکریہ۔ اگر میرا حال اس بچے کی طرح ہے جس کی بند مٹھی میں ابھی روشنی کا صرف ایک جگنو ہی قید ہے اور یہاں سب لوگ اپنے اپنے ہنر کی کہکشاں سجائے، ہر دیکھنے والی آنکھ کو مبہوت اور ذہنوں کو سحر زدہ کررہے ہیں۔

مگر اس ادارے کی یہ ہی تو منفردیات ہے کہ وہ ذرے کو بھی آفتاب کے برابر ہی اہمیت اور عزت دیتا ہے۔

1۔

دل چون تو انم از تو برید ن کہ در ازل
آب و گلم سرشتہ بہ مہر و وفای توست
(عبدالرحمٰن جامی)

ترجمہ: میں (اپنا) دل کیسے تم سے موڑ سکتا ہوں کہ روزِ اول (ازل) میری مٹی تمہاری مہروفا سے گوندھی گئی ہے۔

وراثت میں ملنے والی چیزیں خون کی گردش کے ساتھ ساتھ چلتی ہیں اور بظاہر اوپر سے پرسکون نظر آنے والے لوگوں میں کیسے کیسے طوفان اور تلاطم اٹھتے ہیں یہ سمجھنا آسان ہرگز نہیں ہے۔

میرے والدین کا شمار ان لوگوں میں ہوتا ہے جو اپنی اپنی ذات میں، اپنی اپنی جگہ بہت خاص اور نمایاں رہے ہیں۔ دونوں میں ذہانت اور تخلیقی صلاحیت فطری ہیں۔ اس لیے ہمیں بھی وراثت میں کچھ چیزیں ملی ہیں۔

میں اپنے بہن بھائیوں میں، درمیان میں ہوں۔ اس لیے میری شخصیت بھی ایسی ہے کہ مجھ میں ماں، باپ دونوں کی خوبیاں یا (خامیاں) زیادہ ہیں بہ نسبت دوسرے بہن بھائیوں کے، مگر یہ تناسب ابو کی طرف سے 60% اور امی کی طرف سے 40% ہے۔

میرے والد آرمی ریٹائرڈ آفیسر ہیں۔ علم سے محبت اور عقیدت ان کی فطرت میں ہے، اسی لیے ساری زندگی انہوں نے علم سیکھنے اور سمجھنے کا عمل جاری رکھا۔ میرے ابو کے پاس اردو ادب اور انگلش لٹریچر سے لے کر اسلامی و مذہبی تعلیمات پہ جتنی کتابوں کا ذخیرہ ہے اور سب سے اچھی اور حیرت کی بات ہے کہ وہ کتابیں بہت پرانی ہو جانے کے باوجود، بہت اچھی حالت میں ہیں۔ ابو کتابوں کی حفاظت کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ ان کی کسی کتاب کا صفحہ موڑا ہوا یا اس پہ پنسل یا پین سے کچھ لکھا ہوا، یا نشان نہیں ہوتے ہیں۔ بالکل اسی طرح میری کتابیں، ڈائجسٹ وغیرہ بہت اچھی اور محفوظ حالت میں ہوتے ہیں۔

ابو کی طرح مجھے بھی کتابوں، لفظوں سے عشق ہے۔ یہ عشق میری وراثت ہے! بچپن میں ہمارے لیے بچوں کے سب اچھے رسالے ہر مہینے گھر آتے تھے اور ابو ہر اخبار کا ہفتہ وار بچوں کا ایڈیشن بھی گھر لاتے تھے! اور ان کہانیوں کو پڑھ پڑھ کے ہی میں نے بہت چھوٹی عمر میں رحم دل پری اور شہزادے کی کہانی لکھی تھی! اور اس طرح کی اور بھی بہت سی کہانیاں ایک رجسٹر پہ لکھتی رہی۔ اسکول مقابلوں میں ہمیشہ حصہ لیا، کیونکہ ابو اور امی ان سب باتوں کو بہت پسند کرتے تھے اور مکمل سپورٹ بھی۔ تقریر لکھ کر دیتے، اور پھر اپنے خوب صورت انداز بیاں میں ہمیں بولنا سکھاتے۔

علامہ اقبال کو بھی اسی عمر میں پڑھا اور سمجھا تھا، میرے ابو کا پڑھایا اور سمجھایا بھی کسی کو نہیں بھولتا تھا۔ یہ بھی خداداد صلاحیت تھی ان میں، اس لیے یونیورسٹی لیول کے بہت سے لوگ ان سے ٹیوشن پڑھانے کی درخواست کرتے، مگر جاب کی مصروفیات (آرمی چھوڑنے کے بعد ایک نجی کمپنی میں) کی وجہ سے یہ ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ مگر ان کی توجہ اور محنت کی وجہ سے ہم ضرور پالش ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ ایک وقت تھا

کہ اسکول میں کوئی بھی بیت بازی میں مجھ سے نہیں جیت سکتا تھا۔ فرسٹ پرائز ہمیشہ میرا ہی ہوتا تھا۔ انداز بیان کو ہمیشہ سراہا گیا اور اسی طرح مجھ سے چھوٹی بہن اپنی خوب صورت اور دلکش آواز (یہ شوق امی کی طرف سے تھا) کی وجہ سے نعت کے مقابلے جیتتی تھی۔

میری فطرت میں حساسیت اور بے چینی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔

(سحر ساجد نے کہا تھا کہ Q.A یہ حساسیت سب رائٹرز میں ہوتی ہے۔ کاش سحر جان سمجھتی کہ مجھے کتنی زیادہ خوشی اس کے مجھے رائٹر کہنے اور ماننے پہ ہوئی تھی)۔

میں ایک وقت میں بہت سے کام کرتی ہوں۔ والد کی طرح صاف گوئی، بہادری اور توکل فطری ہیں۔ فطرت پہ غور کرنا اور انسانی چہرے اور نفسیات کا مشاہدہ کرنا بہت بچپن سے میری عادت رہی ہے۔ کم گو ہوں، بولنے سے زیادہ سنتی ہوں۔ مسلسل کوشش اور محنت کرنے پہ یقین رکھتی ہوں۔ مجھے کسی اور کا تو نہیں پتا مگر مجھے کہانی ہمیشہ کسی لفظ، بات، منظر سے کلک (click) کرتی ہیں اور بعض دفعہ تو ایسا ہوتا ہے جیسے کوئی دروازہ کھل گیا ہے جہاں سے خیالات اور لفظوں کے موتی گر رہے ہیں اور میں پاکستانی ٹیم کی طرح، ہر اچھے کیچ کو چھوڑنے میں ماہر، احمقوں کی طرح آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی ہوتی ہوں! دراصل آگہی کا سمندر بہت وسیع ہے مگر ملتا سب کو اپنی کوشش اور ظرف کے مطابق ہی ہے! اس لیے میری تحریروں کی وجہ سے بہت کچھ مس ہو جاتا ہے اور جو ہے وہ یہ کہ

کسی بے نوا کو نوازنا میرے اختیار کی بات ہے!

2 :

میری تڑپ میں ہے سچائی
کون سمجھے گا ذائقہ میرا

میرے بھائی ویسے تو تھوڑا بہت ادبی ذوق رکھتے ہیں مگر میری لکھی ہوئی کہانیوں کو لفٹ نہیں کرواتے ہیں۔ ماسکو میں مقیم بھائی نے میری ایک ٹریجڈی اسٹوری (جو ایڈز) کے موضوع پر تھی پڑھ کر خاص طور پر امی کو فون کر کے کہا تھا کہ

"بہنی کو کہیں کہ اتنا اداس مت لکھا کریں۔"

امی اور مجھ سے چھوٹی بہن نور العین کو کہانی سننا پسند ہے۔ "میں کہوں گی میری کہانی ضرور پڑھنا!" اور وہ خود تین چھوٹے بچوں کی ماں ہو کر مجھے فون کر کے بہت آرام سے کہے گی!

"بہنی! مجھے کہانی پڑھ کر سناؤ!"

کر لو گل ۔۔۔! فری کالز کا بھی لوگ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ابو اور سب سے چھوٹی بہن فرحت العین جو فائن آرٹ کی طالبہ ہے۔ وہ ضرور پڑھتے اور سراہتے ہیں۔

سسرال میں آسیہ باجی اور انیلا بھابھی (مجھے پڑھیں یا نہ پڑھیں) ڈائجسٹ باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔ ایک بار انیلا بھابھی کو میں نے اپنی ایک طویل اسٹوری زبردستی پڑھنے کو دی تھی۔ اور اس کو پڑھنے کے بعد انہوں نے بے ساختہ کہا تھا۔

"میں نے تمہاری اسٹوری پڑھی ہے اب مجھے آئس کریم کھلاؤ! کیونکہ مجھے اب چکر آرہے ہیں!"

(بستی جی نہیں ہو گئی)

شوہر کی سپورٹ کے بغیر کچھ ممکن نہیں ہوتا۔ چونکہ میں اپلائیڈ سائیکالوجی میں ڈپلوما بھی کر رہی ہوں۔ ساتھ ساتھ گھر کو دیکھنا اور تھوڑا بہت لکھنا۔ یہ سب اکٹھے کرنا کافی مشکل ثابت ہوتا ہے کسی کسی وقت۔ مگر ایک تو میں مشکل پسند ہوں۔ اور کچھ میری عادت بھی ہے ہر وقت متحرک رہنا، مجھے ساکت اور منجمد ہونے سے خوف آتا ہے! زندگی کے بے کار جینے سے اسے ضائع کرنے سے! آپ جہاں بھی، جس جگہ بھی ہوں کوشش ضرور کریں کہ اپنی زندگی کو بامقصد گزاریں اور ضروری نہیں کہ اس کے لیے آپ گھر سے باہر ہی نکلیں۔ اپنے آس پاس غور سے دیکھیں، اپنے اندر ضرور جھانکیں! بہت مقاصد ملیں گے۔ اپنی

ذات کے گلاب کو، حسد، کینہ، جھوٹ، چغل خوری، اس طرح کے بے شمار کانٹوں سے صاف کرنا اور بچانا بھی مقصد ہو سکتا ہے!

میرے شوہر مجھے میگزین، صفحات، چین وغیرہ باقاعدگی سے لا دیتے ہیں۔ پوسٹ کروانے میں بھی کاہلی نہیں دکھاتے۔ مگر پڑھنے کا شوق نہیں ہے، کیونکہ ان کی روٹین اور جاب ایسی ہے کہ ان کے پاس اپنی فیملی کے لیے ہی وقت کم ہوتا ہے۔ وہ میڈیا پرسن ہیں اور ایک مشہور نیوز چینل سماء ٹی وی سے وابستہ ہیں۔ اتنی تھکاوٹ کے بعد کچھ پڑھنا ناممکن سی بات ہے۔

3: ابھی یہ سوال قبل از وقت ہے، میرے جیسے نئے لکھنے والوں سے سچ پوچھو تو ابھی ایسا کچھ بھی نہیں لکھا ہے۔ جس پہ فخر اور اطمینان ہو، مگر یہ ضرور ہے ابھی ایک امید ضرور ہے کہ۔

عہد

مجھ کو ایک نظم کا وعدہ ہے
ملے گی مجھ کو
ڈوبتی نبضوں میں جب درد کو نیند آنے لگے
زرد سا چہرہ لیے چاند افق پر پہنچے
دن ابھی پانی میں ہو
رات کنارے کے قریب
نہ اندھیرا، نہ اجالا ہو
نہ یہ رات، نہ دن
جسم جب ختم ہو اور
روح کو جب سانس آئے
مجھ سے اک نظم کا وعدہ ہے
ملے گی مجھ کو۔

(گلزار)

سو دیکھتے ہیں میرے قلم کے لفظوں میں وہ معجزہ کب اترتا ہے۔

4: یہ سوال کافی گھما دینے والا ہے کیونکہ اچھے اور بڑے نام بے شمار ہیں۔ جن کو بار بار پڑھنے کی تمنا رہتی ہے۔

اس طلسماتی شہر بے مثال کے لفظوں کی جادوگرنیاں اپنے اپنے ہنر کی چھڑی سے لازوال اور خوب صورت داستانیں رقم کرتی رہی ہیں اور کرتی رہیں گی (ان شاء اللہ)

مجھے نہیں پتا کہ ایسا کیوں ہے مگر تخیل کے دریچوں میں خوب صورت، حسین چہرے والے شہزادے یا شہزادیاں نہیں بستے ہیں (ہاہا)

میرا تخیل، وجدان یا کچھ اور جو بھی ہے اس میں مٹی، کچی پکی زمینوں پہ بیٹھنے، سونے جاگنے والے بظاہر عام مگر روحانیت کے اسرار لیے ہوئے لوگ ڈوبتے اور ابھرتے رہتے ہیں۔

(حالانکہ میں نے اس زندگی کا ایک فیصد حصہ بھی نہیں دیکھا، بہت شاہانہ زندگی گزاری ہے الحمد للہ۔ مگر پھر بھی۔)

مجھے وقت کی تہ میں چھپی زندگی اچھی لگتی ہے۔ مجھے مٹی سے گندھے والے کردار ہمیشہ بے بس کر دیتے ہیں۔ پتا نہیں یہ "مٹی" ہی اتنی تاثر والی ہے جو خاک ہونے پر مجبور کرتی ہے یا کچھ اور ہے یہ سب۔

کبھی دیکھا ہے تو نے عشق میں وجدان کا عالم
بس تو ہی تو، تو ہی تو اور تو ہی تو کا عالم

میرے تخیل کی کھڑکی میں مختلف چہروں، رنگوں والے بابے، فقیر آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتے ہیں۔ جب تک ان کی نہ مانو، نہ سنو کھڑکی سے ہٹتے ہی نہیں۔ (اور یہ سلسلہ ایک تسلسل کے ساتھ خوابوں میں بھی آتا ہے مگر کسی وجہ یا مخصوص وقت میں۔)

اسی لیے اسکول لائف میں پڑھی تحریر "شہرذات" نے مجھے چونکا دیا تھا۔ اس عمر میں "شہرذات" کا مطلب ٹھیک سے سمجھ نہیں آیا تھا، مگر اس کی سوچیں تلاش اور وہ منظوم "ابو بن ادھم" سب ایک جیسا تھا اور تب احساس ہوا کہ سفر ضروری ہیں زندگی میں اور تلاش بھی ایک سفر ہے۔ وہ میری ذات کا آئینہ تھا اور آئینہ کبھی متاثر نہیں کرتا ہے۔ میں نے دوبارہ کبھی وہ تحریر نہیں پڑھی۔ اس لیے کہ آئینہ تو مجھے مل گیا تھا جو میرے پاس

آج بھی ہے، مگر دنیا پرست ہوں، اس لیے پختگی سے محروم ہوں ابھی! عمیرہ احمد کی تحریر کا نہ ہی رنگ اور فطرت، وہی ہے، جس پہ میری بنیاد ہے۔

عنیزہ سید اور تنزیلہ ریاض کو پڑھتے وقت آپ کو اپنے ہوش و حواس مکمل طور پر حاضر رکھنے پڑتے ہیں۔ ان کی کہانیاں آپ صرف ایسے ہی وقت گزاری کے لیے نہیں پڑھ سکتے۔ دونوں اپنی ذہانت کا پورا پورا استعمال کرتی ہیں۔ اپنی تحریروں میں، ان کی تحریر پڑھتے ہوئے اسپیڈ بریکر جیسے جھٹکے بار بار لگتے ہیں۔ جو بار بار رکنے، ٹھٹکنے اور سوچنے پہ مجبور کرتے ہیں۔

سمیرا حمید لفظوں اور تشبیہات کے خزانے سے مالا مال، ان کی تحریریں ایسی ہیں جیسے کسی درویش کا فیض عام ہو، مگر جب بگڑے تو ایک دم ہی سے کہے۔

"نہیں دیتا.... جا۔"

ایسا ہی ان کی کہانی بہت سے مقامات پہ آکر خود کو چھپاتی ہے اور سامنے والا تعجب سے پوچھتا ہے۔

"میں نے کیا کیا؟"

سائرہ رضا کی سب سے اچھی خوبی! ایک عام موضوع پہ بھی اتنی روانی اور خوب صورتی سے لکھتی ہیں کہ وہ چیز منفرد بن جاتی ہے۔ روانی اور بہاؤ بہت ہے ان کی تحریر میں۔

"اب کر میری رفوگری...!"

ایک ایسی کہانی تھی، جس میں سب کچھ بہت واضح اور عمدہ انداز میں قارئین کے سامنے رکھ دیا گیا تھا۔ مگر اس کا اختتام، پڑھنے والے کی سوچ اور وسعت پہ منحصر کرتا تھا۔

اور باقی یہ ہے کہ۔

اس شہر بے مثال میں، بس مجھ کو چھوڑ کر ہر شخص لاجواب ہے، ہر شخص کمال ہے!

مگر یہ ضرور ہوں گی کہ مجھے بڑے ناموں سے زیادہ بڑا کام، اعلیٰ اخلاق اچھا لگتا ہے اور ایسے لوگوں کو میں کہتی ہوں۔

جو کامیابی اور شہرت کے چکنے سنگ مرمر جیسے فرش پہ تیز رفتاری سے چلنے کے باوجود، با اخلاق اور اعلیٰ ظرف کے مالک ہوتے ہیں۔ میرے جیسے لوگ تو ہر قدم پہ سلپ ہوتے ہیں اور بڑی دور تک پھسلتے ہی چلے جاتے ہیں پھر شرمندگی سے کپڑے جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

5 : پسندیدہ اقتباس

1 : عاشق، بچے اور وحشی یہ سب فطرت سے بے حد قریب ہوتے ہیں۔ اور تصنع اور مہذب ریاکاری کے پردوں میں اصل جذبات نہیں چھپا سکتے اور ان سب کو ٹوٹم، منتروں اور تصویروں کی ضروریات بھی رہتی ہے۔ بچے اپنا پسندیدہ کھلونا سرہانے رکھ کر سوتے ہیں، وحشی تعویذ پہنتے ہیں۔ عاشق بھی اسی قسم کی احمقانہ حرکت کرتے ہیں۔ پرانے خطوط، پرانی تصویریں، نشانیاں، یادگاریں۔ محبت کرنے والوں کے ٹوٹم اور تعویذ ہیں۔

2 : بعض الفاظ کا مطلب محض اپنے زخموں کے ذریعے ہی سمجھ میں آتا ہے۔ (آخر شب کے ہمسفر" قرۃالعین حیدر)

پسندیدہ شعر۔

بے پریدم سوئے کوئے
من اگر بے داشتم بال و پرے!

ترجمہ!

میں ہمیشہ اس کے کوچہ میں اڑتا پھرتا
اگر میں بال و پر رکھتا....!





دیارِ دل کے ہیرو

علی رحمن سے باتیں

شاہین رشید

1 "اصلی نام؟"
"علی رحمن خان۔"

2 "پیار کا نام؟"
"علی۔"

3 "تاریخ پیدائش/شہر؟"
"6 مئی/اسلام آباد۔"

5 "قد/ستارہ؟"
"5 فٹ 11 انچ/ٹورس۔"

6 "تعلیمی قابلیت؟"
"لندن اسکول آف اکنامکس کا گریجویٹ ہوں۔"

7 "بہن بھائی؟ آپ کا نمبر؟"
"ہم دو بھائی ہیں۔ میں قد میں بڑا ہوں۔"

8 "شادی؟"
"ابھی نہیں ہوئی کیونکہ ابھی میرا وقت نہیں آیا۔"

9 "شوبز میں آمد؟"
"بچپن کا شوق ہے (قہقہہ) سچ کہہ رہا ہوں۔"

10 "متعارف کس نے کرایا؟"
"شہنشاہ نبیل نے۔"

11 "پہلی پرفارمنس؟"
"تھیٹر میں دی اور یہیں سے شروعات ہوئی۔"

12 "ٹی وی پہ پہلی پرفارمنس یا ڈرامہ؟"
"رشتے پیار اور عورت سے۔"

13 "پہلی جاب؟ پہلی سیلری؟"
"ایک پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ کام کیا تھا اور چار ہزار روپے پے تھی۔ جاب کہہ لیں یا سیلری کہہ لیں۔"

18 "رات کو سونے کے اوقات؟"

"کوئی اوقات مقرر نہیں۔ اگر بارہ بجے تک سو جاؤں تو پھر 3 بجے آنکھ کھل جاتی ہے۔ یوں سمجھیں کہ میری صبح ہو جاتی ہے۔"

19 "پسندیدہ تہوار۔۔۔؟"

"چھٹی کے جتنے بھی دن ہیں مجھے بہت پسند ہیں عید کا تہوار بہت پسند ہے۔"

21 "شدید بھوک میں کیفیت؟"

"کوئی خاص نہیں دن گزر ہی جاتا ہے۔"

22 "کھانے کے شوقین ہیں؟"

"جب پکانے کا بھی شوقین ہوں۔ بھوک لگی ہو تو کریزی ہو جاتا ہوں دل چاہتا ہے کہ کچھ بہت اچھا پکاؤں اور بہت اچھا کھاؤں۔"

23 "آپ کو انتظار رہتا ہے؟"

"کہ کب پاکستان جاؤں اور والدین سے ملوں۔"

24 "گھر کب یاد آتا ہے؟"

"جب بہت تھک جاتا ہوں۔"

25 "طبیعت میں ضد ہے؟"

"ضدی بہت ہوں۔"

26 "دماغ کا میٹر کب گھومتا ہے؟"

"ایک دم سے نہیں گھومتا جب کوئی بات ایکسٹریم تک چلی جائے تب۔ ورنہ صبر بہت ہے مجھ میں۔"

27 "غصے میں کیا کرنے کو دل چاہتا ہے؟"

"پٹھان ہوں۔ بہت کچھ کرنے کو دل چاہتا ہے۔"

28 "خواتین میں کیا بات اچھی لگتی ہے؟"

"جو پڑھی لکھی ہیں' جو ذہین ہیں' جو پڑھ لکھ کر کچھ بنتی ہیں' جو خود مختار ہیں جو اپنی زندگی خود سنوارتی ہیں۔"

30 "گھر میں کس کے غصے سے ڈر لگتا ہے؟"

"ابو کے غصے سے۔"

31 "وقت سے پہلے نہیں نصیب سے زیادہ نہیں۔۔۔ یقین ہے؟"

"بالکل ہے اور مجھے بھی وقت سے پہلے نہیں وقت کے بعد ہی کچھ ملا ہے۔"

32 "پسندیدہ فوڈ اسٹریٹ؟"

"لاہور کی پرانی فوڈ اسٹریٹ بہت اچھی تھی۔ اب تو بہت ماڈرن کردیا ہے اسے۔"

34 "کس ملک کی شہریت کی خواہش ہے؟"

"مجھے اپنے ملک پہ بہت فخر ہے۔ تو کسی ملک کی نہیں لینا چاہوں گا۔"

35 "کب اپنے آپ کو ساتویں آسمان پر محسوس کرتے ہیں؟"

"جب آپ ایک مقام پر پہنچ جاتے ہیں اور لوگ آپ کی تعریف کرتے ہیں۔"

36 "ونڈو شاپنگ کا شوق ہے یا؟"

"ونڈو شاپنگ کا بہت زیادہ شوق ہے۔"

37 "پیسہ خرچ کرتے وقت کیا سوچتے ہیں؟"

"آپ اسے اچھی عادت کہہ لیں یا بری۔ پیسہ خرچ کرتے وقت کچھ نہیں سوچتا۔"

38 "کب سوچا کہ بس اب دنیا میرے لیے ختم ہے؟"

"کبھی نہیں۔ ہمیشہ اچھی امید کے ساتھ جیتا ہوں۔"

39 "موڈ خوشگوار ہو جاتا ہے؟"

"جب دوستوں کے ساتھ ہوتا ہوں یا کوئی اچھی فلم دیکھ لیتا ہوں یا پھر کوئی بہت اچھی کتاب پڑھ لیتا ہوں۔"

40 "بستر جلدی چھوڑ دیتے ہیں یا سستی سے لیٹے رہتے ہیں؟"

"کاش وہ وقت آئے کہ میں بستر جلدی چھوڑ دوں۔ مگر اٹھنے میں ٹائم لگا دیتا ہوں۔"

41 "ہمیشہ کون مخلص ہوتے ہیں؟"

"صرف اور صرف اپنے۔"

42 "چھٹی کا دن کہاں گزارتے ہیں؟"

"کبھی کبھار گھر میں اور یہ تو موڈ پر منحصر ہے۔"

43 "لباس میں کیا پسند ہے؟"

"گھر میں جینز اور گھر سے باہر سوٹ کہ مجھے گھر سے باہر اچھی طرح تیار ہو کے جانا پسند ہے۔"

44 "عورت ذہین ہونی چاہیے یا حسین؟"

"دونوں کا مکسچر ہونی چاہیے۔"

45 "گھر کے کس کونے میں سکون ملتا ہے؟"
"اگر ویانا (آسٹریا) کی بات کریں تو کچن میں اور اگر پاکستان کی بات کریں تو ہر کونے میں۔"

46 "ایک جملہ اپنی شخصیت کے لیے؟"
"خوش رہنے والا انسان۔ اور خوش قسمت انسان۔"

47 "کس کے ایس ایم ایس کے جواب فوراً" دیتے ہیں؟"
"دوستوں اور گھر والوں کے۔"

48 "بوریت دور کرنے کے لیے کیا کرتے ہیں؟"
"کہیں تفریح کرنے چلا جاتا ہوں یا پھر کوئی کتاب پڑھ لیتا ہوں یا فلم دیکھ لیتا ہوں۔"

49 "کسی کو فون نمبر دے کر پچھتائے؟"
"ہاں جی بہت بار" (تجربہ!)

51 "اگر آپ پاور میں آجائیں تو؟"
"کرپشن ختم کر دوں گا۔ پاکستانی پالیٹکس ختم کر دوں گا۔ پاکستان کو بہتر جگہ پر لے آؤں گا۔"

52 "کیا چیزیں جمع کرنے کا شوق ہے؟"
"کلون، پرفیوم وغیرہ۔ والد کے پاس سے ہمیشہ اچھی خوشبو آتی تھی تو ان ہی کا اثر ہے۔"

53 "انسان کی زندگی کا سب سے اچھا دور کون سا ہوتا ہے؟"
"جب ہم یا کوئی بھی انسان اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارتا ہے۔"

54 "وقت کی پابندی کرتے ہیں؟"
"بالکل جی۔۔۔ کبھی کبھار نہیں کرپاتا۔ ورنہ عموماً" کرتا ہوں۔"

55 "کن لوگوں پہ دل کھول کر خرچ کرتے ہیں؟"
"اپنے دوستوں اور اپنی فیملی پہ۔"

56 "اپنے لیے سب سے قیمتی چیز کیا خریدی؟"
"سیل فون ہی خریدا ہوگا۔"

57 "کھانے کے لیے بہترین جگہ، چٹائی، ڈائننگ ٹیبل یا اپنا بیڈ؟"
"ڈائننگ ٹیبل۔"

59 "خوش خوراک ہیں؟"
"بہت زیادہ۔"

60 "دنیا سے کیا لینا چاہتے ہیں؟"
"لینا نہیں بلکہ دینا چاہتا ہوں۔"

61 "انٹرنیٹ اور فیس بک سے دلچسپی؟"
"کافی ہے۔ میں نے ساری کوکنگ انٹرنیٹ سے ہی سیکھی ہے اور "یوٹیوب" پہ جو بین ہے، ختم ہونا چاہیے۔"

62 "دیسی کھانے پسند ہیں یا بدیسی؟"
"دیسی تو دیسی ہی ہوتے ہیں۔ کیا بات ہے ان کی۔"

63 "عشق کے بخار چڑھے؟"
"بچپن میں چڑھے اور اتر بھی گئے۔"

65 "کیا محبت اندھی ہوتی ہے؟"
"کبھی کبھار۔"

66 "رویے جو دکھ کا باعث بنتے ہیں؟"
"جب کوئی بہت غصہ کرے یا بدتمیزی کرے اور آپ کی بات کو کوئی اہمیت نہ دے تب۔"

67 "شادی میں پسندیدہ رسم؟"
"مہندی۔"

68 "شادی میں تحفہ دینا چاہیے یا کیش؟"
"کیش۔"

69 "ناشتہ اور کھانا کس کے ہاتھ کا پسند ہے؟"
"ہمارا ایک کک ہے جو کہ بہت اچھا کھانا پکاتا ہے۔ ہم بچپن سے اسی کے ہاتھ کا پکا ہوا کھا رہے ہیں۔"

70 "کس تاریخی شخصیت سے ملنے کی خواہش ہے؟"
"آئن اسٹائن سے۔ کیونکہ مجھے سائنس سے بہت دلچسپی ہے۔"

71 "اپنا فون نمبر کتنی بار تبدیل کیا؟"
"کافی بار۔۔۔ یہی کوئی سولہ سترہ بار۔"

72 "آپ کو فوبیا ہے؟"
"سانپ سے خوف آتا ہے۔ اونچائی سے خوف آتا ہے۔"

73 "کن چیزوں کو لیے بغیر گھر سے نہیں نکلتے؟"

"فون ہوا اور گھڑی چابی۔"

74 "ایک کارنامہ جو انجام دینا چاہتے ہیں؟"

"Sky Diving ورلڈ کو ختم کرنا چاہتا ہوں اور یہ میری زندگی کا ایک بڑا چیلنج ہوگا۔"

75 "ماں ناراض ہو جائے تو؟"

"تو سوری کہہ کر منا لیتا ہوں۔"

76 "اپنی غلطی کا اعتراف کر لیتے ہیں؟"

"بالکل جی آسانی سے۔"

77 "بستر پہ لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے یا کروٹیں بدلتے ہیں؟"

"کبھی تو لیٹتے ہی نیند آجاتی ہے اور کبھی کبھار پانچ دس منٹ لگ جاتے ہیں۔"

78 "دل کی سنتے ہیں یا دماغ کی؟"

"دماغ کی۔"

79 "کبھی غصے میں کھانا پینا چھوڑا؟"

"جی اکثر۔"

80 "بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ کیا کیا رکھتے ہیں؟"

"موبائل اور گھڑی۔"

81 "خدا کی حسین تخلیق؟"

"پوری کائنات۔"

82 "کھانے کی ٹیبل پہ کیا نہ ہو تو کھانے کا مزہ نہیں آتا؟"

"روٹی.... ویسے آج کل تو ڈائیٹ پہ ہوں۔"

83 "محنت سے پیسہ ملتا ہے یا قسمت سے؟"

"میرے خیال میں محنت سے پیسہ ملتا ہے۔"

84 "کوئی گہری نیند سے اٹھا دے تو؟"

"دل چاہتا ہے کہ بم پھوڑ دوں۔"

85 "جھوٹ کب بولتے ہیں؟"

"کوشش کرتا ہوں کہ جھوٹ نہ بولوں اور اگر کبھی بولتا بھی ہوں تو دوسروں کو فائدہ پہنچانے کے لیے ہی بولتا ہوں۔"

86 "اپنی شخصیت میں کیا چیز بدلنا چاہتے ہیں؟"

"میں تھوڑا shy ہوں۔ تھوڑا فرینڈلی ہونا چاہتا ہوں۔"

87 "دن کے کس حصے میں اپنے آپ کو فریش محسوس کرتے ہیں؟"

"صبح کے وقت یا پھر شام کو گھر آکر جب شاور لیتا ہوں۔"

88 "ایک وہم جو پریشان کرتا ہے؟"

"بہت وہمی ہوں۔ جیسے چیئر لفٹ پہ بیٹھ تو وہم ہو گیا۔ کسی اونچائی پہ گیا تو وہم ہو گیا۔ مطلب کہیں ایسا نہ ہو جائے کہیں ویسا نہ ہو جائے۔"

89 "گھر آکر پہلی خواہش؟"

"چائے۔"

90 "دنیا کا کون سا مسئلہ فوری طور پہ حل کرنا چاہتے ہیں؟"

"غربت کو ہمارے ملک میں بہت غربت ہے۔ بلکہ غربت پوری دنیا کا مسئلہ ہے۔"

91 "آئینہ دیکھ کر کیا خیال آتا ہے؟"

"ہاں ٹھیک ہیں یا نہیں۔"

92 "کیا چیز نشے کی حد تک پسند ہے؟"

"چائے۔"

93 "کوئی خواب جو بار بار دیکھتے ہیں؟"

"بین الاقوامی سطح پہ اداکاری کروں اور آسکر ایوارڈ حاصل کروں۔"

94 "فقیر کو کم سے کم کتنا دیتے ہیں؟"

"سو روپے۔"

95 "انٹرنیٹ چلی جائے تو؟"

"پاکستان میں تو یہ نارمل بات ہے۔"

96 "کس ملک کے لیے کہتے ہیں کہ کاش یہ ہمارا ہوتا؟"

"بس نظام اچھا ہو جائے تو ہمارے ملک سے بہتر کوئی ملک نہیں ہے۔"

97 "لوگ کن باتوں پہ اپنا وقت ضائع کرتے ہیں؟"

"دوسروں کی برائی میں غیبت کرنے میں۔"

100 "آپ کی شہرت کو زوال آجائے تو؟"

"بس اللہ نے لکھی ہو گی تو زوال آجائے گا۔ ویسے اللہ کسی کے کیریئر کو زوال نہ دے۔"

☆

خاموشی کو بیاں ملے

امتہ الصبور

سنبل ملک ۔۔۔ لاہور

میرا نام سنبل ملک ہے اور میں پاکستان کے دل لاہور کے ایک گاؤں میں رہتی ہوں جو کہ شاہدرہ کے قریب ترین ہے۔ میرے گاؤں میں بجلی' گیس' تعلیم کی سہولتیں میسر ہیں۔ یہاں ایک بنیادی مرکز صحت بھی ہے۔ جہاں ڈاکٹر کی سہولت بھی موجود ہے اور لوگ ایک روپیہ پرچی فیس میں دو دن کی دوائی بھی حاصل کرتے ہیں۔ اسی مرکز صحت میں الٹرا ساؤنڈ اور کور جیسی سہولت بھی NGO کے تعاون سے ممکن ہوئی ہے۔ بجلی نہ ہونے کی صورت میں جنریٹر بھی دستیاب ہیں۔ (واہ میرا گاؤں) یہاں کی کل آبادی 62025 ہے جبکہ صاف پانی صرف منرل واٹر میں ملتا ہے۔

ہم چار بہن بھائی ہیں' میرا نمبر دوسرا ہے مجھ سے بڑا ایک بھائی پھر میں اور میرے بعد دو اور چھوٹے بھائی ہیں۔ تعلیمی قابلیت بی اے' بی ایڈ۔ ایم اے سیاسیات جبکہ ایم اے اردو لٹریچر جاری ہے۔ کیونکہ مجھے اردو سے خاص لگاؤ ہے۔

مشاغل میں ڈھیروں ڈھیر کتابیں پڑھنا' کیونکہ کتابیں ہی میری دوست ہیں اور میرے دکھ سکھ کی ساتھی بھی۔ اور کوکنگ بھی میرے مشاغل میں شامل ہے۔ اس کے علاوہ ہر وہ شوق ہے مجھے جو ایک عام لڑکی کے ہوتے ہیں جیسے سینا پرونا' گھر سجانا یا شاپنگ وغیرہ۔

میری کزنز کہتی ہیں تم کو اتنا پڑھنے کا کیا فائدہ تم ہو تو وہی ٹپیکل ہانڈی چولہا کرنے والی (بندہ پوچھے کہ پڑھنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اپنے بنیادی کاموں سے ہٹ جائے تعلیم تو شعور دیتی ہے) کھانا بنانا بھی آرٹ ہے۔ ہے نا؟ گھر سجانا اس سے بڑا آرٹ۔

انسان مستقبل کی بہت پلاننگ کرتا ہے' مگر ہوتا وہی ہے جو منظور خدا ہوتا ہے' میں نے بھی جو سوچا تھا' وہ نہ بن سکی' مگر اللہ پاک نے جو بھی میری زندگی کا مقصد حیات مقرر کیا۔ میں اس پر تابع ہوں اور مزید اپنی زندگی سے لوگوں کو فائدہ پہنچانے کی کوشش کرتی ہوں۔

خامیاں کیا ہیں ۔۔۔ اپنی خامیاں پاپا سے بھائی سے سب سے پوچھیں سب نے کہا تم میں صرف ایک خامی ہے صرف ایک وہ ہے غصہ (سوچی کر لو کل ساری فساد کی جڑ ہی غصہ ہی تو ہوتا ہے)

خوبیاں۔ وقت کی بہت پابند ہوں' مستقل مزاج ہوں' رحم دل ہوں' ہمدرد بھی ہوں' دوسروں کے جھوٹے آنسو بھی سچ سمجھ کر نرم پڑ جاتی ہوں' مصیبت میں کام آنے والی ہوں۔ سنو بیٹا تم سگھڑ اور گھریلو بھی ہو (یہ ماما کہہ رہی ہیں) ماشاء اللہ اتنی خوبیاں سنبل! ہاہاہا۔۔۔

میری دوست خالدہ کے بقول

رکھتے ہیں جو اوروں کے لیے پیار کا جذبہ
وہ لوگ کبھی ٹوٹ کر بکھرا نہیں کرتے

(3) اور "خواتین" سے تعارف بہت پہلے ہوا' مگر میرے دادا ابا بہت ہی دلدادہ تھے ادب کے' ویسے تو میرے پاپا صرف دس سال کے تھے جب میرے دادا جان کی ڈیتھ ہوئی' مگر وہ سارے رسالے اور کتابیں رضیہ بٹ کے ناول (7 عدد) اشفاق احمد۔ بانو قدسیہ ان کے شروع کے تمام ناول میرے دادا کی بیٹی میں محفوظ تھے اور میں نے وہ سب کچھ پڑھ ڈالا حالانکہ جب میری دسترس میں اتنی ڈھیر کتابیں (ہزار کے لگ بھگ) آئیں تو میں اتنی باشعور نہ تھی (وہ تو ابھی بھی نہیں ہو)

یہ ماما کہہ رہی ہیں۔

مجھے صرف دو سال ہوئے ہیں خواتین 'شعاع سے وابستہ ہوئے 'مگر لگتا ہے جیسے صدیوں کا ساتھ ہے (میرے پاس پیسے جو نہیں تھے شعاع و خواتین خریدنے کے تین سال پہلے) مگر اب اللہ کا شکر ہے۔

مجھے نگہت سیما کی تحریر زمین کے آنسو اور متاع جاں ہے بہنو سجاد اور آبی والی جبکہ پتا نہیں رائٹر نگہت عبداللہ تھیں یا کوئی اور 'سوری یاد نہیں (یہ فرحت اشتیاق کا ناول ہے۔ سنبل) عمیرہ احمد کا "پیر کامل" بہت بہت اچھی کاوش ہم جیسے کمزور ایمان والوں کو حرارت بخشتی ہوئی۔ رخسانہ نگار عدنان کی زندگی کی حقیقت سے پردہ اٹھاتی کہانیاں بہت پسند ہیں۔ عنیزہ سید نہ جانے کیسے کیسے جنگل سے راستہ بناتے ہوئے کہانیوں کو دوام بخشتی ہیں کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ سائرہ رضا سچ کو خوب صورتی سے عیاں کرتی ہیں۔ مطلب یہ کہ خواتین اور شعاع تو اب اوڑھنا بچھونا ہے۔

(4) سالگرہ جی ہاں مناتی ہوں۔ خود ہی سارا انتظام کرتی ہوں 'مگر ہر سالگرہ پر میری ماما مجھے خوب صورت اور نایاب گفٹ دیتی ہیں پرفیوم اور کیک تو لازمی شامل کرتی ہیں 'جبکہ پاپا دعائیں دیتے ہیں بھائی سب کھا کر شکریہ کہہ کر اپنے اپنے کمروں میں چلے جاتے ہیں جبکہ میری دوستیں ضرور گفٹ دیتی ہیں اور مبارک باد بھی ضرور دیتی ہیں اور برتن صاف کروانے تک میرے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔

(5) شاعری کے حوالے سے میں بالکل نالائق ہوں 'مگر سمجھ ضرور رکھتی ہوں۔ پروین شاکر 'وصی شاہ' فیض احمد فیض اور تھوڑا سا احمد فراز کو پڑھا ہے 'مگر شعر کبھی یاد نہیں رہے البتہ امجد اسلام امجد کی شاعری یاد رہ جاتی ہے۔

(6) پسندیدہ کتابوں میں ایک سب سے اونچا اور معتبر نام قرآن مجید۔ ترجمہ و تفسیر پڑھنے کے باوجود تشنگی ہے۔ لگتا ہے جیسے اب تو شروع کیا ہے پڑھنا۔ ہر مرتبہ نئی بات 'ہر مرتبہ نیا سبق سامنے آتا ہے۔ اس کے علاوہ والد صاحب کے کتب خانے میں موجود ہر کتاب ناول پڑھا جن کے مصنف کے نام اور کتابوں کے اپنے نام بھی بھول چکے ہیں وہ بھی پڑھی ہیں 'مگر دور حاضر میں جب سے خواتین سے وابستہ ہوئے اس کی ایک ایک سطر کو نہایت توجہ اور غور سے پڑھتی ہوں۔ (انکساری جو بنتا ہے)

اور اس میں موجود "زندگی کا نچوڑ" اقتباسات بہت بہت پسند آتے ہیں۔ اور یہ سب میرے لیے مشعل راہ بھی ہیں 'کیونکہ مجھے ان اقتباسات میں سے مجھے اپنے دل کی کلبلاتی الجھنوں کے جواب بھی ملتے ہیں۔ کیونکہ تمام خوب صورت رائٹر بہت ہی خوب

صورت لفظ تخلیق کرتی ہیں اور یہ موتی زندگی کی راہوں کو مزید خوب صورت اور روشن بناتے ہیں۔ ان خوب صورت لکھاری بہنوں میں رفعت سراج، عنیزہ سید، نمرہ احمد، عمیرہ احمد، صائمہ اکرم، میری موسٹ فیورٹ رائٹر رخسانہ نگار عدنان، نگہت عبداللہ، نگہت سیما، کنیز نبوی جن کو میں پڑھ سکی دو سالوں میں، جبکہ رضیہ بٹ، بشریٰ رحمٰن کو بھی پڑھا ہے۔ شکریہ دادا جان!

حوریہ معاب آفریدی...ڈی آئی خان

(1) تعارف: میرا نام حوریہ معاب آفریدی ہے، تعلیم جاری و ساری ہے۔ ابھی فرسٹ ایر کی اسٹوڈنٹ ہوں آگے کچھ بھی بن جاؤں معلوم نہیں۔ صوبہ سرحد کے خوب صورت اور پیارے سے شہر ڈیرہ اسماعیل خان سے تعلق رکھتی ہوں۔ مجھ سمیت چچا چچی اینڈ فیملی ہمارے گھر میں ماشاءاللہ بہت رونق ہوتی ہے۔ رونق کیوں نہ ہوگی جس گھر میں 10 کزنز ہوں تو پھر فکر نہ فاقہ عیش کر کاکا۔

مشاغل میں۔ کتابیں پڑھنا، سائیکلنگ کرنا، کرکٹ کھیلنا اور دیکھنا، FM.101 سننا اور ٹی وی دیکھنا شامل ہیں۔ خوبیاں!

اچھے ہیں پیارے ہیں ہم اپنے لیے ہیں
ہم خود کو نہیں دیکھتے اوروں کی نظر سے

خوبیاں تو مجھ میں بے شمار ہیں جو مل جائے اسی پر شکر ادا کرتی ہوں باقی خوبیاں معلوم کرنے کے لیے سب کزنز کو جمع کیا اور ان سے اپنی خوبیوں کے بارے میں پوچھا، پر سب نے خوبیوں کے بجائے خامیاں بتانی شروع کیں، تب میں نے کہا یہ خواتین کا رسالہ ہے۔ اس میں جھوٹ نہیں لکھا جا سکتا۔ لہٰذا آپ میری خامیاں بتا کر جھوٹ نہ بولیں۔

عائشہ آپی کا کہنا ہے کوکنگ اچھی کرتی ہو (اچھا تو یہ بھی خوبی ہے) ذرا ان کی سنیے فہد صاحب کیا کہتے ہیں میرا ہر کام کرو بس وہی خوبی ہی خوبی ہے بقول سویٹ سے عثمان بھائی کے (سویٹ تب ہی ہوئے تعریف جو دل سے کی ہے) بہت مخلص ہو اور کیئرنگ ہو۔ شہزین، ہدیٰ، فاطمہ، مرتضیٰ بھائی، بلال (عرف بلولال) اور علی نے دل کھول کر تعریف کی۔ مزید خوبیاں لکھنے بیٹھ جاؤں تو صفحے بھر جائیں گے اب اتنی خوبیاں لکھی ہیں خامیاں تو لازمی لکھنی ہوں گی چھوٹی سی بات پر ناراض ہونا اور تھوڑی سی ضدی بھی اور موڈی تو بہت زیادہ ہوں۔ رونا تو بہت جلد آتا ہے۔

شاخیں رہیں تو پھول بھی پتے بھی آئیں گے
یہ دن اگر برے ہیں تو اچھے بھی آئیں گے

خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ تعلق تین سال پرانا ہے، لیکن تقریباً پچھلے سارے شمارے پڑھ لیے ہیں، میں اپنی موسٹ فیورٹ رائٹر فرحت اشتیاق کی کسی بھی تحریر کو فراموش نہیں کر سکتی۔ خاص کر "میرے ہمدم میرے دوست" "دیار دل اور ہمسفر" پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ نگہت سیما کی نجات دہندہ میمونہ خورشید کی ہوا کو آوارہ کہنے والوں اور تنزیلہ ریاض کی مرگ برگ یہ سب تحریریں میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکتی۔

سالگرہ ہم مناتے ہیں، لیکن زیادہ اہتمام کے ساتھ نہیں بس عام سا فنکشن گھر میں کر لیتے ہیں اور میری سالگرہ پر بس عام سے ہی گفٹس ملتے ہیں، لیکن ان عام گفٹس میں دیا ہوا جو خاص گفٹ ہے، وہ ہے میری فرینڈ سدرہ کی طرف سے .... وہ عمیرہ احمد کے ناولٹ کا مجموعہ میں نے خوابوں کا شجرہ رکھا ہے، جو میرے لیے بہت ہی اہمیت کا حامل ہے۔

اس سال ہما ملک کا ناول جو چلے تو کتابی شکل میں پڑھا ہے۔ پسندیدہ شعر:

لوٹ آئے نہ کسی روز وہ آوارہ مزاج
کھول رکھتے ہیں اسی آس پہ در شام کے بعد



عمیرہ احمد

آب حیات

آب حیات کی کہانی تاش کے تیرہ پتوں میں چھپی ہوئی ہے۔

2۔ ایک خوب صورت اتفاق نے امامہ اور سالار کو یکجا کر دیا ہے۔ سالار نے امامہ کو ایر رنگز دیے ہیں سو بالکل ویسے ہی ہیں، جیسے امامہ شادی سے قبل پہنتی تھی اور جو اسے اس کے والد ہاشم نے دیے تھے۔ سکندر عثمان نے اس شادی کو کھلے دل سے قبول کیا۔

9۔ بی آئی اے ہیڈ کوارٹرز کے ایک کمرے میں چار اشخاص گزشتہ ڈیڑھ ماہ سے ایک پروجیکٹ پر کام کر رہے ہیں۔ انہیں ایک شخص بلکہ اس کی پوری فیملی کے تمام بیرونی معاملات اور ذاتی زندگی کی تمام تر مکمل معلومات حاصل ہیں اور انہیں اس میں سے کسی ایسے پوائنٹ کی ضرورت ہے۔ جس کی بنیاد پر وہ اس شخص پر ہاتھ ڈال سکیں۔ لیکن اس شخص — سمیت اس کی فیملی کے نہایت شفاف ریکارڈ سے اب تک کوئی مشکوک بات نہیں نکال سکے مگر آخری پندرہ منٹ میں انہیں اس فیملی کی سی لڑکی کی تاریخ پیدائش کے حوالے سے کوئی سراغ مل جاتا ہے۔



1۔ وہ کئی راتوں سے تکلیف میں تھی۔ سکون آور ادویات کے بغیر سو نہیں پا رہی تھی۔ وہ اپنے باپ سے بس ایک سوال کرنے گئی تھی کہ اس نے اس کی فیملی کو کیوں مار ڈالا۔

6۔ اسپیلنگ بی کے بانوسن مقابلے کے فائنل میں تیرہ سالہ اور نو سالہ دو بچے چودھویں راؤنڈ میں ہیں۔ تیرہ سالہ بچی نے نو حرفوں کے لفظ کا ایک حرف غلط بتایا۔ اس کے بعد نو سالہ ایک خود اعتماد بچے نے گیارہ حرفوں کے لفظ کی درست اسپیلنگ بتا دیں۔ ایک اضافی لفظ کے درست ہجے بتانے پر وہ مقابلہ جیت سکتا تھا۔ جسے غلط بتانے کی صورت میں تیرہ سالہ بچی دوبارہ فائنل میں آ جاتی۔ وہ اضافی لفظ سن کر اس خود اعتماد، مطمئن اور ذہین بچے کے چہرے پر پریشانی پھیلی جسے دیکھ کر اس کے والدین اور ہاں کے دیگر مہمان بے چین ہوئے مگر اس کی یہ کیفیت دیکھ کر اس کی ساتھ سالہ بہن مسکرائی۔

A۔ وہ جانتی تھی کہ وہ بددیانتی کر رہی ہے مگر پھر بھی اس نے اس کتاب کے پہلے باب میں تبدیلی کر دی اور ترمیم شدہ باب کا پرنٹ نکال کر دیگر ابواب کے ساتھ فائل میں رکھ دیا۔

7۔ وہ دونوں ایک ہوٹل کے بار میں تھے۔ لڑکی نے اسے ڈرنک کی آفر کی مگر مرد نے انکار کر دیا اور سگریٹ پینے لگا۔ لڑکی نے پھر واس کی آفر کی اس نے اس بار بھی انکار کر دیا۔ وہ لڑکی اس مرد سے متاثر ہو رہی تھی۔ وہ اسے رات ساتھ گزارنے کے بارے میں کہتی ہے۔ اب کے وہ انکار نہیں کرتا۔

4۔ وہ اپنے شوہر سے ناراض ہو کر اسے چھوڑ گئی ہے۔ ایک بوڑھی عورت کے سوال و جواب نے اسے سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔ اب وہ خود اپنے اس اقدام سے غیر مطمئن اور ملول نظر آتی ہے۔

5۔ وہ جیسے ہی گھر آیا۔ معمول کے مطابق اس کے دونوں بچے اپنا کھیل چھوڑ کر اس کے گلے آ لگے۔ حسب معمول اس کی بیوی نے بھی جو تیسری بار امید سے تھی اس کا پرتپاک استقبال کیا۔ وہ ذہن میں اپنی بیوی بچوں کو مطمئن و مسرور دیکھ کر سوچ رہا ہے کہ اگر وہ چند پیپر پھاڑ کر پھینک دے تو اس کی زندگی آئندہ بھی اسی طرح خوب صورت رہ سکتی ہے۔ مگر وہ

ضروری فون آجاتا ہے۔ جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔ اب اسے اپنی فیملی اور استعفیٰ میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

8۔ پریذیڈنٹ ایک انتہائی مشکل صورت حال سے دوچار تھا۔ اس کا فیصلہ کانگریس کے الیکشنز پر بری طرح اثر انداز ہو سکتا تھا۔ کیبنٹ کے چھ ممبرز کے ساتھ پانچ گھنٹے کی طویل نشست کے بعد اسے پندرہ منٹ کا وقفہ ملا تھا۔ فیصلے کی ذمہ داری اس کے سر تھی۔ آخر کار وہ ایک فیصلے پر پہنچ گیا۔

10۔ الزائمر کے مریض باپ کو وہ اپنے ہاتھوں سے یخنی پلا رہا تھا۔ اس کے انداز میں اپنے باپ کے لیے نہایت پیار، احترام اور تحمل ہے۔ اس کے باپ کو معلوم نہیں کہ وہ اس کے ہاتھ سے آخری بار کھانا کھا رہا ہے۔ اس کا سامان ایئرپورٹ پر جا چکا ہے اور وہ گاڑی کا انتظار کر رہا ہے۔

Q۔ وہ نیلے رنگ کی شفاف جھیل پر اس کے ہمراہ ہے۔ خوب صورت حسین مناظر میں گھری جھیل میں وہ صندل کی لکڑی کی کشتی میں سوار ہے۔

K۔ وہ تیسری منزل پر بنے اپارٹمنٹ کے بیڈ روم کی کھڑکی سے ٹیلی اسکوپ کی مدد سے ساٹھ فٹ کے فاصلے پر اس چیکوئٹ ہال پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ ٹائم نو بج کر دو منٹ ہو رہے ہیں۔ پندرہ منٹ بعد وہ مہمان چیکوئٹ ہال میں داخل ہو گا۔ وہ ایک پروفیشنل شوٹر ہے۔ اسے مہمان کو نشانہ بنانے کے لیے ہائر کیا گیا ہے۔

3۔ وہ اس سے اصرار کر رہی ہے کہ نجومی کو ہاتھ دکھایا جائے۔ وہ مسلسل انکار کرتا ہے مگر اس کی خوشی کی خاطر مان لیتا ہے۔ نجومی لڑکی کا ہاتھ دیکھ کر بتاتا ہے کہ اس کے ہاتھ پر شادی کی دو لکیریں ہیں۔ دوسری لکیر مضبوط اور خوشگوار شادی کو ظاہر کرتی ہے۔ وہ دونوں ساکت رہ جاتے ہیں۔

آدم و حوا

ایک خوب صورت اتفاق نے سالار اور امامہ کو یکجا کر دیا۔ اس نے امامہ کو سال بعد دیکھا تھا۔ ان کی ابتدائی زندگی کا پہلا اختلاف لائٹ پر ہوا۔ سالار کو لائٹ آن کر کے سونے کی عادت تھی جبکہ امامہ کو روشنی میں نیند نہیں آتی تھی۔ لیکن سالار نے امامہ کی بات مان لی۔ صبح وہ امامہ کو جگائے بغیر سحری کر کے نماز پڑھنے چلا جاتا ہے۔ امامہ سحری کے لیے اٹھتی ہے تو فرقان کے گھر سے کھانا آیا رکھا ہوتا ہے۔ امامہ اسے سالار کی بے اعتنائی سمجھتی ہے۔ سعیدہ اماں سے فون پر بات کرتے ہوئے وہ رو پڑتی ہے اور وجہ پوچھنے پر اس کے منہ سے نکل جاتا ہے کہ سالار کا رویہ اس کے ساتھ ٹھیک نہیں ہے۔ سعیدہ اماں کو سالار پر سخت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈاکٹر سبط علی کو بھی بتا دیتی ہیں کہ سالار نے امامہ کے ساتھ کچھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ سالار ڈاکٹر سبط علی کے گھر امامہ کا روکھا رویہ محسوس کرتا ہے۔ سعیدہ اماں بھی سالار کے ساتھ ناراضی سے پیش آتی ہیں۔ پھر امامہ اس رات سعیدہ اماں کے ہی گھر رہ جاتی ہے۔ سالار کو اچھا نہیں لگتا مگر وہ منع نہیں کرتا۔ امامہ کو یہ بھی برا لگتا ہے کہ اس نے ساتھ چلنے پر اصرار نہیں کیا۔ اس کو سالار سے یہ بھی شکوہ ہوتا ہے کہ اس نے اسے منہ دکھائی نہیں دی۔ سالار اپنے باپ سکندر عثمان کو بتا دیتا ہے کہ اس کی شادی آمنہ نامی جس لڑکی سے ہوئی ہے وہ در اصل امامہ ہے۔ سکندر عثمان اور طیبہ سخت پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو فرقان کے گھر روزانہ کھانا کھانے پر بھی اعتراض ہوتا ہے اور سالار کے ہی لوٹ کھانے پر بھی۔ سکندر عثمان، طیبہ اور انیتا ان دونوں سے ملنے آتے ہیں اور امامہ سے بہت پیار سے ملتے ہیں۔ وہ سالار کا ولیمہ اسلام آباد میں کرنے کے بجائے اب لاہور میں کرنے کا منصوبہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر سبط علی امامہ سے سالار کے ناروا سلوک کے بارے میں دریافت کرتے ہیں تو وہ شرمندہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بات اتنی بڑی نہیں تھی جتنی اس نے بنا ڈالی تھی۔ سالار امامہ سے اسلام آباد چلنے کو کہتا ہے۔ تو امامہ خوف زدہ ہو جاتی ہے۔

ڈاکٹر سبط، سالار کو سمجھاتے ہیں۔ وہ خاموشی سے سنتا ہے۔ وضاحت اور صفائی میں کچھ نہیں بولتا مگر ان کے گھر سے واپسی پر وہ امامہ سے ان شکایتوں کی وجہ پوچھتا ہے۔ وہ جواباً روتے ہوئے وہی بتاتی ہے، جو سعیدہ اماں کو بتا چکی ہے۔ سالار کو اس کے آنسو تکلیف دیتے ہیں۔ پھر وہ اس سے معذرت کرتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ آئندہ جو بھی شکایت ہو کسی اور سے نہ کرنا، ڈائریکٹ مجھے ہی بتانا، وہ اس کے ساتھ سعیدہ اماں کے گھر سے جہیز کا سامان لے کر آتا ہے، جو کچھ امامہ نے خود جمع کیا ہوتا ہے اور کچھ ڈاکٹر سبط نے اس کے لیے رکھا ہوتا ہے۔ ہزاروں کی تعداد میں گھٹیا رومانوی ناول دیکھ کر سالار کو کوفت

ہوتی ہے اور وہ انہیں تلف کرنے کا سوچتا ہے۔ مگر امامہ کی وجہ سے رک جاتا ہے۔ سالار اپنے بینک میں امامہ کا اکاؤنٹ کھلوا کر تیس لاکھ روپے اس کا حق مہر جمع کرواتا ہے۔ وہ امامہ کو لے کر اسلام آباد جاتا ہے اور ایئرپورٹ پر اسے بتاتا ہے کہ سکندر عثمان نے منع کیا تھا۔ امامہ کو شدید غصہ آتا ہے۔ گھر پہنچنے پر سکندر عثمان اس سے شدید غصہ کرتے ہیں۔

سکندر عثمان سالار کی اسلام آباد آمد پر پریشان ہو جاتے ہیں۔ امامہ کو اس گھر میں آکر شدید ڈپریشن ہوتا ہے۔ وہ نو سال بعد سالار کے گھر سے اپنے گھر کو دیکھتی ہے۔ دو دن رہ کر وہ واپس آجاتے ہیں۔ امامہ کہتی ہے کہ وہ اسلام آباد میں رہنا چاہتی ہے۔ سالار کی جاب یہاں ہے تو وہ مہینے میں ایک دفعہ آجایا کرے۔ اس کی اس بات سے سالار کو دکھ ہوتا ہے۔ پھر جب وہ کہتا ہے کہ اسے امریکہ چلے جانا ہے تو امامہ کہتی ہے کہ وہ دوسری شادی کرلے۔ یہ تجویز سالار کے لیے شاکنگ ہوتی ہے۔ وہ امامہ سے اس کی توقع نہیں کرتا تھا۔

سالار امامہ کو کراچی لے کر جاتا ہے تو وہ انیتا کے گھر جاتی ہے۔ وہ سالار سے کہتی ہے کہ وہ بھی ایسا شاندار گھر چاہتی ہے جس میں سبزیوں کا فارم، فش فارم ہو اور وہ کم از کم ایک ایکڑ کا ہونا چاہیے۔ سالار حیران رہ گیا تھا۔ عید کے موقع پر اس کو میکے کی کمی کا احساس ہوتا ہے۔ سالار کے ساتھ ایک پارٹی میں شراب کی موجودگی پر اس کے دل میں سالار کے لیے بدگمانی آجاتی ہے۔ جس کو سالار دور کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہ اب ان چیزوں سے بہت دور جاچکا ہے۔ سالار بینک میں کام کرتا ہے۔ امامہ اس سے سود کے مسئلہ پر بحث کرتی ہے۔ وہ کہتی ہے سود حرام ہے۔

امامہ سالار کا خیال رکھتی تھی۔ اس کی سالار کے دل میں قدر تھی لیکن وہ زبان سے اظہار نہیں کرتا۔ سالار البتہ جلال کے لیے اس کے دل میں جو نرم گوشہ ہے اس سے بری طرح ہرٹ ہوتا ہے۔

سالار اپنا پلاٹ بیچ کر تقریباً ڈیڑھ کروڑ کی انگوٹھی خرید کر دیتا ہے۔ سکندر عثمان کو جب یہ بات پتا چلتی ہے تو وہ حیران رہ جاتے ہیں پھر وہ اس سے پوچھتے ہیں۔ "کہاں سے لی تھی یہ رنگ؟"

سالار بتاتا ہے کہ اس نے قیمتی ترین شاپ سے خاص طور پر یہ انگوٹھی ڈیزائن — کروائی ہے۔ اور تھوڑی رقم بچی تھی جو اس نے خیراتی اداروں کو دے دی ہے۔ امامہ کو اس انگوٹھی کی قیمت کا بالکل اندازہ نہیں ہے۔ سالار بھی اسے اصل قیمت نہیں بتاتا۔

امامہ کی ملاقات اتفاقاً جلال سے ہوتی ہے۔

جلال اسے لنچ کے لیے لے جاتا ہے۔ وہ یہ جان کر بہت مرعوب ہوتا ہے کہ وہ سالار سکندر کی بیوی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سالار جس عہدے پر ہے۔ وہاں اس نے خوب کمایا ہوگا۔ ریسٹورنٹ میں اچانک فاروق صاحب آجاتے ہیں۔ جلال کے امامہ کے تعارف کرانے پر وہ چونک جاتے ہیں۔ جلال سے مل کر امامہ بہت ڈسٹرب ہو جاتی ہے۔ اس سے گاڑی بھی نہیں چلائی جاتی۔ وہ سالار کو فون کرتی ہے۔ فون آف ہوتا ہے۔ اس کی جوتی کا اسٹرپ بھی ٹوٹ جاتا ہے۔ تب وہ اس کے آفس جانے کا فیصلہ کرتی ہے۔ سالار کو پتا چلتا ہے کہ وہ اپنا کریڈٹ کارڈ بھی شاپنگ سینٹر میں بھول آئی ہے۔ وہ سالار کے آفس کے باتھ روم میں جا کر فریش ہوتی ہے اور اپنی قیمتی انگوٹھی وہاں بھول آتی ہے۔ اسے بعد میں بھی وہ انگوٹھی یاد نہیں آتی۔

دو دن بعد ایک ڈنر پر فاروق صاحب سالار سے ملتے ہیں جب وہ اپنی بیوی کا تعارف کرانا چاہتا ہے تو وہ کہتے ہیں ڈاکٹر جلال انصر کے ساتھ لنچ کے دوران امامہ سے مل چکے ہیں۔

سالار یہ جان کر امامہ سے ناراض ہو جاتا ہے۔ وہ ناراضی میں اسے سعیدہ اماں کے ہاں بھجوا دیتا ہے۔

ڈاکٹر سبط علی سالار کو بلاتے ہیں۔ وہ نہیں جاتا تو وہ امامہ سے تعلق ختم کرنے کا اشارہ کرتے ہیں۔ تب سالار ان کے پاس جاتا ہے اور امامہ سے معافی مانگ کر اسے اپنے گھر لے آتا ہے۔

ایک ہفتہ بعد سالار اسے یاد دلاتا ہے کہ امامہ انگوٹھی کہاں بھولی تھی۔ سالار امامہ سے ایک معاہدہ پر دستخط کراتا ہے۔ جس میں اسے سالار سے علیحدگی کی صورت میں بہت سے حقوق حاصل ہوں گے۔

ڈاکٹر سبط علی کا سلوک سالار کے ساتھ بہت روکھا ہو جاتا ہے۔ امامہ کو برا لگتا ہے تو ان سے کہتی ہے تب ڈاکٹر سبط علی اس کو نصیحت کرتے ہیں کہ عورت کو اپنا گھر کبھی نہیں چھوڑنا چاہیے۔

امامہ سالار کے ساتھ کھانا کھانے ریسٹورنٹ میں جاتی ہے۔ ایک ویٹر سالار کو ایک چٹ لا کر دیتا ہے "آپ یہ جگہ فوراً چھوڑ دیں۔" سالار جانے لگتا ہے لیکن تب ہی امامہ کے باپ اور بھائی وہاں آجاتے ہیں۔ وہ سالار پر حملہ کرتے ہیں۔

آٹھویں قسط

حاصل و محصول

اس نے سالار سے آخری خطبہ کے بارے میں ایک دن پہلے بھی پوچھا تھا۔ تب وہ جبل رحمت پر کھڑے تھے۔

"تمہیں آخری خطبہ کیوں یاد آگیا؟" سالار نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا۔ وہ دونوں ابھی کچھ دیر پہلے جبل رحمت پر نوافل ادا کر کے فارغ ہوئے تھے۔

"یہیں پر آخری حج کے اجتماع سے خطاب کیا تھا انہوں نے؟" وہ جبل رحمت کی چوٹی کے دامن کو دیکھ رہی تھی۔

"ہاں۔" سالار نے اس کی نظروں کا تعاقب کرتے ہوئے نیچے جھانکا۔ ان دونوں کے کپڑے اب ہوا سے پھڑپھڑا رہے تھے۔ وہ دوپہر کا وقت تھا۔ تیز دھوپ اور لو جیسی ہوا کے تھپیڑوں میں وہ اس سے خون جما دینے والے سوال کرنے والی تھی۔

"تمہیں ان کا خطبہ یاد ہے؟" امامہ نے اس سے پوچھا۔

"سارا تو نہیں۔" سالار یاد کرنے کی کوشش کرتے ہوئے اٹکا۔ "بس چند احکامات یاد ہوں گے۔" اس نے بات مکمل کی تھی۔

"جیسے؟" امامہ نے مدھم آواز میں دل گرہ نکال دینے والی بے رحمی کے ساتھ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھا تھا۔ سالار اس کی نظروں سے نظریں ہٹا نہیں سکا۔ وہ بڑی نازک جگہ پر کھڑا کر کے اس سے اس کی زندگی کا مشکل ترین سوال پوچھ رہی تھی اور سوال کا جواب۔ ان کے درمیان آنے والی خاموشی کے وقفے میں بھی تھا۔

"مجھے ٹھیک سے وہ احکامات بھی یاد نہیں۔ میں ایک بار آخری خطبے کو دوبارہ پڑھوں گا۔ پھر تم پوچھ لینا۔ جو پوچھنا چاہتی ہو۔" سالار نے بچنے کی ایک آخری کوشش کی تھی اور ناکام رہا۔

"مجھے پورا یاد ہے اور آج یہاں کھڑی ہوں تو اور بھی یاد آ رہا ہے۔ میں سوچ رہی ہوں آخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ خطبہ یہیں کیوں دیا تھا۔ اس پہاڑ کے دامن میں کھڑے ہو کر جس پر حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا رضی اللہ تعالیٰ عنہ چالیس سال کے بعد آپس میں ملائے اور بخشے گئے۔" وہ اب کچھ سوچنے والے انداز میں بول رہی تھی۔

"شاید اس لیے کیونکہ دنیا کا آغاز انہیں دو انسانوں سے ہوا اور دین مکمل ہونے کا اعلان بھی اسی میدان میں ہوا اور اسی میدان میں ایک دن دنیا کا خاتمہ ہو گا۔" سالار لقمہ دیے بغیر نہیں رہ سکا۔

امامہ ہنس پڑی تھی۔

"تم ہنسیں کیوں؟" سالار الجھا۔

"تم تو کہہ رہے تھے تم کو وہ چند احکامات بھی یاد نہیں۔ اب یہ کیسے یاد آگیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے

اس میدان میں دین مکمل ہونے کا اعلان کیا تھا۔"

سالار لاجواب ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ امامہ کو کوئی توجیہہ ڈھونڈ کر پیش کرتا اس نے اسی پُرسوچ انداز میں اس سے کہا۔

"مجھے لگتا ہے' وہ آخری خطبہ دنیا کے ہر انسان کے لیے تھا۔ ہم سب کے لیے۔ آج کے آدم اور حوا کے لیے۔ اگر وہ سارے احکامات جو اس آخری خطبہ کا حصہ تھے۔ ہم سب نے اپنائے ہوتے یا اپنا لیں تو دنیا اس بے سکونی اور بگاڑ کا شکار نہ ہوتی۔ جہاں ہم آج کھڑے ہیں۔ اگر وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی امت کے لیے آخری وصیت تھی تو ہم بہت بدقسمت ہیں کہ ان کی سنت تو ایک طرف ان کی وصیت تک ہمیں یاد نہیں۔ عمل کرنا تو بہت دور کی بات ہے۔"

وہ کچھ جذباتی انداز میں بولتی گئی تھی اور سالار کو پتہ تھا یہ گفتگو کہاں جا رہی تھی۔ وہ عورت ساڑھے نو سال پہلے بھی اس کے پیروں کے نیچے سے زمین نکال سکتی تھی اور تب بھی نکال رہی تھی۔

"تم کو سود کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے احکامات پتا ہیں نا اس آخری خطبے کے؟" وہ تلوار اس کی گردن پر آگری تھی جس سے وہ اب تک بچنے کی کوشش کرتا آیا تھا۔ وہ کس جگہ پر کھڑی اس سے کیا پوچھ رہی تھی۔ ایسی ندامت تو کبھی خانہ کعبہ میں اللہ کے سامنے کھڑا ہو کر اسے نہیں ہوئی تھی جتنی اس وقت جبل رحمت پر اس جگہ کھڑے ہو کر اسے ہوئی تھی' جہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کے بارے میں احکامات دیے تھے۔ سالار کو چند لمحوں کے لیے لگا جیسے جبل رحمت پر پڑے ہر پتھر نے اس پر لعنت بھیجی تھی۔ پسینہ ماتھے پر نہیں۔ پیروں کے تلووں تک آیا تھا۔ اسے لگا تھا وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑا تھا اور بس وہ تھے جن کی نظروں میں اس کے لیے ملامت نہیں افسوس تھا۔ پھر وہ وہاں ٹھہر نہیں سکا' سر جھکائے تیز قدموں سے امامہ کا انتظار کیے بغیر جبل رحمت سے اترتا چلا گیا۔ وہ رحمت کا حق دار نہیں تھا تو جبل رحمت پر کیسے کھڑا ہو پاتا۔ اسے نیچے اتر کر محسوس ہوا تھا۔

اور آج امامہ نے وہ سوال حرم میں کر دیا تھا۔ سالار نے اس سے اس بار یہ نہیں پوچھا تھا کہ وہ اس سے کیا مانگے گی۔ اس نے اس کے بالمقابل کھڑے ہو کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر حرم کے صحن سے نکلنے سے پہلے امامہ سے کہا تھا۔

"میں سود جب بھی چھوڑوں گا' تمہارے لیے نہیں چھوڑوں گا۔ نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے چھوڑوں گا۔" امامہ نے اس کے اعلان کو سنا اور پھر بڑی ٹھنڈی آواز میں کہا۔

"تو پھر ان ہی کے لیے چھوڑ دو۔"

سالار بول نہیں سکا۔ یہ عورت اس کی زندگی میں پتا نہیں کس لیے آئی یا لائی گئی تھی۔ اس کو اکنامکس اور حساب کے ہر سوال کا جواب آتا تھا سوائے اس ایک جواب کے۔

"تم تو حافظ قرآن ہو سالار۔ پھر بھی اتنی بڑی Violation (خلاف ورزی) کر رہے ہو' قرآن پاک اور اللہ کے احکامات کی۔" امامہ نے اس کے ساتھ حرم سے باہر جاتے ہوئے کہا۔

"تم جانتی ہو میں انویسٹمنٹ بینکنگ کروا رہا ہوں لوگوں کو اور۔۔۔"

امامہ نے سالار کی بات کاٹ دی۔ "تم کو یقین ہے کہ تم انویسٹمنٹ بینکنگ میں جو بھی کر رہے ہو اس میں سود کا ذرہ تک شامل نہیں ہے؟"

سالار کچھ دیر تک بول نہیں سکا' پھر اس نے کہا۔

"تم بینکنگ کے بارے میں میرا موقف (stance) جانتی ہو۔۔۔ چلو میں چھوڑ بھی دیتا ہوں یہ۔۔۔ بالکل' ہر مسلم

چھوڑ دے بینکوں کو۔ اس کے بعد کیا ہوگا۔ حرام حلال میں تبدیل ہو جائے گا؟" اس نے بڑی سنجیدگی سے اس سے کہا تھا۔

"ابھی تو ہم حرام کام ہی سہی مگر اس سسٹم کے اندر رہ کر اس سسٹم کو سمجھ رہے ہیں' ایک وقت آئے گا جب ہم ایک متوازی اسلامک اکنامک سسٹم لے آئیں گے اور وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے سے نہیں آئے گا۔"

"اور ایسا وقت کبھی نہیں آئے گا۔" امامہ نے اس کی بات کاٹ دی۔ "کم سے کم میری اور تمہاری زندگی میں تو نہیں۔"

"تم ایسے کیوں کہہ رہی ہو؟"

"سود جن لوگوں کے خون میں رزق بن کر دوڑنے لگ جائے' وہ سود کو مٹانے کا کبھی نہیں سوچیں گے۔"

سالار کو ایک لمحہ کے لیے لگا۔ امامہ نے اس کے چہرے پر طمانچہ دے مارا تھا۔ بات کڑوی تھی... پر بات سچی تھی۔ تھوک سکتا تھا... پر کڑواہٹ زائل نہیں کر سکتا تھا۔

"میں صرف یہ چاہتی ہوں کہ تم اگر چیزوں کو بدل نہیں سکتے تو اپنی قابلیت ایک غلط کام کو عروج پر پہنچانے کے لیے مت استعمال کرو۔"

وہ اسی امامہ کی محبت میں گرفتار ہوا تھا' اور آج وہ بیوی بن کر ایسی ہی باتیں دہرا رہی تھی تو سالار کو خفگی ہو رہی تھی یا شاید وہ شرمندگی تھی' جو اسے امامہ سے نظریں ملانے کے قابل نہیں رہنے دے رہی تھی۔ اس نے کیا' کیا نہیں کیا تھا۔ اس عورت کو مطیع اور فرماں بردار کرنے کے لیے... اور ابھی کچھ دیر پہلے حرم میں وہ اس سے اپنی محبت اور اطاعت کا اعلان بھی کر رہی تھی۔ اپنی غیر مشروط اور دائمی محبت اور وابستگی کا... اور اس اعلان کے بعد بھی وہ صحیح اور غلط کی واضح تمیز لیے بیٹھی تھی' جو صحیح تھا وہ محبت اور اطاعت بھی غلط نہیں کہلوا سکتی تھی۔ امامہ ہاشم کی زبان سے۔

سالار سکندر کو اس سے ایک بار پھر حسد ہوا تھا۔ کیا اس کی زندگی میں ایسا کوئی وقت آتا تھا جب وہ امامہ ہاشم کے سامنے دیو بنتا اور بنا ہی رہتا' بونا نہ بنتا... فرشتہ دکھتا اور دکھتا ہی رہتا' شیطان نہ دکھتا؛

"میں آخری خطبہ پڑھوں گا۔" کہنا وہ کچھ اور چاہتا تھا اور کہہ کچھ اور رہا تھا۔

"مجھ سے سنو گے؟" امامہ نے اس کا ہاتھ تھامے حرم سے باہر نکلتے ہوئے بڑے اشتیاق سے کہا۔

"تمہیں زبانی یاد ہے؟" سالار نے بغیر حیران ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"اتنی بار پڑھا ہے کہ لگتا ہے زبانی دہرا سکتی ہوں۔" وہ اب جیسے کچھ یاد کر رہی تھی۔

"سناؤ..." سالار نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

"آدم..." مکہ کی زمین پر کئی سو سال بعد اس خطبہ کو حوا کی زبان سے سننے کی تیاری کر رہا تھا' جو کئی سو سال پہلے آخری نبی الزماں ﷺ نے دین کی تکمیل کا اعلان کرتے ہوئے دنیا بھر کے انسانوں کے لیے دیا تھا... صرف مسلمانوں کے لیے نہیں۔

☼ ☼ ☼

سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں' ہم اسی کی حمد و ثنا کرتے ہیں اور اسی سے مدد و مغفرت چاہتے ہیں اور اسی کے سامنے توبہ کرتے ہیں اور اسی کے دامن میں اپنے نفس کی خرابیوں اور برے اعمال سے پناہ چاہتے ہیں۔ جس کو اللہ تعالیٰ ہدایت دے دے' اسے کوئی گمراہ نہیں کر سکتا اور جس کو وہ گمراہ کر دے' اسے کوئی ہدایت نہیں دے سکتا اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور وہ اکیلا ہے اور

اس کا کوئی شریک نہیں اور میں اعلان کرتا ہوں کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کا بندہ اور رسول ہے۔

اے لوگو! میں تمہیں اللہ سے ڈرنے کی وصیت کرتا ہوں اور تمہیں اس کی اطاعت کا حکم دیتا ہوں اور اپنے خطبے کا آغاز نیک بات سے کرتا ہوں۔ لوگو! سنو میں تمہیں وضاحت سے بتاتا ہوں کیونکہ شاید اس کے بعد کبھی تم سے اس جگہ مل نہ سکوں۔

اچھی طرح سن لو تم میں سے جو حاضر نہیں، وہ یہ باتیں غیر حاضر لوگوں تک پہنچا دے، ممکن ہے اگلے لوگ یہاں موجود لوگوں کی نسبت ان باتوں کو زیادہ اچھی طرح یاد رکھیں اور ان کی حفاظت فرمائیں۔

اے لوگو...... اللہ تعالیٰ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور میں آج سے تمام سود کالعدم قرار دیتا ہوں اور سب سے پہلے وہ سود معاف کرتا ہوں جو لوگوں نے میرے چچا عباس بن عبدالمطلب کو ادا کرنا ہے۔

البتہ تم کو اپنی اصل رقم لینے کا حق ہے جس میں نہ اوروں کا نقصان ہے نہ تمہارا۔

☆ ☆ ☆

پینتیس سالہ غلام فرید ذات کا کمہار اور پیشے کے لحاظ سے ایک اسکول کا چوکیدار تھا۔ گاؤں میں رہتا تھا لیکن شہر میں بسنے کے خواب دیکھتا تھا اور خواب صرف شہر میں آباد ہونے کا نہیں تھا جو وہ اپنی آنکھوں میں سجائے پھرتا تھا۔ اسے راتوں رات امیر ہونے کا بھی بڑا شوق اور شوق سے زیادہ حسرت تھی۔ ویسا امیر ہونے کا جیسے اس کے کئی دوست گاؤں سے دبئی یا سعودی عرب جا کر ہو گئے تھے۔ اس کے پاس وسائل نہیں تھے۔ ورنہ وہ انہیں دوستوں میں سے کسی کی منت سماجت کر کے خود بھی سعودی عرب یا دبئی جا کر ہی امیر ہوتا، وسائل تو شاید وہ کیسے نہ کسی طرح پیدا کر ہی لیتا مگر اس کی شادی بائیس سال میں ہی اس کی ماں نے اپنے بھائی کی بیٹی سے نہ کر دی ہوتی۔

وہ سات بہنوں کا اکلوتا اور سب سے بڑا بھائی تھا جس کی شادی کا خواب ماں نے اس کے پیدا ہوتے ہی سجا لیا تھا۔ دھوم دھام کی شادی نے اگلے کئی سال غلام فرید کو وہ قرض اتارنے میں مصروف رکھا۔ جو اس کی شادی پر ماں، باپ نے خاندان والوں سے چھوٹی بڑی رقمیں کر کے لیا تھا اور جب وہ قرض ختم ہوا تو اسے بہنوں کی شادی پر قرض لینا پڑا اور اس بار خاندان والوں سے قرض نہ ملنے پر اس نے سود پر قرض لیا تھا۔ سات بہنیں تھیں اور ہر سال کسی نہ کسی کی شادی آ جاتی۔ پچھلا قرضہ وہیں کھڑا رہتا۔ مزید قرضہ سر پر چڑھ جاتا اور پھر ایک کے بعد ایک بچے کی پیدائش۔

غلام فرید کو کبھی کبھار لگتا اس کا نام غلام قرض ہونا چاہیے تھا غلام فرید کے بجائے۔

شادی کے تیرہ سالوں میں قرض کی ہر رقم تو اس نے اتار دی تھی لیکن سود کی رقم اس کے سر پر اس کے سر کے بالوں سے بھی زیادہ ہو گئی تھی۔ اس کی بیوی بھی اسی اسکول کی عمارت میں صفائی کا کام کرتی تھی۔ جس اسکول میں وہ چوکیدار تھا۔ دو بڑے بچے بھی گاؤں کی دو دکانوں پر کام کرتے تھے۔

ایک چائے کے ایک کھوکھے پر کام کرتا تھا۔ دوسرا ایک ورکشاپ میں موٹر سائیکلیں دھونے کا کام، دس گیارہ سال کی عمر میں وہ دو بچے یہ ہی کر سکتے تھے۔ انہیں تنخواہ نہیں دیہاڑی ملتی تھی اور اسی دیہاڑی سے گھر کی دال روٹی چلتی تھی کیونکہ نسیمہ اور غلام فرید کی تو ساری کی ساری تنخواہ ہر ماہ سود میں چلی جاتی تھی۔ کئی سالوں سے سود کی وہ سل پھر بھی ان کے سینے سے ہٹتی ہی نہ تھی۔ بوجھ تھا کہ بڑھتا ہی گیا تھا۔

غلام فرید کو دن میں چوکیداری کرنی ہوتی تھی پر عجیب بات تھی کہ نیند اسے راتوں کو بھی نہیں آتی تھی۔ وہ صرف اتنا پڑھا لکھا تھا کہ جمع تفریق اور جوڑ توڑ کر کے قرآن پاک پڑھ لیتا۔ اور اس کی زندگی بس جمع تفریق ہی رہ گئی تھی اور اس جمع تفریق نے قرآن پاک کو جوڑ توڑ کر کے پڑھنے کا وقت بھی کھا لیا تھا۔

پینتیس سال کی عمر میں بھی کئی بار اسے لگتا وہ پچاس سال کا تھا۔ کئی بار اسے لگتا وہ سو سال کا ہو گیا تھا اور کئی بار

اسے لگتا وہ مر گیا ہے۔ مرنے والا ہے، مر رہا ہے، پتا نہیں وہ عمر کا کون سا سال ہوتا ہے جو ایسی کیفیت کے ساتھ گزرتا ہے۔

کئی بار وہ سوچتا تھا، وہ ایک رات چپکے سے بیوی، بچوں کے ساتھ گاؤں سے بھاگ جائے۔ کسی دوسرے شہر۔ دنیا کے کسی دوسرے کونے پہ۔ جہاں پر وہ اس سود سے آزاد ہوتے۔ غلام فرید جی بھر کر رات کو سوتا اور پھر وہ اس کی۔ بیوی اور بچے جو کماتے خود پر خرچ کرتے۔ تین وقت کا ڈھیر سارا کھانا پکاتے اور کھاتے پیٹ بھر کے۔ اور جو بچتا وہ کسی کو دے دیتے۔ برتن چاٹ چاٹ کر اور روٹی کے آخری لقمے سے چٹنیں پونچھنے کے بجائے۔

سال میں دس بیس نہیں تو دو چار تو اچھے سے جوڑے سلواتے اپنے اور سب بچوں کے لیے۔ گاؤں کے امیر خاندانوں کے بچوں اور افراد کی اُترن پہننے کے بجائے۔ اور لنڈا بازار سے خریدے ہوئے کپڑے پہن کر عیدیں گزارنے کے بجائے۔

اور پھر ایک گھر بناتے۔ اپنا گھر۔ پکی اینٹوں اور پلستر والا پکی چھت والا گھر۔ شاید ڈبل اسٹوری ہی بنوا لیتے۔ اور صحن کے فرش میں چپس ڈلواتے۔ پانی کی موٹر لگواتے۔ شاید اے سی بھی۔ اور فریج۔ ٹی وی۔ اچھا سا فرنیچر۔ اور لش پش کرتے پردے۔ اور چینی کے برتن اور پھر وہ اس کے بچے زمین کے بجائے ٹیبل اور کرسیوں پر بیٹھ کر کانٹے اور چمچے سے ان چینی کے برتنوں میں کھانا کھاتے۔

غلام فرید کے خوابوں کی ریل گاڑی ساری رات چھکا چھک چلتی رہتی۔ ہر اسٹیشن پر رکتی کچھ اور خواب اٹھاتی اور پٹڑی پر پھر دوڑنے لگتی اور پھر دوڑتے دوڑتے وہیں آ کر رک جاتی، جہاں سے وہ چلی تھی۔ رات گزر جاتی۔ زندگی بھی گزر رہی تھی اور غلام فرید کو پتا تھا وہ اپنی رات کو خوابوں میں گزار سکتا ہے، زندگی کو نہیں۔

گاؤں سے بھاگ جانا آسان تھا۔ مگر ان لوگوں سے چھپ جانا نہیں جن سے وہ قرضہ لیے بیٹھا تھا اور قرضہ ادا ہونے کے باوجود سود وہیں کا وہیں کھڑا تھا۔ وہ لوگ اس کی چمڑی ادھیڑنے پر قادر تھے اور اس کو کتوں کے سامنے بھی پھنکوا دیتے۔ اور غلام فرید بچوں اور ایک بیوی کے ساتھ ساری عمر کے لیے کہاں چھپ جاتا کہ دوبارہ کسی کو نظر نہ آتا۔ اپنے اور اپنی بیوی کے خاندان والوں کو ہمیشہ کے لیے کیسے چھوڑ دیتا کہ دوبارہ کبھی رابطہ ہی نہ کرتا۔

راہ فرار غلام فرید کے پاس نہیں تھی اور اگر کوئی تھی تو صرف ایک۔ وہ امیر ہو جاتا اور پتا نہیں کیوں، لیکن غلام فرید کو لگتا تھا کہ وہ امیر ہو سکتا تھا۔

امیر ہونا اس وقت غلام فرید کی زندگی کی واحد ترجیح تھی۔ حالات اور ہوتے اور اس کا بال بال سود میں نہ بندھا ہوتا تو شاید غلام فرید اس وقت اپنی زندگی کو مختلف ترجیحات کے ساتھ گزار رہا ہوتا۔ وہ اس اسکول کے دوسرے نچلے درجے کے ملازمین کی طرح تنخواہ اور چھوٹی موٹی محنت مزدوری میں بڑی اچھی زندگی گزار رہا ہوتا۔ اپنے بچوں کے بارے میں سوچ رہا ہوتا، کس کو کیا پڑھانا ہے اور کیا مستقبل بنانا ہے، مگر غلام فرید کو اس سود نے کسی قابل نہیں چھوڑا تھا جو اسے ورثے میں ملا تھا اور جس نے اسے عمر سے پہلے بوڑھا کر دیا تھا۔

✲ ✲ ✲

اے لوگو! میں نے تمہارے پاس ایسی چیز چھوڑی ہے کہ تم اسے مضبوطی سے تھامے رہو گے تو میرے بعد ہرگز گمراہ نہیں ہو گے۔ یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور تم لوگ غلو سے بچو کیونکہ تم سے پہلے لوگ اسی کے باعث ہلاک ہوئے۔

✲ ✲ ✲

چنی غلام فرید کی آخری اولاد تھی۔ اگر نسیمہ کی زندگی رہتی اور وہ سب کچھ نہ ہوتا جو ہو گیا تو شاید وہ آخری اولاد

نہ ہوتی 'پیچ کی اولاد ہوتی اور اس کا نمبر کیا ہوتا اس کا اندازہ کوئی بھی نہیں کر سکتا تھا۔ مگر وہ غلام فرید کی آخری اولاد زندگی کی ایک اسٹیج پر اس کی واحد اولاد رہ جانے والی تھی' یہ غلام فرید کو نہیں پتا تھا' پتا ہوتا تو شاید وہ واحد اولاد بھی زندہ نہ رہ پاتی۔

ڈیڑھ سالہ چنی کو اس کی پیدائش سے پہلے کئی بار مارنے کی کوشش کی گئی تھی۔ نسیمہ کو جب اپنے نویں بار حاملہ ہونے کا اندازہ ہوا تو اس نے گاؤں میں دائی سے ملنے والی ہر اس چیز کا استعمال کیا تھا' جس سے اسقاط حمل ہو جاتا۔ چنی کو تو کچھ نہیں ہوا' لیکن خود نسیمہ ان مضر صحت ادویات کے استعمال سے کئی قسم کی بیماریوں کا شکار ہو گئی۔

چنی کو مارنے کی ایک کوشش تب بھی کی گئی' جب ساتویں مہینے طبیعت زیادہ خراب ہونے پر نسیمہ کو شہر جانا پڑا اور وہاں الٹرا ساؤنڈ میں اپنے ہونے والے بچے کی جنس کا اسے پتا چل گیا تھا۔ نویں اولاد لڑکی ہونے کا مطلب تھا کہ اس کی بیٹیوں کی تعداد چھ ہو جاتی۔ نسیمہ کو جیسے غش آگیا تھا۔ سات بچیاں بیاہتے بیاہتے غلام فرید اور اس کا یہ حال ہو گیا تھا۔ چھ بیٹیاں بیاہتے ہوئے انہیں اب کون سے دوزخ سے گزرنا تھا۔ نسیمہ نے سوچا تھا اور اس خیال نے آخری دو تین مہینے میں ہر وہ بد احتیاطی کرنے پر اسے اکسایا تھا' جس سے وہ بچی جان سے چلی جاتی۔ یہ نسیمہ کی خوش قسمتی تھی کہ ان سب بے احتیاطیوں میں وہ خود جان سے ہاتھ نہیں دھو بیٹھی۔

چنی صحت مند پیدا ہوئی تھی۔ یعنی صحت کے اس معیار کے مطابق صحت مند تھی' جس پر اس کے بہن بھائی اور ماں' باپ پورا اترتے تھے۔ اس کا پیدا ہونا جیسے اس کی اپنی ذمہ داری بن گئی تھی۔ (اس کی ماں کی لاتعداد اسقاط حمل کی کوششوں کے بعد) اور جیسے اس کا پلنا بھی اس کی اپنی ہی ذمہ داری ہو گیا تھا۔ ماں کو ہفتے بعد ہی واپس ڈیوٹی پر جانا تھا۔ یہ کوئی شہر نہیں تھا کہ میٹرنٹی لیو جیسی سہولت سے اسے نوازا جاتا اور وہ بھی نویں بچے کی پیدائش پر۔ باپ کے پاس پہلے ہی اپنے بچوں کے لیے وقت نہیں تھا۔ وقت شاید ایک بہت بڑا حق تھا اور ایسا حق جس سے کوئی وہاں واقف ہی نہیں تھا۔ غلام فرید کو اگر احساس ہوا تھا تو صرف یہ کہ اس کے سر اور کندھوں کا بوجھ ایک بیٹی کی پیدائش نے بڑھا دیا تھا۔

دو مرلوں کا وہ گھر جو غلام فرید کا واحد خاندانی ترکہ تھا۔ چنی کی پیدائش کے چند ہفتوں بعد سود میں گروی رکھا گیا تھا۔ اسکول نے غلام فرید کی اس مشکل وقت میں مدد کی اور اسے ایک کوارٹر مل گیا رہائش کے لیے' جس میں صرف ایک کمرہ تھا' مگر وہ بھی غنیمت تھا تنگی الحال غلام فرید کے لیے۔ پر چنی' ماں باپ کو اس حوالے سے خوب یاد رہی کہ اس کی پیدائش نے انہیں بے گھر کیا تھا۔ چنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ روایتی انداز میں اس پر منحوس کا لیبل نہیں لگا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ غلام فرید کو اپنے ہر بچے کی پیدائش پر کوئی نہ کوئی بری خبر ملتی رہی تھی۔ اسے کوئی بھی ایسی اولاد یاد نہیں تھی' جس کے دنیا میں آنے سے غلام فرید کی زندگی میں کوئی آسانی پیدا ہوئی تھی۔

نحیف و نزار اور سانولی رنگت والی چنی سارا دن گرمی میں بان کی ایک چارپائی پر ایک کپڑے پر پڑی رہتی۔ روتی' کلبلاتی' پھر خود ہی انگوٹھا چوستی اور سو جاتی۔ کسی بہن کو خیال آجاتا تو چنی کو اس کے سستے سے پلاسٹک کے اس فیڈر میں دودھ مل جاتا' جس میں اس کے ہر بہن' بھائی نے دودھ پیا تھا اور جو اتنے سالوں میں اتنا گندا' میلا اور گھس گیا تھا کہ اس میں ڈالا ہوا دودھ بھی میلا دکھنے لگتا۔ وہ بلاشبہ جراثیم کی آماجگاہ تھا' لیکن چنی کی خوش قسمتی یہ تھی کہ وہ غریب کی اولاد تھی اور غریب کی اولاد بھوک سے مرجاتی ہے۔ گندگی سے نہیں۔

پورے دن میں ایک آدھ بار ملنے والا دودھ کا فیڈر وہ واحد غذا تھا' جس پر چنی سارا دن گزارتی تھی۔ اس سے زیادہ خوراک غلام فرید کے گھر میں کسی بچے کو نہیں ملی تھی۔ سوائے اس کے پہلے دو بیٹوں کے نسیمہ شام کو تھکی ہاری آتی اور جو بھی روکھی سوکھی ملتی وہ کھا کر کمرے کے ایک کونے میں اپنے کسی بچے سے ٹانگیں دبواتی لیٹتی اور وہیں سو

جاتی۔ اسے خیال ہی نہیں آتا تھا کہ اس کمرے میں اس کی ایک نوزائیدہ اولاد بھی تھی۔ ہاں بھی کبھار وہ اس وقت چنی کو ضرور دیکھنے بیٹھ جاتی تھی۔ جب بڑی بچیوں میں سے کسی کو اچانک وہم ہوتا کہ چنی شاید مرگئی تھی کیونکہ وہ کبھی سانس نہیں لے پاتی اور کبھی اس کا جسم اتنا ٹھنڈا اور نیلا ہو جاتا کہ نسیمہ کو لگتا شاید اس کا بوجھ واقعی کم ہو گیا تھا۔ لیکن... لیکن چنی اپنے ماں باپ کے سب ارمانوں پر پانی پھیرتے ہوئے پھر سانس لینا شروع کر دیتی۔ پتا نہیں یہ اس کی ڈھٹائی تھی یا غلام فرید اور اس کی بیوی کی وہ بدقسمتی جس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کبھی ان کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔

بھوک واحد مسئلہ نہیں تھا جس کا سامنا چنی کو تھا۔ ایک اور مسئلہ یہ بھی تھا کہ وہ سارا سارا دن پیشاب اور پاخانہ میں لتھڑی پڑی رہتی اور اس کی بہنیں ماں کی ہدایات کے باوجود اسے صاف نہیں کرتیں۔ ان کا قصور نہیں تھا۔ سات اور نو سال کی بچیوں کو اگر چنی سے کراہیت محسوس ہوتی تھی تو ٹھیک ہی ہوتی تھی۔ نسیمہ گھر آتی پہلے ان دونوں کو پیٹتی، پھر چنی کو دھوتی اور بچوں میں سے کسی کو پکڑا دیتی۔ چنی کے جسم پر کھجلی ہوئی اور پھر اس حد تک ہوئی کہ اس کی جلد جیسے عادی ہو کر خود ہی ٹھیک ہوتی گئی تھی شاید چنی کی یادداشت کام کرتی تو وہ بتا سکتی کہ اسے سب سے زیادہ تکلیف کس چیز سے ہوتی تھی بھوک سے، جسم پر پھیلے ہوئے ان گرمی دانوں سے جو جلدی خارش میں تبدیل ہو گئے تھے اور ان سے کئی بار پانی بھی رسنے لگتا تھا یا پھر اس گندگی سے جس میں وہ سارا دن اور ساری رات لتھڑی پڑی رہتی تھی اور کوئی اس کی پروا نہیں کرتا تھا۔ اس چھوٹے سے کمرے میں ہر جگہ سب رات کو بے سدھ آڑے ٹیڑھے سوئے ہوئے ہوتے تھے صرف غلام فرید تھا جو باہر چارپائی ڈال کر کبھی بیٹھا اور کبھی لیٹا رہتا تھا۔

کئی ہفتوں تک کسی کو یہ خیال ہی نہیں آیا کہ چنی کی پیدائش رجسٹر کروانی چاہیے۔ اس کا کوئی نام ہونا چاہیے۔ چنی نام اسے اس کی ماں نے اس کی جسامت دیکھ کر دیا تھا اور سب اسے اسی نام سے پکارنے لگے تھے۔ پھر گاؤں میں حفاظتی ٹیکوں کی مہم والے آئے تو غلام فرید کو چنی کا نام اور پیدائش رجسٹر کروانی پڑی۔ غلام فرید نے اس کی پیدائش رجسٹر کروانے کے لیے بھی تین سو روپے کسی سے ادھار لیے تھے اور وہ ادھار بھی گاؤں کی مسجد کے امام سے... اور ان تین سو روپے نے غلام فرید کی زندگی میں کیا کردار ادا کرنا تھا۔ اس کا اندازہ نہ غلام فرید کو تھا، نہ ہی اس کی اس نویں اولاد کو، جسے رجسٹر میں کنیز کا نام دیا گیا تھا۔ یہ نام چنی کے لیے کس نے چنا تھا، کسی کو یاد نہیں۔ شاید محلے کی کسی بوڑھی عورت نے... یہ سوچتے ہوئے کہ انسان پر نام کا اثر آتا ہے اور عورت کے لیے سب سے اچھی صفت اطاعت اور فرماں برداری ہے، جو کنیز نام رکھے جانے پر چنی میں بھی کوٹ کوٹ کر بھر جائے گی۔

گاؤں میں کسی کو یہ اندازہ نہیں تھا کہ کنیز ولد غلام فرید عرف چنی کو نہ اس نام کی ضرورت تھی، نہ اس صفت کی... اسے اللہ تعالیٰ نے کسی اور کام کے لیے چنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"دیکھو میں نے حق پہنچا دیا ہے۔ بس اگر کسی کے پاس امانت رکھوائی گئی ہے تو وہ اس بات کا پابند ہے کہ امانت رکھوانے والے کو امانت پہنچا دے اور بے شک تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا اور حساب دینا ہے۔"

☼ ☼ ☼

امام صاحب سے تین سو روپے کا وہ قرض ہی تھا جس نے غلام فرید کو پہلی بار یہ احساس دلایا کہ امیر بننا اتنا مشکل نہیں تھا جتنا وہ سمجھتا تھا اور اس گاؤں کے اور بہت سے لوگ تھے جو اسی کی طرح کئی سال یہ خواب پالنے کے بعد بالآخر وہ آسان راستہ یا راستے ڈھونڈنے میں کامیاب ہو گئے تھے جن سے امیر بنا جا سکتا تھا۔

امام مسجد بھی ان ہی لوگوں میں شامل تھے' جو صرف آخرت میں ہی جنت نہیں چاہتے تھے' بلکہ اس دنیا میں بھی انہیں جنت کا عیش و آرام چاہیے تھا۔ انہوں نے غلام فرید کو تین سو روپے کا قرض تو دے دیا تھا' مگر ساتھ اس کی یہ ذمہ داری بھی لگادی تھی کہ وہ اس اسکول کے مالکان سے مسجد کے لیے چندہ لے کر انہیں دے۔

غلام فرید نے جہاں مولوی صاحب کو یہ یقین دلایا تھا کہ اسکول کے مالکان بڑے فیاض ہیں' وہاں یہ جھوٹ بھی بولا تھا کہ وہ غلام فرید کو بہت مانتے تھے' اور وہ گاؤں میں کسی کو کچھ بھی دینے دلانے کے لیے غلام فرید سے اکثر مشورہ کرتے تھے اور مسجد کے لیے چندہ تو غلام فرید کے لیے ویسے ہی بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔

مولوی صاحب نے غلام فرید کی باتوں پر اندھا اعتماد تو یقیناً "نہیں کیا تھا' ورنہ ایک ہزار روپے کی وہ رقم جو اس نے قرض مانگی تھی' اس کے بجائے صرف تین سو روپے اسے نہ دیتے۔ لیکن انہوں نے پھر بھی کسی نہ کسی حد تک غلام فرید کی بات پر یقین ضرور کیا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ اسکول کے مالکان غلام فرید کو شکل سے تو پہچانتے ہوں گے' لیکن اس کا نام کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ اسکول میں کوئی ایک چوکیدار نہیں تھا۔ اسکول کی وسیع و عریض عمارت میں مختلف اوقات میں تین' چار چوکیدار پہرہ دیتے تھے اور غلام فرید ان میں سے ایک تھا اور غلام فرید کو اپنی حیثیت اور اوقات کے بارے میں پتا بھی تھا۔

مولوی صاحب سے تو غلام فرید نے جھوٹ بولا تھا۔ لیکن مولوی صاحب کے بار بار اصرار پر حیلے بہانے بنانے کے بعد اس نے بالآخر اسکول کے مالکان سے مسجد کے لیے چندے کی بات کر ہی لی تھی۔ اسکول کے اس مالک نے مولوی صاحب کو بلوا کر اس چندے کے حوالے سے یہ تفصیلات معلوم کی تھیں کہ انہیں چندہ کس لیے چاہیے تھا اور مولوی صاحب نے چھوٹے موٹے اخراجات کی ایک لمبی تفصیل اسکول کے مالک کے سامنے رکھ دی تھی۔

اسکول کے مالک نے ان اخراجات کی تفصیلات جاننے کے بعد مسجد کے لیے نہ صرف اس وقت کچھ رقم مہیا کی تھی' بلکہ ہر مہینے اسکول کے اخراجات کے لیے ایک معقول رقم دینے کا وعدہ بھی کر لیا تھا۔ مولوی صاحب کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں رہا تھا۔ ان کا تین سو روپے کا دیا قرض ہزاروں میں تبدیل ہو کر ان کی طرف لوٹا تھا۔ غلام فرید جیسے معمولی نوکر کی حیثیت ان کی نظر میں ایک دم بڑھ گئی تھی اور غلام فرید کو اس گاؤں میں پہلی دفعہ کسی نے عزت دی تھی' وہ بھی گاؤں کی مسجد کے امام نے۔ جس نے نہ صرف اس جمعے کے خطبے میں لاؤڈ اسپیکر پر اسکول کی انتظامیہ اور مالکان کی دردمندی کے قصیدے پڑھے تھے بلکہ غلام فرید کی کوششوں کو بھی سراہا تھا۔ جس کی کوششوں سے مسجد کے پاس یہ رقم آئی تھی۔

مسجد میں جمعے کے خطبے کے دوران بیٹھے ہوئے غلام فرید کا سینہ خوامخواہ میں چوڑا ہو گیا تھا اس دن۔

اسکول کے مالک نے یہ رقم ہر ماہ غلام فرید کے ذریعے ہی مولوی صاحب کو پہنچانے کا وعدہ کیا تھا اور اس کے ساتھ غلام فرید کو یہ ذمہ داری بھی سونپ دی تھی کہ وہ مسجد میں اس رقم کے صحیح استعمال پر نظر رکھے اور یہ دیکھتا رہے کہ وہ رقم ان چیزوں پر خرچ ہو رہی ہے جن اخراجات کا ذکر اس فہرست میں تھا جو مولوی صاحب نے اسکول کے مالک کو دی تھی۔ غلام فرید کو سونپی جانے والی اس ذمہ داری نے مولوی صاحب کے لیے اس کی اہمیت کو دگنا کر دیا تھا۔ اگر مولوی صاحب نے یہ رقم واقعی مسجد کے انتظام و انصرام پر لگائی ہوتی تو انہیں غلام فرید کی اس طرح عزت و قدر کرنے اور جتانے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ مگر مولوی صاحب کو یہ رقم "اپنے لیے" چاہیے تھی ______ گاؤں کے دوسرے زمین دار اور صاحب حیثیت لوگوں سے وصول پائے جانے والے چندوں کی طرح جن کے بارے میں کوئی مولوی صاحب سے استعمال کے حوالے سے سوال جواب نہیں کرتا تھا۔ البتہ ان سب لوگوں کو جمعہ کی نماز کے خطبے کے دوران لاؤڈ اسپیکر پر اس چندے کا اعلان چاہیے ہوتا تھا اور مولوی

صاحب اس اعلان کو قصیدوں کے تڑکے کے ساتھ پیش کرنے کے ماہر تھے۔ یہ پہلی بار ہوا تھا کہ کسی نے مسجد کے لیے دیے جانے والے پیسوں کے حوالے سے جواب دہی کا سسٹم بنانے کی کوشش کی تھی جو مولوی صاحب کو قابل قبول نہیں تھا' لیکن چندے کی ماہانہ رقم کو ٹھکرانے کا حوصلہ بھی ان میں نہیں تھا۔

اسکول کا مالک وہاں دوسرے مہینے آیا تھا اور مولوی صاحب نے غلام فرید کے ساتھ مل کر مسجد میں ہونے والی تمام مرمتیں اسے دکھائی تھیں۔ وہ مطمئن ہو کر لوٹا تھا۔ مگر یہ صرف اسی مہینے ہوا تھا۔ دوسرے مہینے غلام فرید کے ہاتھ سے وصول پائی جانے والی رقم کا مولوی صاحب نے کیا کیا تھا' اس کا غلام فرید کو اندازہ بھی نہیں ہو سکا۔ وہ مسجد میں دو چار بار گیا تھا اور اس کا خوب اچھی طرح استقبال کیا تھا مولوی صاحب نے۔ اپنے گھر سے کھانا' پانی' چائے بھی اسے دی تھی' لیکن اس ماہانہ چندے کے استعمال کے بارے میں صرف آئیں بائیں شائیں ہوتا رہا تھا۔ غلام فرید کو چندے کے صحیح استعمال میں کوئی زیادہ دلچسپی نہیں تھی' اس کے لیے عام حالات میں اتنا ہی کافی ہوتا کہ مولوی صاحب اسے گوشت کھلا رہے تھے' مگر فی الحال مسئلہ یہ تھا کہ غلام فرید اپنے ہاتھ سے ہر مہینے بیس ہزار کی رقم' جس مشکل سے مولوی صاحب کو دے رہا تھا' وہ غلام فرید ہی جانتا تھا۔ مگر اسے خوف تھا تو صرف اللہ کا۔ کہ وہ مسجد کا پیسہ تھا اور وہ اس کا امانت دار بن گیا تھا' مگر اس پیسے کا مولوی صاحب کے ہاتھوں غائب ہونا اس سے ہضم نہیں ہو رہا تھا۔

مولوی صاحب نے اس کے دل سے مسجد کے پیسے کے لیے اللہ کے خوف کو ختم کرنے میں بنیادی کردار ادا کیا تھا۔ اگر مولوی صاحب چندے کے پیسے کو لوٹ کے مال کی طرح استعمال کر سکتے تھے تو پھر غلام فرید کو بھی حق تھا۔ اس کی بھی ضروریات تھیں۔ وہ بھی مجبور تھا۔ اس کے سر پر تو قرضہ بھی تھا۔ غلام فرید چار مہینے اپنے دل میں یہ ہمت پیدا کرتا رہا کہ وہ مولوی صاحب سے اس سلسلے میں بات کرے۔ اسے بھی اس پیسے کا مسجد میں صحیح استعمال نہیں چاہیے تھا اور نہ ہی اسے مولوی صاحب کے اس مرغ مسلم میں دلچسپی رہ گئی تھی جو وہ اس کی اپنے گھر آمد پر اس کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ اسے ان پیسوں میں سے اپنا حصہ چاہیے تھا۔ وہ رقم آدھی آدھی ہونی چاہیے تھی اور اگر آدھی نہیں ہو سکتی تھی تو کم از کم پانچ ہزار تو اسے ملنا ہی چاہیے تھا۔ اسکول کے مالک نے پچھلے مہینے کے بعد کسی مہینے مسجد میں جا کر مولوی صاحب سے ان چیزوں کو دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی جن پر اس کی رقم خرچ ہوئی تھی۔ مسجد میں صفوں کے بجائے قالین' رنگ روغن اور باتھ روم میں ٹائلز لگوا کر اسے یہ اطمینان ہو گیا تھا۔ کہ اس نے مسجد کو اب بہتر کر دیا تھا اور اس کے ہر ماہ بھیجے گئے پیسوں سے مسجد میں قرآن پاک کی تعلیم کے لیے آنے والے بچوں اور مسجد کے اور دوسرے بنیادی قسم کے اخراجات پورے ہوتے رہیں گے۔

غلام فرید نگران تھا کہ وہ یہ دیکھے کہ مسجد میں آنے والے بچوں کو قرآن پاک' قاعدے اور سپارے مسجد ہی مہیا کرے اور اسی طرح کی دوسری چیزیں' غلام فرید کو دوسرے مہینے ہی یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مسجد میں آنے والے کسی بچے کو مسجد سے کچھ نہیں مل رہا تھا اور اگر کچھ مل رہا تھا تو بالکل مفت تو نہیں مل رہا تھا۔ یہ اس کے اضطراب اور بے چینی کا آغاز تھا اور یہ دونوں کیفیات انتہا پر تب پہنچ گئی تھیں جب چوتھے مہینے مولوی صاحب نے نیا موٹر سائیکل خرید لیا تھا۔

غلام فرید انہیں اگلے مہینے کے پیسے دینے گیا تھا اور ان کی نئی موٹر سائیکل کو دیکھ کر وہ اس قدر حسد اور خفگی کا شکار ہوا تھا کہ وہ ان پیسوں کا ذکر کیے بغیر صرف موٹر سائیکل کی مٹھائی کھا کر آ گیا تھا۔ مولوی صاحب نے ماہانہ چندے کا پوچھا تھا' کیونکہ وہ مہینے کی پہلی تاریخ تھی۔ غلام فرید نے مسجد میں بیٹھ کر اس دن پہلا جھوٹ بولا تھا اور کہا تھا کہ اسکول کا مالک ملک سے باہر چلا گیا ہے اور ابھی واپس نہیں آیا۔ مولوی صاحب کو یک دم فکر ہوئی تھی

کہ اسکول کا مالک فوری طور پر واپس نہ آیا تو پھر اس مہینے کے پیسے کون دے گا؟ غلام فرید کے پاس سوال کا جواب نہیں تھا۔ البتہ اس نے مولوی صاحب کو اسکول کے مالک کا فون نمبر دے دیا تھا' جو غلط تھا۔ مولوی صاحب مطمئن ہو گئے تھے کہ اگر کچھ دن تک وہ چندہ نہ پہنچا تو وہ اسکول کے مالک سے خود بات کریں گے۔

غلام فرید بیس ہزار کی رقم جیب میں لیے اس دن ایک عجیب سی کیفیت کے ساتھ مسجد سے نکلا تھا۔ یوں جیسے اس کی لاٹری نکل آئی تھی۔ اسے پتا تھا مولوی صاحب ہر سال مختلف چیزوں سے اکٹھی ہونے والی رقم کو اپنی رقم کے طور پر گاؤں کے انہیں سود خوروں کو بزنس میں سرمایہ کاری کرنے کے لیے دیتے تھے جو سود خور غلام فرید جیسے ڈھیروں ضرورت مندوں کو وہ رقم دے کر انہیں ساری عمر کے لیے چوپایہ بنا دیتے تھے۔ مولوی صاحب بظاہر یہ ظاہر

کرتے تھے کہ انہیں یہ پتا ہی نہیں کہ وہ جن لوگوں کے بزنس میں مسجد کی رقم کی سرمایہ کاری کر کے ماہانہ ایک فکسڈ رقم وصول کر رہے ہیں ان کا اصلی اور بنیادی بزنس کیا تھا۔ وہ اس ماہانہ فکسڈ رقم کو بھی سود نہیں منافع کہتے تھے' کیونکہ انہوں نے چند امیر لوگوں کے منافع بخش بزنس میں شراکت داری کی تھی اور کیونکہ ان لوگوں کو بھی بزنس میں نقصان نہیں ہوتا تھا۔ اس لیے مولوی صاحب کو بھی نہیں ہوتا تھا۔ مولوی صاحب یہ توجیہہ نہ بھی پیش کرتے تب بھی گاؤں میں کوئی کمی کمین بھی امام مسجد سے جا کر یہ سوال و جواب نہیں کر سکتا تھا کہ وہ مسجد کے پیسے کو اپنی ذاتی رقم ظاہر کر کے کسی سود خور کے بزنس میں کیسے لگا اور اس کا منافع کھا رہے تھے۔

یہ سوال کوئی چندہ دینے والا کرتا تو شاید مولوی صاحب کو قرآن و حدیث میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کرنی پڑ جاتی اور وہ اس میں ماہر تھے۔ دین میں اپنی مرضی کا رد و بدل ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل تھا۔ لیکن اب ان کی بدقسمتی یہ ہوئی تھی کہ سود میں جکڑے ہوئے ایک شخص کو مولوی صاحب کو چندے کی رقم سونپنے کی ذمہ داری دے دی گئی تھی۔

مولوی صاحب نے ایک ڈیڑھ ہفتہ مزید رقم کا انتظار کیا اور پھر کچھ بے صبری میں وہ نمبر گھما دیا جو غلام فرید نے دیا تھا۔ نمبر آف تھا۔ دو دن وقفے وقفے سے کئی بار فون کرنے پر بھی جب وہ نمبر آف ہی ملا تو مولوی صاحب غلام فرید کے پاس جانے کے بجائے اسکول پہنچ گئے تھے اور وہاں پہنچ کر انہیں یہ خبر مل گئی تھی کہ اسکول کا مالک کئی دن پہلے اسکول سے ہو کر جا چکا تھا۔ مولوی صاحب کا پارہ اب ہائی ہو گیا تھا۔ انہوں نے غلام فرید کو اس کے کوارٹر پر جا لیا تھا اور جب غلام فرید نے انہیں ایک بار پھر پہلے کی طرح یہ کہہ کر ٹرخانے کی کوشش کی کہ مالک ابھی تک نہیں آیا تو مولوی صاحب نے اس کے جھوٹ کی پول کھول دی تھی اور اسے کہا تھا کہ وہ اسکول سے ہو کر آئے ہیں اور وہ جانتے ہیں۔ مالک ہمیشہ کی طرح مہینے کے شروع میں ہو کر جا چکا تھا۔ غلام فرید نے جواباً مولوی صاحب سے کہا کہ "ہو سکتا ہے وہ آیا ہو' لیکن اس دن غلام فرید کی چھٹی تھی اور اس کی ملاقات مالک سے نہیں ہوئی۔"

مولوی صاحب اس پر کچھ زیادہ بھڑکے تھے اور انہوں نے غلام فرید سے کہا کہ اس نے انہیں مالک کا نمبر بھی غلط دیا ہے' وہ اس کو فون کرتے ہیں' مگر وہ نمبر آف ہے اور وہ اب مالک کا نمبر اسکول کی انتظامیہ سے ہی لیں گے اور پھر خود اس سے بات کریں گے۔

غلام فرید کو اب اندازہ ہو گیا کہ وہ مولوی صاحب سے مزید جھوٹ نہیں بول سکتا تھا۔ اسے ان سے اب دو ٹوک لیکن صاف صاف بات کرنی تھی۔ اور پھر اس نے بالآخر مولوی صاحب کو یہ بتا ہی دیا تھا کہ اسے اس رقم میں سے ہر مہینے اپنا حصہ چاہیے تھا۔ کچھ لمحوں کے لیے مولوی صاحب کو جیسے یقین ہی نہیں آیا تھا کہ گاؤں کا ایک کمی کمین گاؤں کی مسجد کے "امام صاحب" سے کیا مطالبہ کر رہا تھا اور جب انہیں یقین آیا تو ان کے منہ سے جیسے غصے سے جھاگ نکلنے لگا تھا۔ ان کے ساتھ ایسی جسارت پہلی بار کسی نے کی تھی۔

"تم اللہ کے گھر کے لیے ملنے والے ہدیے سے اپنا حصہ مانگ رہے ہو' وہ زخمی انسان!"

انہوں نے غلام فرید کو ڈرانے کی کوشش کی تھی۔ انہیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ غلام فرید دوزخ جیسی زندگی گزارتے گزارتے اب موت کے بعد دوزخ سے کیا ڈرتا۔

"اللہ کے گھر کے پیسے اگر اللہ کے گھر پر لگتے تو کبھی نہ مانگتا مولوی صاحب!" اس نے بھی ترنت کر ان سے کہہ دیا تھا۔ مولوی صاحب نے جواباً "اسے دھمکایا کہ وہ اسکول کے مالک سے بات کریں گے اور اسے اس کا کچا چٹھا سنا دیں گے۔

جواباً "غلام فرید نے انہیں دھمکایا کہ وہ بھی اسکول کے مالک کو یہ بتا دے گا کہ مولوی صاحب چندے والی رقم کو خود استعمال کر رہے ہیں اور انہوں نے مسجد کے پیسوں کو ایک سود خور کو دے رکھا ہے اور وہ اس کا سود کھا رہے ہیں' بلکہ وہ پورے گاؤں میں انہیں بدنام کرے گا۔ ان کے پول کھول کھول کر۔ مولوی صاحب کے تن بدن میں آگ لگ گئی تھی۔ ان کا بس چلتا تو غلام فرید کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے کتوں کے سامنے ڈال دیتے۔ انہیں یہ علم ہی نہیں تھا کہ وہ کمینہ ان کے اتنے بڑے راز سے واقف تھا۔ وہ کچھ دیر اسے جی بھر کے برا بھلا کہتے رہے۔

اس دن مولوی صاحب نے غلام فرید کو دنیا بھر کی ہر وہ گالی دے ڈالی جو انہوں نے کبھی کہیں سنی تھی' لیکن غلام فرید ڈھٹائی سے اپنے پیلے دانتوں کے ساتھ منہ کھول کر ان کے سامنے ہنستا رہا۔

"ٹھیک ہے مولوی صاحب مجھے تو کیڑے ہی پڑیں گے' سانپ اور بچھو قبر میں میری لاش نوچیں گے اور مجھے مرتے دم کلمہ بھی نصیب نہیں ہوگا۔ میرے ساتھ جو بھی مرنے کے بعد ہوگا' لیکن آپ کے بیس ہزار تو آپ کی زندگی میں ہی بند ہو جائیں گے۔ اسی مہینے سے۔ میں مالک کو کہہ دیتا ہوں کہ میں نے اس لیے آپ کو پیسے نہیں دیے کیونکہ آپ تو مسجد میں پیسے لگا ہی نہیں رہے تو سوچیں زیادہ نقصان دوزخی کا ہوا کہ جنتی کا؟"

غلام فرید نے خود زندگی میں کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس جیسا کمین مسجد کے امام کے ساتھ کبھی اس طرح بات کرے گا۔ لیکن کسی نے ٹھیک کہا ہے۔ پیسہ بڑی کتی چیز ہوتی ہے۔ اچھے اچھوں کو کتا بنا دیتی ہے۔ بڑے بڑوں کو بھونکنے پر مجبور کر دیتی ہے۔

سب گالم گلوچ اور لعنت ملامت کے بعد اس دن مولوی صاحب نے واپس گھر پہنچ کر اپنی بیوی سے مشورہ کیا تھا اور پھر اگلے دن بڑے ٹھنڈے دل و دماغ کے ساتھ مولوی صاحب نے غلام فرید کے ساتھ پندرہ ہزار وصول کرنے پر اتفاق کر لیا تھا اور اس سے بھی بڑی اعلا ظرفی کا مظاہرہ انہیں اس وقت کرنا پڑا' جب غلام فرید نے انہیں بتایا کہ وہ اس مہینے کے بیس ہزار پہلے ہی خرچ کر چکا تھا۔ یہ پچھلے چار مہینوں کے پیسوں سے اس کا کمیشن تھا۔ مولوی صاحب کا دل چاہا وہ غلام فرید نامی اس کو اپنے ہاتھوں سے گاؤں کے بیچ کھیتوں میں اسی طرح پھانسی پر لٹکا دیں' جس طرح لوگ کھیتوں میں پرندوں کو ڈرانے والے بیجا لٹکاتے ہیں۔ مگر پھر انہیں یاد آیا تھا کہ سال کے آخر میں انہیں اپنی بیٹی کی شادی کرنی تھی اور وہ زمین بھی خریدنی تھی' جس کا بیعانہ وہ کچھ دن پہلے دے کر آئے تھے۔ اس لیے وہ بھی چند گالیوں کے بعد بے حد ٹھنڈے مزاج کے ساتھ وہاں سے چلے گئے تھے۔

غلام فرید کو یقین نہیں آیا تھا کہ بیٹھے بٹھائے اس کو ہر ماہ تنخواہ سے کچھ ہی تھوڑی رقم ملنے لگے گی اور وہ رقم اگر وہ سود والوں کو دیتا رہتا تو بہت جلدی اس کا سب سود ختم ہونے والا تھا۔

غلام فرید کے خوابوں کی گاڑی اس دن پہلی بار دن کے وقت بھی چھکا چھک چلنے لگی تھی۔ مگر اسے اس وقت اندازہ نہیں تھا کہ وہ مولوی صاحب سے دشمنی پال کر اپنی زندگی کی سب سے بڑی غلطی کر بیٹھا تھا۔ سود لینے سے بھی بڑی غلطی۔

☼ ☼ ☼

"اے لوگو! عورتوں کے معاملے میں اللہ سے ڈرو۔ تم نے اللہ کو گواہ بنا کر ان کو خود پر حلال کیا اور انہیں اپنی امان میں لیا ہے۔ تمہیں اپنی عورتوں پر حقوق حاصل ہیں بالکل ویسے ہی جیسے تمہاری عورتوں کو تم پر حقوق حاصل ہیں۔ ان پر تمہارا یہ حق ہے کہ وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ دوستی نہ کریں جسے تم پسند نہیں کرتے اور تمہاری حرمت کی نگہبانی کریں اور اگر وہ تمہاری فرماں بردار رہتی ہیں تو پھر یہ ان کا حق ہے کہ تم ان کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور ان کے نان نفقے کی ذمہ داری اٹھاؤ۔"

☆ ☆ ☆

احسن سعد نے تین سال کی عمر میں اپنی ماں کو اپنے باپ کے ہاتھوں پہلی بار پٹتے دیکھا تھا۔ اس نے کوئی "بے حیائی" کا کام کیا تھا۔ وہ بے حیائی کا کام کیا تھا' وہ تین سال کی عمر میں جان نہیں سکا تھا لیکن اپنے باپ کی زبان سے بار بار ادا ہونے والا وہ لفظ اس کے ذہن پر نقش ہو گیا تھا۔

اسے یہ بھی یاد تھا کہ اس کے باپ نے اس کی ماں کے چہرے پر دو تھپڑ مارے تھے۔ اس کا بازو موڑا تھا اور پھر اسے دھکا دے کر زمین پر گرایا تھا۔ اسے وہ چاروں غلیظ گالیاں بھی یاد تھیں جو اس کے باپ نے اس کی ماں کو دی تھیں۔ اپنی ماں کا رونا بھی اور اس پر باپ کا چلانا بھی۔

وہ خوف کے مارے کمرے میں موجود صوفے کے پیچھے چھپ گیا تھا۔ کیونکہ اسے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ اس کا باپ اب اسے پیٹے گا۔ اس کے باپ نے اسے چھپتے دیکھا تھا۔ اس نے شادی کے پانچ سال میں کئی بار اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا لیکن آج اس دن اس نے پہلی بار اپنی اولاد کے سامنے اپنی بیوی پر ہاتھ اٹھایا تھا۔

مارکٹائی کے اس سین کے فوراً" بعد اس کے باپ نے اسے صوفے کے پیچھے سے بڑے پیار سے پچکارتے ہوئے نکالا تھا۔ پھر وہ اسے گود میں اٹھائے گھر سے باہر لے گیا تھا۔ اگلے دو گھنٹے وہ باپ کے ساتھ اپنی پسند کی جگہوں پر پھرتا اور پسند کی چیزیں کھاتا رہا تھا۔ لیکن اس کا ذہن صرف ان دو تھپڑوں' ایک دھکے اور چار گالیوں میں پھنسا رہا تھا۔ اور اس کے بعد اس کی ماں کا اس طرح رونا جس طرح وہ کوئی ضد پوری نہ ہونے پر روتا تھا۔

"تم تو میرے پیارے بیٹے ہو۔ سب سے زیادہ پیارے ہو مجھے۔" اس کا باپ اسے ان دو گھنٹوں کے دوران مسلسل بہلاتا پچکارتا رہا تھا۔ وہ باپ کے گلے بھی لگتا رہا' باپ کے کہنے پر اس نے باپ کے چہرے کو چوما بھی اور وہ باپ کی باتوں کا جواب دینے کی بھی کوشش کرتا رہا۔ لیکن وہ اس دن پہلی بار اپنے باپ سے خوف زدہ ہوا تھا۔

دو گھنٹے کے بعد گھر واپسی پر اس نے اپنی ماں کو معمول کے کاموں میں مصروف پایا تھا۔ وہ کھانا پکا رہی تھی۔ جیسے روز پکاتی تھی۔ اس کے باپ کو چائے پیش کر دی تھی۔ جیسے روز دیتی تھی۔ اور اس سے اور اس کی بڑی اور چھوٹی بہن سے بات کرتی رہی تھی جیسے روز کرتی تھی۔ مگر فرق صرف یہ تھا کہ آج اس کے چہرے پر انگلیوں کے چند نشان تھے' اور اس کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ اور وہ اس سے آنکھیں نہیں ملا رہی تھی۔ اس دن اس کا دل اپنی ماں کے پاس سونے کو نہیں چاہا۔ اور اس کا دل ان نئے کھلونوں سے کھیلنے کو بھی نہیں چاہا جو اس کے باپ نے اسے دلائے تھے۔ وہ اپنی پانچ سالہ بہن کے بستر میں سونے کے لیے گیا تھا اور بہت دیر تک نہیں سو سکا تھا۔ اس نے کسی بڑے کو کسی دوسرے بڑے کو پہلی بار "مارتے" دیکھا تھا اور اس دوسرے "بڑے" کو کسی مزاحمت کے بغیر مار کھاتے دیکھا تھا۔ یہ بچوں کے جھگڑے میں تو نہیں ہوتا تھا۔ وہ اپنی بہن کے ساتھ لڑتا تھا اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پیٹتے تھے یہ ون سائیڈڈ مقابلہ۔

اگلے چند دن وہ پریشان رہا تھا اور خاموش بھی۔ اس کی ماں نے اس کی خاموشی نوٹس کی یا نہیں' لیکن اس کے باپ نے کی تھی اور وہ اس کی وجہ سے واقف تھا۔ وہ اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ اسے اپنی جان سے بھی زیادہ عزیز تھا اور

اب وہ باپ سے ہلکا سا کھنچا تھا تو اس کے لیے اسے نظرانداز کرنا ناممکن تھا۔ اگلے کئی دن اس کا باپ اس پر معمول سے زیادہ توجہ دیتا رہا 'اس کے زیادہ نخرے اٹھاتا رہا' زیادہ فرمائشیں پوری کرتا رہا۔ وہ آہستہ آہستہ نارمل ہو تا گیا تھا اور وہ پہلی اور آخری بار تھا جب اس کے باپ نے اس کی ماں کو مارنے کے بعد اس کے اتنے نخرے اٹھائے تھے۔ بعد کے سالوں میں اس کی ماں کئی بار اس کے سامنے پٹی تھی۔ (آنسو بہائے بغیر۔ وہ جیسے اب عادی ہو گئی تھی۔) اس نے ان غلیظ گالیوں کو معمول کے الفاظ میں تبدیل ہوتے دیکھا تھا جب بھی اس کے باپ کو غصہ آتا تو وہ ان الفاظ کا بے دریغ استعمال کرتا۔ اور وہ اب صوفے کے پیچھے نہیں چھپتا تھا۔ وہ ایک خاموش تماشائی کی طرح اپنی بہنوں کے ساتھ یہ سارا منظر دیکھا کرتا تھا۔ اور ایسے ہر منظر کے بعد اس کا باپ اسے شام کی سیر کے لیے لے جایا کرتا تھا۔ اور اس سیر کے دوران وہ اسے بتایا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ بے حیائی کے کاموں کو کتنا ناپسند کرتا ہے اور عورت سب سے زیادہ بے حیائی کے کاموں میں ملوث ہے۔ اور بے حیائی کے کام کرنے والوں کو سزا دینی چاہیے۔

پانچ سال کی عمر میں اسے قرآن پاک کی بہت ساری آیات اس کے باپ نے یاد کروائی تھیں۔ بہت ساری دعائیں بھی۔ اور اس کے ساتھ بے حیائی کے کاموں کی وہ فہرست بھی جس کے کرنے پر کسی عورت کو سزا دینا واجب ہو جاتا تھا اور بے حیائی کے ان کاموں میں شوہر کی نافرمانی 'پردے کی پابندی نہ کرنا' کسی نامحرم سے مذاق یا بات کرنا 'گھر سے اجازت کے بغیر جانا' کسی قسم کا فیشن یا سنگھار کرنا 'شوہر سے اونچی آواز میں بات کرنا' کھانا دیر سے بنانا یا بدمزہ بنانا 'ٹی وی دیکھنا' میوزک سننا 'نماز روزے کی پابندی نہ کرنا' اس کے دادا دادی کی خدمت نہ کرنا اور بہت سے دوسرے کام تھے جو اسے مکمل طور پر ازبر تھے کیونکہ بے حیائی کے ان سارے کاموں پر اس نے کبھی نہ کبھی اپنی ماں کو پٹتے دیکھا تھا۔

وہ جن قاری صاحب سے قرآن پاک پڑھتا تھا ان سے ماں باپ کے ادب اور خدمت کے بارے میں قرآنی احکامات بھی سنتا تھا 'خاص طور پر ماں کے حوالے سے۔ مگر اس کا ذہن یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ عورت جو بے حیائی کے بہت سارے کام کرتی ہے اور اسے سزا ملتی ہے وہ اس کی عزت کیسے کرے۔ آخر کیسے کر سکتا تھا۔ سوال اس کے پاس اور بھی بہت سے تھے لیکن ان کے جواب ایک پانچ سال بچہ اپنے باپ کے ساتھ واک کرتے ہوئے اور اسلام کے حوالے سے لمبی لمبی تقریریں سنتے ہوئے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ آسان تشریح وہی تھی جو اس نے کی تھی۔ وہ بڑا ہو کر مرد بننے والا تھا 'ایک ایسا مرد جسے کسی بھی عورت کو بے حیائی کے کاموں سے منع کرنے کے لیے اس پر ہاتھ اٹھانے اور اسے وہ گالیاں دینے کا حق تھا جو اس کا باپ اسے عام زندگی میں اپنے ساتھ کھیلنے یا پڑھنے والے کسی بچے کو دینے سے سختی سے منع کرتا تھا۔ اور اس کا آئیڈیل اس کا باپ تھا۔ باریش داڑھی کے ساتھ اسلامی شعائر پر سختی سے کاربند 'پانچ وقت نماز پڑھنے والا 'ایک بے حد خوش اخلاق 'نرم خو' خوش گفتار انسان اور سعادت مند بیٹا۔ جو اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ مغرب میں گزارنے کے باوجود ایک "مثالی" اور "عملی" مسلمان تھا۔ وہ بھی بڑا ہو کر ویسا ہی مثالی اور عملی مسلمان بننا چاہتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اے لوگو تمہارے خون 'تمہارے مال ایک دوسرے کے لیے اسی طرح محترم ہیں جیسے آج کا یہ دن (عرفہ کا دن) یہ مہینہ (ذی الحجہ) اور یہ شہر (مکہ)

خبردار زمانہ جاہلیت کی ہر رسم اور طریقہ آج میرے قدموں کے نیچے ہے اور جاہلیت کے خون معاف کر دیے گئے ہیں اور پہلا خون جو میں اپنے خونوں سے معاف کرتا ہوں وہ ابن ربیعہ حارث کا خون ہے۔

دیکھو میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا کہ پھر سے ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔

☆ ☆ ☆

غلام فرید کی زندگی میں صرف چند اچھے مہینے آئے تھے۔ ایسے مہینے جن میں پہلی بار اس نے راتوں کو سکون سے سونا سیکھا تھا۔ مہینے کے آخر میں سود کی قسط جمع کرانے کے لیے پیسوں کی جمع تفریق کیے بغیر۔ اور وہی چند مہینے تھے، جن میں شادی کے ابتدائی دنوں کے بعد پہلی بار نسیمہ اور غلام فرید نے مل کر کچھ خواب بُنے تھے۔ اچھے دنوں کے خواب جب ان کے سر سے وہ سود ختم ہو جائے گا۔ پانچ ہزار کی وہ اضافی رقم جیسے ایک نعمت مترقبہ تھی ان کے لیے۔ اور وہی کچھ دن تھے جب غلام فرید اور اس کی بیوی نے اپنے بچوں کے بارے میں بھی سوچا تھا کہ وہ جب بڑے ہوں گے تو ان کے سر پر قرض کی وہ تلوار نہیں لٹک رہی ہوگی جو اب لٹک رہی تھی۔

غلام فرید بہت معصوم تھا یا شاید بہت بے وقوف۔ وہ یہ سمجھ رہا تھا کہ اس نے زندگی میں پہلی بار کوئی بہت بڑی کامیابی حاصل کرلی تھی۔ جیسے امیر بننے کی طرف پہلا قدم اٹھالیا تھا اس نے۔ وہ پانچ ہزار کی رقم کو پنشن بنا بیٹھا تھا، جو ساری عمر کسی رکاوٹ کے بغیر اسے ملتی رہتی تھی۔

مولوی صاحب کے ساتھ غلام فرید نے جو کچھ کیا تھا اس کے بعد مولوی صاحب کی نیندیں کئی دن اُڑی رہی تھیں۔ بیس ہزار کی رقم بیٹھے بٹھائے پندرہ ہزار رہ گئی تھی اس کا صدمہ تو تھا ہی تھا لیکن ساتھ اس بات کا بھی اندیشہ انہیں ہو گیا تھا کہ مسجد کی رقم کو سود خوری کے کاروبار میں لگانے کی خبر اگر گاؤں میں کسی طرح پھیل گئی تو اور کچھ ہو گا یا نہیں انہیں مستقبل میں چندے ملنا بند ہو جائیں گے۔

بدنامی کی تو خیر انہیں زیادہ فکر نہیں تھی۔ بدنامی ہو بھی جاتی تو بھی کوئی انہیں امامت سے اور اس مسجد سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ مسجد انہیں باپ دادا کی جاگیر کی طرح ورثے میں ملی تھی اور گاؤں کے لوگوں کو صحیح طرح سے وضو کرنا تو آتا نہیں تھا۔ سو امام مسجد کو دینی لحاظ سے کیا جانچتے اور اگر ہٹا بھی دیتے تو ان کی جگہ پر لاتے کس کو۔

بیوی مولوی صاحب کو سودی کاروبار میں لگائی رقم واپس لینے نہیں دے رہی تھی۔ یہ وہ پہلا خیال تھا جو غلام فرید کی دھمکی کے بعد مولوی صاحب کو آیا تھا کہ وہ جتنی جلدی ہو سکے اپنی رقم واپس لے لیں تاکہ کم از کم غلام فرید کی ایسی کسی دھمکی کو سچ ثابت کرنے پر وہ اسے جھوٹا تو ثابت کر دیتے۔

بیوی کا کہنا تھا اور کون سی ایسی جگہ ہے جہاں پیسہ لگانے پر 25 فی صد منافع مل جائے۔ بینک والے تو آٹھ یا نو فی صد بھی رو دھو کر دیتے تھے۔ اور وہ یہ رقم کاروبار سے نکال لیں گے تو اس منافع کی کمی کہاں سے پوری کریں گے۔ بیٹیوں کے جہیز کہاں سے بنیں گے۔ ان کی شادی کے اخراجات کہاں سے پورے ہوں گے۔ مسجد کی امامت سے تو تین وقت کی روٹی ہی پوری ہو سکتی تھی۔ باقی اخراجات کے لیے وہ آمدنی ناکافی تھی۔

مولوی صاحب کو بیوی کی باتیں تو سمجھ میں آرہی تھیں اور وہ اس کے خدشات سے بھی واقف تھے لیکن خود اب ان کو شدید دھڑکا لاحق ہو گیا تھا کہ کہیں کسی دن غلام فرید پندرہ ہزار کی باقی رقم بھی دینے سے انکاری نہ ہو جائے اور ان کا یہ خدشہ بالکل ٹھیک نکلا تھا۔

دو ماہ بعد غلام فرید نے اپنے گھر کے کچھ ناگزیر اخراجات کی وجہ سے مولوی صاحب کو بیس ہزار کی رقم دینے سے معذرت کرلی تھی اور ان سے اگلے ماہ کی مہلت مانگ لی تھی۔ یہ وہ لمحہ تھا جب مولوی صاحب نے گالم گلوچ اور لعنت ملامت نہیں کی تھی اسے۔ انہوں نے اسے جہنم سے ڈرانے کے بجائے اس کی زندگی خود جہنم بنانے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ انہوں نے اپنی بیوی کو بتائے بغیر گاؤں کے اس شخص سے اپنی رقم کا مطالبہ یہ کہہ کر کیا تھا کہ مسجد کی تزئین و آرائش کے لیے فوری طور پر ایک بڑی رقم چاہیے اس لیے وہ چاہتے ہیں کہ اپنی رقم نکال کر اس میں سے کچھ مسجد میں چندہ کردیں۔ جو جواب انہیں ملا تھا وہ ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

اس آدمی نے انہیں رقم واپس کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ فی الحال رقم کاروبار میں لگی ہوئی ہے اور وہ اگلے دو تین سال تک اس کا منافع تو دے سکتا ہے لیکن اصل رقم واپس نہیں کر سکتا۔ مولوی صاحب کو وہاں کھڑے کھڑے دن میں تارے نظر آ گئے تھے۔ انہوں نے پانچ لاکھ کی رقم اس آدمی کو دی ہوئی تھی، اور وہ کچھ کمیشن وغیرہ کٹوانے کے بعد تقریباً "ستر" اسی ہزار روپیہ ہر ماہ وصول کر رہے تھے اور اب ایکدم اس آدمی کے انکار نے ان کے چودہ طبق روشن کر دیے تھے۔

وہ پچھلے کئی سالوں سے اس آدمی کے پاس یہ سرمایہ کاری کر رہے تھے شروع میں دس بیس ہزار سے شروع ہونے والا یہ بزنس آہستہ آہستہ پانچ لاکھ رقم تک چلا گیا تھا۔ اور اب وہ آدمی کہہ رہا تھا کہ وہ اصل رقم نہیں دے سکتا تھا' صرف سود دے سکتا تھا۔

اس دن غلام فرید سے مولوی صاحب کی نفرت کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ گھر جا کر انہوں نے بیوی کو یہ قصہ بھی سنایا تھا' وہ بھی ان ہی کی طرح دل تھام کے رہ گئی تھی۔ مگر پھر اس نے مولوی صاحب کو یہ کہتے ہوئے تسلی دی۔

"چلیں مولوی صاحب دو تین سال بعد ہی دے گا مگر دے تو دے گا نا۔ اور شکر ہے اس نے منافع دینے سے انکار نہیں کیا۔ میں تو پہلے ہی آپ کو روک رہی تھی۔ کہ ابھی اپنی رقم واپس لینے کی ضرورت نہیں ہے لیکن پتا نہیں آپ کو کیا سوجھی تھی کہ لگی لگائی روزی پر لات مارنے چل پڑے۔" اسے مولوی صاحب سے یہ بات کہتے ہوئے یہ پتا نہیں تھا کہ وہ لگی لگائی روزی خود ہی انہیں لات مار دینے والی تھی۔

اگلے مہینے ایک بار پھر مولوی صاحب کو غلام فرید سے پیسے نہیں ملے اور اس مہینے انہیں اس ساہوکار نے منافع کی رقم بھی نہیں دی۔ ایک ماہ پہلے مولوی صاحب کے رقم کے مطالبے نے جیسے اسے چوکنا کر دیا تھا کہ وہ پارٹی ٹوٹنے والی تھی اور جب وہ پارٹی ٹوٹنے والی تھی تو وہ اس کو منہ بھر بھر کے منافع کیوں کھلاتا۔ اب اس کی باری تھی' گیا گیا سارا منافع واپس وصول کرنے کی۔ لیکن اس نے مولوی صاحب سے یہ باتیں نہیں کی تھیں' اس نے مولوی صاحب سے بس فی الحال چھ ماہ کی مہلت مانگی تھی اور یہ کہا تھا کہ چھ ماہ کے بعد وہ چھ ماہ کا منافع اکٹھا انہیں لوٹا دے گا لیکن فی الحال اس پر شدید مالی۔ بحران آیا تھا اور اس نے مولوی صاحب سے نہ صرف دعا کی درخواست کی تھی بلکہ کوئی قرآنی وظیفہ بھی مانگا تھا اپنے کاروبار میں برکت کے لیے۔

مولوی صاحب کو ٹھنڈے پسینے آ گئے تھے اس کی باتیں سن کر۔ اور کچھ بعید نہیں تھا کہ ہارٹ فیل ہی ہو جاتا ان کا۔ وہ پل بھر میں لکھ پتی سے ککھ پتی ہوئے تھے۔ اور وہ بھی دن دہاڑے۔ یہ غلام فرید نہیں تھا۔ گاؤں کا کمی کمین جسے وہ اس کے دروازے پر منہ بھر بھر کر گالیاں دیتے رہتے اور وہ ڈھیٹوں کی طرح دانت نکال کر ہنستا رہتا۔ یہ گاؤں کا "ساہوکار" تھا۔ ایک بزنس مین۔ جو مالی۔ بحران کے باوجود شان دار گھر میں بیٹھا تھا اور اس کے آگے پیچھے نوکر پھر رہے تھے۔ مولوی صاحب چوں بھی کرتے تو وہ انہیں اٹھوا کر گھر سے باہر پھنکوا دیتا اس بات کی پروا کیے بغیر کہ وہ گاؤں کی مسجد کے امام صاحب تھے۔

مولوی صاحب چپ چاپ وہاں سے تو اٹھ کر آ گئے تھے لیکن انہوں نے اپنے اس مالی نقصان کا سارا کا سارا غصہ غلام فرید پر اتارا تھا۔ وہی تھا جو ان کی تباہی کا ذمہ دار تھا تو اب ضروری تھا کہ وہ بھی تباہ و برباد ہوتا۔

انہوں نے اسکول سے اس کے مالک کا نمبر لیا تھا اور پھر اسے فون کر کے غلام فرید کے اوپر جی بھر کے الزامات لگائے تھے۔ مالک کا رد عمل فوری تھا اور متوقع تھی۔ وہ پہلی فرصت میں گاؤں آیا تھا اور مولوی صاحب سے ملاقات کے بعد غلام فرید کی صفائیاں' اور وضاحتیں' معافیاں سننے کے باوجود اس نے اسے نوکری سے فارغ کر دیا تھا۔

غلام فرید کے سر پر جیسے پہاڑ آ گرا تھا۔ صرف اسے نوکری سے فارغ نہیں کیا گیا تھا' اس کی بیوی کو بھی نوکری

سے نکال دیا گیا تھا اور ان سے کوارٹر بھی خالی کروالیا گیا تھا۔

گیارہ لوگوں کا وہ خاندان چھت سے بے چھت ہو گیا تھا۔ وسائل اتنے نہیں تھے کہ وہ گاؤں میں بھی کوئی جگہ کرائے پر لے سکتے۔ شاید بے ہی لیتے اگر انہیں زندگی کی گاڑی کے ساتھ قرضے کی ریل گاڑی نہ کھینچنی پڑتی۔ وہ گاؤں تھا، وہاں نوکریاں نہیں ملتی تھیں۔ لوگ کھیتی باڑی کرتے تھے یا اپنا کاروبار یا پھر محنت مزدوری۔

غلام فرید اور اس کی بیوی کو لوگ خوش قسمت سمجھتے تھے کہ ان پڑھ ہونے کے باوجود انہیں ایک اسکول میں اتنے اچھے پیسوں پر کام بھی ملا ہوا تھا اور کوارٹر بھی۔ مگر اس گاؤں میں اور ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں پر کام کرنا خوش قسمتی قرار پاتا۔ مولوی صاحب کے طفیل غلام فرید پورے گاؤں میں اپنی بیوی سمیت بدنام ہو چکا تھا۔ وہ ایک چور تھا جس نے اللہ کے پیسوں کو بھی نہیں چھوڑا تھا۔ گاؤں والوں نے مولوی صاحب کے بار بار دہرائے گئے قصے سن سن کر غلام فرید کا جیسے سوشل بائیکاٹ ہی کر دیا تھا۔ غلام فرید نے بھی مولوی صاحب کے کارنامے لوگوں کو بتانے کی کوشش کی تھی لیکن کسی نے ایک کمین چور پر یقین نہیں کیا تھا۔ یقین کرتے بھی کیسے وہ "مولوی صاحب" پر الزام لگا رہا تھا۔ "مولوی صاحب" پر۔ اور وہ بھی کمین اور بددیانتی کے الزام میں بیوی سمیت نوکری سے نکالے جانے کے بعد۔ مولوی صاحب بری الذمہ اور معصوم قرار پائے تھے۔

پتا نہیں وہ کون سا لمحہ تھا جب غلام فرید نے اپنا ذہنی توازن کھونا شروع کیا تھا۔ بھوک اور تنگ دستی نے اس کا دماغ خراب کیا تھا۔ گاؤں والوں کی باتوں اور طعنوں نے۔ لڑکپن میں داخل ہوتی بیٹیوں پر پڑتی گاؤں کے لڑکوں کی گندی نظروں اور اپنی بے بسی نے۔ یا پھر ان سود خوروں کی دھمکیوں اور چکروں نے جو غلام فرید کو سود کی قسطیں ادا کرنے کے قابل نہ رہنے پر بار بار اس احاطے کے ٹوٹے دروازے کے باہر کھڑے ہو کر مار پیٹ کرتے جہاں جانوروں کے ایک باڑے کے برابر غلام فرید نے بھی لکڑی کی چھت ڈال کر وقتی طور پر اپنے خاندان کو پناہ دی تھی۔

پتا نہیں کیا ہوا تھا غلام فرید کو۔ اور یہ واقعی پتا نہیں چلتا کہ انسانوں کو ہو کیا جاتا ہے جب وہ اپنے خونی رشتوں کو اپنے ہی ہاتھ سے ختم کر دیتے ہیں۔

چنی ایک سال کی تھی جب غلام فرید نے ایک رات اپنے خاندان کے نو کے نو افراد کو ذبح کر دیا تھا۔ چنی واحد تھی جو بچ گئی تھی اور وہ بھی شاید اس لیے بچ گئی تھی کیونکہ پاگل پن کے اس لمحے میں غلام فرید اپنی اولاد کی گنتی ہی بھول گیا تھا۔ چنی کو بھی اس نے گود میں اٹھا کر دیکھا نہیں تھا تو وہ اسے یاد آتی بھی تو کیسے۔ پھر اس پر بھی اپنے بہن بھائیوں کا اتنا خون لگ گیا تھا کہ ان کے برابر بے سدھ سوئے ہوئے بھی غلام فرید کو وہ مری ہوئی ہی لگی ہو گی۔

نو انسانوں کو مارنے کے بعد غلام فرید نے اپنی جان نہیں لی تھی۔ وہ زندہ تھا ہی کب۔ زندہ تو انسان عزت نفس کی وجہ سے ہوتا ہے۔ جو غلام فرید کی کب کی چھن چکی تھی۔ خاندان کو مار دینا جیسے وہ حل تھا جو ایک ان پڑھ شخص نے غربت اور قرض سے نجات کے لیے نکالا تھا جب کوئی حل ہی باقی نہیں رہا تھا۔

ایک سال کی چنی کو کچھ یاد نہیں تھا۔ نہ قاتل نہ مقتول۔ اس کو یاد تھا تو بس ایک چہرہ جو اسے وہاں سے لے گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اے لوگو! نہ تو میرے بعد کوئی نیا پیغمبر یا نبی آئے گا نہ تمہارے بعد کوئی نئی امت۔ میں تمہارے پاس اللہ کی کتاب اور اپنی سنت چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اگر تم ان پر عمل کرو گے تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے۔"

☼ ☼ ☼

وہ رات ہاشم مبین کی زندگی کی مشکل ترین راتوں میں سے ایک تھی۔ صرف انہیں کی نہیں کسی بھی باپ کے

لیے مشکل ترین ہوتی' انہیں لگ رہا تھا' انہوں نے ایک بھیانک خواب دیکھا تھا کچھ دیر پہلے۔ مگر خواب انسان جاگتی آنکھوں سے کیسے دیکھ سکتا ہے اور خواب میں بھی انسان کی اپنی اولاد اپنے والدین کے ساتھ ایسی بے رحمی کا سلوک کیسے کر سکتی ہے کہ انسان ایک لمحے کے لیے اس کے اپنی سگی اولاد ہونے پر شبہ کرے۔

وہ اپنی اسٹڈی میں بیٹھے اپنی جائیداد اور بینک اکاؤنٹس اور دوسرے اثاثہ جات کی فائلز اپنے سامنے میز پر ڈھیر لیے صرف یہ سوچ رہے تھے کہ یہ سب ان کے ساتھ کیوں ہو رہا تھا انہوں نے تو اپنی اولاد کو ہمیشہ "حلال" کھلایا تھا۔ پھر ایسی کون سی غلطی یا گناہ ہوا تھا کہ وہ آج وہاں کھڑے تھے۔

اولاد ماں باپ کے مرنے کے بعد ترکہ پر لڑے تو سمجھ میں آتا ہے مگر اولاد ماں باپ کی زندگی میں ہی ان کے سامنے اسی طرح جائیداد کے حصوں اور پائی پائی پر لڑے جیسے ماں باپ مر گئے ہوں تو ماں باپ کو کون سی صلیب پر چڑھنا پڑتا ہے۔ ہاشم مبین آج کل اسی صلیب پر چڑھے ہوئے تھے۔

بڑھاپا بڑی ظالم چیز ہوتا ہے۔ اور تخت پر بیٹھے بوڑھے بادشاہ کو تخت پر بیٹھے ہوئے اپنا ولی عہد بھی اچھا نہیں لگتا' اپنی اولاد سے بھی خوف آتا ہے اسے۔ ہاشم مبین نے بھی ساری زندگی ایک بادشاہ ہی کی طرح گزاری تھی۔ وہ سب پر حاوی رہے تھے اور ان کی کسی بھی اولاد کی یہ مجال نہیں تھی کہ وہ ہاشم مبین کے سامنے سر بھی اٹھا سکے۔ اور اب اسی ہاشم مبین پر وہی فرماں بردار اولاد انگلیاں بھی اٹھا رہی تھی اور گستاخانہ باتیں بھی کر رہی تھی۔ انہوں نے ساری زندگی اس اولاد کو ایک بہترین لائف اسٹائل دینے کے لیے بہت سارے سمجھوتے کیے تھے۔ اور سمجھوتے کرتے ہوئے وہ صحیح اور غلط کی تمیز ہی بھول گئے تھے۔ آج بیٹھے تھے تو سب کچھ یاد آ رہا تھا پوری زندگی جیسے ایک فلم کی طرح ان کے سامنے چل رہی تھی۔ زندگی میں کب کب انہوں نے ضمیر کا سودا کیا تھا وہ بھی یاد آ رہا تھا کب کب انسانیت کا اور کب اپنے مذہب کا۔

وہ بے چین ہو کر اٹھ کر کمرے میں پھرنے لگے۔ مال و زر کا وہ ڈھیر جو انہوں نے اپنا مذہب بیچ اور بدل کر اکٹھا کیا تھا وہ شاید اسی قابل تھا کہ ان کی اپنی اولاد ہی اسے لوٹ لیتی۔

وہ کھڑکی کے سامنے آ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ پچھتاوے کی ایک اسٹیج وہ ہوتی ہے جب انسان پچھتاوا نام کا لفظ بھی نہیں سننا چاہتا۔ یہ اسے گالی کی طرح لگتا ہے۔ انہیں بھی لگ رہا تھا۔ پچھتاوا کیسا؟ ایسا کیا ہی کیا تھا جس پر پچھتاوا ہوتا۔؟ جو بھی کیا تھا سوچ سمجھ کر ہی کیا تھا' غلطی کہاں ہوئی۔؟ ساری زندگی بہترین آسائشوں میں گزری' اگر کچھ غلط ہوتا تو کہیں تو ٹھوکر لگتی۔؟ وہ ایک کے بعد ایک سوال سے جیسے اپنی زندگی غلطیوں اور گناہوں کی چھان پھٹک کر رہے تھے۔ چیک لسٹ میں اپنی ٹھوکریں نظرانداز کر کے خود کو درست قرار دے رہے تھے آنکھیں بند کیے۔

اور پھر زندگی کے اس لمحے پر انہیں ایک غلطی اور اس ایک غلطی کے ساتھ امامہ یاد آئی تھی۔ انہوں نے اسے ذہن سے جھٹکا۔ پھر جھٹکا پھر جھٹکا۔ اور پھر وہ رک گئے۔ فائدہ کیا تھا اس کوشش کا۔ پہلے کبھی اس میں کامیاب ہوئے تھے جو آج ہو جاتے۔

کتنے سال ہوئے تھے انہیں اسے دیکھے۔ اس سے ملے۔ آخری بار۔ آخری بار انہوں نے اسے اس ہوٹل میں دیکھا تھا سالار کے ساتھ۔ اور آخری بار انہوں نے اس کی آواز کب سنی تھی۔ اس سے کب بات کی تھی۔؟۔ انہیں یہ بھی یاد تھا۔ یہ کیسے بھول جاتا؟۔ وسیم کی موت پر۔

کتنے سال... کتنے سال گزر گئے تھے۔ انہوں نے ایک گہرا سانس لیا۔ آنکھوں میں آنے والی نمی صاف کی۔ پتا نہیں یہ نمی کس کے لیے آئی تھی وسیم کے لیے۔؟ یا امامہ کے لیے۔؟

آنے والے ہفتے میں سب کچھ بکنا اور بٹنا تھا۔ یہ گھر۔ فیکٹری۔ زمین۔ پلاٹ' اکاؤنٹس میں پڑا پیسہ۔ گاڑیاں۔

سب اثاثے' اگر کچھ بٹنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ تو وہ ہاشم مبین اور ان کی بیوی تھیں' جنہیں کوئی بھی اثاثہ نہیں سمجھ رہا تھا اور کوئی بھی ساتھ رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اکیلے رہ سکتے تھے۔ امامہ کے بعد بھی رہ رہے تھے۔ اور وسیم کے بعد بھی رہ رہے تھے۔ نوکر رکھ سکتے تھے اپنے لیے۔ بڑا گھر نہ سہی کوئی چھوٹا گھر لے سکتے تھے' جائیداد کی تقسیم کے بعد ان کے اور ان کی بیوی کے حصے میں اتنا کچھ تو ضرور آجاتا۔ لیکن پریشانی اب پیسے کی نہیں تھی زندگی کی تھی۔ آخر زندگی اتنی لمبی کیوں ہو جاتی ہے؟ انسان بڑھاپے کی سیڑھی پر قدم رکھے یہ سب دیکھ کر اور سہ کر ہی کیوں مرتا ہے۔ پہلے ہی کیوں نہیں مر جاتا۔ ہاشم مبین نے اس وقت جو سوچا تھا۔ وہ کبھی پہلے نہیں سوچا تھا۔

صدمہ یہ نہیں تھا کہ اپنا سب کچھ اولاد کو سونپ کر' ہاتھ جھاڑ کر الگ ہوتا تھا۔ اور ان میں بیٹے اور بیٹیاں سب شامل تھے۔ صدمہ یہ تھا کہ یہ تقسیم ایسے ہو رہی تھی۔ اس ذلت آمیز انداز میں۔

یہ وہی رات تھی جب انہوں نے ایک بار امامہ سے ملنے کا سوچا تھا۔ یہ وہی رات تھی جب انہوں نے سوچا تھا' کہ شاید انہیں باقی اولادوں کی طرح امامہ کو بھی اپنی جائیداد میں سے حصہ دینا چاہیے۔ اور وہ یہ جانتے تھے وہ اس سوچ پر عمل کبھی نہیں کر سکتے۔ وہ امامہ کو اپنی جائیداد کا وارث نہیں بنا سکتے تھے کیونکہ اس کے لیے انہیں بہت سارے اعتراف کرنے پڑتے۔ عمر کے اس حصے میں ہاشم مبین نے پہلی دفعہ یہ بھی سوچا کہ وہ کچھ اعتراف کر لیں۔ شاید ضمیر کا کچھ بوجھ کم ہو جائے۔ گناہ کا بوجھ گھٹانا تو اب ممکن نہیں رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اور شیطان سے خبردار رہو۔ وہ اس بات سے مایوس ہو چکا ہے کہ اس زمین پر اس کی پرستش کی جائے گی لیکن وہ اس بات پر راضی ہے کہ تمہارے درمیان فتنہ و فساد پیدا کرتا رہے اس لیے تم اس سے اپنے دین وایمان کی حفاظت کرو۔"

☼ ☼ ☼

مویشیوں کے اس احاطے میں اپنے خاندان کی لاشوں کے پاس چند گھنٹے بیٹھے رہنے کے بعد غلام فرید اس رات پہلی بار جا کر جانوروں کے باڑے میں سویا تھا۔ زمین پر پڑی دری جو جانوروں کے بول و براز سے اٹی ہوئی تھی۔ اس پر گائے بھینسوں کے قریب۔ اسے جس آدمی نے اس احاطے میں خاندان سمیت رہائش دی تھی اس آدمی نے جانوروں کی چوکیداری اور دیکھ بھال کے کام کے عوض دی تھی۔ اور غلام فرید اب ان کی چوکیداری کر رہا تھا۔ یا پھر شاید وہ بھی ایک جانور تھا جسے جانوروں کے ساتھ ہی رہنا چاہیے تھا۔

اس کے خاندان کی لاشیں صبح سویرے دودھ لینے والے کچھ لوگوں نے دیکھی تھیں اور اس کے بعد گاؤں میں کہرام مچ گیا تھا۔ غلام فرید اس کہرام کے دوران بھی جانوروں کے باڑے میں ہی وہ چھری پاس رکھے بیٹھا اسے گھور رہا تھا۔ جو آلہ قتل تھی۔ مگر غلام فرید کی نظر میں وہ آلہ رہائی تھی۔

پورا گاؤں اس احاطے میں آگیا تو لوگوں نے غلام فرید کو بھی دیکھ لیا۔ اس کے کپڑوں اور ہاتھوں پر لگے خون کو بھی۔ اور اس خون آلود چھری کو بھی۔ وہ پہلا موقع تھا جب گاؤں میں سے کوئی غلام فرید کو گالی نہیں دے سکا تھا۔ ہمیشہ کی طرح۔ وہ اس سے دہشت زدہ ہو گئے تھے۔ اس کے قریب تک آنے کی جرات بھی نہیں کر پا رہے تھے۔ بس گم صم اسے دور دور سے دیکھ کر یوں سرگوشیاں کر رہے تھے جیسے وہ چڑیا گھر میں رکھا ہوا پنجرے میں بند کوئی جنگلی جانور ہو جو کسی بھی وقت ان میں سے کسی پر بھی حملہ کر سکتا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ وہ پنجرے کی سلاخوں کے پیچھے نہیں تھا اس لیے زیادہ خطرناک تھا۔

اس دن پوری زندگی میں پہلی بار گاؤں میں سے کسی نے غلام فرید کو ماں بہن' بیوی بیٹی کی کوئی فحش گالی دے کر

مخاطب کیا تھا نہ ہی کسی نے اس کے ذات کے کمی کمین ہونے کو کسی طعنے میں جتایا تھا۔ نہ کسی نے اس پر لعنت ملامت کی تھی نہ گالم گلوچ۔ نہ ڈرایا دھمکایا تھا۔ نہ گریبان سے پکڑا تھا نہ تھوکا تھا نہ ہاتھ اٹھایا تھا۔ اور نہ ہی یہ یاد کرایا تھا کہ اسے سود کی قسط ادا کرنی ہے اس تاریخ تک اور اگر ادا نہ کی تو اس کے ٹکڑے کرنے کے بعد اس کی بیوی اور بیٹیوں کے ساتھ کیا کیا جائے گا۔

زندگی میں پہلی بار اس دن غلام فرید نے جیسے چند لمحوں کے لیے جانور بننے کے بعد انسان جیسا درجہ حاصل کیا تھا۔

پولیس کے آنے سے کچھ دیر پہلے مولوی صاحب بھی موقع واردات پر پہنچ گئے تھے۔ وہ رستے میں سن چکے تھے کہ غلام فرید نے کیا کیا تھا لیکن اس کے باوجود نو لاشوں اور ان نو لاشوں کے درمیان بلکتی ایک بچی نے ان پر چند لمحوں کے لیے لرزہ طاری کر دیا تھا۔ انہیں لگا تھا جیسے غلام فرید کو اللہ نے اس کے کیے کی سزا دی تھی۔ اس برائی کی جو اس نے مولوی صاحب کے ساتھ کی تھی اور یہ بات وہ اگلے کئی مہینے وقتاً" فوقتاً" جمعے کے خطبے میں دہراتے بھی رہے۔ اپنی موفیت رجسٹر کروانے کا اس سے اچھا موقع کہاں مل سکتا تھا مولوی صاحب کو۔ کم علم، جاہل لوگوں کے دل پر اللہ اور مولوی صاحب کی ہیبت قائم کرنے کی۔

پولیس کے پہنچنے پر مولوی صاحب نے ہی اس کا استقبال کیا تھا اور وہ "شیطان" دکھایا تھا جو پھانسی کا حق دار تھا۔ اس "شیطان" نے کسی مزاحمت کے بغیر اپنے آپ کو پولیس کے حوالے کر دیا تھا۔

"ہاں میں نے ہی مارا ہے سب کو۔ اور صرف اس لیے کیونکہ میں نہیں چاہتا تھا وہ ویسی زندگی گزاریں جو غلام فرید جی رہا تھا۔ میں کچھ بھی کر لیتا کسی جائز طریقے سے اپنا قرض نہیں اتار سکتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا وہ بھی کیڑے مکوڑوں کی طرح جئیں۔" غلام فرید نے پولیس کے سامنے اپنے اعترافی بیان میں کہا تھا۔

غلام فرید نے ٹھیک کہا تھا، وہ کسی بھی حلال طریقے کی آمدنی سے سود جیسی حرام چیز کو اپنے سر سے نہیں ہٹا سکتا تھا۔ اس حرام چیز سے نجات کے لیے کوئی اس سے بھی زیادہ حرام کام کرنا تھا اسے۔ اور وہ حرام کام اس نے کر ہی لیا تھا۔

حلال برکت پیدا کرتا ہے۔ حرام بدی کو جنم دیتا ہے۔

☆ ☆ ☆

" جان جاؤ کہ ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور تمام مسلمان ایک امت ہیں۔ کسی کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اپنے بھائی سے کچھ لے۔ سوائے اس کے جسے اس کا بھائی رضامندی اور خوشی سے دے۔ اور اپنے نفس پر اور دوسرے پر زیادتی نہ کرو۔"

☆ ☆ ☆

بھوک سے روتی بلکتی اور خون میں لتھڑی ہوئی چنی کو سب سے پہلے جس نے دیکھا تھا اس نے اسے بھی زخمی سمجھا تھا لیکن جب اس کی مدد کرنے اور اسے طبی امداد دینے کے لیے اٹھایا گیا تو یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ صحیح سلامت تھی۔ گاؤں والوں کے لیے یہ ایک معجزہ تھا کہ اتنی لاشوں میں ایک بچی زندہ رہ گئی تھی۔ غلام فرید کی بے رحمی اور پاگل پن کے باوجود۔ گاؤں والوں کے لیے معجزوں کی تشریح بس وہی تھی۔

غلام فرید کا کوئی بھائی نہیں تھا اور بہنوں میں سے صرف ایک اس بات پر تیار ہوئی تھی کہ وہ چنی کو اپنے پاس رکھے گی۔ نسیمہ کے خاندان میں سے کوئی بھی اس پر تیار نہیں ہوا تھا کہ وہ ایک قاتل باپ کی بیٹی کو اپنے گھر پالیں۔ لیکن فوری طور پر چنی کی دیکھ بھال صلہ رحمی کے جذبے کے تحت ان کے ایک پرانے ہمسائے نے کرنا

شروع کی تھی۔ چنی کو پیدائش کے بعد زندگی میں پہلی بار پیٹ بھر کر خوراک اور اچھے صاف ستھرے کپڑے اور بستر اس دن نصیب ہوا تھا جس دن اس کا خاندان قتل ہوا تھا۔ وہ چنی جس کو کبھی ماں باپ نے بھی غور سے نہیں دیکھا تھا اسے دیکھنے کے لیے پورا گاؤں امڈ آیا تھا اس کے ددھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے سوا۔ جنہیں یہ خدشہ تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو۔ وہ ذمہ داری انہیں کے گلے پڑ جائے۔ غربت اتنی بڑی لعنت ہوتی ہے کہ وہ انسان کے اندر سے خونی رشتوں کی محبت اور انسانیت کی بنیادی صفات بھی نکال دیتی ہے۔ چنی کے ددھیالی اور ننھیالی خاندانوں کے ساتھ بھی یہی مسئلہ تھا۔ وہ سب چھوٹی موٹی مزدوریاں کرتے اور بڑے بڑے خاندانوں کو پال رہے تھے۔ چھ آٹھ بچوں والے خاندان میں ایک اور بچہ اور وہ بھی کسی دوسرے کا پالنا بہت مشکل تھا۔ وسائل اور آمدنی کے محدود ہونے کی وجہ سے۔

صرف غلام فرید کی ایک بہن تھی جس کے صرف چار بچے تھے۔ اور ان میں سے بھی تین بیٹے تو دونوں خاندانوں کا دباؤ اسی پر پڑا تھا کہ چونکہ اس کی ذمہ داریاں کم ہیں اس لیے چنی کو وہی رکھے۔ صدمے اور غم سے بے حالی کی کیفیت میں وہ اپنے اکلوتے بھائی کے خاندان کی آخری نشانی کو اپنے پاس رکھنے پر تیار تو ہو گئی تھی۔ لیکن اس کے شوہر اور سسرال والوں نے اس کا وہ صدمہ اس حادثے کے دوسرے ہی دن اپنے تیوروں اور ناراضی سے ختم کروا دیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھی باقی رشتہ داروں کی طرح چنی کی ذمہ داری سے ہاتھ اٹھاتی۔ اس علاقے میں انتظامی عہدے داران اور سیاست دانوں اور سماجی شخصیات کی آمد شروع ہو گئی تھی اور جو بھی آرہا تھا وہ چنی کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے ساتھ کچھ نہ کچھ مالی امداد بھی کرکے جا رہا تھا۔

مالی امداد کے لیے دیے جانے والے چیکوں اور کیش رقومات کے سلسلے نے ایک دم چنی کے رشتہ داروں کے اندر صلہ رحمی اور خونی رشتوں کی چاہ جگا دی تھی۔ چنی بوجھ نہیں تھی بلکہ بوجھ بٹانے والی تھی اس کا اندازہ سب ہی کو ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی چنی کی کفالت کے لیے جھگڑوں کا آغاز بھی ہو گیا۔

دونوں سائیڈوں سے پورے کے پورے خاندان والے چنی کی دیکھ بھال کرنے والے اس ہمسائے کے گھر میں دھرنا دے کر بیٹھ گئے تھے۔ آپس میں گالم گلوچ اور مار کٹائی تک نوبت آنے پر ہمسائے کو پولیس کو طلب کرنا پڑا اور پولیس نے اس بچی کو اسی ہمسائے کی کفالت میں دیتے ہوئے فریقین سے کہا کہ وہ چنی کی کسٹڈی کے لیے عدالت سے رابطہ کریں اور جب تک عدالت کوئی فیصلہ نہیں کرتی وہ بچی اسی گھر میں رہے گی۔

وہ چنی کی زندگی کے اچھے دنوں کا آغاز تھا۔ ہمسائے نے اگرچہ چنی پر وقتی طور پر رحم کھا کر ہی اس کی دیکھ بھال کا ذمہ اٹھایا تھا لیکن چنی کو ملنے والی چھوٹی بڑی نقد رقومات جیسے اس کے لیے لاٹری لگنے کے مصداق ہو گئی تھیں۔ چنی کو حکومتی ذرائع سے ملنے والے چیکس کو کیش کرانے پر تو عدالت نے اس کے رشتہ داروں کی طرف سے درج کرانے والے کیس کی وجہ سے حکم امتناعی دے کر روک دیا تھا مگر کیش رقومات کا حساب کتاب رکھنا اور ان پر کوئی پابندی مکمل طور پر لگانا ناممکن تھا۔

چنی کو اپنے پاس رکھنے والے ہمسائے نے اس کے لیے ملنے والی نقد رقومات کو چنی پر خرچ کرنے کے بجائے کھل کر خرچ کرنا شروع کر دیا۔ وہ جیسے ایک بہتی گنگا تھی جس سے ہر کوئی ہاتھ دھو رہا تھا۔ اس رقم کے ثمرات چنی تک بھی خوراک، کپڑوں، کھلونوں اور طبی سہولیات کی شکل میں پہنچ رہے تھے مگر وہ بہت معمولی تھے ان ثمرات کے مقابلے میں جو اس ہمسائے کے خاندان کو ملنا شروع ہو گئے تھے۔

کیش رقوم کا وہ سلسلہ بہت جلد ہی ختم ہو گیا تھا۔ ایک ڈیڑھ مہینہ میں۔ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی ہمدردیاں ان کی یادداشت کے ساتھ ساتھ کم ہوتی گئیں اور پھر ایک وقت آیا تھا جب چنی ہمسایوں کے لیے ایک بوجھ بن گئی تھی۔ سرکاری امداد کا وہ چیک جس کو استعمال کرنے پر فی الحال پابندی تھی اور وہ صرف اس کو مل سکتا تھا

سے چنی کی کسٹڈی ملتی۔ اور چنی کی کسٹڈی رشتہ داروں ہی میں سے کسی کو ملنا تھی۔ ہمسائے کو نہیں۔ سو اس سے پہلے کہ عدالت کیس کا فیصلہ کرتی۔ ہمسائے چنی کے سب سے بڑے ماموں کو کچھ رقم کے عوض چنی تھما گئے تھے اور ساتھ انہوں نے عدالت میں یہ بیان بھی دے دیا تھا کہ چنی اسی ماموں کے گھر سب سے زیادہ اچھی پرورش پا سکتی تھی۔

تین مہینے کے بعد باقی تمام رشتہ داروں کی آہ و بکا کے باوجود چنی کا وہ ماموں چنی کی کسٹڈی اور دس لاکھ روپے کی رقم کا چیک عدالت سے حاصل ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ سونے کی چڑیا اب ماموں کے سر پر بیٹھ گئی تھی جو اس سے پہلے ایک 'ریڑھا' چلا کر پھل سبزیاں ادھر سے اُدھر ڈھوتا تھا' دس لاکھ روپے سے اس نے فوری طور پر زمین کا ایک ٹکڑا خرید کر کاشت کاری کا آغاز کر دیا تھا۔ چنی اس کے گھر میں اس کے سات بچوں کے ساتھ احسان کے طور پر پلنے لگی تھی۔ مگر یہاں اس کی اس طرح کی ناز برداری نہیں کی گئی تھی جو وقتی طور پر ہی سہی لیکن اس ہمسائے نے کی تھی۔

ماموں کے بچوں نے پہلی بار زندگی میں اپنے باپ کے پاس اتنا پیسہ دیکھا تھا جس سے وہ انہیں وہ سب کچھ لے کر دے سکتا تھا جو پہلے ان کے لیے خواب اور حسرت تھے۔ اللہ تعالیٰ نے جیسے معجزاتی طور پر ان کی زندگی بدلی تھی' اور اس معجزے کا سہرا کوئی بھی چنی کے سر نہیں باندھ سکتا تھا۔ چنی اب ڈیڑھ سال کی ہو گئی تھی اور ایک بار پھر نہلانے دھلانے اور صاف کپڑوں کے ساتھ ساتھ وقت پر کھانے اور زندگی کی بنیادی ضروریات کے لیے ترسنا شروع ہو گئی تھی۔ مگر چنی کی صحیح خوش قسمتی کا آغاز اس دن ہوا تھا جب چنی کے خاندان کے ساتھ ہونے والے حادثے کے تقریباً" چھ مہینے کے بعد اس اسکول کا مالک چنی کو دیکھنے آیا تھا جہاں غلام فرید کام کرتا رہا تھا اور جہاں سے ایک سزا کے طور پر نکالے جانے نے چنی سے اس کا خاندان چھین لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم سب آدم اور حوا کی اولاد ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ کسی عرب کو عجمی پر اور کسی عجمی کو عربی پر' کسی گورے کو کالے پر اور کسی کالے کو گورے پر کوئی برتری حاصل نہیں۔ برتری اگر ہے تو صرف تقویٰ کو۔
اور اپنے غلاموں کا خیال رکھو اور جو تم کھاؤ اس میں سے ان کو کھلاؤ اور جو تم پہنو اسی میں سے ان کو پہناؤ اور اگر وہ ایسی خطا کریں جو تم معاف نہ کرنا چاہو تو انہیں فروخت کر دو لیکن کوئی سزا نہ دو۔

☼ ☼ ☼

بیرونی گیٹ ہمیشہ کی طرح گھر میں کام کرنے والی میڈ نے کھولا تھا۔ ڈرائیووے پر گاڑی کھڑی کرتے ہوئے سالار نے ابھی ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ ہی کھولا تھا جب ہر روز کی طرح لان میں کھیلتے اس کے دونوں بچے بھاگتے ہوئے اس کے پاس آ گئے تھے۔ چار سالہ جبریل پہلے پہنچا تھا۔ ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے بیٹھے اس نے اپنے بیٹے کا چہرہ چوما تھا۔ وہ پسینے سے شرابور تھا۔

"السلام علیکم!" گاڑی میں پڑے ٹشو باکس سے ٹشو نکال کر اس نے جبریل کا ماتھا اور چہرہ صاف کیا۔ جو اس نے بڑی فرماں برداری سے کروایا تھا۔ دو سالہ عنایہ تب تک ہانپتی کانپتی' شور مچاتی کرتی پڑتی اس کے پاس آ گئی تھی۔ دور سے چھپنے اس کے بازوؤں کو دیکھ کر وہ کچھ اور کھلکھلائی تھی۔

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گود میں لیا تھا بہت زور سے اسے بھینچنے کے بعد اس نے باری باری بیٹی کے دونوں گال چومے تھے۔ جبریل تب تک ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ بند کر چکا تھا۔

اس نے عنایہ کو نیچے اتار دیا۔ وہ دونوں باپ سے ملنے کے بعد دوبارہ لان میں بھاگ گئے تھے جہاں وہ میڈ کی دو

بیٹیوں کے ساتھ کھیلنے میں مصروف تھے۔ وہ چند لمحے ڈرائیو وے پر کھڑا اپنے بچوں کو دیکھتا رہا۔ پھر گاڑی کے پچھلے حصے سے اپنا بریف کیس اور جیکٹ نکالتے ہوئے وہ گھر کے اندرونی دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

امامہ تب تک اس کے استقبال کے لیے دروازے تک آچکی تھی۔ دونوں کی نظریں ملی تھیں۔ وہ حیرانی سے اس کے پاس آتے ہوئے مسکرائی۔

"تم جلدی آگئے آج؟"

اس نے ہمیشہ کی طرح اسے گلے لگاتے ہوئے اس کے بالوں کو ہولے سے سہلاتے ہوئے کہا۔ "ہاں آج زیادہ کام نہیں تھا۔"

"تو ڈھونڈ لیتے۔" وہ جواباً اس کے ہاتھ سے جیکٹ لیتے ہوئے ہنسی وہ جواب دینے کے بجائے مسکرا دیا۔

اپنے بیڈ روم میں بیٹھے اس نے جب تک اپنا بریف کیس رکھا اور جوتے اتارے وہ اس کے لیے پانی لے آئی تھی۔

"تمہاری طبیعت ٹھیک ہے؟" وہ اس کے ہاتھ میں پکڑی ٹرے سے گلاس اٹھا رہا تھا جب امامہ نے اچانک پوچھا تھا۔ اس نے چونک اس کی شکل دیکھی۔

"ہاں بالکل۔ کیوں؟"

"نہیں مجھے تھکے ہوئے لگے ہو اس لیے پوچھ رہی ہوں۔" سالار نے جواب دینے کے بجائے گلاس منہ سے لگا لیا۔ وہ ٹرے لے کر چلی گئی۔

کپڑے تبدیل کرکے وہ سٹنگ ایریا میں آگیا تھا۔ لان میں اس کے دونوں بچے ابھی بھی اس فٹبال کے پیچھے بھاگتے پھر رہے تھے۔ وہ سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے سامنے جاکر کھڑا ہو گیا۔ کانگو کا موسم اسے کبھی پسند نہیں رہا تھا اور اس کی وجہ وہ بارش تھی جو کسی وقت بھی شروع ہو سکتی تھی اور جو شاید ابھی کچھ دیر میں پھر شروع ہونے والی تھی۔ کنشاسا میں پچھلے کئی دن سے ہر روز اسی وقت بارش ہوتی تھی۔ سہ پہر کے آخری چند گھنٹے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی بارش اور اس کے بعد مطلع صاف۔

"چائے۔" وہ امامہ کی آواز پر باہر لان میں دیکھتے بے اختیار پلٹا۔ وہ ایک ٹرے میں چائے کے دو مگ اور ایک پلیٹ میں چند بسکٹ لیے کھڑی تھی۔

"تھینکس۔" وہ مگ اور ایک بسکٹ اٹھاتے ہوئے مسکرایا۔

"باہر چلتے ہیں بچوں کے پاس۔" وہ باہر جاتے ہوئے بولی۔

"میں تھوڑی دیر میں آتا ہوں، کسی کال کا انتظار کر رہا ہوں۔"

وہ سر ہلاتے ہوئے باہر چلی گئی، چند منٹوں کے بعد اس نے امامہ کو لان میں نمودار ہوتے دیکھا تھا۔ لان کے ایک کونے میں پڑی کرسی پر بیٹھتے وہ کھڑکی میں اسے دیکھ کر مسکرائی تھی۔ وہ بھی جواباً مسکرا دیا تھا۔

چائے کا مگ اور بسکٹوں کی پلیٹ اب لان میں اس کے سامنے پڑی ٹیبل پر رکھی تھی۔ اس نے باری باری جبریل اور عنایہ کو اس کے پاس آکر بسکٹ لیتے دیکھا۔ جبریل نے بسکٹ لے جاکر ٹونو اور لویا کو دیے تھے چاروں بچے ایک بار پھر سے فٹ بال کھیلنے لگے تھے امامہ اب مکمل طور پر بچوں کی طرف متوجہ تھی۔ چائے کے گھونٹ لیتے ہوئے وہ اپنے کندھے پر پڑی شال سے اپنے جسم کا وہ حصہ چھپائے جہاں ایک نئی زندگی پرورش پا رہی تھی (ان کے ہاں تیسرے بچے کی آمد متوقع تھی) وہ فٹ بال کے پیچھے بھاگتے بچوں کو دیکھتے ہوئے وقتاً فوقتاً ہنس رہی تھی اور پھر انہیں ہدایات دینے لگتی۔

سٹنگ ایریا کی کھڑکی کے سامنے کھڑے باہر دیکھتے ہوئے وہ جیسے ایک فلم دیکھ رہا تھا ایک مکمل فلم۔ اس کے

ہاتھ میں پکڑی چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی' ایک گہرا سانس لے کر اس نے مگ پاس پڑی ٹیبل پر رکھ دیا۔
امامہ کا اندازہ "ٹھیک" تھا۔ وہ "ٹھیک" نہیں تھا۔ وہ کھڑکی کے شیشے سے باہر لان میں نظر آنے والی ایک خوش حال فیملی کو دیکھ رہا تھا۔ آئیڈیل پرفیکٹ لائف کا ایک منظر اس کے بچوں کے بچپن کے قیمتی لمحے۔ اپنے اندر ایک اور ننھا وجود لیے اس کی بیوی کا مطمئن و مسرور چہرہ۔
چند پیپرز کو پھاڑ کر پھینک دینے سے یہ زندگی ایسے ہی خوب صورت رہ سکتی تھی۔
وہ ایک لمحہ کے لیے بری طرح کمزور پڑا۔ اولاد اور بیوی واقعی انسان کی آزمائش ہوتے ہیں ان کے لیے جنہیں "مل" زمانے سے قاصر رہتا ہے انہیں دیکھتے ہوئے وہ بھی اسی آزمائش کا شکار ہو رہا تھا ایک مرد' ایک شوہر ایک باپ کے طور پر لان میں موجود اس کی فیملی اس کی ذمہ داری تھی۔ وہ ان سے "خون" اور "محبت" کے رشتوں سے بندھا ہوا تھا۔
ایک لمحہ کے لیے اس کی نظر بھٹک کر جبریل اور عنایہ کے ساتھ کھیلنے والی چار اور چھ سال کی ان دو سیاہ فام کی غر بچیوں پر گئی تھی۔ اس کے خوب صورت گورے بچوں کے ساتھ کھیلتے ہوئے وہ اور بھی زیادہ بد صورت لگ رہی تھیں۔ ہیڈی کی وہ دونوں بیٹیاں اگر اس وقت مناسب لباس اور جوتوں میں ملبوس تھیں تو اس کی وجہ ہیڈی کا ان کے گھر کام کرنا تھا۔ ورنہ وہ گومیے کے بد حالی کے شکار ہزاروں بچوں کی طرح اپنا بچپن کسی آسائش کے بغیر محنت مشقت کرکے گزار رہی ہوتیں۔ اور ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد ان کا مستقبل پھر کسی بے یقینی کا شکار ہو جاتا' بالکل اسی طرح جس طرح اس مغربی نو آبادی کے وہاں آ جانے سے پورا افریقہ بے یقینی اور عدم استحکام کا شکار ہو رہا تھا۔ وہ اسی مغربی نو آبادیات کے ایک نمائندے کے طور پر وہاں موجود تھا۔
اس نے اپنی تیس سالہ ملازمہ کو ڈرائیو وے پر کھڑے اپنی بچیوں کے کسی شاٹ پر تالیاں بجاتے دیکھا بالکل ویسے ہی جیسے لان کے ایک کونے میں کرسی پر بیٹھی اس کی بیوی اپنے دونوں بچوں کو کھیلتے دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔ ہیڈی نے خود بھی "بچپن" نہیں دیکھا تھا' وہ پیدا ہونے کے فوراً بعد "بالغ" ہو گئی تھی۔ افریقہ کے نوے فی صد بچوں کی طرح جنہیں "بچپن" یا "بقائے زندگی" میں سے کوئی ایک چیز ہی مل سکتی تھی۔
بچپن بہرحال ان آپشن میں سے تھا جو پریمیم کی نسٹ میں آتے تھے اور ایسا ہی ایک option اپنے بچوں کو دینے کے لیے ہیڈی سنگل پیرنٹ کے طور پر جان توڑ محنت کر رہی تھی۔ وہ ان کے ساتھ "انسانیت" کے رشتے میں منسلک تھا۔
ایک لمبے عرصہ کے بعد وہ پہلی بار وہاں کھڑا اپنی اولاد کا اس عورت کی اولاد سے موازنہ کر رہا تھا۔ اپنی بیوی کی زندگی اور اس عورت کی زندگی کا مقابلہ کر رہا تھا حالانکہ وہ آج وہاں اس کام کے لیے نہیں کھڑا تھا۔
اس کا فون بجنے لگا تھا۔ ایک گہرا سانس لے کر اس نے فون کرنے والے کی آئی ڈی دیکھی۔ کال ریسیو کرتے ہوئے اسے اندازہ تھا' اس وقت دوسری طرف وہ کس سے بات کرنے والا تھا۔ اسے اپنی فیملی کی زندگی اور استعفے میں سے ایک چیز کا انتخاب کرنا تھا۔

☼ ☼ ☼

"خوب سن لو۔ اپنے پروردگار کی عبادت کرو۔ پانچ وقت کی نماز قائم کرو۔ رمضان کے روزے رکھو۔ اپنے مال کی زکوٰۃ خوشی سے ادا کرو۔ اپنے حاکم کی اطاعت کرو۔ چاہے وہ ایک ناک کٹا حبشی ہی کیوں نہ ہو۔۔۔ اور اس طرح اپنے رب کی جنت میں داخل ہو جاؤ۔"

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

ایک عکس

شازیہ جمال طارق

جس کے قدموں کی مخصوص دھمک نے گھر کے کونے کونے میں اس کی آمد کی اطلاع پہنچادی تھی۔

شاہ مشرق کی روپہلی کرنوں نے اس کے کمرے کی بند کھڑکی پر نرم سی دستک دی تھی۔ کچے صحن میں پانی کے چھڑکاؤ کے بعد اٹھتی مٹی کی مخصوص مہک‘ املتاس کے پتوں میں چھپی ڈھیر ساری بھوری چڑیوں کی چہکار‘ موتیا کی خوشبو سے لبریز باد نسیم کے سبک جھونکے اور مختصر سے باغ میں کھیلتے رنگ برنگے پھولوں پر محو رقص تتلیاں! یہ ہر لحاظ سے ماہ رخ کی نئی شادی شدہ زندگی کی ایک بہترین اور مکمل صبح ہوتی اگر جو اس کی سماعتوں میں اپنی چھوٹی نند نگہت کی آواز نہ پڑتی۔



یہ نہیں تھا کہ وہ ایک کینہ پرور بھابھی تھی یا شادی شدہ نندوں کا آئے روز میکے آ دھمکنا اسے کھٹکتا تھا۔ بلکہ بات دراصل یہ تھی۔ بات صرف یہ تھی کہ۔

✡ ✡ ✡

یہ اس کی شادی کا دوسرا دن تھا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد اس نے تیار ہونے کے لیے اپنا پہلے سے منتخب کردہ گولڈن رنگ نفیس سوٹ الماری سے باہر نکالا تو بیڈ پر چائے کی چسکیاں لیتی نگہت کو گویا کرنٹ سا چھو گیا۔

جبکہ صوفے میں دھنسی جہیز کی ایک ایک چیز کا ایکسرے کرنے میں مصروف بڑی دونوں نندیں بھی چونک کر نگہت کو دیکھنے لگی تھیں۔ جو تاسف اور ناپسندیدگی سے سرہلاتی کپ سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر بیڈ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔

"آئے ہائے بھابھی جی! آج کے دن یہ سوٹ زیب تن کرو گی کیا؟ جس کا نہ کوئی رنگ ہے نہ ڈھنگ۔"

کہنے کے ساتھ ہی ماہ رخ کے ہاتھ سے جھپٹنے کے سے انداز میں سوٹ لے کر دوبارہ الماری میں لٹکایا اور چند لمحوں کی سوچ بچار کے بعد تیز نارنجی رنگ کا بھاری کامدار سوٹ باہر نکال لیا۔

"آج کے دن پہننے کے لیے کیا اس سے بہتر کوئی اور سوٹ ہو سکتا ہے بھلا؟" سوٹ کو تھوڑا سا اوپر اٹھا کر ادھر سے ادھر لہراتی وہ اپنی پسند کو گویا خود ہی داد دے رہی تھی۔ بڑی دونوں نندوں کی آنکھوں میں بھی توصیف کے رنگ جھلکنے لگے تھے۔

ماہ رخ نے گویا کراہ کر اپنی بری کے اس "لباس فاخرہ" کو دیکھا تھا۔ اس کی سادہ طبیعت پر ایسے چیختے چنگھاڑتے رنگ گراں گزرتے تھے۔ مدد طلب نظروں سے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے بال بناتے مجازی خدا کو دیکھا جو بے نیازی سے کندھے اچکاتے برش ڈریسنگ ٹیبل پر پھینک کر باہر نکل گئے۔ سو بے چارگی سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

"چلیں بھابھی جی! جلدی سے کپڑے بدل آئیں، لگے ہاتھوں میں آپ کا میک اپ بھی کردوں۔" اس کی کیفیت سے بے خبر نگہت اپنی ہی کہے گئی۔

اور اس دن خود کو اپنی نندوں کے رحم و کرم پر چھوڑ دینے کے بعد اس نے جانا کہ اپنی پسند ناپسند اور دل میں اٹھتی خواہش پر دوسروں کی مرضی کو فوقیت دینا کتنا صبر آزما امر ہے!

✡ ✡ ✡

"اف میرے خدایا!" کچن سے برآمد ہوتی نگہت کی آواز پر کپڑے نچوڑتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے تھم گئے تھے۔ گردن موڑ کر کچن کے ادھ کھلے دروازے کی طرف دیکھا جہاں سے نگہت کی آہ سے مشابہ پکار بلند ہوئی تھی۔ قریب ہی چارپائی پر سبزی کاٹتی ساس اپنا کام ترک کرکے اس کی جانب دیکھنے لگی تھیں۔ ان کی نظروں کا مفہوم سمجھ کر ماہ رخ کپڑے چھوڑ کر کچن کی طرف بڑھ گئی۔

"کیا ہوا نگہت؟" چولہے پر چڑھے چائے کے پانی کی طرح کھولتی نگہت نے خاصی کینہ توز نظروں سے اسے گھورا تھا۔ ماہ رخ بدستور استفہامیہ نگاہوں سے اسے دیکھے گئی۔ بظاہر تو اسے آس پاس ایسا کوئی غیر معمولی پن دکھائی نہیں دے رہا تھا جو نگہت کی گرفت میں آکر اس کے لیے قابل گرفت ٹھہرتا۔

"یہ کچن کی سیٹنگ آپ نے تبدیل کی ہے؟" سوال سے زیادہ جارحیت انداز میں تھی۔ ماہ رخ نے اثبات میں سرہلاتے ہوئے گویا اقبال جرم کیا تھا۔ ویسے بھی وہ نگہت کے سامنے زبان ہلانے کی جرات کم ہی کرتی تھی۔

"چ چ چ، بھابھی جی! میں آپ کو اتنا پھوہڑ نہیں سمجھتی تھی۔ سیٹنگ کے نام پر چھونے سے کچن کا آپ نے حشر کردیا۔ کوئی ایک چیز بھی تو اپنے اصل ٹھکانے پر نہیں۔ چائے کے دو کپ بنانے میں میرا تو دماغ چکرا کر رہ گیا۔ چینی اٹھانے کے لیے ہاتھ بڑھایا تو مرچ مسالحوں کے ڈبے ہاتھ آگئے، پتی کو ڈھونڈنا چاہا تو اس کی جگہ دال چاول کے ڈبے منہ

چڑاتے ملے۔"

نگہت جب اپنی زبان کے جوہر دکھانے پر آتی تو یونہی مکمل کر دکھاتی تھی۔ ماہ رخ "ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں" کے سے تاثرات چہرے پر سجائے خاموشی سے سنتی رہی۔ نگہت کی زبان اور ہاتھ ایک سی رفتار سے چل رہے تھے۔ ماہ رخ کی پھوپھو زاد بہن کے اس "نئے مظاہرے" پر کف افسوس ملنے کے ساتھ ساتھ مسالہ جات کے ڈبے وغیرہ سابقہ جگہوں پر رکھتی جا رہی تھی۔

ماہ رخ کا زیادہ تر وقت کچن کے کام نپٹاتے گزرتا تھا اور اس نے اپنی آسانی کی خاطر سیٹنگ میں ردوبدل کیا تھا۔ وہ ہر بار نگہت کو ڈبے ادھر سے ادھر پٹختے دیکھتی رہی۔ اختلاف کے باوجود کچھ کہہ کر وہ ایک نئے محاذ کا منہ نہیں کھولنا چاہتی تھی۔ سو نڈھال قدموں کے ساتھ خاموشی سے واپس پلٹ آئی۔

❋ ❋ ❋

وقت کا کام گزرنا ہے اچھا یا برا بہر حال گزر ہی جاتا ہے۔ اس کے تھال میں ایک تواتر سے گرتے ماہ و سال کے سکوں کی کھنک "ماضی" کی صورت میں ہمیشہ ساتھ رہتی ہے۔ شادی کے دو سال بعد ماں کے عہدے پر فائز ہونے کے باوجود گو کہ اس کی سسرال میں حیثیت مستحکم ہو چکی تھی لیکن نگہت کی ہنگامہ خیز آمد آج بھی روز اول کی طرح اسے بوکھلاہٹ میں مبتلا کر دیتی اس کی نکتہ چینی اور حاکمانہ طبیعت سے اچھی طرح واقف ہونے کے باوجود کبھی کبھار اس کا ضبط جواب دینے لگتا۔

لیکن ماں کا پڑھایا وہی سبق دل میں اٹھتی بے چین لہروں کو آہستہ آہستہ پرسکون کر دیتا "درگزر، برداشت، صبر اور بس صبر! دوسروں کی عادات سے سمجھوتہ اگرچہ آسان نہیں ہوتا، لیکن بہرحال اس کی وجہ سے اور بہت سی مشکلات کا منہ بند ہو جاتا ہے۔"

اپنے اکلوتے اور لاڈلے بھائی کی شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی نوید سن کر وہ کھل اٹھی تھی۔ خوشی کے اس موقع پر بھرپور تیاری کے ساتھ میکے جا کر رہنے کا تصور ہی اس کے لیے نہایت خوش کن تھا۔ بہت مگن انداز میں اپنی اور بیٹے کی پیکنگ کرتے ہوئے اس نے دل سے آج نگہت کے میکے نہ آنے کی دعا کی تھی۔

لیکن ڈیوڑھی میں داخل ہونے کے بعد حسب عادت بیٹی کی انگلی تھام کر کھینچنے کے سے انداز میں اندر آتی نگہت کو دیکھ کر وہ گہری سانس کھینچ کر رہ گئی۔ اور پھر وہی ہوا جس کا اسے ڈر تھا۔

"اس سوٹ کے ساتھ یہ میچنگ جوتا کیوں؟"

"وہ والا سوٹ کیوں نہیں پہن رہیں؟"

"فلاں سوٹ کے ساتھ یہ بھاری بھرکم جیولری پہننے کی کیا تک ہے بھلا؟"

"یہ کیوں؟"

"وہ کس لیے؟"

ماہ رخ رونے والی ہو گئی، لیکن مسئلہ یہ تھا کہ نگہت کو اپنی کہنے اور اپنی "کہی" ہی منوانے کی عادت تھی اور عادتیں کب بدلتی ہیں بھلا؟

آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں سرخ چہرہ لیے بیگ کی زپ بند کرتی ماہ رخ نے بے اختیار سوچا۔

"خود کو "بہت کچھ" سمجھنے کے زعم میں مبتلا لوگ اے کاش! کسی کو "سب کچھ" نہ سہی "کچھ" تو سمجھ لیں۔"

سکون اور طمانیت کے بے پایاں احساس نے اس کے رگ و پے میں لطیف سی سرشاری بھر دی تھی۔ وقتی طور پر سسرالی جھمیلوں، پریشانیوں، مصلحتوں کو سسرال میں ہی چھوڑ کر میکے میں گزرنے والے ان دنوں نے اسے خوشی کے عجیب سے احساس سے دوچار کیا تھا۔

صحن میں پڑے امی کے تخت پر تکیے سے ٹیک لگائے دور آسمان کے فراخ سینے پر اڑتے پنچھیوں کو دیکھتی وہ بہت مگن انداز میں پاؤں ہلا رہی تھی۔ (گو کہ شادی سے پہلے اسی پاؤں ہلانے والی عادت کی وجہ سے وہ کئی بار امی سے جھاڑ کھا چکی تھی کہ بقول ان

کے یہ عادت نحوست کے زمرے میں آتی ہے)

"ارے بھئی وردہ! ایک کپ اچھی سی چائے تو پلوا دو۔" ڈھیر سارے دھلے ہوئے کپڑوں کا ڈھیر اٹھائے اپنے کمرے کی طرف جاتی نئی نویلی کم عمر بھابھی کو دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا تھا۔

"جی آپا! ابھی بنا کر لاتی ہوں۔ یہ کپڑے اندر رکھ آؤں؟" اس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے آنکھیں موند کر سر تکیے پر گرا لیا تھا۔

"آپا چائے!" کچھ ہی دیر میں وردہ ساس کو ان کی چائے کمرے میں پہنچا کر اس کے لیے بھاپ اڑاتا مگ تھامے چلی آئی۔ ماہ رخ اٹھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔

"قسم سے بہت طلب ہو رہی تھی اس وقت چائے کی۔" اس نے مسکراتے ہوئے مگ تھام لیا اور پہلا ہی گھونٹ بھرتے ہی... "آخ!!!"

"ارے بھئی، یہ تو نمکین چائے ہے۔" وردہ کے پلٹتے قدم تھم گئے تھے۔

"لگتا ہے جلدی میں تم نے چینی کی جگہ نمک ڈال دیا۔" وردہ کے چہرے کا رنگ یکبارگی بدل گیا تھا۔ قدرے سہمے ہوئے انداز میں گردن موڑ کر ساس کے کمرے کے بند دروازے کی جانب دیکھا۔ گزشتہ کچھ دنوں سے "سرزد" ہونے والی چھوٹی چھوٹی غلطیوں کی "پاداش" میں ملنے والے طعنے ایک بار پھر سماعتوں میں گونجتے محسوس ہوئے۔

"وہ آپا! دراصل..." غائب دماغی، نااہلی، پھوہڑپن پر ایک طویل لیکچر! وردہ نے لب کچلتے ہوئے سر جھکا لیا تھا۔ متوقع طوفان خیز لمحے خاموشی کی نذر ہونے لگے تھے۔

"یار! مانا کہ تمہاری چائے خاصی اسٹرونگ ہے، لیکن اس وقت نمکین چائے پینے کا میرا بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا۔" وردہ نے جھکا سر اوپر اٹھایا۔

کیا وہ اس پر طنز کر رہی تھیں؟

سادہ الفاظ، شریر انداز، ہلکا پھلکا شگفتہ سا لہجہ! وردہ کو اس کے علاوہ اور کچھ محسوس نہیں ہوا تھا، لیکن اسی لمحے وہ ساس کو بگڑے تیوروں کے ساتھ چائے کا مگ تھامے اپنی جانب آتا دیکھ چکی تھی۔ اس سے پہلے کہ وہ چائے کا مگ اس کے سامنے پٹخ دیتیں، ماہ رخ بول پڑی۔

"جانتی ہیں اماں! آپ کی سوتے تو آج اس واقعہ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ ایسے ہی ایک ٹھنڈے میٹھے موسم میں نگہت نے مجھ سے کھیر پکا کر کھلانے کی فرمائش کی، میں جی جان سے کام میں لگ گئی، ساتھ ساتھ اماں جی کا پرہیزی سالن پکانا تھا اور دوسرے کام بھی کرنے تھے۔ ذہن مسلسل لوڈشیڈنگ کے نئے شیڈول میں الجھا ہوا تھا۔ عجلت میں کھیر میں چینی کی جگہ نمک ڈال دیا۔ باخدا اماں! کھیر کی گارنشنگ دیکھ کر منہ میں پانی بھر بھر آ رہا تھا، لیکن میرے چودہ طبق تو اس وقت روشن ہوئے جب نگہت پہلا چمچ منہ میں ڈالتے ہی اسے اگلنے کے لیے واش بیسن کی جانب بھاگی۔ مت پوچھیں اماں کیسی درگت بنی آپ کی اس قابل، لائق فائق، سگھڑ بیٹی کی۔ غلطی میری تھی، تسلیم مگر! میں پھوہڑ تو ہرگز نہیں نا اماں؟"

آواز رندھ گئی تھی۔ آنسو روکنے کی کوشش میں زور زور سے پلکیں جھپکتی اماں کی آنکھوں میں دیکھتی وہ انہیں جو کچھ بتانا جتانا چاہتی تھی، اماں سمجھ گئیں۔ چہرے پر چھائی سرمئی کے بادل چھٹنے لگے تھے۔ ایک انجانی سی نرمی نے چہرے کا احاطہ کر لیا۔

"میں تو سمجھ رہی تھی سسرال میں ایسی بونگیاں صرف میں نے ہی ماری تھیں، لیکن یہ تو آج پتا چلا آپ کی سو بھی میرے ہی قبیلے کی نکلی۔"

"میں اور بنا کر لاتی ہوں..."

"ارے نہیں رہنے دو۔ پہلے ہی میرے گھٹنے کے درد کی وجہ سے سارے گھر کا کام تم پر آن پڑا ہے۔ سارا دن اکیلی لگی رہتی ہو۔ اب دیکھو ہانڈی چڑھانے کا وقت بھی ہو چلا ہے۔" الفاظ خواہ جتنے بھی عام ہوں انہیں خاص لہجہ ہی بناتا ہے۔ یہ لہجہ اور انداز اس کے لیے نیا سہی، لیکن اسے حیرت نہیں ہوئی تھی۔ اس نے ممنونیت سے ماہ رخ کو دیکھا جو آسودگی سے سوچے جا رہی تھی۔

"کاش ہم میں سے کوئی ایک!"



کنیز نور علی

محبت حقیقت

میں یہ ماننے پر مجبور ہو گئی کہ وہ جو لوگ کہتے ہیں یہ سب کہانیوں میں ہوتا ہے حقیقت میں نہیں۔ وہ لوگ صحیح کہتے ہیں۔

ہائے کیا رنگا رنگ ست رنگ، دھنک رنگ خواب تھے میرے اور اب سب ملیا میٹ ہو گئے۔ نہ جانے کون سی لڑکیاں ہوتی ہیں وہ اور کہاں پائی جاتی ہیں جن کی زندگی میں اچانک کوئی آجاتا ہے پھر ان کی سفید واشنگ پاؤڈر سے دھلی زندگی کے کینوس پر رنگ ہی رنگ بکھر جاتے ہیں اور "وہ" جو آجاتا ہے اس کی شان ہی نرالی ہوتی ہے۔ آنکھیں غضب کی ہوتی ہے۔ آنکھیں جذبے لٹاتی ہوتی ہیں اور بات کرتا ہے تو دھڑکن رک سی جاتی ہے۔ ہائے میرے اللہ ایسا ہیرو کہاں پایا جاتا ہے، کس کو ملتا ہے، کسی کو ملا بھی ہے آج تک کیا اور ایسے ہیرو کا فیملی بیک گراؤنڈ اس کی اپنی ذات سے بھی بڑھ کر غضب کا ہوتا ہے۔

کہانیوں میں اتنا عام ملنے والا یہ ہیرو جس کو ہر دوسرے خط میں لکھا ہوتا ہے کہ شعاع سے وابستگی ایسے ہوئی، ویسے ہوئی، فلاں کے ذریعے ہوئی تو جناب مجھے بھی ہو گئی بس جیسے بھی ہوئی، لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ وابستگی کوئی ایسی ویسی کمزور سی نہ تھی۔ بہت مضبوط تھی۔

ہر ہر کہانی کو پڑھ کر اپنے اندر جذب کر لینے والی ایسی نایاب قاری شاید ہی کوئی اور ہو، ظاہر ہے میں خود کو ایک بہترین ہیروئن سمجھتی تھی، ہر لڑکی سمجھتی ہے چاہے جیسی بھی ہو، لیکن میں ایسی ویسی نہیں تھی۔ ابھی بھی حسین و جمیل لڑکی ہوں۔ بس اتنی سنجیدگی سے ہر ہیرو ہیروئن کا میں نے مشاہدہ کیا اور پڑھا، پھر لگی انتظار کرنے کہ کب میری زندگی میں ایسے خوب صورت اتفاقات کا آغاز ہو گا۔ ہیرو کی آمد کیسے ہو گی؟

آخر کون ہو گا وہ خوش نصیب؟ کوئی راہ چلتا ہینڈسم ایک ننھے منے سے ایکسیڈنٹ کے ذریعے مجھ سے آ ٹکرائے گا یا کسی شادی پر سوٹڈ بوٹڈ ہیرو کے دل میں، میں جوتوں سمیت گھس جاؤں گی اور اگلے دن وہ اپنی والدہ سمیت میرا طلب گار بن کر آجائے گا بس ایسے ہی اندازے قیافے میں دن رات لگایا کرتی تھی کہ میرے سارے خواب دھڑام سے زمین بوس ہو گئے۔

دوسری رائٹر اپنی ہر تیسری کہانی میں ضرور ہی ڈالتی ہے۔ لاڈلا ناز و نعم میں پلا ہیرو' فیکٹریوں' زمینوں اور جائیدادوں کا مالک۔ جو گاؤں کا بیک گراؤنڈ رکھتا ہو تو حویلی والا ہوتا ہے اور شہر میں جس کا بنگلہ ہوتا ہے بڑی ساری کئی کنالوں پر محیط کوٹھی ہوتی ہے کوئی معاشی مسئلہ نہیں سو محبت کرنے کے لیے آزاد اور فل ٹائم دستیاب ہوتا ہے میں نے بھی بالکل یہی سوچ رکھا تھا۔

لیکن یہ کیا میرا پہلا ہی معصوم سا خواب کرچی کرچی ہو گیا تھا۔ میں شادی کے فنکشنوں یا کہیں راہ چلتے ہیرو کے ٹکرا جانے کا منظر سوچے بیٹھی تھی کہ میرا رشتہ طے کر دیا گیا۔ بھلا کہاں۔ بوجھیے ذرا' جہاں اکثر ہیروئنز کا ہو جاتا ہے۔ کزن سے' چچا کے گھر۔ جی ہاں چچا کے گھر جہاں دیوار سے دیوار ملی ہوتی ہے کہانی میں سب سے فضول اور ناپسندیدہ کپل مجھے ہمیشہ یہ کزنز والا کپل لگا کرتا تھا اور آج میں خود اس کا شکار ہو گئی تھی۔

چچا واجد کا بیٹا زین۔

میرے خواب چکنا چور ہوئے تھے اور ایسے چکنا چور ہوئے تھے کہ اب دوبارہ جڑ بھی نہ سکتے تھے کہاں وہ ہیرو جس کی اپنی بڑی ساری گاڑی ہوتی ہے اور کہاں یہ زین جو ہر دوسرے دن میرے بھائی کی موٹر سائیکل مانگنے آجاتا تھا۔ یہ سوچ کر ہی آنسو آگئے تھے میرے۔ ایسا ہیرو میں نے آج تک نہیں دیکھا تھا جو ہیروئن کے بھائی کی منتیں کر کے موٹر سائیکل لے کر جاتا ہو یہ میرے ساتھ ہی ہونا تھا۔ سب جھوٹ ہوتا ہے' افسانے' ناول من گھڑت ہوتے ہیں' فریب ہے' بھئی سب فریب ہے۔ مایا ہے سب مایا ہے۔

رشتہ طے کرنے کی بھی خوب رہی۔ اگر ہیرو ذرا ہائی فائی ہو تو کہانی کے مطابق گھر کے لان میں منگنی کا فنکشن ارینج کیا جاتا ہے اور اگر ذرا نارمل سا ہیرو ہو تو گھر میں بھی اچانک چھوٹی سی تقریب ہو جاتی ہے جو اتنی بھی چھوٹی نہیں ہوتی جیسی میری ہوئی۔ ہائے چچا

چاچی آئے اور پرانے ڈیزائن کی سونے کی انگوٹھی مجھے پہنا کر پیار کر کے چائے پی کر باتیں کر کے چلے گئے۔ بس میں صدموں کی زد میں تھی۔

سوچ سوچ کر دماغ تھک گیا تھا' لیکن اس دل میں وہ سب منظروں نقش تھے کہ نکالے نہیں نکل رہے تھے ایسا کیسے ہو سکتا ہے کہ کچھ بھی اس طرح سے نہ ہو۔ ہو سکتا ہے اگلے آنے والے دنوں میں میرے ساتھ ایسا خوش گوار حادثہ ہو جائے جو میں آج تک پڑھتی آئی تھی۔

منگنی کے بعد فوراً" شادی کی تیاری تھی اور میں اس حوالے سے پھر خوش فہمی میں مبتلا ہو گئی تھی۔ وہ کہانی میں ہوتا ہے نا جیسے ہی شادی کی تیاریوں کا مرحلہ آتا ہے ہینڈسم ہیرو کی باوقار مما جانی بہو کو لینے آتی ہیں۔ اپنے ساتھ شاپنگ پر لے جانے کے لیے... بھلا کیسے وہ سین بنتا ہے کہ مما جانی آتی ہیں جنہوں نے خوب صورت سوٹ کے اوپر کندھوں کے گرد قیمتی کشمیری کڑھائی والی شال کیپ رکھی ہوتی ہے (سردیوں کی ڈریسنگ) اور بہت نازک نفیس جیولری پہن رکھی ہوتی ہے۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھی وہ چائے پیتے ہوئے ہیروئن کی مما سے گپ شپ لڑا رہی ہوتی ہیں کہ ہیروئن صاحبہ آجاتی ہیں' مما جانی انہیں لپٹا کر ملتی ہیں اور ان کی ماما سے بہت شائستہ انداز میں کہتی ہیں۔

"میں تو بس آج اپنی بیٹی کو لینے آئی ہوں۔ شاپنگ کرنا ہے اس کی جیولری کا آرڈر بھی دینا ہے سو ہمیں اجازت دیں۔"

اور ماما کی محبت بھری "ارے ارے" "میں ہاں" چھپی ہوتی ہے اور پھر وہ دنیا کی سب سے بہترین ساس' بہو ایک ساتھ چلی جاتی ہیں۔

ہائے کیسی حسرت ہوتی تھی مجھے یہ لائنز پڑھ کر۔ کب وہ دن آئے گا جب... جب میں اور...

اور وہ دن شاید آج آگیا تھا۔ ظاہر ہے شادی کی تیاریاں دونوں طرف چل رہی تھیں اور آج اچانک چاچی تشریف فرما تھیں' میں بہت غور سے ان کا چہرہ

دیکھتے ہوئے ان کی جانب بڑھ رہی تھی (اندازہ لگا رہی تھی کہ یہ شاپنگ پر لے جانے کے لیے تیار ہیں)

مجھے آتے دیکھ کر وہ جلدی سے اٹھی تھیں۔ میں ان کے بالکل پاس جا کر رک گئی تھی کہ اب یہ مجھے ساتھ لپٹا کر پیار کریں گی (کہانی میں ہوتا ہے نا) چاچی نے ایک مولنہ سفید قمیص میری طرف بڑھائی میں حیرانی سے کبھی ان کو کبھی قمیص کو گھور رہی تھی۔

"ہادیہ' یہ جلدی سے سلائی لگا دو۔ تمہارے چچا کی قمیص کی یہ سائیڈ والی جیب ادھڑی ہوئی ہے' مجھے نظر ہی نہیں آئی پہلے ابھی استری کرنے لگی تو دیکھا میری مشین خراب ہے۔"

آج تک مجھے چاچی کبھی اس قدر روایتی چاچی نہیں لگی تھیں اور اب جب میرا ان سے رشتہ بدل گیا تھا تو وہ ساس پن پر اتر آئیں گی' میں نے سوچا بھی نہیں تھا اور سوچا تو یہ بھی نہیں تھا کہ شاپنگ پر جانے کے بجائے سلائی لگانا پڑ جائے گی۔ میرا دل چھلنی ہو گیا تھا کہاں ان کی جیب سے پیسے نکلوانا اور کہاں ادھڑی ہوئی جیب کی سلائی لگانا۔

میں چاچی کی بات سن کر صدمے کی شدت سے گنگ رہ گئی تھی جب کہ وہ میرے ہاتھوں میں قمیص تھما کر اسی کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔ میں مرے مرے قدموں سے قمیص لیے اسٹور روم کی طرف آ گئی۔ دل خون کے آنسو رو رہا تھا کہیں کسی کہانی میں آج تک ایسا ہوا تھا بھلا۔

چلیں میں بار جن رکھ کر سوچ لیتی ہوں کہ ہیروئن کو کبھی کبھار سلائی ٹانکا یا بٹن لگانے کی زحمت دے دی جاتی ہے' لیکن وہ تو ہیرو کی قمیص ہوتی ہے نا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ ڈائریکٹ چاچا پلس سسر کی قمیص۔

میرے دل میں بھالا گھسا تھا۔ چچا کے بجائے زین کی قمیص ہوتی تو میں کچھ انسانیت محسوس کرتی' سلائی لگاتے ہوئے میرا دل دھڑک دھڑک جاتا' لیکن اب تو صدمے سے میرا سر پھٹا جا رہا تھا۔ قمیص چچی کو تھما کر میں چھت پر آ گئی تھی۔

اب یہاں اکثر میں نے پڑھا تھا کہ جہاں چھتیں آپس میں ملتی ہوں وہاں ہیرو موقع تلاش کر کے ہیروئن سے ملنے آ جایا کرتا ہے' لیکن میرا ہیرو اس کار خیر سے شاید آگاہ نہیں تھا' ساتھ ان کی چھت پر تار پر دھلے ہوئے کپڑے لٹک رہے تھے میں دو تین چکر لگا کر نیچے آ گئی۔ بھاڑ میں جائے کہانی اور دفع ہو جائے ہیرو۔

☼ ☼ ☼

شادی ہو گئی تھی اور میں خوش تھی۔ زین بہت اچھا خیال رکھنے والا شوہر تھا اور چچا چچی بھی مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ عجیب بات ہے جسے محبت کرنا چاہیے وہ خیال رکھ رہا تھا اور خیال رکھنے والے محبت کیے جا رہے تھے۔ میرے کہانی کار دماغ میں خواہ مخواہ ایسے خیالات آتے رہتے تھے۔

ابھی ایک ہفتہ ہی تو ہوا تھا شادی کو' میں اور زین موٹر سائیکل پر (یہ موٹر سائیکل میرے بھائی کی نہیں تھی۔ میرے ہیرو نے اپنی خریدی تھی) بڑی پھوپھو کے گھر جا رہے تھے۔

راستے میں سگنل پر ٹریفک رکی تو میں نے ادھر ادھر سر گھما کر کسی کو تلاش کرنے کی کوشش کی تھی۔ زین کو شاید میرے زیادہ ہلنے سے الجھن ہوئی تھی۔

"کیا تانکا جھانکی کر رہی ہو۔ تمہارے ابا کی کار نہیں ہے جو بیٹھی ہوئی بھی اچھلتی رہو' دھیان سے بیٹھو یار۔"

میں اس کی بات پر ضرور ناراض ہوتی' لیکن اس کا لہجہ بہت دوستانہ تھا سو "نہیں' بس ویسے ہی وہ۔" کہہ کر میں چپ ہو گئی تھی اب بھلا کیا بتاتی کہ میں تو اس گجرے والے کو ڈھونڈ رہی تھی جو ہر نئے جوڑے کو سگنل پر ضرور ہی ملتا ہے اور ہیرو گجرے لے کر ساتھ "گاڑی" میں بیٹھی ہیروئن کو "خود" پہناتا ہے یہاں بے شک گاڑی نہیں تھی اور میرا ہیرو موٹر سائیکل پر تھا اور خود ایزی ہو کر گجرے پہنانے کی پوزیشن میں نہیں تھا' لیکن پھر بھی میں نے مینیج کر لینا تھا اگر مجھے وہ بس گجرے لے کر دیتا (گجروں کا سین ہمیشہ سے میرا فیورٹ رہا تھا) لیکن وہ منحوس مارا گجرے والا کہیں

نہیں تھا۔ شاید کسی کہانی میں اپنی حاضری لگوانے گیا ہوا تھا۔ میرا منہ اداسی سے لٹک کر رہ گیا تھا۔

پھوپھو کے گھر بھی میں گم صم سی رہی۔ گھر واپس آکر بھی میری چپ نہیں ٹوٹی تھی کپڑے تبدیل کر کے جیولری سنبھال کر میں بیٹھی تھی۔ اپنے اندر کی کیفیت خود اپنے بس سے باہر ہو رہی تھی۔ آنکھوں میں بار بار نمی آ رہی تھی۔ میں جانتی تھی میری آنکھیں بس چھلک جانے کو بے تاب تھیں کہ زین کمرے میں چلا آیا' میری آنکھوں میں نمی دیکھ لی تھی اس نے۔ وہ ذرا ٹھٹکا تھا۔

"کیا ہوا ہے ہادیہ؟" وہ بہت اپنائیت سے پوچھ رہا تھا۔

"کچھ نہیں۔" میں نے آنسو پینے کی کوشش کی تھی۔

"کچھ تو ہوا ہے بتاؤ نا میری جان!" اس نے اپنا بازو میرے کندھے کے گرد پھیلا کر مجھے ساتھ لگا لیا تھا۔

اتنی سی حدت اور لہجے کی نرمی سے ہی میں پگھل گئی تھی۔ میرے آنسو ٹپ ٹپ بہہ نکلے تھے اور اس کی قمیص میں جذب ہو رہے تھے۔ (کہانیوں میں بھی تو ایسا ہی ہوتا ہے میرے دل نے سگنل دیا تھا)

اف یہ کہانیاں' میرا دماغ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔ بظاہر سب کچھ ٹھیک ہے' لیکن میرا دل ایسے ناخوش ہے جیسے مجھ پر کوئی ظلم ہو رہا ہو' میں خود سے الجھتے ہوئے مزید رو دی تھی مجھے خود پر بھی غصہ آ رہا تھا اور اپنے خوابوں پر بھی' آنسوؤں پر بھی اور اپنی اس بے بسی پر بھی۔

زین گھبرا گیا تھا۔ "ہادیہ یہ کیا پاگل پن ہے' کچھ بتاؤ تو سہی۔" وہ بے حد نرمی سے بولا تھا۔ مجھے اس پر بھی غصہ آنے لگا تھا۔

"جی ہاں میں پاگل ہوں تو پاگل پن کروں گی نا۔" میں نے سختی سے کہا تھا۔

"ارے۔" وہ حیران ہوا تھا پھر اس کے لہجے میں شرارت ناچی تھی۔ "تم پاگل ہو نہیں۔ پاگل کر دیتی ہو۔" اس کی سرگوشی میرے کان میں گنگنائی تھی۔

اس لہجے میں ایسا خمار تھا کہ تھا میں حیران ہو کر آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

اور وہاں ان آنکھوں میں شوق کا ایک جہان آباد تھا اور وہ مجھ سے اپنی محبت کا اظہار کر رہا تھا۔ ورنہ محبت شدید محبت کب میں اسے اچھی لگنے لگی۔ کب اس نے مجھے پانے کی خواہش کی۔ کیسے اس کے دل میں مجھے کھو دینے کا خوف تھا اور میں حیرانی کی منازل طے کر رہی تھی۔

زین نے مجھے وہ سب بتایا اور میں حیران تھی کہ مجھے اس کے التفات کا احساس کیوں نہ ہوا۔ میں کچھ اور چیزوں میں الجھی ہوئی تھی اور محبت کسی اور راستے سے میری زندگی میں آئی تھی۔ میں نے بہت گہرائی میں جا کر جائزہ لینا شروع کیا تھا۔

میں نے کہانیاں تو بہت پڑھی تھیں تمام افسانے اور ناول حفظ کر رکھے تھے' لیکن ان کی تہہ میں اترنے کی توفیق ہی نہیں ہوئی تھی میں یہ جان بھی نہ پائی تھی کہ ہیرو امیر اور ہینڈسم ہونے کی وجہ سے ہیرو نہیں ہوتا۔ وہ ہیرو اس لیے ہوتا ہے کہ وہ محبت کرتا ہے۔

اور میں بھی یہ جان نہ پائی کہ کہانی کی بنت جیسی بھی ہو کہانی کی بنیاد ہمیشہ محبت ہوتی ہے۔

میں اپنی زندگی کی کہانی کی بنت پر غور کرتی رہی اور اس کی گہرائی میں چھپی محبت تک نہ پہنچ سکی۔ وہاں میرا ہیرو ہی مجھے لے کر گیا اور یہی کہانی کی خوب صورتی ہوتی ہے۔

میں بے حد مسرور تھی جیسے ہر ہیروئن ہوتی ہے اور زین بے حد خوش تھا جیسے ہر ہیرو ہوتا ہے۔ میرا یقین لوٹ آیا تھا۔ کہانی پر بھی اس کے ہیرو پر بھی اور سب سے بڑھ کر اس محبت پر جو ہر کہانی کی بنیاد ہوتی ہے۔ جس میں کوئی کھوٹ' جھوٹ' کوئی ملاوٹ نہیں ہوتی۔

آسیہ رزاقی

رنگِ حنا

"آپ بلاوجہ ضد کر رہے ہیں۔ آسمان کا رنگ دیکھیں۔ موسم کا کوئی اعتبار نہیں۔ کب بارش شروع ہو جائے۔ بارش میں پیڈل پر زور زور سے پیر ماریں گے تھک تو جائیں گے ہی۔ بھیگیں گے بھی۔" بیگم مشورہ دینے میں کبھی کوتاہی نہیں کرتی تھیں۔

"مجھے پہاڑ پر نہیں چڑھنا۔ سیدھی سڑک ہے۔ چلا جاؤں گا آرام سے۔" میاں صاحب بھلا کب ملن کر بیگم کو ایوارڈ دے سکتے تھے۔

"ٹریفک کا ہی لحاظ کر لیں۔ لمبا راستہ۔ اور اپنی حالت کا بھی خیال کریں۔"

"سیدھی طرح سے کہو کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں۔ تو

ناولٹ



پھر کیا بوڑھوں کے لیے چلنے پھرنے، سائیکل چلانے کی ممانعت ہے بھئی۔ میں تو ثواب کی نیت سے جا رہا ہوں۔ آپ کو کیا اعتراض ہے؟"

"میں اعتراض کیوں کروں گی۔ میں تو موسم کی خرابی کی وجہ سے کہہ رہی ہوں۔ کار میں بیٹھنے سے آپ کو الرجی ہے۔ کھجلی ہونے لگتی ہے۔ تو فراز یا زیاد موٹر سائیکل پر آپ کو چھوڑ آئیں گے۔ سمیٹتے رہنا ثواب، ضروری ہے کہ سائیکل چلانے کی مشقت برداشت کریں؟ ہمدردی میں مشورہ دے رہی ہوں۔ تاکہ آپ آرام سے چلے جائیں۔"

"میں بہت آرام سے سائیکل چلاتا ہوں۔ کوئی تکلیف نہیں ہوتی مجھے۔ کسی دن تم بھی سائیکل چلا کر گیٹ تک جا کر دیکھیں۔ کتنا لطف آتا ہے۔"

"آپ کو تو۔۔۔ ہمدردی سے بھی الرجی ہے۔ میری ہانڈی چولہے پر رکھی ہے۔ جل نہ جائے (میرے کلیجے کی طرح)" جلتی بھنتی وہاں سے کچن میں جا کر بیٹھ گئیں۔ بیٹی چولہا بند کر چکی تھی۔ ورنہ شاید۔

"آپ نہ مشورے دیا کریں۔ کب مانتے ہیں وہ۔ ہر بار بحث بے نتیجہ۔" شازیہ الجھ کر بولی۔

"تو۔۔۔ زبان پر تالے لگا لوں یا ہونٹ سی لوں۔ غلط بات پر ٹوکنا چاہیے۔ خود ان کی اپنی صحت کے لیے۔ میری کیا غرض ہے؟ بہت دن چپ رہی۔ اب۔۔۔ اور دیکھو گھر میں گاڑی ہے۔ اس میں بیٹھتے ہی ان کے کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔ موٹر سائیکل پر وہ پیچھے پھسلنے کی ایکٹنگ کرنے لگتے ہیں۔ بھلا بتاؤ۔ اس عمر میں سائیکل پر ماڈل ٹاؤن جانا۔ عقل کی بات نہیں



مانتے۔"

"وہ کوئی بات نہیں مانتے۔ جانتی ہیں ان کی مجبوری۔ جو ٹھان لیتے ہیں۔ اس پر عمل کرتے ہیں۔ خوامخواہ کہہ کر بات کھونا۔ ای کچھ حاصل نہیں۔"

"سچ کہہ رہی ہو۔ پر دل کا کیا کروں۔ مجبور ہو کر بول پڑتی ہوں۔"

واقعی دل تو مجبور کر ہی دیتا ہے۔ اب ٹریفک بے ہنگم۔ سائیکل پر ماڈل ٹاؤن کا سفر۔ کوئی حادثہ۔ اللہ نہ کرے۔ ہو جائے۔ تو لوگ ان ہی کو موردِ الزام ٹھہرائیں گے یا پھر بچوں کو طعنے سننے کو ملیں گے کہ گھر میں گاڑی کیا دکھاوے کے لیے کھڑی ہے۔ حالانکہ ان کے اپنے خاندان کے لوگ تو ان کی ہر بات جانتے ہیں۔ عادتوں سے واقف ہیں۔ مگر ان کو سب بری الذمہ ٹھہراتے ہیں۔ نندیں تو موقعے پر کہہ بھی دیتی ہیں۔ بھابھی چاہتیں تو بھائی جان ایسا کیوں کرتے (جیسے کہ وہ ان کے اشاروں پر چلتے ہوں) ہائے۔ خوش فہمیاں' غلط فہمیاں۔

چند ماہ پہلے کی بات ہے۔ اپنی معشوقہ کو لے کر غائب ہو گئے۔ گھنٹوں گزر گئے۔ شام کو انتظار کر کر کے تھک گئے۔ تو رشتے داروں کو فون کھڑکائے۔ کہیں سے سراغ نہ ملا۔ اتفاق سے ان کے پرانے محلے کا باشی۔ جو اپنے بھائی کی ملازمت کے سلسلے میں رابطے میں تھا۔ اکثر فون کرتا رہتا تھا۔ اس دن اس کا فون آگیا۔ لڑکے جو باپ کی وجہ سے فکر مند تھے۔ خاطر خواہ جواب نہ دے سکے۔ فون رکھنے والے تھے کہ اس نے کہا۔

"میاں صاحب کو سلام کہہ دیں۔ دوپہر کو ملے تھے۔ مگر جلدی میں تھے۔ بس میں بیٹھ کر چلے گئے۔"

"دوپہر کو ملے تھے؟ بس میں۔۔۔ کہاں کب کیا؟"

تابڑتوڑ سوال کر رہا تھا سجاد۔

پھر اس نے بھائیوں سے بات کی۔ دونوں اٹھ کر

نہیں چلے گئے۔ ماں کے پاس ایک بیٹا رہ گیا۔ وہ ہونقوں کی طرح گم صم بیٹھی تھیں۔

دونوں بھائی اسٹیشن پہنچے' دکان داروں سے پوچھ گچھ کی پتا چلا۔

"میاں صاحب آئے تھے۔ سائیکل ایک دکان پر کھڑی کی اور کہا لڑکے شام کو آ کر لے جائیں گے بچے۔"

"اچھا۔۔۔ پھر۔" سائیکل تو گھر وہاں تھی نہیں' چلو اچھا ہوا کوئی چرا کر لے گیا خس کم جہاں پاک۔ وہی تو ان کی معشوقہ تھی امی کے الفاظ میں۔ خود ہی چھٹکارا مل گیا۔

"پھر وہ کراچی جانے والی بس میں بیٹھ کر کراچی چلے گئے۔"

لڑکوں کی چیخ نکل گئی۔ "کراچی۔ بس میں اوہ خدا!" سر تھام کر رہ گئے۔ بس کے بارے میں معلومات کے لیے ادھر ادھر مارے مارے پھرے۔ پتا چلا کہ۔۔۔ اگلے دن صبح بس کراچی پہنچے گی۔ منہ لٹکائے واپس آئے۔ ماں کو خوش خبری سنائی۔

"امی! آپ کی سوکن ابا کی معشوقہ کو چور چرا کر لے گئے۔"

"اور۔۔۔ تمہارے ابا کو۔۔۔ کون لے گیا۔"

"ایک نئی کمپنی کی بس لے گئی ہے کراچی۔"

فراز نے کراچی اپنے ایک کزن کو فون کیا "زبیر بھائی! ہمارے ابا حضور۔ آپ کے چچا حضور ایک بس سے کراچی روانہ ہو گئے ہیں۔ میں بس کا نمبر وغیرہ اور اس کی جگہ بتاتا ہوں۔ پلیز آپ فون کر کے پہنچنے کا ٹائم معلوم کر لیں اور انہیں بصد احترام اتروا کر اپنے ساتھ لے جائیں۔ مجھے بتا دیجیے گا۔"

صبح بلکہ علی الصبح زبیر کا فون آگیا۔

"آپ کے والد حضور ہمارے چچا حضور کی تشریف آوری ہو چکی ہے۔ میں تو پورے پروٹوکول کے ساتھ انہیں بس سے اتار کر لایا ہوں۔ بصد احترام۔ نہ صرف ان کو بلکہ ان کی عزیز از جان لاڈلی سائیکل کو بھی۔ میں تو ان ہی کو لے کر آنے والا تھا۔ انہوں نے ایک خاموش اشارے سے فرمایا۔ "اسے بھی

اتروالو۔" چنانچہ اسے بھی پورے عزت و احترام کے ساتھ اتروا کر گھر لے آیا۔ اب دونوں محو آرام ہیں۔"

تینوں لڑکے بزرگی سائیکل کی اندوہناک خبریں کر آہیں بھرنے لگے۔ والدہ صاحبہ جو اس موئی کی رحلت پر خوش ہو گئی تھیں۔ اس کی نئی زندگی پر دل مسوس کر رہ گئیں۔

چار دن کے بعد زبیر میاں کے فون سے معلوم ہوا۔

"چچا حضور اپنی اسی شاہی سواری کو جھاڑ پونچھ کر اسی پر سوار ہو کر رشتے داروں سے ملنے چلے جاتے ہیں۔ مگر اب ہم نے قسم دی ہے کہ آئندہ ایسا نہیں ہو گا۔ گاڑی پر ہمارے ساتھ جانا ہو گا۔ وہ تو بلکہ افسوس کر رہے تھے کہ خوامخواہ بس کے کرائے کی چپت پڑ گئی۔ ورنہ وہ سائیکل پر ہی کراچی آجاتے۔ ایک دن نہ سہی چار دن میں تو پہنچ ہی جاتے۔"

زبیر ہنس رہے تھے اور کراچی سے یہ خبریں تواتر کے ساتھ لاہور کے رشتوں داروں کو بھی پہنچ رہی تھیں۔

کراچی کے بعض رشتے دار تو ان کی سائیکل سے الفت اور رغبت دیکھ کر یہ نتیجہ نکال چکے تھے کہ میاں رشید سائیکل پر کراچی آئے ہیں۔

کسی نے شاباش دی۔ کسی نے ان کی صحت کو داد دی۔ کسی نے دعائیں دیں۔ کوئی معترض ہوا۔ کوئی حیران اور سب نے متفق ہو کر بیٹوں کو قصوروار ٹھہرایا۔ جو باپ کو ٹرین یا جہاز سے بھیجنے کے روادار نہ ہوئے۔ کسی نے برملا منہ کھول کر کہا۔

"توبہ توبہ۔ کیسی اولاد ہے بوڑھا باپ سائیکل پر کراچی آیا رشتے داروں سے ملنے تھک کر ہلکان برے حال برا احوال۔"

کسی نے سچائی سے تجزیہ کیا اور کہا "کسی کو خبر کیے بغیر آگئے ہوں گے میاں رشید ورنہ کون ایسا بیٹا ہو گا۔ ان کا مزاج تو ایسا ہی ہے۔"

"ارے آج کی اولاد کا یہی وتیرہ ہے۔ ماں باپ کی پروا کب کرتے ہیں۔ کوئی خبر نہ لیتا ہو گا کہ باپ کر کیا رہا ہے۔ چاہتا کیا ہے؟"

کسی نے باحیثیت اولاد کو ذمہ دار ٹھہرا کر تند و تیز نشتر سے جو کسی زہر آلود تیر کی مانند لاہور پہنچے۔ سنسناتے ہوئے۔ سیدھے ماں بیٹوں کی سماعت سے ٹکرائے۔ اب کوئی زخمی ہوا ہو تو ہو تا رہے۔ سب نے اپنا فرض ادا کر دیا۔ ایسے ہر موقعے پر عزیز رشتے دار میاں صاحب کی عادت و مصروفیات کو جانتے ہوئے پس پشت ڈال دیتے۔ ملبہ آکر تا بیٹوں اور بیوی پر۔

میاں صاحب بہنوں بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ والدین جوانی میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پانچ اولادیں۔ جوان بیوی۔ میاں رشید سب سے بڑے تھے۔ ابھی انٹر کیا تھا۔ ماں باپ کے ارمان کہ بیٹا ڈاکٹر انجینئر بنے خاک میں مل گیا۔ جیسے تیسے بی اے کر کے نوکری کی جستجو میں لگ گئے۔ قسمت نے یاوری کی۔ نوکری بھی اچھی مل گئی۔ دوسرے کام بھی ساتھ میں کرتے رہے۔ کہ گھر اور بہنوں بھائیوں کی پڑھائی کے اخراجات بھی بخیر خوبی ادا ہوتے رہیں۔ گھر بھی چلتا رہا اور بہنوں کی شادیاں بھی ہو گئیں۔

والدہ کی فوتگی کے بعد ایک بھائی کی شادی بھی کر دی۔ پھر بہنوں کو ان کا بھی خیال آہی گیا۔ ان کو بیوی بھی مل گئی گھر بس گیا۔ بچے بھی بہت اچھے تھے۔ انہیں تو پتا ہی نہ چلا کب پل بڑھ کر جوان ہو گئے۔ بیگم اول دن سے شوہر کا بغور مطالعہ کر رہی تھیں۔ اندازہ تو ہو ہی گیا تھا کہ عام انسل سے تعلق نہیں رکھتے۔

سالوں کے مطالعے سے نت نئے انکشافات ہوتے چلے گئے۔ یہ کہ اول درجے کے بھلکڑ ہیں۔ بہت عام مرض ہے۔ مگر وہ خاص قسم کے تھے اس لیے۔ صرف اپنی اور اپنی فیملی سے متعلق ہوئی تھی ان کی بھول۔ دوسروں کی تو ہر ضرورت۔ ہر خواہش' ہر فرمائش ازبر ہوتی۔ کسی سے زیادہ مراسم کے قائل نہ تھے۔ مگر اپنے تمام عزیز و اقارب دل و جان سے پیارے تھے۔ بلاوجہ بھی کسی سے دل برا ہو جاتا۔ تو ملنا جلنا موقوف ہو کہ بیگم پر تو کوئی پابندی نہ تھی اور وہ ان کی ناپسندیدہ ہستی کو گھر بلانے یا بیگم سے ملنے کو منع نہ کرتے۔ مگر برے برے منہ بناتا' پرشور حرکتیں کرنا

ضروری سمجھتے۔ یعنی کوئی چمچہ گرا دیا۔ کرسی زور سے کھینچی۔ کبھی با آواز بلند جمائیاں لے کر نیند آنے کا اشارہ دیتے ہوئے سرِعام صوفے کو ہی عزت بخشتے ہوئے دراز ہو جاتے۔ بیگم کا دل جلتا ہے تو جلے۔ اب نا پسندیدہ مہمان کی رخصتی لازمی ہوتی۔

طرح طرح کی اوٹ پٹانگ حرکتوں کی عادی ہو جانے کے باوجود بیگم ہار ماننے کو تیار نہ تھیں۔ مشورے نصیحتوں سے نوازتی رہتیں گو کہ ان پر تو کچھ اثر ہوتا نہ تھا' وہ تو بیگم کا دل جلانے شرمندہ کرنے کا ہر جگہ انتظام کر لیتے۔

بیگم کو ان کے یار دوستوں' عزیز اقارب سے ملنے پر کوئی اعتراض نہ تھا۔ وہ اپنا گھر اور بچوں کو سنبھالتے بچوں کی دل بستگی میں ہی مصروف رہتیں۔ گو کہ میاں کو سدھارنے کی کوشش کرتی رہتی تھیں مگر فائدہ نہ تھا۔ بچوں کے بڑے ہونے تک ان کی عادات بھی ترقی کر چکی تھیں۔ خاندان والے بھی ان کی عادت کو جانتے بوجھتے نظر انداز ہی کرتے۔ بیگم پہ ذمہ داری کا الزام لگانا آسان تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ دل ہی دل میں میاں کی خیر کی دعا کر رہی تھیں۔ جو سائیکل پر ماڈل ٹاؤن کے لیے روانہ ہو چکے تھے۔ ڈاکٹر اسرار احمد کا درسِ قرآن ہر جمعرات کو سننے کے لیے جاتے تھے۔ بیگم کی بہن حامدہ ماڈل ٹاؤن میں رہتی تھیں۔ درس شاید شام تک ہوتا تھا۔ حامدہ کے گھر سے ڈاکٹر اسرار کی اکیڈمی دور بھی تھی۔ رات کو حامدہ کے گھر قیام ہوتا۔ یہ بھی شکر ہے کہ رات کو گھر واپسی کا خیال نہ آتا تھا ورنہ شاید۔ شام کو حامدہ کو فون کر کے اپنی آمد کی اطلاع دے دیتے تھے۔ اس وقت بارش شروع ہو گئی تھی دل پریشان تھا۔ بہن کو فون کیا۔

"حامدہ۔ تمہارے دولھا بھائی پہنچ گئے؟"

"جی آپا۔ سائیکل ہمارے ہاں کھڑی کر کے پڑوس میں چلے گئے ہیں۔"

"پڑوس میں؟ کیوں وہاں کیا کرنے گئے ہیں؟"

"ہمارے ساتھ والے گھر میں ان کے ایک دوست رہتے ہیں۔ ابھی نئے آئے ہیں۔"

"اچھا۔ ان کے ساتھ جاتے ہوں گے ڈاکٹر اسرار کے درس القرآن میں وعظ سننے۔"

"جاتے واتے نہیں ہیں۔ دوست کے گھر پر ہی ٹی وی پر جمعرات کو ڈاکٹر اسرار کا پروگرام ٹیلی کاسٹ ہوتا ہے۔ وہیں دیکھ لیتے ہیں۔"

"ٹی وی پہ۔" چیخ نکل گئی۔ حیرت سے۔

"ہاں۔ وہ پہلے ہمارے ہاں ہی دیکھتے تھے اب وہاں چلے جاتے ہیں۔ ان کا ٹی وی بڑا ہے۔ اچھا نظر آتا ہے نہ اس لیے۔" حامدہ نے گل کھلائے۔ بیگم ہکا بکا۔

"مجھ سے تو کہہ رہے تھے۔ سائیکل حامدہ کے گھر کھڑی کر کے ٹہلتا ہوا چلا جاتا ہوں۔ ڈاکٹر اسرار کا وعظ سننے۔" انہوں نے خود کو ہی سنایا شاید۔

"ہاں تو ٹہلتے ہوئے ہی چلے جاتے ہیں۔ ہر جمعرات کو پہلے ہمارے ہاں سن لیتے تھے۔"

"میں ہی پاگل ہوں۔ ان کی باتوں میں آجاتی ہوں۔ اف۔ چالاکی تو دیکھو اس شخص کی۔ مجھے اسی طرح پاگل بناتے ہیں۔"

دوسری جانب سے بہن کی کھلکھلاہٹ سن کر چڑ گئیں۔ "ہاں ہاں اڑا لو مذاق میرا۔"

"آپا نہیں۔ یہ بات نہیں۔ میں تو دولھا بھائی کی ہوشیاری پر ہنس رہی ہوں۔"

"اچھا خیر۔ کیا رات کو ان ہی کے گھر رہتے ہیں؟ اور فون پر تم سے بالٹی بھرنے کا کیا کہہ رہے تھے۔ میں نے غور نہیں کیا تھا۔"

"وہ؟ اچھا ہاں۔ اصل میں ہمارے گھر تنگی تو ہے نہیں۔ رات کو دس بجے یہاں سرکاری پانی بند ہو جاتا ہے اور دوست کے گھر انہیں گرمی بہت لگتی ہے۔ اے سی نہیں ہے ان کے ہاں۔ کمرہ بھی خاصا گرم ہے۔ تو یہاں آکر نہاتے ہیں۔ اس لیے بالٹی بھرنے کا یاد دلاتے ہیں۔"

"اور۔ وہ تو وہی منگا کر رکھنے کا کہہ رہے تھے۔"

کچھ یاد آنے پر پوچھ لیا۔

"جی۔" ادھر پھر کھلکھلانے کی آواز سنی۔ "دوست کے گھر سے آکر لسی بنا کر پیتے ہیں۔ انہیں نہانے کے بعد بھوک لگتی ہے اور لسی پینے کے بعد نیند اچھی آتی ہے۔"

"کمبخت مارے کون سے دوست ہیں۔ جو سوکھے منہ ٹرخا دیتے ہیں۔ شربت چائے کا بھی نہیں پوچھتے۔ تو یہ ابھی کھانا کھلا دیا کرو۔"

"نہیں چائے شربت تو پلاتے ہیں۔ کچھ نہ کچھ کھا کے آتے ہیں۔ اسی لیے کھانا نہیں کھاتے۔ پتا تو ہے آپ کو۔ دولہا بھائی جو نخرہ لیں۔ اسی پر عمل کرتے ہیں۔ دوسرے دیر ہو جاتی ہے۔ تو تو ڈھا کلو دہی کی لسی دودھ ملا کر بنا کر پی لیتے ہیں۔ کہتے ہیں۔ ٹھنڈ پڑ جاتی ہے۔ ہمارے ہاں تو سالن میں مرچیں ہوتی ہیں۔ وہ کب مرچوں کا سالن کھاتے ہیں۔ آپ کو پتا تو ہے۔" حامدہ کچھ شرمندہ تھی۔

"ہاں ں۔ مگر ان کی بہنیں نہیں جانتیں۔ کہتی ہیں معصوم بن کر۔ بھائی جان تو کبھی اتنے مذہبی نہیں تھے۔ آپ نے کون سی گھٹی گھول کر پلا دی ہے۔ کہ اتنے شوق سے ڈاکٹر اسرار کا درس سننے جانے لگے۔ ہر جمعرات کو۔ اصل میں رضیہ۔ جمعرات کو ہی آتی ہیں۔ بھلا بتاؤ ان کا منہ جب سے لگا وہ بھی میرا جر مہین گیا۔"

"ان سے کہیے۔ وہ جمعے کو آجایا کریں۔"

"کہا تھا بھئی۔ جمعے کو تو وہ اپنے گھر کی صفائی کرتی ہیں۔ نہاتی ہیں۔ شاید نماز بھی پڑھتی ہیں۔ تھک جاتی ہیں۔ ہفتے کو ان کی بیٹی داماد آجاتے ہیں۔ ان کے ساتھ وقت گزارتی ہیں۔"

"کسی دن داماد بیٹی کے بجائے بھائی کے ساتھ وقت گزار لیا کریں۔ اتوار کو یا پیر کو آجائیں۔ دفتر تو جانا نہیں انہیں۔"

"سب کہہ لیا۔ بس فالتوں دن جمعرات کا ہی ہے ان کے پاس۔ فالتو بھائی کے لیے۔" چڑ کر فون کے پاس سے ہٹ گئیں۔ دل جل کر کباب ہو رہا تھا۔

صبح حامدہ کا فون آگیا۔ راز دارانہ انداز میں بتایا

"ڈاکٹر اسرار بیمار ہو گئے ہیں۔ کل تو ٹی وی پر پروگرام آیا ہی نہیں۔ نعتیں سنواتے رہے۔ ڈاکٹر اسرار کی صحت کے لیے دعا کی اپیل کی ہے۔ کیا آپ نے ٹی وی نہیں لگایا۔"

"مجھے کہاں فرصت ہے ٹی وی شی وی لگانے کی۔" مزید چڑ گئیں۔ اب ان کی آمد کا انتظار تھا۔

دس بجے تشریف آوری ہوئی۔ مسکراتے گنگناتے لہراتے بل کھاتے آئے۔ ہاتھ اٹھا کر بیگم کو از خود سلام کیا۔ جواب میں بیگم کی خشمگیں نظروں کا سامنا ہوا۔ کچھ خائف ہو گئے۔

"مل آئے ڈاکٹر اسرار احمد سے؟"

"نہیں بھئی کہاں، وہ اتنا مصروف بندہ، میں کیا میری اوقات کیا؟"

"کسی دن ان سے آٹو گراف ہی لے لیتے۔ بچے خوش ہو جاتے۔" دانت پیس کر کہا۔

"اچھا؟ خیال ہی نہیں آیا۔ دعا کرو وہ صحت یاب ہو جائیں پھر سہی۔"

"ڈھٹائی کی بھی حد ہے۔ ذرا بتائیں۔ آپ کب ملے ان سے۔ اور وہ کب بیمار ہوئے۔"

میاں صاحب ٹھٹکے۔ پھر ہلکا سا تبسم ہونٹوں پر لہرایا۔

"اوہ بھئی۔ کل وہ آیا کہ بس کی نعتیں سننے کو ملیں۔ روح پرور محفل تھی۔ واہ بھئی واہ واہ۔" موضوع کس خوبی، کس لاپروائی سے بدلا کہ واہ واہ۔

"بہن آئی تھیں آپ کی۔" بھنا کر مطلع کیا۔ "وہ شکوہ کر رہی تھیں کہ کبھی ملتے نہیں۔"

"چلیں پھر آج ہی مل آتے ہیں تیار ہو جائیں۔" بحث بے کار تھی۔ مشورے پر عمل کرنا بہتر سمجھا۔

بہن نے بہت خوشی کا اظہار کیا۔ مگر کہا یہی۔

"ارے بھائی جان۔ آپ سے ملاقات تو عید کے چاند کی طرح ہوتی ہے۔ بھابی جان آپ کو بتاتی نہیں کیا؟ کہ میں ہر جمعرات آپ سے ملنے جاتی ہوں۔ آپ کی خاطر۔"

بیگم منتظر رہیں۔ بھائی صفائی دیں گے کہ وہ ڈاکٹر اسرار کا وعظ سننے جاتے ہیں۔ تم صبح آجایا کرو مگر کاش... بولے بھی تو کیا۔

"بتانے کی ضرورت کیا ہے؟ میں جانتا ہوں۔ اسی لیے تو آگیا کہ چلو بھائی۔ بہن سے مل لیا جائے۔"

دل جلانے کے مواقع تو ہر وقت تیار رہتے۔ کبھی جو بیگم کی صفائی عزت افزائی کا موقع۔ بہنوں کے سامنے آنے دیا ہو۔ افوہ۔

کچھ دیر بعد بھائی خود ہی بہن کی بے رنگ بے مقصد باتوں سے بے زار ہو کر چلنے کو تیار ہوئے۔ بہن نے شرما حضوری اتنا ضرور کہا۔

"اتنی جلدی کیا ہے بھائی جان۔ کھانا کھا کر جاتے۔ دس منٹ بعد نکلوالوں گی۔"

اوپری دل سے ہی کہا تھا۔ کچن کی طرف جاتے ہوئے تو دیکھا نہیں۔ شربت پلا کر بے فکر ہو گئیں۔ اسی وقت اندر کہیں سے ان کی بیٹی کی آواز آئی۔

"امی! کیا آج باتوں سے پیٹ بھریں گی۔ بتادیں کیا پکاؤں۔ گوشت ہے نہ سبزی۔"

"گھر میں کھانا پک گیا ہے رضیہ! اور میں تو سیدھے گھر کھانا کھاتا ہوں۔" میاں صاحب نے وکیل پیش کی، اور باہر کی طرف قدم بڑھائے۔ مجال ہے۔ بہن کو شرمندہ ہونے کا موقع دیں ہاں بھئی شرمندگی کے لیے بیوی کافی ہے۔ اگر کہہ دیتے کھانا نہیں پکا تو خاطر کیوں کر رہی ہو۔ لیکن کیوں؟ جمعراتوں کا سلسلہ رک گیا۔

آج کل بہنوں اور دوسرے احباب کی جانب توجہ تھی۔ کچھ الجھے ہوئے کھنچے رہتے۔ ایک دن کہنے لگے۔

"سوچتا ہوں پراویڈنٹ فنڈ کی رقم بنک سے نکلوالوں۔" کچھ سوچ میں تھے۔ بیگم نے بغور ان کی حرکات و سکنات کا جائزہ لیا۔

"کیوں؟ یہ خیال کیوں آیا؟ ضرورت ہے تو فراز سے لے لیں۔ تھوڑی بہت رقم تو وہ دے سکتا ہے۔ طرح طرح کے خیال دماغ میں آتے ہیں بلاوجہ۔"

"ارے بھئی۔ مجھے کب خیال آیا۔ یہ تو سعیدہ نے عقل دی ہے۔ خاصی رقم بینک میں بے کار پڑی ہے۔ کچھ کام میں لائی جائے۔"

"بے کار؟" بیگم حیران ہو گئیں۔ "ابھی بیٹی کی پڑھائی باقی ہے۔ پھر اس کی شادی بھی ہونا ہے۔ اخراجات کی فکر نہیں۔ اس لیے کہ ابھی تو ماشاء اللہ فراز ہی اخراجات برداشت کر رہا تھا۔ اس کی بھی شادی ہوگی۔ باپ تو یوں بے خبر بیٹھے ہیں جیسے ان کا کوئی فرض ہی نہیں۔"

رات کو فراز سے انہوں نے ذکر کیا۔

"تمہارے ابا کو کچھ رقم کی ضرورت ہے۔ تم دے دو۔" وہ زیاد کو دیکھنے لگا۔

"بیٹا زیاد۔ امی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ ابا بھلا مجھ سے رقم لیں گے۔ میری خریدی ہوئی گاڑی میں بیٹھنے کے روادار نہیں۔ انہیں الرجی کی کھجلی شروع ہو جاتی ہے۔ کراچی میں چچا کی گاڑی میں جاتے رہے۔ تو کچھ ہوا نہیں۔ میں نے شکوہ کیا۔ تو بولے۔ وہ کراچی کی آب و ہوا کی وجہ تھی۔"

"اور امی کو شاید یہ بھی خبر نہیں کہ عرفان بھائی کی شادی ہو رہی ہے۔ ولیمہ کے اخراجات ابا نے ذمے لے لیے ہیں۔" زیاد نے عقدہ کھولا۔

"سعیدہ آپا نے بتایا نہیں کہ عرفان کی شادی ہو رہی ہے؟" وہ دنگ رہ گئیں۔

"اچھا۔ تو پراویڈنٹ فنڈ کی رقم کی اس لیے ضرورت تھی جو کہ بے کار بینک میں سڑ رہی تھی۔ ہاں بھئی بھئی بجے کی سہولت۔ بہن کا مفاد۔ لوگوں کی واہ واہ۔" دانت پیس کر رہ گئیں۔ پچھلے سال ہی سعیدہ کی بیٹی کی شادی میں اپنا زیور نکال کر دے چکی تھیں۔ رضیہ کی بیٹی کی مہندی کا خرچا بھی بڑے ماموں نے اٹھایا۔ رضیہ نے کہا کہ ہمارے ہاں رواج ہے۔ لڑکی کے جہیز میں بستر ماموں کی طرف سے ہوتا ہے۔ وہ بھی انہوں نے کسی طرح جوڑ توڑ کر کے بنا دیا تھا۔

ساری زندگی بہنوں بھانجیوں کی خبر گیری کرتے رہے۔ بہنوں کی شادی، بھائیوں کی شادی۔ بعد کے اخراجات بھی۔ میاں صاحب کے معاملات میں انہوں نے کبھی دخل نہ دیا تھا۔ بہن بھائی کے معاملات، تعلقات وہ کیوں رخنہ ڈالیں۔ مگر ان کی اوٹ پٹانگ حرکتوں سے نالاں رہتی تھیں۔ سائیکل کا شوق۔ بلکہ استعمال۔ لباس کی طرف سے تغافل۔ نائٹ سوٹ میں ہی ہر جگہ جانے کو تیار۔ جب نہ تب سر نیچا پیر اوپر کر کے کھڑے ہو جاتے۔ جسے ایکسر سائز کہہ کر خاموش کر دیتے۔

"دوران خون تیز ہوتا ہے۔ بھئی۔"

کوئی ناپسندیدہ شخصیت گھر آجائے۔ اس سے قطعاً ناواقفیت ظاہر کرنا اور بھولے پن سے پوچھنا۔

"آپ کی تعریف؟ میں نے پہچانا نہیں۔"

رمضان شریف میں بیٹی سے کہا۔ "شازیہ مہندی چوڑی کی خبر ہے؟ چلو میں چوڑیاں پہنا لاؤں۔"

بیٹی خوش ہو گئی۔ زبردستی ماں کو بھی لے گئی۔ آخری ہفتہ تھا۔ بازار میں خصوصاً خواتین سے متعلق دکانوں پر خوب رش تھا۔ شازیہ بھیڑ چیرتی ہوئی اندر گھس گئی اور چوڑیوں سے چھیڑ چھاڑ کرنے لگی۔ ابا جان نے بیٹی کی تقلید میں اندر داخل ہونا چاہا۔ دکاندار چلا اٹھا۔

"سر۔ سر جی، کدھر لیڈیز ہیں ادھر۔" مگر وہ بیٹی کے ساتھ جا کر کھڑے ہو گئے۔ اماں بیٹی نے چوڑیاں پسند کر لیں۔ تو ابا جان نے دکان دار سے کہا۔

"میرے ناپ کی اچھی سی چوڑیاں دکھاؤ۔" پھر دکان والے کی حیرانی رفع کرنے کے لیے اپنی معلومات کے تجزیے بیان کرنے لگے۔ پھر خود ہی بڑے ناپ کی چوڑیاں پسند کر کے کہا۔ "یہ پیک کر دو۔"

چوڑی والا شازیہ کی چوڑیاں پیک کر رہا تھا۔ دہشت زدہ ہو گیا۔ "صاحب آپ؟"

"کیوں بھئی کیا میرا دل نہیں ہے۔"

بیگم کا تو بس نہ چلتا تھا۔ کہ زمین پھٹے اس میں سما جائیں۔ بغیر کچھ لیے پیچھے ہٹ گئیں۔ باپ بیٹی نے چوڑیاں پیک کروائیں۔ اور بیگم کے غصے اور شرمندگی کی پروا کیے بغیر۔ خوشی خوشی تانگے پر واپسی ہوئی (ٹیکسی میں بیٹھ کر اگر گردن اور کمر کھچ جاتے۔ ڈرائیور بیمار سمجھ کر اتار ہی دیتا)

"ہر جگہ شرمندہ کرنے کے موقعے ضائع نہیں

کرتے تمہارے ابا۔ خاص کر میری شرمندگی۔ نہ جانے کیا دشمنی ہے مجھ سے۔" شازیہ کے سامنے شکوہ کرلیتی تھیں۔

"امی! ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیں۔ وہ جو چاہتے ہیں انہیں کرنے دیں۔ پلیز۔ کیوں اپنا دل جلاتی ہیں۔ اچھا میرے لیے عید کا سوٹ... یا وہ بھی ابا لائیں گے۔" شرارت سے کہا۔

"خبردار۔ وہ تو دلہن پر ساڑی پہن کر کھڑے ہو جائیں گے۔ لادوں گی آج۔"

عید کے دن بہنیں عید منانے آگئیں۔ بھائی نے انتہائی خوش دلی، خوش مزاجی اور خوش مذاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہنوں کو بتایا۔

"شازیہ کو میں نے خود مارکیٹ جاکر چوڑیاں دلوائی ہیں۔ مگر تمہاری بھابھی... خیر اور میں نے تو اپنے لیے بھی چوڑیاں پیک کروائی تھیں۔ مگر... پتا نہیں کہاں غائب ہو گئیں۔ پر لگ آئے۔ وہ اڑ گئیں۔ یا پیر لگ گئے کہ کہیں بھاگ گئیں۔ بہت تلاش کیا۔ ملی ہی نہیں۔"

ہاتھ جھاڑ کر حسرت بھری نظروں سے اپنی سونی کلائیاں دیکھنے لگے۔ بہنیں کھلکھلائیں۔ ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر چہک کر بولیں۔

"جائیں گی کہاں۔ بھابھی جان نے چھپا دی ہوں گی۔"

دوسری بہن بولیں۔ "چھپائی کہاں ہوں گی۔ دے دی ہوں گی کسی کو۔ بلکہ اپنی امی معنی کزن کو تحفہ دیا ہو گا۔ عید کا تحفہ۔"

بھابھی جان ان کے درست اندازے پر عش عش کرنے نہیں۔ (دل میں) ویسے تو دنگ رہ گئی تھیں۔

"آپ ایسی فضول حرکتیں کیوں کرتے ہیں؟" بہنوں کے جانے کے بعد انہوں نے میاں صاحب سے سوال کیا۔ جب وہ سر کے بل کھڑے ہونے کی تیاری میں مصروف تھے۔

"کیسی حرکتیں۔ یعنی کہ ہوں جلوں بھی نہیں۔ ماشاء اللہ تندرست ہوں بہت اسمارٹ ہوں، بھتیجے کی طرح یا مردے کی طرح۔"

سادہ لہجے میں بولے۔ تولیے سے گردن کا پسینہ پونچھ رہے تھے۔ باہر کے برآمدے میں کمرے کی کھڑکی سے لگے بچے اندر جھانک رہے تھے۔ منتظر تھے۔ بابا کی ورزش کا سین۔ دلچسپ اور عجیب۔ خود بھی تو سیکھنا تھا۔

"میرا مطلب ہے۔ یہ جو الٹی سیدھی حرکتیں کرتے ہیں آپ۔"

"کیا؟ یعنی اب ورزش پر بھی پابندی ہے؟" حیران ہو گئے۔ کھڑکی سے کھلکھلانے کی آواز آئی۔

"بھی سے کیا مراد ہے؟ میں نے کب کوئی پابندی لگائی ہے بھلا۔"

"بھولتی بہت ہو بیگم۔ ابھی کل نہیں گزری کہ تم نے میرا حامدہ کے گھر جانا روک دیا۔ ڈاکٹر اسرار احمد کے درس میں جانے پر پابندی لگا دی۔ بندہ پھر ایسی ویسی حرکتیں تو کرے گا ناں؟" بالکل معصوم۔

"حامدہ کے گھر جانے سے نہیں روکا۔ جمعرات کو جانے سے منع کیا ہے۔ ڈاکٹر اسرار کا وعظ اپنے گھر کے ٹی وی پر دیکھ سکتے ہیں۔ ضروری ہے دوسروں کے گھر جا کر دیکھنا؟"

"دوست سے ملاقات ہو جاتی تھی اس بہانے۔ آپ کا کیا نقصان تھا بھلا؟"

"خیر۔ میں آپ کی ان حرکتوں کا کہہ رہی ہوں، جس سے مجھے شرمندگی ہوتی ہے۔ چوڑیاں پہننے کے لیے لی تھیں آپ نے۔ کہا تو یہی۔ پھر... ڈاکٹر اسرار کا درس سننے کا کہہ کر جاتے تھے اور ٹی وی پر دیکھ آتے ہیں۔ جمعرات کو آپ کی بہن کا نزول ہوتا تھا۔ نزلہ مجھ پر گرتا تھا کہ میں نے کچھ گھول کر پلا دیا ہے، جس سے آپ مذہبی ہو گئے ہیں۔ کبھی جو آپ نے میری صفائی میں کچھ کہا ہو۔ کرتے آپ ہیں۔ سنتی میں ہوں کہ آپ میرے اشاروں پر چلتے ہیں۔"

"آپ کان بند کرلیا کریں۔ ویسے کہتی تو وہ بھی صحیح ہیں۔"

"کہ آپ میرے اشاریوں پر چلتے ہیں؟" گردن اقرار میں ہلتی دیکھ کر مزید جتائیں۔

"ہاں جی۔ آپ نے منع کیا۔ میں نے حامدہ کے گھر جانا بند کر دیا۔ آپ نے دوست کے گھر جا کر وی سی آر پر فلم دیکھنے پر پابندی لگا دی۔ میں نے مان لیا۔"

"اچھا۔۔۔ چوڑیاں میری فرمائش پر خریدی تھیں۔ کیا کہتا ہو گا دکان دار؟"

"بھئی میں نے سوچا۔ آپ کی موٹی کزن کے ناپ کی چوڑیاں مشکل سے ملتی ہیں۔ وہاں نظر آ گئیں۔ تو لے لیں۔ آپ کا تو دل اتنا بڑا ہے نہیں کہ اس بے چاری کے لیے اس کی موٹی کلائیوں کے سائز کی تلاش کر کے لے لیتیں۔"

"آپ کو میری کزن سے کیا دلچسپی ہو گئی۔ میں کسی کو چھو دوں۔ نہ دوں۔ آپ سے مطلب۔" سخت جھنجلاہٹ سوار تھی۔

"اس دن آئی تھی۔ شکوہ کر رہی تھی کہ بچی کو توفیق نہیں کہ خود سے چوڑیاں اور سینڈل لے آئے۔ اور ماں کو ساتھ لے جانے سے وہ شرمندہ ہوتی ہے۔ جب آپ نے اسے چوڑیاں دی تھیں۔ اس نے دعائیں دی ہوں گی۔"

میاں صاحب نے انہیں لاجواب کر دیا۔ سچ ہے۔ وہ بے چاری موٹاپے کے باعث زیادہ چلنے میں دقت محسوس کرتی تھی۔ خصوصاً "رمضان کے رش میں جانا۔ بچی کے پاس بہانوں کی کمی نہ تھی۔ آپ کے ناپ کی چوڑیاں ملتی کب ہیں۔ دس دکانیں جھانکو، سو چوڑیاں ٹٹولو۔ تب جا کر۔ اب کسے اتنی فرصت ہے اماں۔ دھکم پیل اس قدر کی ہوتی ہے۔ روزے میں بندہ ویسے ہی بے زار ہوتا ہے رش میں۔ کزن کے ہاتھ سے چوڑیوں کا تحفہ لے کر دعائیں تو بہت دیں انہیں۔

"اچھا اور گاڑی ہوتے ہوئے سائیکل استعمال کرنا۔ بغیر بتائے کراچی روانہ ہونا۔ وہ بھی بس سے، کراچی میں 'اپنے بھائی کی گاڑی میں تو آپ کو کبھی ہوئی نہ الرجی۔"

آج موقع مل گیا تو شکوے شکایت کیوں نہ کرتیں۔

"بھول جاتا ہوں یار۔" کہہ کر سر نیچے ٹانگیں اوپر کر کے کھڑے ہو گئے۔ باہر برآمدے میں کھڑکی سے لگے بچوں نے خوشی سے نعرے لگائے۔ پڑوسیوں کے بچے تھے۔

"آنٹی روزانہ کامیڈی سین دیکھتی ہیں۔ کتنے مزے کرتی ہیں ناں؟"

(مزے؟) انہیں لگا وہ خود جوکر بن گئی ہیں۔ انہی کا کامیڈی سین چل رہا ہے۔

جوانی میں تو میاں صاحب کی حرکتوں سے لوگ لطف لیا کرتے تھے۔ اب مضحکہ اڑاتے ہیں۔ بہنیں بھی مذاق اڑاتیں۔ مگر۔۔۔ بھائی کا نہیں بھابھی کا (بھابھی جل بھن کر راکھ ہو رہی ہیں۔ انہیں کیا پروا)

"بھابھی جان۔ سچ آپ نے شادی سے پہلے اپنی زندگی کی خوشیوں کی خوب دعائیں کی ہوں گی۔ تبھی بھائی جان کے ساتھ اتنی مزیداری کی عمر گزار رہی ہیں۔" طنز تو ان کے لہجے میں ہوتا ہی تھا۔

مزے داری؟ شاید بہن کی نظر میں شرمندگی اور کڑھنے کے مواقع مزے دار لگتے تھے۔ وہ تو اپنے جذبات خفیہ رکھنے کی عادی ہو چکی تھیں۔ ورنہ کہہ سکتی تھیں۔

"آپ نے بھی اپنے لیے دولت اور محل کی دعا کی ہو گی۔ تب ہی ایک نمبر کا راشی شوہر ملا۔ جس کی ساری عمر حرام کمانے میں لگ گئی۔ دولت کے انبار تو لگ گئے۔ مگر۔۔۔ قسم قسم کی بیماریاں پریشانیاں بھی لاحق ہیں۔ توبہ۔" مگر وہ سب سن کر چپ رہنے کا تہیہ کر چکی تھیں۔

چھوٹی نند نے تو ایک بار خاصا فتنہ ڈالنے کی کوشش بھی کی تھی۔ بھائی کو تو اکسایا ہی۔ چھوٹے بھائیوں کو بھی شکایتاً "اطلاع دی۔

"لگتا ہے بھابھی جان ہمارے بھائی کی کمائی میکے والوں پر لٹا رہی ہیں۔ ان کے بھائیوں کے تو حالات بہتر ہوتے جا رہے ہیں۔ بھائی جان بے چاروں کی جیب خالی رہتی ہے۔ میں نے ذرا سی فرمائش کر دی۔ تو ٹکا سا جواب دیا۔ ارے بھئی میں نے تو کہا کہ بھائی جان۔ آپا

تو پراپرٹی بڑھائے جا رہی ہیں۔ کل بھی ایک کوٹھی خریدی ہے بیٹی کو جہیز میں دینے کے لیے۔ آپ مجھے پانچ مرلے زمین ہی دلوا دیں۔ میں ایک جھونپڑی ہی ڈلوا لوں۔ آخر بھائی ہی بہنوں کے کام آتے ہیں۔ تو بولے میرے پاس اتنی رقم ہو تو میں اپنے گھر کی حالت درست کروں گا کہ تمہارے مقابلے کی دوڑ کے لیے لگاؤں گا۔ لو سنو۔ اتنی سی بات بھی پوری نہیں کی۔ اتنا کماتے ہیں۔ پتا نہیں ساری رقم کہاں جاتی ہے۔"

شازیہ کو خبر تھی۔ وہ چلا اٹھی۔ "امی آپ نے چپ چاپ سن لی یہ بات۔ جواب کیوں نہیں دیا۔ میکے میں اس لیے خوش حال ہے کہ سب ماموں لوگ تعلیم یافتہ۔ محنتی اور خود دار ہیں۔ آپ لوگوں کی طرح دوسروں پر انحصار نہیں کرتے۔"

"پاگل ہو گئی ہو۔ مجھ سے کب کہا کچھ۔ ویسے وہ کہہ بھی سکتی تھیں۔ ذرتی تو نہیں ہیں مجھ سے۔ یہ تو تمہارے چچا نے مجھے ان کے خیالات بتائے ہیں۔"

"خیر۔ آپ بھی ان تک اپنے خیالات پہنچا سکتی ہیں۔ کہ ابا کے پاس اتنی رقم ہوتی کب ہے۔ جب نہیں بھی ہوتی۔ تب بھی مانگنے والوں کو اس سے کیا؟ بھانجوں کی ضرورت ابا ہی پوری کرتے ہیں۔ پچھلے دنوں سعد اللہ بھائی نے اپنی گاڑی کی مرمت کے لیے پندرہ ہزار مانگے۔ ابا نے اگلے دن ہی دے دیے۔ امین بھائی صاحب نے موٹر سائیکل کی فرمائش کی ۔ وہ بھی ابا نے قسطوں پر لے کر دی۔ قسطیں ابا ادا کرتے رہتے ہیں۔ آپ منع بھی نہیں کرتیں۔ کہ کم از کم اپنی ضروریات کے لیے ہی کچھ بچا کر رکھیں۔" سخت غصے میں تھی شازیہ۔

"میں منع کروں؟ کبھی ایسا نہیں کیا۔ ویسے بھی میں بری مشہور ہو چکی ہوں۔ میں نے انہیں کبھی اپنوں پر خرچ کرنے سے منع نہیں کیا۔ اپنے لیے بھی کبھی مانگا نہیں۔ جو مل جاتا ہے وہ میرے لیے کافی ہے۔ اور اب تو۔۔ اللہ میرے بچوں کو سلامت رکھے۔ وہ میرے لیے کافی ہیں۔"

بہت صابر شاکر اور مطمئن خاتون تھیں۔

"بچے تو اب آپ کے لیے کافی ہیں۔ پہلے تو آپ ہی بچوں کے لیے ناکافی تھیں۔ نہ کسی اچھے اسکول کالج میں پڑھایا۔ نہ ہماری خواہش کوئی پوری ہوئی۔ ہم چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے ترستے تھے۔" شازیہ کے لہجے میں حسرتیں نوحہ کناں تھیں۔ ماں نے بیٹی کا ہاتھ تھپکا۔

"ابا نے بینا باجی کو میڈیکل میں داخلہ کروایا۔ ان کی تعلیم کا پورا خرچا برداشت کیا۔ ہم بینا باجی ثمینہ باجی اور اسد اللہ سعد اللہ بھائی کی ڈریسنگ اور شان دیکھا کرتے۔ کیسے اسکول کالج گاڑی میں بیٹھ کر جاتے تھے۔ جس گاڑی کا ایک ایک پرزہ ابا کی کمائی سے آتا تھا۔ ہم سب بسوں میں لٹک کر جاتے۔ میرے لیے تو اب وین لگوائی ہے۔ آپ نے کبھی ہمارے لیے بھی کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ کبھی احتجاج نہ کیا۔ ہمیشہ صبر کرنے کا درس دیتی رہیں۔"

"اچھا اچھا۔ چپ رہو۔ جو تربیت میرے ماں باپ نے کی۔ میں نے تم لوگوں کو وہی منتقل کی۔ جو مجھے سکھایا۔ وہ میں نے تم کو سکھایا۔"

"جی ہاں۔۔ یہی سکھایا ہے۔ کہ ظلم برداشت کرو۔ ناانصافی صبر کے ساتھ قبول کرو۔ حدیث میں ہے کہ ظلم سہنا بھی ظلم کا شریک ہونا ہے۔ آپ بھی ظالموں میں شریک ہیں۔"

"اور۔۔ شوہر کی اطاعت تابع داری کا بھی حکم ہے۔" آواز میں کمزوری تھی۔

"تو ٹھیک ہے۔ آپ تابع داری کرتی رہیں۔ ناانصافی برداشت کریں۔ اولاد چاہے باغی ہو جائے۔ پھر کسی سے شکوہ نہ کریں۔" شازیہ ہاتھ جھٹک کر کھڑی ہو گئی۔

"بغاوت کی تعلیم نہ میں نے دی۔ نہ ایسی تربیت کی۔ نہ ہی میں برداشت کروں گی۔ سن لو۔"

"امی۔ وقت بدل گیا ہے۔" شازیہ اب نرمی سے بولی۔ "اب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ذہن بدل گئے ہیں۔ ترجیحات بدل گئی ہیں۔ اس پر غور کریں۔ لڑکیاں جہاز اڑا رہی ہیں۔ آپ نے مجھے پتنگ بھی اڑانے نہ دی

بھی۔ "ہائے حسرتیں۔

"لڑکیوں کو گھر چلانا ہوتا ہے۔ مستقبل کی منصوبہ بندی کرنی ہوتی ہے۔ پتنگ اڑا کر تمہیں کون سی دولت مل جاتی۔" ماں تھیں۔ غصہ انہیں بھی آہی جاتا تھا۔

"دولت مل جاتی۔ سب سے بڑی دولت 'خوشی' تسکین قلب۔ اپنی ذرا سی خواہش معمولی سی تمنا چھوٹا سا ارمان پورا ہونے پر جہان بھر کی دولت ملتی ہے۔ مگر امی۔ آپ نے بھی شاید ایسی کوئی دولت حاصل نہیں کی۔ نہ آپ نے ہمیں کبھی خوش ہونے دیا۔ نہ کبھی اسکول کالج کے کسی پروگرام میں حصہ لینے دیا۔ میرے میڈیکل میں جانے کے نمبر تھے۔ آپ نے لمبے اخراجات کا کھاتا کھول دیا۔ جائز خواہشیں بھی... نامکمل رہیں۔"

"ماں باپ کی تابعدار اولاد۔ کبھی نقصان نہیں اٹھاتی۔ فرماں برداری اور اطاعت کا اسے کبھی نہ کبھی اجر ملتا ہے۔" تسلی دینا ان کا فرض تھا۔

"دل مردہ کر کے۔ حسرتوں کو پال کر۔ جذبات کا خون ہونے کے بعد۔ کچھ ملا تو وہ اجر ہوگا؟ بعد از وقت پھر اس کا فائدہ؟؟"

زخمی نظروں سے ماں کو دیکھا۔ وہ آنکھ چرا کر چھت کو آسمان بنا کر اپنی قسمت تلاش کرنے لگیں۔ وہاں کوئی ستارہ تھا نہ چاند۔ سنگین دیواروں' آہنی چھت میں تلاش سے کیا ملتا؟ حرماں نصیبی۔

موضوع ختم ہو گیا۔ سوچ کا دائرہ سمٹ گیا۔ دکھی اور زخمی لمحے گزر گئے۔

"اب میں اپنے بچوں کی خواہش نامکمل نہیں رہنے دوں گی۔" انہوں نے مصمم ارادہ کر لیا۔

کتنے باصلاحیت فرماں بردار بچے۔ خاندان بھر میں کسی کے بچے ایسے نہ تھے۔ محنتی' صابر' کار گزار۔ اپنی کوشش جدوجہد سے تعلیم حاصل کی۔ حالات دیکھ کر باپ سے کوئی مدد طلب نہ کی۔ ماں حوصلہ بڑھاتی رہتیں۔ اپنی سی کوشش بھی کرتی رہیں۔ ذہین اور شوقین' ہمت' جرات اور صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرتے ہوئے۔ دوران تعلیم چھوٹا موٹا کام کیا۔ بچوں کو ٹیوشن پڑھائی۔ باپ کو خبر تک نہ ہوئی۔ فراز نے کب کیسے ایم بی اے کر لیا۔ خود ایک اچھی معقول جاب حاصل کر لی۔ نہ کوئی سفارش تھی نہ مدد۔ پھر چھوٹے بھائیوں کو بھی تعلیم دلائی۔ ماں کی بے چارگی۔ باپ کی مجبوریاں: (جسے وہ اپنے فرائض کا نام دیتے تھے۔) جانتے تھے' خود انحصاری پر توکل کر کے آگے بڑھتے گئے۔ ابا کی مشکلوں میں اضافہ نہ کیا۔

وہ جو اپنے بڑے پن کے خول میں بند۔ بہنوں بھائیوں کے سر پر اس وقت محبت اور سرپرستی کا سائبان بن گئے تھے۔ جب وہ یتیمی کے دور سے گزر رہے تھے۔ سب کو پڑھا لکھا کر ان کے گھروں تک پہنچا کر فرض ادا کیا۔ لیکن وہ عادت بن گئی۔ بہنوں کے مسائل سے پہلو تہی آسان نہ تھا۔

اپنی اولاد کا وقت آنے تک ریٹائرمنٹ کی مدت آ گئی۔ چراغ تلے اندھیرا والی مثل تھی۔ گھر کا تمام اختیار بیگم کے سپرد کر کے چین کی بانسری بجانے لگے۔ گو کہ اب بھی کچھ نہ کچھ کر کے کما رہے تھے۔ اپنی ضروریات ہی محدود تھیں۔ مگر چھوٹی بہن جو بڑی بہن کی قابل رشک زندگی سے اپنا مقابلہ کرتے کرتے تھک جاتیں بھائی سے امداد لینا اپنا حق سمجھتیں۔

☼ ☼ ☼

"ارے بیگم بھئی گھر میں سناٹا سا ہے۔ بچے بڑے ہو گئے۔ آپ کا دل نہیں چاہتا۔ گھر میں ہلچل ہو۔ بھاگ دوڑ' بچوں کی قلقاریاں ہوں۔"

بیگم رضائی میں روئی بھر رہی تھیں۔ چونک گئیں۔ حیرت' تعجب۔ حد سے زیادہ۔ میاں صاحب اور گھر کے سناٹے کو محسوس کریں۔ کسی معاملے میں سوچیں۔ بے خبر انسان کیسے ہوش میں آیا۔ یقیناً "کسی نے لقمہ دیا ہوگا۔ کسی نے نہیں بھئی بہنیں کافی ہیں۔ دونوں اپنی بیٹیاں لیے آس بھری نظروں سے بھائی کا گھر تک رہی تھیں۔ انہوں نے محسوس کیا تھا۔ بھائی کو بھی کہا ہوگا۔ حیرت تو یہ کہ وہ حسب عادت خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے بیگم سے اشارے بازی کا کھیل کھیل

رہے تھے۔

"آپ کو سناٹا لگتا ہے؟ کوئی نہیں۔ شازیہ اس قدر ہنگامہ مچاتی ہے۔ سہیلیوں کے ساتھ اور بھائیوں کے ساتھ رات کو... آپ گھر میں رہتے ہی کب ہیں۔ جو آپ کو علم ہو۔"

"بھئی۔ بہوؤں کا سوچو' بیٹے ماشاء اللہ برسرروزگار ہیں۔" اشارہ دیا۔

"سوچا ہوا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔" رضائی بھر چکی تھی۔ اب ڈورے ڈالنے تھے۔

"اچھا ٹھیک ہے۔ میں نے بھی سوچا ہے۔ وہ بھانجیاں باقی ہیں۔ تم بھی سوچ لو۔" سبحان اللہ۔ سوچا بھی تو بھانجیوں کے بارے میں۔

"میری بھتیجیاں بھی موجود ہیں۔ مجھے کچھ سوچنے کی ضرورت نہیں۔" اب وہ رضائی کا منہ بند کر رہی تھیں۔ اشتعال کی سرخی چہرے پر چھائی تھی۔

"ایں... ؟ اچھا تو پھر شازیہ کا مراد یا سعد کے ساتھ ہے؟ کیسا؟ سعد وہ چھوٹا لول نمبر۔ فراڈیا۔ بھک منگا۔ ساری عمر ملنگ رہے گا۔" انہوں نے غصے سے چادر کھینچی۔ "آپ سے کس نے کہا ہے جوڑے بنانے کا" میں جہاں چاہوں گی۔ کروں گی۔ بہوئیں بھی اپنی اور بیٹوں کی پسند کی لاؤں گی۔"

"ہاں ہاں ٹھیک ہے۔ بہوئیں تمہاری مرضی کی۔ داماد میری پسند کا منظور؟"

بیگم نے رضائی کا کام ادھورا چھوڑ دیا اور طیش میں آ کر میاں کے نیچے سے بیڈ کور کھینچا۔ جسے وہ اوڑھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بیڈ کور بیگم کے ہاتھ تھا۔ انہوں نے پلنگ کی چادر اوڑھ لی۔ بیگم کے غصے' احتجاج کی پروا نہ کی۔

"بس یہ ٹھیک ہے۔ فیصلہ شازیہ پر چھوڑ دو۔ وہ سعد کو پسند کرتی ہے کہ مراد کو۔" کہہ کر آنکھیں بند کر لیں۔ سوچنے کی ایکٹنگ... ویسے وہ ہر قسم کی ایکٹنگ کر لیتے تھے۔

رات ہو گئی تھی۔ رضائی کا معاملہ ادھورا چھوڑ کر وہ کرسی پر گر گئیں۔ شازیہ' سعد' مراد۔ کمرے کی نیم تاریکی میں میاں صاحب کے خراٹے گونج رہے تھے۔

وہ نیند کی تلاش میں بستر پر لیٹ گئیں۔ جس کی آدھی چادر میاں نے اوڑھی ہوئی تھی۔ بے نیازی کے اظہار میں وہ اپنی لیلن کی چادر میں لپٹ گئیں۔ سعد یا مراد۔ اف بے بسی۔

☆ ☆ ☆

اگلے دن حسب معمول میاں صاحب اپنی پرانی معشوقہ کو لے کر چلے گئے۔ چھٹی کا دن تھا۔ بیٹوں کو کمرے میں لے کر مذاکرات کی ابتدا کی۔ میاں صاحب کی خواہش اپنی ناپسند ہو گی۔ بیٹوں کی رائے۔ اہمیت انہی کی ہوتی ہے۔ جن کی زندگی کا معاملہ ہو۔ انہوں نے اپنی خواہش بھی ظاہر کی۔ مگر رائے دینے کا حق بیٹوں کو ہی دیا۔

"امی! سعد میری کلاس فیلو ہے۔ آپ کو پسند نہ آئی تو میرا ووٹ آپ کی طرف ہو گا۔ لیکن ایک بار ان کے گھر جانا ہو گا۔"

زیاد نے آرام سے کہہ دیا۔ "ابا کی کوئی بات تو ماننی پڑے گی۔ میرے خیال میں سعدیہ خاصی مختلف ہے' چھوٹی پھپھو سے۔ لیکن پھر بھی۔ آپ کی پسند پر مجھے بھروسا ہے۔"

"مجھے تم لوگوں پر بھروسا ہے۔ تم جس سے چاہو۔ جہاں چاہو۔ میں بارات لے کر چلی جاؤں گی۔ اچھی طرح سوچ لو۔"

"میرا ووٹ ابا کی طرف ہو گا۔ یعنی سعدیہ..." زیاد نے کہا۔

"میرا بھی۔" شازیہ نے اعصاب پر بجلی گرائی۔ "مگر میرا ووٹ مراد کے حق میں ہے۔"

وہ ہکا بکا رہ گئیں۔ مراد سے تو کوئی شکایت نہ تھی۔ یوں بھی خاصا معقول اور خاموش طبیعت کا تھا۔ مگر اس کی ماں۔ شازیہ کو ہی ان سے شکایت تھی۔ لیکن جب اس نے خود ہی خطرہ مول لے لیا تو وہ کیا کہتیں۔ مگر بجھ کر رہ گئیں۔ باپ نے بیٹی سے بات کی۔ اس نے دبی زبان سے کہہ دیا۔

"ابا! پھپھو سے میری خاطر بگاڑ پیدا نہ کریں۔ آپ مراد سے بات کرلیں۔"

ابا خوشی سے بے حال ہو کر فوراً" الٹے کھڑے ہو گئے' سر نیچے پیر اوپر۔ شازیہ کو ہنسی آگئی۔ توبہ۔ ابا کتنا جنساتے ہیں۔ اسے یہ خبر نہ تھی کہ زیاد کے سعدیہ کے لیے ہاں کرنے پر وہ لان میں چھلانگیں بھی لگا چکے ہیں۔

☼ ☼ ☼

فراز کے ساتھ ماں بیٹی سجیلہ کے گھر گئیں۔ ان کے بیٹے کی پسند تھی۔ اچھی لگی۔ رشتہ دے دیا۔ اگلی بار دونوں نندوں کو ساتھ لے گئیں۔ سجیلہ کے والدین نے اقرار کرلیا۔ نندیں ہکابکا ہو گئیں۔ ان کے لیے یہ اچانک خبر تھی۔ وہ تو تینوں بھتیجوں کو اپنے داماد تصور کرچکی تھیں۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہوا۔ بھابھی نے اتنا بڑا قدم کیسے اٹھالیا۔ اتنا اختیار کیسے ملا۔ فراز کی خوشی دیکھ کر سمجھ گئیں کہ اب بچوں نے اپنی مرضی سے زندگی کے فیصلے کرنے کی ٹھان لی ہے۔ مراد اور سعدیہ کے لیے بھائی نے اقرار کرلیا۔ بڑی نند ناراض۔۔ چھوٹی خوش ہو گئیں۔

"ابا! پھپھو کو بتادیں۔ شازیہ نے تمہید باندھی۔ میں نے مراد سے بات کرلی ہے۔ میری کچھ شرائط ہیں۔ آپ اور پھپھو دونوں کو منظور کرنا ہے۔ ورنہ پھر یہ بات ختم سمجھیں۔" وہ سنجیدہ تھی۔ ابا لاڈ کے مارے اس کو چمکارنے لگے۔

"ہاں ہاں بولو بیٹا' جو تم چاہو گی ویسا ہی ہو گا۔"

"ابا! میں اس گھر سے جہیز نام کی خرافات لے کر نہیں جاؤں گی۔ جو زیور' کپڑے پھپھو لائیں گی۔ وہی پہنوں گی۔ امی کو بتادیں۔ جو بنایا ہے۔ وہ سجیلہ کو دے دیں۔"

"پاگل ہو۔ مذاق اڑواؤ گی میرا؟" ماں کا دل کانپ گیا۔ "یہ کیسی شرط ہے۔"

"جتنا مذاق آج تک اڑایا جاچکا ہے آپ کا۔ اس سے زیادہ کون اڑائے گا۔ آپ کو تو عادی ہو جانا چاہیے۔"

"دیکھو تمہارے کپڑے زیور بن گئے ہیں۔ سجیلہ کے بھی تیار ہیں۔ فضول شرطوں کے ساتھ زندگی کی ابتدا کرنے کی وجہ بھی بتادو۔ پھر میں اس نقصان کا بتاؤں گی۔ جو شرطوں کے ساتھ تمہارا اچھا کرے گا۔"

"جو آپ بنا چکی ہیں۔ کسی مستحق کو دے دیں۔ اس گھر سے اب وہاں کچھ نہیں جائے گا۔ پھپھو سے ابا بات کریں گے۔ میں نے مراد کو بتادیا ہے۔ جو نقصان باپ کے گھر میں اٹھا چکی ہوں۔ اس سے زیادہ کچھ ہو نہیں سکتا۔ اور جو ہوا۔ اسے میں نوشتہ تقدیر سمجھ کر قبول کرلوں گی۔ آپ سے کبھی شکوہ نہیں کروں گی۔"

ابا نے کس طرح بات کی۔ پھپھو کیسے مان گئیں۔ لیکن خاندان میں یہ خبر عام ہو گئی۔ شازیہ جہیز کے بغیر شادی پر راضی ہوئی ہے۔ فراز اور زیاد کی بری میں ماں نے پورے ارمان نکالے۔ لیکن شازیہ۔ بارات کے ساتھ آئے کپڑوں کے جوڑے میں ہی رخصت ہوئی۔ شازیہ کی بارات فراز کے ولیمہ کے دن تھی۔ پھپھو کا موڈ آف تھا۔ بڑی بہن سے شکوہ کرنا مناسب سمجھا۔

"جہیز کا بہانہ تو شازیہ کے نام پر چل گیا۔ بتاؤ نہ بھابھی نے مجھے کوئی زیور دیا نہ پسٹوئیاں لائیں۔ مراد کی بہنیں تو انتظار کرتی رہ گئیں کہ شازیہ کو نہیں۔ تو ان کی نندوں کو تو تحفے ملیں گے۔ زیور' کپڑا' بھتی دان۔ کیسی سستی چھوٹیں۔ بیٹا نے ماموں سے کہا تو وہ بولے۔ "بھئی اپنی ممانی سے پوچھو۔" آپا بھابھی اتنی با اختیار کیسے ہو گئیں۔"

"تو وہ جو فراز کی ساس نے بھابھی کو جھمکے دیے تھے۔ انہوں نے کب لیے۔ انکار کیے گئیں۔ کہ جس نے بیٹی دی۔ اپنا کلیجہ نکال کر دے دیا اور ان کے بہت اصرار پر وہ جھمکے بہو کے حوالے کر دیے۔ تو بھلا۔ جب لے لیے تو رکھ لیتیں۔ مگر پھر واہ واہ کیسے ہوتی۔ سب چالاکی ہوتی ہے عورتوں کی۔"

☼ ☼ ☼

زیاد کی شادی ایک سال کے بعد ہوئی تھی۔ اس نے خود وقت لیا تھا۔ جانتا تھا کہ شادی کے اخراجات

شازیہ کو کچھ نہ دینے کے باوجود کافی بڑھ گئے تھے۔ دونوں بھائیوں کی جمع پونجی لگ گئی تھی۔ ابا تو شازیہ کی فہم و فراست پر عش عش کرتے تھکتے نہ تھے اور سب کو خاصی سہولت ہو گئی تھی۔ زیاد نے سوچ لیا تھا۔ سعدیہ کو بغیر جہیز کے بیاہ لائے گا۔ بیچارے ابا پر کیوں بوجھ ڈالے۔ وہ نہیں۔ مگر سعدیہ کا جہیز بلکہ شادی کا کھانا بھی بہن کے گھر کا بھائی ذمہ اٹھائیں۔ تو ابا کو بھی سہولت رہے گی۔ جب میں انہیں بتاؤں گا۔ میری بارات میں میرے گھر کے لوگ ہوں گے لمبا چوڑا مجمع نہیں۔ شربت کے پیالے پر نکاح رخصتی ہو گی۔ پھر ابا کو میری فہم و فراست کا اندازہ ہو گا۔ سوچ کے زور سے ہنس دیا۔

سجیلہ بہت سادہ مزاج اور سنجیدہ تمیزدار لڑکی تھی۔ چند دن بعد ہی اس نے گھر کے کئی کام اپنے ذمے لے لیے۔ اسے اپنے ساس سسر بہت اچھے لگے۔ وہ ان کی خدمت فرض سمجھ کر کرتی تھیں۔ فراز کو خوشی تھی کہ اس کی پسند اس کے ماں باپ کی پسند بن گئی۔ گھر میں سکون تھا۔ زیاد سجاد کے ساتھ سجیلہ کی دوستی ہو گئی تھی۔ دونوں فرمائشیں کر کے نئی نئی ڈشیں بنواتے اور سجیلہ خوش دلی سے ان کی فرمائش پوری کرتی۔

مراد اور شازیہ بھی آتے رہتے تھے۔ وہ بھی خوش مطمئن نظر آتے تھے۔ لیکن مراد کی والدہ خوش نہ تھیں۔ آئے دن شکایت لے کر پہنچ جاتیں۔ کبھی شازیہ کی ڈھٹائی۔ کبھی تھکے پن کا ذکر۔ بھائی تو ایسے لاپروا ہو گئے۔ وہ بہن کی شکایت کر رہی ہیں۔ وہ کرسی پر نیم دراز ٹانگ ہلاتے گنگنا رہے ہیں۔ ”آئے موسم رنگیلے سہانے۔“

بے چاری بہن بھابھی سے ہی مخاطب ہونے پر مجبور۔

”بھابھی! آپ نے شازیہ کو تمیز نہیں سکھائی۔ کمرہ بند کیے ٹی وی دیکھتی رہتی ہے۔ کوئی آئے۔ کوئی جائے۔ اس کی بلا سے مہمان آ کر چلے جاتے ہیں۔ میں ہی سب کے ساتھ مغز ماری کرتی ہوں۔ میری سسرال میں سب میرا مذاق اڑاتے ہیں کہ بڑے چاؤ سے بھتیجی لائی تھیں۔ جو پھوپھی کو گھاس نہیں ڈالتی۔“

”چلو مذاق اڑانے کا ذائقہ تو چکھا۔“

”لوگ کہتے ہیں۔ دان دہیز لائی نہیں پھر کس بات پر ناز ہے۔ مجھ سے لوگ کہتے ہیں تمہارے بھائی کیا دیوالیہ ہو گئے ہیں۔ کنگال ہو گئے کہ جہیز کا تنکا نہ دیا اور سنو۔ کل میرے منہ پر جھلا گئی کہ میں نے اس کی ہر شرط مان کر شادی پر ہامی بھری۔ بھلا شرطوں سے شادیاں کامیاب ہوتی ہیں۔ بیٹی کا جہیز تو رسول اللہ نے بھی دیا تھا۔ چاہے مٹی کا پیالہ ہو یا بورے کا بستر۔ تو کہتی ہے وہ جہیز نہیں تحفہ تھا۔ شادی کے ذمے دار مرد ہوتے ہیں۔ اسی لیے حضرت علیؓ نے زرہ بیچ کر اپنے ولیمے کی دعوت کی۔ ترکی بہ ترکی جواب دیتا تو اس نے اپنا وتیرہ بنا لیا ہے۔ بھابھی آپ اسے سمجھائیں۔ سسرال میں رہ کر ساس سے بیر رکھنا نیک شگون نہیں۔“

پہلے تو نند تھیں۔ اب سمدھن بن گئی تھیں۔ بیٹے کی ماں تھیں۔ دباؤ ڈالنا ان کا حق تھا۔ مگر بھابھی نے تو کبھی اپنے حق کے لیے منہ نہ کھولا تھا مگر شرہا حضوری۔

”اچھا۔ میں سمجھاؤں گی۔“ کہہ کر خود چور بن جاتیں۔ بیٹی کو سمجھانا بھی ایک مسئلہ۔

”آپ ان سے کہہ دیں۔ میری شکایتیں آپ سے نہ کریں۔ کیونکہ یہ شادی آپ کی مرضی سے نہیں۔ میری مرضی سے ہوئی ہے۔ تو مجھ سے ہی کہا کریں۔ میں خود جواب دوں گی۔“

”کیا جواب دو گی۔ ساس سے لڑو گی؟ لڑکی میری تربیت پر الزام آیا۔ تو یاد رکھنا۔“

”یاد ہے آپ کو بھی یاد ہونا چاہیے۔ وہ پہلے میری پھپھو پھر ساس بنی ہیں۔ جو کہتی تھیں۔ پھپھو بھتیجی ایک ذات، ماں بیٹی دو ذات۔ اب بھتیجی بہو بنالی۔ تو اس پر اعتراض نہ میں ان کی اجازت کے بغیر جانے کا نام لوں۔ نہ کسی کو بلاؤں۔ میری کوئی دوست خود آجائے تو اس کے سامنے میری شکایت۔ کچھ بولتی ہوں تو زبان

درازی کا الزام۔ اب مزا چکھیں بھتیجی کے ایک ذات ہونے کا۔ جیسی وہ ہیں۔ ویسی میں ہوں۔ پھر انہیں تکلیف کیا ہے؟ جہیز نہیں لائی۔ اچھا پھر۔"

"بیٹا۔ تحمل بھی کوئی چیز ہے۔ ذرا آرام سے بات کرنا چاہیے۔ بڑی ہیں بزرگ ہیں۔"

"بزرگوں کو بھی اپنے رتبے کا لحاظ ہونا چاہیے۔ آپ نے ان کی ہربات مان کر۔ زیادتیاں برداشت کر کر کے عادی بنا دیا۔ مگر میں اپنی ذات پر غلط حرف برداشت نہیں کروں گی۔"

وہ پہلے ہی بھتیجی ہونے کے ناتے ان سے ناخوش تھی۔ اب ماں کے نصیحت کرنے پر بھی اپنی ضد پر اڑی رہی۔ جب انہوں نے کہا۔ "تم عزت دو گی۔ تو تمہاری عزت ہوگی۔"

"ٹھیک۔ مل گئی عزت۔ آپ نے کرلیا سب کا لحاظ۔ مروت عزت کون سی عزت آپ کو ملی؟"

"تو یہ کیا ذلیل ہے۔ ارے میرا کیا ذکر۔ گزر گئی میری زندگی۔ ہوش میں تو۔ اپنی فکر کرو۔"

"اپنی ہی ذات کے لیے لڑ رہی ہوں۔ اپنی شخصیت منوانا چاہتی ہوں۔ ہوش حواس درست ہیں میرے۔ اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہو۔ عزت افتخار اور اختیار کے ساتھ۔"

"عورت کو کچھ نہیں ملا کرتا۔ یہ چند خوش کرنے والے الفاظ ہیں۔ عمل کے لیے نہیں۔"

"جدوجہد پر یقین رکھتی ہوں میں' آپ نے ہتھیار ڈال دیے۔ میں ایسا نہیں کر سکتی' یاد رکھیے امی! دبنے والے کو سب دباتے ہیں۔ جو جھک جاتا ہے۔ اسے مزید جھکایا جاتا ہے۔ قدر کوئی نہیں کرتا۔"

"پتا نہیں۔ کہاں سے یہ سبق سیکھا ہے۔"

"سچ ہے۔ یہ تربیت آپ کی نہیں ہے۔ آپ سے تو سر جھکانا سیکھا تھا۔ مگر دنیا نے کچھ اور ہی نقشہ پیش کیا۔ اپنے احساس سے تعلیم لی۔ ضمیر سے غور لیا۔ وہ ضمیر جو زخمی تھا۔ مگر زندہ۔۔۔ ہر بار جب مرضی کے خلاف سر جھکایا۔ ضمیر زخم کھاتا رہا۔ آخر۔۔۔ میں نے ہمت پکڑی۔ کیا غلط کیا؟ ہر کسی سے خوف کھانا۔ دب جانا۔ اپنی ذات کے وقار کی تذلیل' آپ نے اپنے حق کے لیے آواز نہیں اٹھائی۔ نتیجے میں کیا ملا۔ بتایئے؟"

"میرا ذکر چھوڑو۔ دوسری عورتوں کو دیکھو۔ فرق محسوس کرو۔"

شازیہ نے دنیا سے ہی سبق لیا تھا۔ فرق محسوس کیا تھا۔ تبھی بے باکی سے جواب دیتی تھی۔ ماں کو قائل نہ کر سکی۔ یا قائل ہونے کے باوجود وہ عادت کے مطابق جذبات پر پردے ڈال کر سامنے سے ہٹ گئیں۔ لیکن ان کی آنکھوں کے چمکتے ستارے موتی بن کر ٹپک پڑے۔ شازیہ افسردگی سے دیکھتی رہی۔ میری عظیم ماں۔ اپنی ہستی کی قدر کر سکی۔ نہ کروا سکی۔ اور ماں کا دل بیٹی کے لیے دکھ رہا تھا۔ اگر یہ نئے دور کی دلیر اولوالعزم لڑکی۔ اپنے مقاصد کے حصول میں ناکام رہی۔ لوگوں نے اسے ناکام کر دیا۔ تو۔۔۔ یہ ہار جائے گی۔ زندگی کی بازی ہارنا۔ موت کو دعوت دینا ہو گا۔ یہ ناتجربے کاری اسے مہنگی پڑ جائے گی۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آج نہیں آ رہی اور جب سمجھ میں آیا۔ کہیں دیر نہ ہو جائے۔

شازیہ اتنی نادان نہ تھی۔ لیکن نئے دور کی سمجھ دار لڑکی تھی۔ لیکن وہ ماں جیسی متانت اور سنجیدگی مصلحت میں لپٹی اطاعت کہاں سے لاتی۔ سچی کھری بے باک مستقل مزاج شازیہ۔ اس نے اپنی ذات کے وقار کی حفاظت کے ساتھ اپنی ماں کی کھوئی ہوئی عزت بحال کرنے کا بیڑہ اٹھایا تھا۔ ماں کی جھکی ہوئی گردن کو فخر سے اونچا کرنے کا عزم۔ ان کے ایثار اور عظمت کا اقرار۔

وہ بیٹی کا فرض ادا کرتی رہتی تھی۔ ماں کی حمایت کر کے۔ ان کی قربانیاں یاد دلا کر۔ کبھی تو یہ لوگ اقرار کریں گے۔ اظہار پر مجبور ہوں گے اور نہ بھی ہوں۔ وہ ثابت کرنا چاہتی تھی لوگ مانیں۔ احساس کریں۔ اقرار پر مجبور ہو جائیں۔ عورت جو اللہ کے نزدیک عزت کے قابل تھی۔ اللہ نے اسے رحمت کا لقب دیا۔ پھر اسے ماں کی عظمت بخشی جس کے قدموں تلے اولاد کے لیے جنت کی نوید دی۔ پھر اس کو ہر دفعہ ہر

جگہ کمتر ہی سمجھا گیا کیوں؟ میری ماں عظیم تر ہے۔ دوسروں کے لیے قربانی دینے والی اپنی ذات کی پروانہ کر کے دوسرے لوگوں کی خدمت کرنے والی پھر بھی۔۔۔ پھر بھی اسے کوئی بلند درجہ نہیں دیتا۔ ظلم تھا کہ نہیں۔

✲ ✲ ✲

اس دن میاں صاحب کو گھر میں چلتا پھرتا دیکھ کر حیرانی ہوئی۔ فراز نے بیوی کو اشارہ کیا۔ اس نے پوچھ لیا۔

"ابا آپ کو آج جانا نہیں۔ سائیکل بھی اب بہت پرانی ہو گئی ہے۔ آپ "ان" کے ساتھ چلے جائیں۔" وہ فراز کو "ان" "ان" سے ہی کام چلاتی تھی۔ اسے شوہر کا نام لے کر پکارنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ شرم آتی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ (کوئی نصیحت یا اپنے گھر کی روایت)

"نہیں اگر جانا ضروری ہوتا تو فراز کے ساتھ چلا جاتا۔ مگر آج گھر میں رہنا ضروری ہے۔" عجیب پُراسرار سا رویہ اور غیر متوقع جواب۔ فراز کے ساتھ جانے کا مطلب۔ الجھن سے نجات؟ یا کوئی اور فیصلے کی نوید۔

"بیگم! میرے لیے ذرا چائے تو بنانا۔" اٹھ کر بیگم کے کمرے میں آ گئے۔

"ابا میں بنالی ہوں۔ آپ بیٹھیں۔" خدمت گزار بہو فوراً باہر سے ہی بولی۔

"رضیہ۔۔۔ اور شازیہ میں کوئی معرکہ ہو گیا ہے۔ یعنی کہ پھڈا اسٹنا۔ یعنی کہ فساد۔" عجیب زبان کا گورکھ دھندا بنا کر منہ بگاڑ رہے تھے۔ بیگم سکتے میں آ گئیں۔

"آپ۔۔۔ آپ جائیں" آپ کی بیٹی۔۔۔ میں الگ رہوں گی۔ سن لیں۔"

ان کو کمرے میں ہی براجمان دیکھ کر بیگم نے مناسب سمجھا کہ وہ کم از کم اپنی موجودگی کو اس فساد سے دور رہنے سے آگاہ کر دیں۔

"آپ۔۔۔ دوسرے کمرے میں چلے جائیں سجیلہ کو بتا دیں۔ چائے کھانا یا کچھ بھی وہ بنا دیں گی۔ مجھے بہت ضروری کام کرنا ہے۔ مجھے نہ بلائیں۔"

فرماں برداری کے ریکارڈ برابر کرتے ہوئے میاں صاحب چلے گئے۔ ڈرائنگ روم بہتر جگہ تھی۔ بیگم اپنی جگہ دم بخود بیٹھی رہیں۔ وہ پیدا ہوئیں تو گھر والوں پر مایوسی کے بادل چھا گئے تھے۔ بیٹے کی آمد کے منتظر باپ دلوی۔ اس عورت کے جذبات کا لحاظ کیے بغیر (جس نے اذیت ناک وقت گزار کر اپنے خیال میں قابل فخر معصوم فرشتہ تحفے میں دیا تھا۔ فرشتہ نہ سہی فرشتی تو تھی وہ پیاری سی گڑیا) گھر والوں نے برملا ناپسندیدگی کا اظہار کر کے اس ماں کے جذبات کو ٹھیس پہنچائی تھی۔

دادی نے اس کا نام حنا رکھ دیا تھا۔ نانا نے اعتراض کیا۔ یہ کیسا نام ہے؟ معنی مطلب۔ کچھ نہیں سوچا۔ مہندی کے پتے۔ پکارنے میں بھی کچھ۔۔۔ مناسب نہیں۔ مگر دادی کا آرڈر نام بدلا نہیں جا سکتا۔ رکھ دیا۔ سو رکھ دیا۔ دادی کو لڑکی ذات سے چڑ (اپنی بیٹیوں سے نہیں) نانا کو نام پسند نہیں۔ بچپن سے یہی سن سن کر بڑی ہو گئیں۔ چھوٹے بہن بھائیوں کی دیکھ بھال، گھر کے کام اماں ابا کی خدمت۔ کسی کو ان کی ذات سے دکھ نہ پہنچے یہی کوشش کرتے کرتے جوان ہو گئیں۔ اور شادی ہوئی تو بھری پُری سسرال کی خدمت گزاری۔ شوہر بھی اسی عادات کے ملے۔ بہنوں بھائیوں کے خدمت گزار۔ سب کے مسائل کے حل کنندہ۔ وہ بھی شوہر کے تعاون پر کمربستہ ہو گئیں۔ گھر کے امن سکون۔ خوشیاں برقرار رکھنے میں کوشاں۔ بہن بھائی کی محبت میں کہیں ان کی وجہ سے رخنہ نہ پڑے دل پر جبر کر کے بیٹی حوالے کر دی نند کو۔

اب یہ چار دن کی لڑکی ان کو عقل سکھا رہی ہے۔ منہ زور ہے۔ باغی ہے۔ اس کی بغاوت میں بہرحال وہ حصہ دار تھیں نہ بننا چاہتی تھیں۔ اپنی من مانی کر لی۔ بغیر جہیز کے دندناتی ہوئی سسرال پہنچ گئی۔ پھر چاہتی ہے کوئی اسے کچھ نہ کہے۔ بھئی زبان پکڑنے کی چیز نہیں۔ چلانے کی ہوتی ہے۔ لوگ باپ کا نام لے رہے ہیں۔ ننھیال میں ابھی تو ماں کا قصور سمجھ رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے پھر زبان سے بھی کہیں۔ ساری نیک نامی بنی بنائی برسوں کی عزت خاک میں مل جائے گی۔ میاں

صاحب کو تو ان کی بہنیں اور بھائی فرشتہ سمجھتے تھے۔ وہ بھلا ایسا کام کیوں کریں گے۔ (بہنوں کے خیال میں) جس سے بہن خسارے میں ہو۔ شازیہ ان کے نام پر معترض تھی۔

"آپ کے نانا نے درست اعتراض کیا تھا امی۔ حنا یعنی کہ مہندی کے پتے۔ یہ بھی کوئی نام ہوا۔ سوکھے پتے۔ رنگ اور خوشبو تو اس میں جب آتا ہے جب وہ پستی ہے۔ سوکھے پتوں میں کوئی رنگ نہ مہک نہ حسن یہ بھلا نام ہے۔ خصوصیت ہے۔ پستی ہے تو رنگ لاتی ہے۔"

"اچھا جی۔ تمہارے ابا کا تو نام رشید ہے۔ وہ بھی شروع سے ہی پس رہے ہیں۔ وہ کس لیے۔ پستے ہی چلے جا رہے ہیں فرائض کے بوجھ تلے۔"

"وہی تو روکنا چاہتی ہوں۔ بس بہت ہو گیا۔ اب آزاد ہونا چاہیے۔ کم از کم میں اپنے سسرال کے فرائض سے ابا کو آزاد کرواؤں گی۔ اور آپ کو بھی۔"

نہ جانے کیا کیا منصوبے تھے اس کے ذہن میں۔ ہوش سنبھالتے ہی اپنے ماں باپ کو دوسروں کی جی حضوری کرتے دیکھنا اسے ناگوار گزرتا تھا۔ صبح ہو یا رات کوئی کہیں سے بھی آواز دیتا۔ ابا لبیک کہتے ہوئے چل پڑتے۔ وقت کے تقاضے کا لحاظ کیے بغیر۔ بہنوں بھائیوں پر نثار ہونے کو بے تاب جیسے آقا حکم دیں غلام حاضر۔ کوئی ماں بھی شاید اولاد کے لیے یوں نہ تڑپ کر کہیں جاتی ہو گی۔ جیسے ابا ہر کام اہم ضرورت چھوڑ کر۔ امی تھیں تو ہر کسی کی خدمت میں حاضر۔ کوئی ہسپتال میں کسی وجہ سے داخل ہو گیا۔ زمانے بھر میں کوئی مریض کا ساتھ دینے کو نہ ملتا۔ امی تو ہر وقت مل سکتی تھیں۔ پھر بچے شوہر سب اللہ کے حوالے۔ امی کو تو کسی بات پر انکار کرنے کی جرأت نہ ہوتی۔ البتہ میاں صاحب کے لیے کبھی بول پڑتیں۔ مثال کے طور پر۔ وہ دن بھر کہیں کام کر کے شام کو گھر آئے۔ تھکن اتارنے کو لیٹے تو نیند آ گئی۔ بہن کا فون آیا۔ تو سوئے ہوئے دس منٹ ہوئے ہوں گے۔

"بھابھی! بھائی کہاں ہیں۔ بلائیں ذرا۔"

بھابھی حکم کی بندی۔ مڑ کر دیکھا۔ سوئے ہوئے تھے۔ اٹھانے کا دل نہ چاہا۔

"اصل میں ارشد کے ایک دوست آسٹریلیا سے آئے ہیں۔ کراچی کل پہنچے۔ اب وہ ٹرین سے آ رہے ہیں۔ انہیں لینے کے لیے ارشد کو اسٹیشن جانا ہے۔ ٹرین لیٹ ہے۔ کمبخت رات کے ڈیڑھ بجے آ رہی ہے۔ ارشد کا اکیلے اسٹیشن جانا مناسب نہیں۔ بھائی ساتھ چلے جائیں گے تو مجھے تسلی ہو گی۔ دیکھیں نا۔ بارش کے آثار ہیں۔ رات کو کہیں گاڑی خراب وراب ہو گئی۔ تو ارشد اکیلے کیا کریں گے۔ بھابھی جلدی سے بلائیں نا بھائی کو۔" تحکم تھا آواز میں۔

"آج دفتر میں کام بہت تھا۔ تھکے ہوئے تھے۔ سو گئے ہیں۔ تم سعد یا اسد کو بھیج دو۔"

"لو۔ بچوں کو بھیج دوں۔ بھابھی حد ہے۔ میاں کی وجہ سے فکر مند ہو رہی ہوں۔ بچے کی خاطر تو۔ مر ہی جاؤں گی۔ صبح انہیں کالج جانا ہو گا تو۔ بھائی کہاں ہیں۔ آپ انہیں بلائیں۔ میں خود ان سے کہوں گی۔ آپ تو کہیں گی نہیں۔" چڑ کر بولی تھیں۔

ہاں جیسے بھائی تو بڑے سورما ہیں۔ "فجر کے وقت کے جاگے ہوتے ہیں۔ آج آفس میں بھی دیر ہو گئی۔ کچی نیند ہے۔"

آخر خدمت گزار بیوی تھیں۔ شوہر کے آرام کا خیال رکھنا فرض تھا۔ مگر بہن کو ان کے آرام سے کیا۔ اپنے ننھے منے شوہر کی فکر تھی کہ اسٹیشن کے راستے میں تنہا دیکھ کر کوئی چڑیل۔ بھوت پریت نہ لپٹ جائے' اور جن کے آرام کی خاطر بیوی سچائی بیان کر رہی تھیں۔

وہ فون کی گھنٹی اور بیگم کے دبے لہجے ہلکی آواز سے ہی سمجھ گئے۔ نسطور جن کی طرح بہن کی خدمت میں جا حاضر ہوئے۔ حکم کے غلام۔ مگر ناگواری سے کہتے گئے۔ "دوست بھی ارشد جیسا باگڑ ہی ہو گا۔ بڑا لاٹ صاحب ہے جیسے۔ آسٹریلیا سے کراچی آیا۔ یہاں بھی جہاز سے آ جاتا۔ بارش میں اگر میرا کوٹ بھیگا۔ اسی سے وصول کروں گا۔"

نند میں جھومتے جھامتے۔ سائیکل سنبھال رہے تھے۔ اللہ خیر کرے۔ بارش، رات کا وقت، سائیکل، اف۔ بہن جانتی ہیں بھائی کو کار الرجی ہے۔ مگر غلام کو حکم دینا ہی فرض تھا اب کمر گردن سہلاتے۔ اسٹیشن جائیں گے۔ جل کر اپنا کلیجہ بھون رہی تھیں۔ فضول جاگتی رہیں۔

وہ بہن کے گھر جا کر سو گئے۔ بے چارے ارشد میاں اکیلے ہی دوست کو لینے گئے۔ دل خوش ہو گیا۔ پھر توبہ کرتی رہیں۔ توبہ میں اتنی کینہ پرور نہ تھی۔ کیا ہو گیا ہے مجھے۔ یہ سب شازیہ کے بار بار اکسانے والے الفاظ نے میرے ذہن کو متاثر کر دیا۔ ورنہ پہلے تو میں بلا عذر سب کی بات مانتی تھی۔ کسی کے ساتھ ہاسپٹل میں رہنا ہو کسی کو شاپنگ پر لے جانا ہو۔

سب کی لڑکیوں کے کان ناک چھیدنے کے لیے مجھے بلایا جاتا۔ میں فخریہ یہ کام کرتی۔ شازیہ کہتی ہے۔ وہ اپنے پیسے بچاتی رہیں۔ آپ سے غلامی کرواتی رہیں۔ کسی کا بچہ گر کر یا کسی طرح زخمی ہو جائے۔ تو اس کی مرہم پٹی مجھ سے کرائی جاتی۔

(اسپتال میں پیسے خرچ ہوتے ہیں۔) کوئی اضافی اخراجات کے لیے تیار نہ تھا۔ میاں رشید اور حنا سلطان موجود ہیں پھر۔

"آج تو رضیہ شازیہ آ رہی ہیں۔ ایک کو بھائی پر اعتماد ہے۔ دوسری کو باپ سے انصاف کی توقع۔ اللہ رحم کرے۔" انہوں نے نفل کی نیت کی اور اللہ کے حضور حاضر ہو گئیں۔ معاملہ خاصا گمبھیر تھا۔ مدد مانگنا ان پر لازم تھا۔ ہمیشہ کسی بھی الجھے معاملے میں یہی کرتی تھیں۔

"ابا۔ میں اپنی مرضی کی زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔ اپنے لیے خود فیصلہ کرنا میرا حق ہے۔ بینا باجی ہسپتال میں سروس کر سکتی ہیں۔ میں کیوں نہیں؟"

"بیٹا۔ وہ تو ڈاکٹر ہے۔ اس کا تو فرض ہے مریضوں کا علاج کرنا۔ اتنا پیسہ اور محنت گھر بیٹھ کر ضائع تو نہیں کرے گی۔" ابا بہن کے اشاروں کے پابند۔

"جب میں نے میڈیکل کی خواہش کی۔ تو آپ نے عذر کر دیا۔ ان دنوں آپ سعد اللہ بھائی کی فیسیں بھر رہے تھے۔ جو ہر سال فیل ہو کر یونیورسٹی کا ریکارڈ قائم کرنے کے چکر میں تھے۔ پھر مراد کی تعلیم بھی آپ کے ذمے ہو گئی۔ بینا باجی کو آپ پہلے ہی پڑھا کر ڈاکٹر بنا چکے تھے۔ میرے لیے آپ کے پاس فیس کا ایک پیسہ نہیں تھا۔ خیر جب میں اپنی محنت اور اپنے بھائیوں کی مدد سے پڑھ لکھ گئی۔ تو مجھے کام سے روکا جا رہا ہے۔ میں اپنے بھائیوں کی محنت مشقت کی رقم اپنی رات دن کی محنت ضائع کر دوں؟"

"بیٹا وہ تو اس لیے۔۔۔ تمہیں ضرورت کیا ہے؟ مراد کی خاصی تنخواہ ہے۔"

"وہ تنخواہ میرے لیے نہیں ہے۔ میں کیا اپنی ضرورت کے لیے اب بھی بھائیوں سے مانگوں؟"

"رضیہ۔۔۔ یہ کیا کہہ رہی ہے۔" ابا یوں چونکے۔ جیسے جانتے نہ ہوں۔ بہن کی پالیسی۔ "اور ابا۔ آپ سے تو میں مانگوں گی نہیں۔ کیونکہ اس کی عادت ہی نہیں ہے۔ کبھی آپ نے کچھ دیا ہی نہیں۔ سعد اللہ بھائی کی انجینئرنگ سات سال میں ہوئی۔ مراد ہر سال سبجیکٹ بدل کر نئے سرے سے کلاس جوائن کرتے رہے۔ اس کی سزا ہم بہن بھائیوں کو دی گئی۔ ہم آپ کے آسرے پر آپ کی توجہ چاہتے۔ آپ کی جیب خالی ملتی۔"

"لڑکی ہوش میں رہو۔" ساس نما پھوپھو نے گھُرکا۔

"بہت کر لی تقریر۔ یہ نہ بھولو کہ تم اب میرے گھر میں ہو۔ ہم نہیں چاہتے کہ تم در در کی ٹھوکریں کھا کر دفتروں کے چکر لگاؤ۔ مردوں کے ساتھ کام کرو۔ تمہاری عزت عزیز ہے۔ اس لیے چاہتے ہیں گھر سنبھالو۔"

"بینا باجی بھی تو مردوں کو چیر پھاڑ کرے۔ ان سے کہیے۔ گھر بیٹھیں۔ میں بھی گھر سنبھال لوں گی۔"

"دیکھ رہے ہیں بھائی۔ بچی کی زور آوری۔" دانت کچکچائے۔ "آپ سمجھائیں اس طرح گھر نہیں بسائے جاتے۔ عقل کے ناخن لے۔ تعلیم یافتہ ہونے کا ثبوت دے۔"

(بھائی ٹک ٹک دیدم' دم نہ کشیدم کی عملی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ ان کے سکوت پر بہن کو غصہ آرہا تھا۔)

"تعلیم یافتہ ہونے کے ثبوت کے لیے ہی جاب کرنا چاہتی ہوں۔ اپنی شخصیت منوانا حق ہے میرا۔"

ارے بھتیجی تو بہت ہی زور آور ہے۔ بھائی کو کیا ہو گیا۔ یعنی نافرمانی۔ ہر معاملے میں تم میری نافرمانی کرتی رہی ہو۔ چاہتی کیا ہو آخر۔"

"بتا رہی ہوں ناں۔ اپنی مرضی سے زندگی گزارنا۔ زندگی سنوارنا۔ گھر کی قید سے نجات۔ مستقبل کی پلاننگ۔ اپنی صلاحیتوں کا اظہار۔"

دوسرے کمرے میں فکر مند اماں گھبرا کر کھڑی ہو گئیں۔ آواز بلند تھی۔ وہ چپکے سے لاؤنج میں آگئیں۔ یہاں آوازیں قدرے صاف تھیں۔

"اوہو۔ تو یہ کہو۔ تمہیں گھر قید خانہ لگتا ہے۔ آزادی چاہتی ہو۔" پھپھو کی آواز بلند بھی تھی۔ کرخت بھی۔ اور وہ بھلا اس چار دن کی لڑکی سے کیوں ڈریں۔

"اس آزادی کی قیمت کیا ہے؟ جانتی ہو؟ تمام عمر کی آزادی۔ مراد نہیں چاہتا اس کی بیوی گھر سے باہر نکلے تو۔"

"آپ نہیں چاہتیں۔ آپ مراد کو ورغلاتی ہیں۔ میں آپ کے تسلط سے آزاد زندگی کی طلب گار ہوں۔ برسہا برس آپ نے میری ماں پر حکومت کی ہے۔ مگر میں وہ نہیں ہوں۔ ڈرنے والی ہوں نہ دبنے والی۔ آپ چاہیں ساری عمر کی آزادی دلوادیں۔"

لف یہ لڑکی۔ ماں کی تربیت پر بٹہ لگائے گی۔ اماں جان تھرا گئیں۔

"بھائی! آپ خاموش کیوں ہیں؟" بہن بھنا گئیں۔ بھائی کی خاموشی تو دیکھو۔ "اف۔ لگائیں ایک تھپڑ۔ یہ تمیز سکھائی ہے بھابھی نے۔ یہ کیسی تعلیم ہے۔ اس سے بہتر تو ہمارے گھر کے نوکر ہیں۔ گھرکی سن کر بھی آواز نہیں نکلتی۔" غصہ اشتعال۔

"تو ٹھیک ہے۔ نوکر ہی سوٹ کرتے ہیں آپ کو۔ وہ شیداں ہے ناں اسے بہو بنا کر لے آئیں۔ ڈانٹتی رہیں۔ مگر یاد رہے۔ بہو بن کر وہ بھی بولے گی۔ آپ نے سنا تو ہو گا پھپھو۔ دب کر تو چیونٹی بھی کاٹ لیتی ہے۔ اور اپنی بھابھی کو الزام کیوں دیتی ہیں۔ انہوں نے تو خود آپ کی غلامی چاکری میں زندگی گزاری ہے۔ آپ کو اسی حاکمانہ نظام کی عادت ہے۔ مگر میں حنا سلطان نہیں۔"

تڑاتڑ جواب۔ حنا سلطان شدت شرم سے پانی پانی ہو گئیں۔ میری بچی؟

"تو پھر کر لو فیصلہ۔ اس دیدہ دلیری کے ساتھ تم میرے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔"

آگ بگولہ ہو رہی تھیں۔ شاید بے بسی نے جکڑا ہوا تھا۔ حنا سلطان کا جی چاہا اندر جا کر نند کے سامنے ہاتھ جوڑ کر معافی مانگیں۔ مگر قدموں میں جنبش نہ ہوئی۔

"چلیے پھر۔ آج سے میں یہیں رہوں گی۔" اف کیسا مطمئن لہجہ تھا۔ یہ لڑکی پاگل تو نہیں ہو گئی۔ اسے تو فرشتوں سے نصیحت ملنی چاہیے۔

"میرے بھائی کے گھر میں بھی۔ میری مرضی چلتی ہے۔ سوچ لو۔" آخر سچ منہ سے نکل گیا۔

"جی۔ بچپن سے دیکھ رہی ہوں۔ باپ کی غلامی۔ ماں کی بے بسی۔ میں ہی نہیں پورا خاندان دیکھتا ہے۔"

"بھائی جان!" تلملا کر فریاد پر اتر آئیں۔ بے چاری ساس۔ "سن رہے ہیں آپ۔ یہ بدزبانی۔ بے باکی۔ یہ دیدہ دلیری۔ ساس سمجھ کر ہی لحاظ کر لے۔"

"لحاظ ہی کر رہی ہوں پھپھو۔ ورنہ میرے اندر جو محرومیاں ہیں۔ مایوسیاں ہیں۔ جو بے مائیگی کے زخم ہیں آپ لوگوں کے دیے ہوئے۔ ان کے لیے کچھ احتجاج نہیں کروں گی۔ آج تو میں اپنی ذات کے لیے آ گئی ہوں۔ ابا کی عدالت میں پیشی لے کر۔ حاضری لے کر آپ چاہیں تو اپنے گھر سے نکال دیں اور چاہیں تو اپنے بھائی کے گھر سے بے دخل کر دیں۔ اپنے اقتدار اور طاقت کو استعمال کر کے۔ اتنا تو سمجھتی ہوں۔ آپ کے حکم پر ابا کو میرے فٹ پاتھ پر فقیروں کی طرح جا بیٹھنے پر بھی اعتراض نہ ہو گا۔ ہمیشہ ان کی اولاد قدموں میں ہی پڑی رہی۔ بھانجے بھتیجیاں سر پر۔ ہمیں تو

حقوق میں صرف حقارت ملی۔ کسی کو ہم نظر ہی نہیں آئے۔ ابا نے کبھی پوچھا نہ دیکھا۔ بیٹے کیا پڑھ رہے ہیں، کیسے پڑھ رہے ہیں۔ بغیر باپ کی مدد اور تعاون کے کہاں سے فیسیں دے رہے ہیں۔ جی آج بتا دوں۔ چھٹی کے بعد سڑک پر گاڑیوں کے شیشے صاف کر کے۔ اخبار کے دفتر سے شام کے اخبار گھر گھر بانٹ کر۔ دکان داروں کے نیچ انہیں گھروں سے لا کر پہنچا کر۔ کبھی کبھی بس اسٹاپ پر مسافروں کا سامان سر پر لاد کر ٹیکسی تک پہنچانا اور بھی کئی قابل نفرت کام کر کے۔ خود فراز بھائی نے پڑھا۔ ہمیں پڑھایا۔ اتنی محنت مشقت کی کمائی سے تعلیم حاصل کر کے۔ میں گھر بیٹھ کر آپ کے لیے کھانے پکاؤں۔ مجھ پر اپنے بھائیوں کے احسان کا قرض ہے۔ اسے اس طرح ادا تو کر سکتی ہوں۔" آواز رندھ گئی۔

ابا کا رنگ یک لخت سفید ہو گیا تھا۔ پھپھو گھبرا گئیں مگر ہٹ دھرمی کا مظاہرہ بھی ضروری تھا۔ آخر اقتدار کا نشہ تو تھا۔

"دیکھ لیں نا۔ مراد تو تمہیں بسائے گا نہیں۔"

"وہ تو جی جان سے بسائے گا۔ مگر آپ بسنے نہیں دیں گی۔ ہمیشہ یہی تو کیا ہے آپ نے۔"

اچھل پڑیں۔ "ہائیں ہائیں۔ بھائی کو دیکھنا۔"

وہ ڈبڈبائی آنکھوں سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔

لاؤنج میں کھڑی حنا سلطان لڑکھڑا کر کرسی پر گریں۔ سجیلہ نے انہیں دیکھا۔

فراز اور زیاد آن پہنچے تھے۔ سجیلہ انہیں بلا لائی۔

"امی کی طبیعت کچھ خراب ہے۔" اس کی سمجھ میں یہی آیا۔ فراز اور زیاد آئے تو حنا سلطان نے اشارے سے انہیں روکا۔ اور بند کمرے کی طرف اشارہ کیا۔ ماں کی آنکھوں میں آنسو۔ یہ کیسے... انہوں نے کبھی ماں کو آنسو بہاتے دیکھا نہ تھا اور وہ بھی پراسرار اشاروں کے ساتھ۔ اندر سے آتی شازیہ کی آواز اس نے بھائیوں کے بارے میں انکشاف نے ماں کو رلا دیا۔ مگر لڑکوں نے تو کچھ سنا نہ تھا۔ انہوں نے دونوں بیٹوں کو دائیں بائیں پہلو سے لگا کر بازوؤں میں لے لیا۔ اور پیار سے ان کے بازو پر بوسہ دیا۔

"ہاں یہ میری اولاد۔ میری طاقت۔ میرا غرور اور ممتا پسپائی کی زندگی گزارتی رہی۔"

کچھ دیر پہلے شازیہ سے خفا تھیں۔ مگر اب انہیں سب قدرتی لگ رہا تھا۔ اندر کا سین عجیب ڈرامائی انداز اختیار کر گیا تھا۔ پھپھو بھائی سے مایوس ہو کر شازیہ پر جھپٹیں۔ اسے بازوؤں میں جکڑ لیا۔

"کیا بکواس ہے۔ تو سمجھتی ہے۔ تو مجھے شرمندہ کر لے گی۔ جھوٹ بکواس کر کے بھائی کو میرے خلاف کرے گی۔ ارے یہ کیسا بہتان ہے۔ بھائی اس جھوٹی مکار فتنی کی بات پر یقین نہ کریں۔ میں میں کسی کا گھر... کسی سے مجھے کیا دشمنی۔ اوہ۔"

شازیہ نے با آسانی ان سے بازو آزاد کرا لیے تھے۔ اس پر ان کے منہ سے اوہ نکلا تھا۔

"میں نے آج ایک لفظ جھوٹ نہیں کہا۔ آپ نے بھائیوں کو ان کی بیویوں سے برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔"

وہ مضبوط لہجے میں ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مقابلہ کر رہی تھی۔

"امی اتنی وفاپرست اور سخت جان نہ ہوتیں۔ تو آپ شاید کامیاب ہو جاتیں۔ مگر پھر بڑے چچا جان کو چچی جان سے بدظن کرنے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ اپنی بیٹیوں کے ذریعے انہیں ورغلایا۔ جھوٹ اور غلط الزام لگا کر۔ جب چچی جان مایوس ہو کر میکے چلی گئیں۔ تو چھوٹے چچا کی شامت آگئی۔ وہ تو آپ کے بیان کو سچ جان کر مہینوں چچی سے خفا رہے۔ آپ کی کوشش تھی کہ یہ خنگی برقرار رہے۔ اور آپ ان سے مطالبات پورے کرواتی رہیں۔ آپ کو ہمیشہ اپنا مفاد عزیز رہا۔ بھائیوں کا سکون نہیں۔ چچا جان کا ٹرانسفر کراچی ہو گیا۔ چھوٹے چچا نے پشاور جا بسایا۔ تو ان کی بیویوں سے صلح ہو گئی۔ اب بچے اپنے والدین کے ساتھ خوش خرم۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔ مگر ابا آپ کی دسترس میں رہے۔ کیونکہ۔۔۔ آپ بہنیں ان کی محبت کو کمزوری بنا کر اپنا الو سیدھا کرتی رہیں۔ سوری یہ لفظ

سخت ہو گیا۔"

باہر کرسی پر بیٹھی حنا سلطان پتھر بن گئیں۔ جی چاہا چلو بھر پانی ملے تو اس میں… ان کی بیٹی کیسے کیسے عقدے کھول رہی تھی۔ وہ سمجھتی رہیں کہ انہوں نے اندرونی معاملات اپنی اولاد سے خفیہ رکھے۔ تاکہ ان کے ذہنوں پر اپنے رشتے داروں کا غلط تاثر نہ پہنچے۔ خود اپنے اور میاں صاحب کے معاملات میں بچے احتجاج کرتے۔ وہ انہیں سمجھاتیں۔

"تمہارے ابا اپنے بہن بھائیوں کو اولاد کی طرح چاہتے ہیں۔ عزت کرتے ہیں۔ ان کی توقعات پوری کر کے اپنے بڑے ہونے کا ثبوت دیتے ہیں۔ فرض ادا کرتے ہیں۔ ہمیشہ انہیں اپنے وجود کا حصہ سمجھا باپ بن کر پرورش کی۔ اب کیسے ان سے الگ ہو جائیں۔"

"بچے کہتے۔" ہم بھی تو ان کے بچے ہیں۔ ہمیں کچھ کیوں نہیں لا کر دیتے۔ سعد بھائی کے یونیفارم کا کوٹ۔ بینا باجی کی اتنی مہنگی کتابیں۔ مراد کے لیے سائیکل۔ ہمارے لیے کچھ نہیں" اور وہ انہیں بہت پیار سے سمجھاتیں۔

"بیٹا تمہارے ابا ہیں وہ۔ تم سے سب سے زیادہ محبت کرتے ہیں اور وہ لوگ تو… ماموں کے رشتے سے۔

بیٹا محبت ظاہر کرنے کی چیز نہیں یہ تو دل میں ہوتی ہے۔ محبت کے ثبوت تھوڑی دیے جاتے ہیں۔ یقین کیا جاتا ہے۔ تم ان کی نسل ہو۔ قیامت تک ان کی نسل تم سے چلے گی۔ سعد اور مراد سے نہیں۔"

بچے ماں کی دلیلوں سے قائل ہو جاتے۔ انہوں نے کبھی پھوپھوں کی طرف سے ان کے دل میں برائی نہیں ڈالی۔ رشتوں کی مضبوطی ان کا ایمان تھا۔ انہوں نے ہر رشتے کا احترام کیا۔

جب بہنوں کے بھڑکانے سے دیور اپنی بیویوں سے ناراض ہوئے۔ انہوں نے ہی الگ الگ انہیں سمجھایا۔ اور انہیں یہاں سے دور جانے کا مشورہ دیا۔ ایک نے کوشش کر کے ٹرانسفر کروالیا۔ دوسرے نے پشاور جا کر کام شروع کیا۔ اور بیویوں کو بلا لیا۔ بہنوں کی دسترس سے باہر نکل کر ان کے گھر کا ماحول بہتر ہو گیا۔ پھر چھوٹا والا بھی کراچی چلا گیا۔ وہیں جاب مل گئی۔ بیوی اسکول میں پڑھانے لگی۔ اسی اسکول میں بچے داخل ہو گئے۔ فیسوں کی سہولت مل گئی۔

دراصل رضیہ کا مسئلہ یہی تھا وہ بڑی بہن کے مقابلے میں بھائیوں سے امداد کی طالب رہتی تھیں۔ چھوٹے بھائیوں کے پاس آمدنی محدود۔ کچھ دے نہ سکتے تو بیویوں سے برگشتہ کر کے چھٹکارا دلایا۔ لیکن انہیں علم نہ ہوا کہ بڑی بھابھی جان نے اندر اندر کس طرح ان کی صلح کروائی۔ بچوں کو بھی نہیں پتا چلا۔

اور اب شازیہ… اپنی زندگی اپنا بسا بسایا گھر داؤ پر لگا رہی تھی۔ اسے کچھ تحمل اور رواداری سے کام لینا چاہیے تھا۔ نہ جانے اس نے کس طرح ٹھیک ٹھاک اندازہ لگایا۔ یا پھر… سب بچوں کو بھی علم ہو گیا کہ جیسا ماں ظاہر کرتی تھیں۔ ویسا نہ تھا۔

یہ دراصل رضیہ کا بچھایا ہوا جال تھا۔ اپنے مفاد کے لیے انہوں نے بھائیوں کی محبت اور شفقت کو پیروں تلے روند دیا تھا۔ انسان کتنا خود غرض ہوتا ہے۔ جو وفا کے عوض دغا کرتا ہے۔ اندر اب اور ہی منظر تھا۔ دروازے میں تھوڑی درز تھی۔ لاؤنج میں ناظرین اب ڈرامہ دیکھ رہے تھے انہونی سا…

ابا نے شازیہ کو گلے لگایا تھا۔ اور سسک سسک کر رو رہے تھے۔ شازیہ بھی آنسو بہا رہی تھی۔

"ہاں۔ میرے بچے میری محبت کے لیے ترستے رہے۔" ابا گلوگیر آواز میں کہہ رہے تھے۔ "میں سب دیکھتا تھا۔ مگر میری جیب میں جو بھی پیسہ آتا۔ وہ رضیہ کے کام آتا۔ میں بچوں سے شرمندہ ہوتا مگر اس وعدے سے ڈرتا۔ جو میں نے مرتی ہوئی ماں سے کیا تھا۔ بہنوں بھائیوں کا خیال رکھنے کا۔ جو فرض سمجھ کر میں نے ادا کیا۔ مجھے اللہ کا خوف تھا۔ کہ وعدہ شکنی میرے رب کو پسند نہیں۔ کہیں میں خود غرض نہ کہلاؤں۔ بہن بھائی کو انکار… یہیں میری سزا نہ بن جائے۔ میرے بچے۔ مجھ سے بدظن ہو گئے۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ مجھ سے نفرت نہ کرنے لگیں۔ مگر ان کی ماں

نے نہ جانے کیا کہہ کر۔ میری محبت ان کے دل میں جگائے رکھی۔"

شازیہ نے ابا کے گلے میں بازو ڈال دیے۔

"ابا! امی کہتی تھیں۔ تمہارے ابا تم سے بہت محبت کرتے ہیں۔ کیونکہ تم سے ان کی نسل چلے گی۔ وہ ظاہر نہیں کرتے۔"

"ہاں۔ میں جب ظاہر بھی کرنا چاہتا۔ شرمندہ ہو جاتا۔ مجھے اپنی ذات سے نفرت ہو گئی۔ میں اماں سے کیے وعدے کو نبھاتے نبھاتے تھک گیا۔ مگر پھر رضیہ! تم نے اپنے بھائیوں سے محبت کا خراج وصول کرتے ہوئے کبھی بھائیوں کی بیویوں اور بچوں کا خیال نہ رکھا۔ آج۔"

انہوں نے آستین سے آنکھیں صاف کیں۔

"آج بتاتا ہوں۔ تم نے جب مجھ سے آخری خراج طلب کیا۔ میرے بچوں کو اپنانے کی خواہش۔ میں بہت خوف زدہ تھا۔ میں نے یقین کر لیا کہ یہ میں تباہی کا سامان کر رہا ہوں۔ شازیہ کے لیے کتنا ظلم کیا تھا میں نے۔ اپنی لاڈلی کی زندگی کی قربانی اور اداسی۔ کوئی باپ ایسا بے درد نہیں ہوتا۔ مگر میں... تمہارا اشارہ حکم سمجھتا تھا۔ جب شازیہ نے مراد کو بغیر جہیز کے لیے کہا۔ اس نے اس شرط کو مان لیا۔ تو۔ میں ذرا سا مطمئن ہوا۔ بہت ظالم ہو رضیہ۔ تم۔ تم سب سمجھتی تھیں۔ میں بزدل ہوں۔ مگر میں۔ وعدے کی زنجیر میں جکڑا ہوا محبت میں جتلا ایک بزدل بھائی تھا۔ میں اپنے بچوں سے شرمندہ رہتا تھا۔ کمتر اور مسکین اسی شرم کی وجہ سے کبھی ان کی گاڑی میں نہیں بیٹھا۔

مگر... اب نہیں... میں نے تمہاری بھابھی کے ساتھ بھی بہت زیادتی کی۔ تمہارے اشارے پر۔ مگر... رضیہ یہ سلسلہ ختم۔"

رضیہ بیگم کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ رنگ فق۔ پیارے بھائی کے الفاظ ہضم نہیں ہوئے۔

"اب... شازیہ کہیں نہیں جائے گی۔ تم اس قابل تھیں ہی نہیں کہ میری بیٹی تمہارے گھر جاتی۔ اب میں اس نقصان کی تلافی کرنا چاہتا ہوں۔ جو میرے بیوی بچے تمہاری وجہ سے اٹھا چکے ہیں۔ مراد سے کہو۔ میری بیٹی کو آزاد کر دے۔"

حنا سلطان کپکپا رہی تھیں۔ فراز نے ان کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ ورنہ وہ کرسی سے گر جاتیں۔ بھائی کے دو ٹوک فیصلے نے رضیہ بہن کو لرزا دیا۔ وہ انہیں پھر گر ہی گئیں۔

"مراد کو فون کرو شازیہ! میں ابھی۔ اسے اس کی ماں کا فیصلہ سناتا ہوں۔"

"میں 'میں' میرا۔" رضیہ ہکلا گئیں "نہیں میرا نہیں یہ تو شان۔" بات پوری نہ کر سکیں۔

"تم نے کہا مراد اسے نہیں بسائے گا۔ تم اسے اپنے گھر میں نہیں رکھو گی۔"

"نہیں وہ 'وہ تو مجھے مار ڈالے گا۔ بھائی وہ 'وہ تو خود چاہتا ہے کہ۔ میرے بھائی اسے کچھ نہ بتائیں۔ میں ہی خود۔ بس ضد میں مجھے عادت ہو گئی ہے۔ وہ اصل میں۔"

"رضیہ! اب میں تم پر اعتبار نہیں کر سکتا۔ ہرگز نہیں میرے بچے میری محبت کے ترسے ہوئے ہیں۔ میں ان کا قرض دار ہوں۔ اب شازیہ تمہارے گھر نہیں جائے گی میرا فیصلہ ہے۔"

پھپھو نے بھائی کا یہ رنگ کب دیکھا تھا۔ وہ واقعی خوف سے پیلی ہو گئیں۔ ہکلانے لگیں۔ لڑکھڑانے لگیں۔ پھر زخمی لہجے میں آہستہ آہستہ بولنے لگیں۔

"بھائی! اب آپ میرے بیٹے پر تو ظلم نہ کریں۔ وہ مجھ سے بہت مختلف ہے۔ میں بری ہوں۔ مگر مجھے کس نے ایسا بنایا۔ آپ نے ہر ضد ہر مطالبہ پورا کر کے مجھے اپنا محتاج بنا دیا۔ میں جانتی ہوں۔ شازیہ بچی ہے۔ بالکل بچی کھری۔ مگر حیران ہوں۔ یہ اس ماں کی بیٹی ہے جس نے کبھی ہمارے خلاف زبان نہ کھولی۔ ہم ان کا حق لیتے رہے ہمارے بچے آپ سے آپ کے بچوں کا حق چھینتے رہے۔ بھابھی نے کبھی رکاوٹ نہ ڈالی۔ ہم ڈرتے رہے کہ کہیں بھابھی آپ پر قبضہ کر کے ہماری محبت سے محروم نہ کر دیں۔ مجھے زیادہ ہوس۔ آپا کی شاندار زندگی دیکھ کر ہوئی۔ آپ سے مانگ مانگ کر

۔۔۔ میں نے اپنا گھر ان کے مقابلے کا بنانا چاہا۔ مگر۔۔۔ پھر بچوں کی مہنگی تعلیم کا رونا رو کر آپ سے خرچ لیا۔ بھابھی نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ کبھی مایوس نہیں کیا۔ میری ہر فرمائش آپ پوری کرتے رہے۔ بھابھی تکلیف اٹھاتی رہیں۔ گھر کے اخراجات کے لیے ان کے پاس محدود رقم آپ دیتے تھے۔ مگر میری آنکھوں پر حرص کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ بھابھی جیسی اعلا ظرف اور صابر عورت ہم نے دنیا میں نہیں دیکھی۔

ہم دراصل ان ہی کے محتاج تھے۔ انہی کی خاموشی نے ہمارے حوصلے بلند کیے۔ ورنہ اگر وہ کچھ رکاوٹ ڈالتیں۔ میں۔۔۔ ان کی طرف سے آپ کو بدظن کرنے میں کمی نہ کرتی۔ ہاں بھائی۔ بہت بری ہوں میں۔ شازیہ سچ کہہ رہی ہے۔ ظہیر نصیر کو ان کی بیویوں سے میں نے ہی بدظن کیا تھا۔ وہ صاف کہتی تھیں۔ آمدنی کم ہے۔ ہمارا خود مشکل سے گزارا ہوتا ہے۔ میں سمجھتی تھی۔ بھابھی کو چپ رہنے کی عادت ہے۔ اسی لیے میں نے خوب فائدہ اٹھایا۔ میں سمجھتی رہی۔ میرا یہ ڈراما چلتا رہے گا۔ شازیہ جہیز لائے گی۔ جو میری بیٹی کے کام آئے گا۔ میں نے اس کی شرط کو بچکانہ ضد سمجھ کر پروانہ کی مگر مراد ڈٹ گیا۔ اس نے وعدہ کر لیا تھا شازیہ سے۔ وہ بھی وعدہ شکن بننا پسند نہیں کرتا۔ اسی لیے مجھے ضد ہو گئی۔ شازیہ نے جب سروس کا ارادہ کیا۔ مراد راضی تھا۔ میں صرف میں شازیہ کو ذلیل کرنے کے لیے آپ سے فریاد لے کر آئی کہ آپ ہمیشہ کی طرح میری بات کا مان رکھیں گے۔ آپ نے کبھی مجھے خالی ہاتھ نہیں لوٹایا۔ مجھے آپ کی عادت پڑ گئی۔ میں شازیہ کو شکست دے کر انتقام لینا چاہتی تھی۔ اس کے خالی ہاتھ آنے کی ضد کا۔ بھابھی کی ہم نے ہمیشہ تضحیک کی۔ وہ سن کر چپ رہتیں۔۔۔ آفرین ہے۔ انہوں نے خاندان میں تفرقہ نہیں ڈالا۔ سب کو ایک لڑی میں باندھے رکھا۔ ان کی اس مہربانی کا۔ ان کی انا، ظرف اور برداشت پر ان کا بہت شکریہ ادا کرنا ہے اور۔۔۔ معافی بھی۔ آپ سے بھابھی اور آپ کے بچوں سے مانگنا چاہتی ہوں۔ میری خود غرضی اور بے حسی کی تلافی تو نہیں ہو سکتی۔ مگر میں معافی مانگ کر اپنے ضمیر کی عدالت میں شاید کچھ تلافی کر سکوں۔"

رضیہ بیگم بے انتہا شرمسار اور پشیمان تھیں۔ سر جھکا ہوا تھا۔ شازیہ نے ان کو بازوؤں میں لے لیا۔

"پھپو!" وہ بہت نرمی سے ان کا ہاتھ سہلاتے ہوئے کہنے لگی۔ "میں ضدی نہیں ہوں۔ میں تو آج اپنی ذات کا مقدمہ لے کر آئی تھی۔ اپنی شخصیت کی اہمیت منوانے کے لیے نہیں۔ بلکہ دراصل اپنی ماں کی عظمت کا آپ پر اظہار۔ اور آپ سے اعتراف کروانا بھی تھا۔ جو کچھ ابا نے آپ لوگوں پر مہربانیاں کیں۔ وہ میری ماں کی وجہ سے ممکن ہوئیں۔ وہ ہمیشہ اپنی ذات پر جبر کر کے ابا سے تعاون کرتی رہیں۔ گھر کے سکون کے لیے۔ ابا کے کسی عمل میں کوتاہی نہ ہو۔ ہمیں صبر وضبط کی تلقین کرتی رہیں۔ ابا کی نیکیوں میں رکاوٹ نہ ڈالی۔ میں ان کی برتری کے لیے ہی آج آپ سے اعتراف کرانا چاہتی تھی۔ میں ان کی ذات کا حصہ ہوں لیکن۔ پسپا ہونے کے لیے نہیں۔ صلاحیتوں کے اظہار کو حق سمجھ کر آئی تھی۔ جہیز نہ لینا۔ جاب کرنا۔ یہ میرا اپنا فیصلہ ہے۔ آپ نے مان لیا۔ یہی میرا مقصد ہے۔"

پھپھو نے اسے تھپکا۔ "آخر میری بھتیجی ہو۔ کون جیت سکتا ہے تم سے۔ ہاں بھابھی عظیم ہیں اور بھائی عظیم تر۔"

"پھپھو ڈنڈی مار دی نا۔ اب بھی اپنے بھائی کو ترجیح دی۔" ہنس کر ابا سے لپٹ گئی۔

ابا ہنس رہے تھے۔ نم آنکھوں میں خوشی کے جذبات چمک رہے تھے۔

باہر لاؤنج میں بیٹھی حنا سلطان کو آج اپنی قربانیوں کا صلہ مل گیا تھا۔ وہ جیت گئی تھیں۔ انہیں آج تک پستے رہنے کا کوئی ملال نہ رہا۔ انہوں نے آنکھیں خشک کر لیں۔ فراز اور زید نم آنکھوں سے مسکرا رہے تھے۔ حنا سلطان کو اب کسی تعریف یا اعتراف کی ضرورت نہ رہی۔ آج بہار نے ان کے دل کے آنگن میں قدم رکھ دیے تھے۔ وہ مطمئن تھیں۔

"سنو۔ اپنے ابا کی سائیکل ابھی کباڑیے رفیق کو دے آؤ۔ کل سے وہ تمہاری کار پر جائیں گے۔" وہ فراز سے مخاطب ہوئیں۔ "اور اگر نہ بیٹھیں۔ تو تینوں بھائی ڈنڈا ڈولی کر کے گاڑی میں بٹھانا۔" نہایت تحکمانہ انداز تھا۔ فراز حیران ہو گیا۔ "بس کہہ دیا ہے میں نے۔"

"اور اگر ۔۔۔ کھجلی ہوئی؟" میاں صاحب نہ جانے کب باہر آ گئے تھے۔

"تب بھی۔ وہ بے تا کھجانے کا لکڑی کا پنجہ لے جانا۔ کھجاتے رہنا۔" بے نیازی سے کہا۔ فراز نے شرمندگی سے ابا کو دیکھا۔ زیاد کان کھجانے لگا۔

"یہ ہو گیا ہے بیگم ۔۔۔ میں ۔۔۔ اب تو آپ کے اشاروں پر چلنے والا ہوں۔" ہائے بے چارگی۔

"ہاں جی۔ کیونکہ اب رضیہ ریٹائر ہو گئی ہیں۔ تو مجھے حکومت کرنے کا اختیار مل گیا ہے۔" بے نیازی بیگم نے لہجے اور رویے سے عیاں کی۔

فراز اور زیاد کے قہقہوں میں میاں صاحب کا قہقہہ سب سے بلند تھا۔

"افسروں کی ترقی تو ہوتی ہے ابا محکمے میں۔" فراز شریر لہجے میں بولا۔

"مگر ۔۔۔ اب تو بادشاہت ہوتی ہے۔ تو امی کو بھی حکومت ملنے کا حق ہے۔ تو ابا۔ پھر کیا امی ملکہ بن گئی ہیں۔ آج ہی فوراً۔" زیاد بھولے پن سے کہہ رہا تھا۔

"بیٹا جی ۔۔۔ دراصل۔" میاں صاحب گدی کھجاتے ہوئے ترچھی نظروں سے بیگم کو دیکھ رہے تھے۔

"بات یہ ہے آہم۔ وہ تو ہمیشہ سے ملکہ تھیں مگر اپنا حق لیا نہیں۔ تم لوگ ان کی رعایا تھے اور میں ۔۔۔ بے وفا وزیر سلطنت۔" وہ معصومیت کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ شازیہ اور رضیہ بھی آ گئیں۔ شازیہ تالیاں بجا رہی تھی۔

"اور ۔۔۔ آخر کار۔" شازیہ نے فخریہ انداز میں کہا۔ "امی کو ان کا عہدہ مل گیا۔"

آج حنا سلطان سرخرو تھیں۔ ان کی دی ہوئی حنا کا رنگ سب کے چہروں کو گل رنگ بنا رہا تھا۔ آج حنا کا رنگ خوشیوں کی سوغات بن گیا تھا۔ کیا ہوا جو میاں صاحب اپنی مایوسی اور بچوں کی حق تلفی کو مجبوری کا رنگ دے کر اوٹ پٹانگ حرکتوں سے فرسٹریشن کا ابال نکالتے تھے۔ وہ خوب سمجھتی تھیں۔ شرمندگی میاں صاحب کو ہوتی تھی۔ وہ اس کا سدباب کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

"وہ خود بھی اپنی شرمندگی پر شرمندہ تھیں (آج) اور آخر کار آج وہ کامیاب ہو گئی تھیں۔

کیا ہوا جو رضیہ آج پشیمان تھیں۔ یہ تو ہونا ہی تھا۔ شازیہ کی کامیابی ان کی کامیابی بن گئی تھی۔

قرۃ العین خرم ہاشمی

کملی دا ڈھولا

"ہو گیا ہے کام۔ کیسا لگ رہا ہے؟"

موحد نے باقی کا بچا ہوا سیمنٹ ایک طرف کیا اور ہاتھ جھاڑتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ اس نے پیچھے مڑ کر سیڑھیوں پر بیٹھی نمل کو دیکھا تھا' جو دونوں ہتھیلیوں میں اپنا پرسوچ چہرہ رکھے' بہت غور سے اسے کام کرتے ہوئے دیکھ رہی تھی۔ موحد کے پوچھنے پہ اٹھ کر اس کی طرف آئی اور اینٹوں اور سیمنٹ سے بنے چھوٹے سے گھر کو غور سے دیکھنے لگی جس کے تین طرف دیوار تھی اور سامنے کا حصہ کھلا چھوڑ دیا تھا اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد ایک مطمئن سی مسکراہٹ اس کے چہرے پہ پھیل گئی تھی اور موحد کو ایسا لگا جیسے ساری محنت وصول ہو گئی تھی۔ وہ ایک دم خود کو ہلکا پھلکا سا محسوس کرنے لگا۔

"یہ کیوں بنایا ہے یہاں؟" اسی وقت بے بے محلے کا چکر لگا کر واپس آئیں تو صحن کے کونے میں بنے گھر کو دیکھ کر چونک پڑی تھیں۔

"وہ بی جی! نمل کافی عرصے سے فرمائش کر رہی تھی کہ بلی کا بچہ پالنا ہے تو اسی کے لیے یہ..." بے بے کے بدلتے تیوروں کو دیکھ کر موحد نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی۔

"موحد پتر! یہ تو ہے ہی کملی! اتنی عقل اس میں ہوتی تو مجھے رونا ہی کس بات کا تھا مگر تو تو سمجھ دار ہے! شہر کے بڑے اسکول (یونیورسٹی) میں پڑھتا ہے اسے سمجھا تو سکتا تھا نا!"

بے بے نے سر پہ رکھی چادر اتارتے ہوئے' نمل عرف کملی کو گھورا تھا جو بہت اطمینان سے گھر کو دیکھ رہی تھی۔

"او ہو بے بے! آپ خود ہی تو کہتی ہیں کہ بے زبان جانور سے محبت کرتے ہیں۔ جیسے آپ نے مرغیاں اور چوزے پال رکھے ہیں اور تو اور ہر وقت سر کھانے والا یہ طوطا بھی...!"

نمل نے صحن کے درمیان میں لٹکے ہوئے پنجرے میں موجود طوطے کو گھورا تھا۔ جو اس کے مرحوم باپ کو کسی نے پہاڑی علاقے سے لا کر تحفے میں دیا تھا۔ تب نمل دس سال کی تھی اس طوطے کی خاصیت یہ تھی کہ یہ بولتا تھا اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گھر کے مکینوں سے بہت کچھ سیکھ چکا تھا۔ خاص کر دادی جان کے اکثر جملے اسے رٹے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کی وفات کے بعد بھی' ان کی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نمل سے اس کی بنتی نہیں تھی کیونکہ

"کملی ہے اس لیے باتیں بھی ایسی ہی کرتی ہے۔"

بے بے نے ہتھیار پھینکتے ہوئے کہا تو پنجرے میں قید طوطا پھڑپھڑاتا ہوا چلایا تھا۔

"کملی' کملی۔"

"اس کی تو..." نمل تپ کر اس کی طرف بڑھی' اسی وقت موحد نے ہاتھ پکڑ کر اسے روکا۔

"نمل! اسے چھوڑو اور میں کِٹی کو لے کر آتا ہوں۔ تم یہاں ہی رکو۔"

موحد کہتا ہوا باہر نکل گیا اور کچھ دیر میں واپس آیا تو براؤن رنگ کا خوب صورت بلی کا بچہ اس کے ہاتھوں میں تھا۔ نمل خوشی سے کھل اٹھی' جبکہ بے بے کے ماتھے پہ سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔

"کتنا کیوٹ ہے کِٹی!" نمل نے خوشی سے اسے گھر

کے اندر جاتے دیکھ کر کہا تھا۔
"یہ کیسا نام ہے ثمی۔ کوئی اچھا سا نام رکھنا تھا۔ ایسے نام سن کر تو فرنگیوں کا خیال ذہن میں آتا ہے۔"
بے بے نے ایک اور اعتراض اٹھایا۔
"بے بے! اس کا نام نام ہے! اچھی طرح سے یاد کریں۔"
ثمل نے ان کی بات کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہا تھا۔ بے بے منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ گئی تھیں۔ جبکہ ثمل موحد کے ساتھ مل کر ثمی سے کھیل رہی تھی۔

اور پنجرے میں طوطا امرود کھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔
"ثمل، ثمی، ثمل۔!!"

ثمل، بے بے کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں کے



بڑے سے بچے پکے گھر میں رہنے والی من موجی سی لڑکی تھی۔ اس کی ہر بات' ہر منطق الگ ہوتی تھی یا بے بے کو لگتی تھی۔ پہلے شوہر پھر شفیق ساس کے آگے پیچھے چلے جانے کے بعد عائشہ بی بی عرف بے بے کی زندگی اور اثاثہ نمل ہی تھی۔ جس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کا نام کملی پڑ گیا تھا۔

نمل پرائیویٹ بی۔ اے کی تیاری کر رہی تھی۔ اور یہ سب موحد کی وجہ سے ممکن ہوا تھا۔ جو اس کا چچازاد بھی تھا اور نمل کے یہ اکلوتے چچا بہت سال پہلے ہی اپنے بال بچوں کے ساتھ شہر میں جا بسے تھے' موحد تین بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ یونیورسٹی میں آنرز کا اسٹوڈنٹ مگر اس کا دل گاؤں کی اس کملی میں اٹکا رہتا تھا۔ اسی لیے وہ بھاگ بھاگ کر گاؤں کے چکر لگاتا تھا اور نمل کو مختلف میگزین' کتابیں اور ضرورت کی بہت سی چیزیں لا کر دیتا تھا۔

دونوں کی محبت بے بے کی نظروں سے چھپی ہوئی نہیں تھی۔ موحد ہر لحاظ سے بہتر تھا۔ ان کی کملی بیٹی کا بہترین جوڑ' مگر موحد کی ماں راشدہ کے خواب ہمیشہ سے بہت اونچے رہے تھے۔ اس کا نخرہ بہت تھا اور یہ چیز ہی بے بے کو پریشان کرتی تھی۔

جبکہ نمل اور موحد ایسی ہر پریشانی اور سوچ سے مکمل آزاد اپنے آج میں مگن رہتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی خوشیوں کو بانٹتے' گاؤں کے کچے پکے راستوں پہ چلتے' نہر کے پانی میں پاؤں ڈالے گھنٹوں باتیں کرتے رہتے تھے۔ موحد کو اسے سننا اچھا لگتا تھا۔ جبکہ نمل کو اس کے کم کم بولنے پہ اعتراض رہتا تھا۔ اور موحد ہنس پڑتا۔

"ندی اتھروں قیمت پچھ تاں سہی
میڈے کملے ربے دل توں!"

موحد اس کے سانولے چہرے پہ نظریں جما کر کہتا تو وہ دھیرے سے مسکرا دیتی۔

"کملی رہی تو میں ہوں!"

"ہاں کملی تم ہی ہو مگر تمہارے معاملے میں میرا دل کملا ہے!" موحد بات کو ایسے مکمل کرتا تھا جیسے کسی کے ملنے سے ذات مکمل ہوتی ہے۔ جیسے اندھیرا گہرا ہونے سے رات مکمل ہوتی ہے۔ مکمل اور پر اسرار۔ اپنی گرفت میں لے لینے والی۔

☼ ☼ ☼

"دعا کرنا ایک بہت اچھی کمپنی میں جاب ملنے کا چانس ہے۔ اگر ایسا ہو گیا تو بہت جلد میں دبئی چلا جاؤں گا۔"

صحن میں لٹکے طوطے کے پنجرے کو چھیڑتے ہوئے موحد نے نمل سے کہا تھا۔ جو موحد کے لائے نوٹس الٹ پلٹ کر دیکھ رہی تھی۔ اس کی بات پہ چونکی تھی۔ موحد اتنی دور بھی جا سکتا ہے! ایسا تو کبھی سوچا ہی نہیں تھا۔ یکایک اس کی کالی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

"سچ میں کملی ہے تو! پوری بات تو سن لے۔ میں جانے سے پہلے ہمارے رشتے کو نام دے کر جاؤں گا۔ تاکہ بہت جلد واپس آ کر تجھے اپنے ساتھ لے جاؤں۔"

موحد نے اس کی بھیگی آنکھوں کو دیکھتے ہوئے ناراضی سے کہا تھا۔ جس کی چھوٹی سے چھوٹی خوشی کے لیے وہ سب کچھ کر جاتا تھا۔ اسے رلانے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔

"مگر راشدہ چاچی مانے گی؟" نمل نے پریشانی سے پوچھا تھا۔ محبت میں جدائی کا خوف' جان لیوا ہوتا ہے۔

"نہیں ماننا ہی پڑے گا۔" موحد نے مضبوطی سے کہا تھا۔ اور پھر سر جھٹکتے ہوئے خود کو سوچوں سے آزاد کیا اور پنجرے کو کھول کھول تھپتھپاتا ہوا پوچھنے لگا۔

"مٹھو میاں! چوری کھاؤ گے؟"

"ہاں کھاؤں گا۔" طوطے نے ادھر سے ادھر اڑتے ہوئے کہا تھا۔

"اس ندیدے کے لیے یہ جملہ نہیں بنا تھا۔ اس نے تو ہاں کہنا ہی سیکھا ہے۔"

نمل حسب معمول چڑ کر بولی تھی۔ اور موحد بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

"تم جانتی ہو میں اتنے سالوں سے یہ رٹے رٹائے

جملے اس کے منہ سے سن رہا ہوں مگر ہر بار مجھے بہت اچھا لگتا ہے ان کا دہرانا کیونکہ۔۔۔!!"

موحد نے ایک لمحے کا توقف کیا تھا اور پنجرے کے پار سے نظر آتی نرگی کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

"مجھے ہر بار تمہارا چڑنا اور چڑ کر جواب دینا اچھا لگتا ہے! تمہارے انداز میں اتنی بے ساختگی ہوتی ہے کہ میرا دل کرتا ہے کہ یہ طوطا بولتا رہے اور تم یونہی الجھتی رہو۔!!"

موحد کے کہنے پہ نمل نے آنکھیں سکوڑ کر اسے دیکھا تھا۔

"بے بے مجھے کملی کہتی ہیں۔ یہاں تو سارے ہی کملے ہیں۔" نمل کہہ کر نوٹس کی طرف متوجہ ہو گئی۔ اور موحد ڈھلتی شام کے کنارے پہ کھڑا اپنی محبت پہ نازاں تھا۔ مگر محبت کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ قسمت ہوتی ہے!

☼ ☼ ☼

بے بے بہت خاموشی اور شکستہ قدموں سے گھر میں داخل ہوئی تھیں۔ نمل جو اپنی مخصوص جگہ پہ بیٹھی ان کے لوٹنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک دم سے ٹھٹک کر رہ گئی۔ اس کا دل بہت زور سے دھڑکا اور خوف سے سمٹا تھا۔

"راشدہ چاچی نے کس لیے فون کیا تھا۔ اور ایسا کیا کہا ہے کہ بے بے؟؟"

بے بے ساتھ والی زرینہ کے گھر سے فون سن کر آئی تھیں۔ زرینہ نمل سے چند سال بڑی تھی مگر دونوں میں کافی دوستی بھی تھی۔

"بے بے! کیا ہوا؟ راشدہ چاچی نے کیوں فون کیا تھا؟" نمل نے چارپائی پہ بے دم بیٹھی بے بے کے کندھے پہ ہاتھ رکھتے ہوئے بے تابی سے پوچھا تھا۔ تو وہ ایک نظر اس کے خوف زدہ چہرے پہ ڈال کر رہ گئی تھیں۔ کیسے بتاتیں کہ اس کے خدشے حقیقت کا روپ دھار چکے ہیں۔

"راشدہ ابھی موحد کی شادی نہیں کرنا چاہتی۔ جب تک تینوں بیٹیوں کی نہ کرے۔ بس یہ ہی بتا رہی تھی۔" بے بے نے نظریں چراتے ہوئے دھیرے سے کہا تھا تو سکھ کا سانس لیتی نمل کچھ سوچ کر پریشانی سے بولی تھی۔

"پھر اس میں اتنا پریشان ہونے والی کیا بات ہے بے بے! راشدہ چاچی کی بات جائز ہے۔ ارم اور فرح مجھ سے بڑی ہیں اور ویسے بھی ابھی میں پڑھ رہی ہوں اور مجھے ابا کی خواہش کے مطابق ایم۔ اے تو ضرور ہی کرنا ہے۔"

نمل نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔ جیسے ماں کو تسلی دینا چاہ رہی ہو۔ بے بے کے تاثرات ہنوز وہی رہے۔ وہ بہت خاموشی سے اس کے چہرے کو تکنے لگیں۔ جو ماں کی خاموشی پہ خائف ہو کر واپس سیڑھیوں پہ جا کر بیٹھ گئی تھی۔ چھت پہ جاتی سیڑھیوں کے ساتھ ہی شہتوت کا پھل دار درخت بھی تھا۔ جس کی شاخیں سیڑھیوں کے کچھ حصے پر بھی سایہ کرتی تھیں۔ نمل نے کتابیں گود میں رکھیں۔ اور سر اٹھا کر میٹھے پھل کو تکنے لگی۔ چڑیاں ہر وقت پتوں میں چھپی شور مچاتی رہتی تھیں۔

"تیرے ابا کی تو یہ بھی خواہش تھی کہ موحد ان کا بیٹا بنے مگر۔"

بے بے نے چپکے سے چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کی تھیں۔ وہ اسے کیسے بتاتیں کہ راشدہ نے کتنے نازیبا الفاظ میں اس رشتے سے منع کیا تھا۔

"تیری بیٹی کملی بن کر میرے بیٹے کو پھنسا رہی ہے۔ مگر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لے عائشہ! میں کبھی بھی اپنے پتر کا رشتہ غریب غرباء میں نہیں کروں گی۔ ساری زندگی کی جمع پونجی ہے میری اسے ایسے ہی لٹا دوں؟"

راشدہ نے تنفر بھرے لہجے میں کہا تھا۔ جو خود بھی غربت سے نکل کر آج بہتر حالات میں پہنچی تھی اور اب اکلوتے بیٹے کی شادی اپنی امیر بہن کی بیٹی سے کر کے اپنے باقی کے خواب بھی پورے کرنا چاہتی تھی۔ دونوں بیٹیوں کی بات تو طے تھی ماموں کے گھر۔ چھوٹی

والی ابھی میٹرک میں تھی۔ چاہتی تو موحد کی بات طے کر سکتی تھی۔ مگر موحد کی ضد ایک ہی تھی۔

"نمل سے شادی کروں گا ورنہ کبھی بھی نہیں۔" ماں سے واضح لفظوں میں کہہ کر وہ دبئی جانے کی تیاریوں میں لگ گیا تھا۔ جبکہ راشدہ اسے وقتی ابال سمجھ کر "ورنہ" کہہ کر رہ گئی تھی' مگر اپنے دل کی بھڑاس نمائشہ پہ نکالنا نہیں بھولی تھی۔

☆ ☆ ☆

"شکر ہے تو نظر تو آئی۔ روز تیری راہ دیکھتی ہوں۔" نمل دو تین دن کے بعد آج چھت پہ آئی تو ساتھ والی زرینہ اسے دیکھتے ہی لپک کر اس کی طرف آئی۔ اس کے تین بھائی بہت سخت تھے اپنی اکلوتی بہن کے معاملے میں۔ اسی لیے اسے کہیں بھی آنے جانے کی اجازت نہیں تھی۔ نمل اور بے بے سے واقف تھے اس لیے نمل اور اس کی دوستی پہ کوئی اعتراض نہیں کرتے تھے مگر یہ دوستی بھی پابندی اور شک کے دائرے میں قید رہتی تھی۔ بہت جلد زرینہ کی شادی اپنے تایا کے گھر ہونے والی تھی۔ اس لیے وہ بھی اچھے وقت کی امید میں وقت خاموشی سے گزار رہی تھی۔

"ہاں تو تو مجھے آواز دے لیتی! ایسی کیا خاص بات کرنی ہے تو نے۔" نمل نے منڈیر کے پاس آتے ہوئے کہا۔ زرینہ نے آگے کی طرف سر جھکا کر راز داری سے کہا۔

"نملی تب و بیچ میں اتنا کچھ ہو گیا اور تجھے پتا ہی نہیں چلا۔ اس دن جب خالہ ہمارے گھر فون سننے آئی تھیں تو۔"

زرینہ تفصیل سے بتاتی گئی۔ نمل کے چہرے کا رنگ زرد پڑتا گیا۔ اسی لیے اس دن بے بے اتنی ٹوٹی ہوئی اور روتی لگ رہی تھیں۔

"خالہ رو رو کر اماں کو بتا رہی تھیں جو تیری چاچی نے کہا۔ میری مان تو موحد سے جلد بات کرلے' تیری بیٹی کے تیور ٹھیک نہیں ہیں۔" زرینہ نے جلدی جلدی کہا اور بھابی کی آواز پہ۔

"آئی بھابی۔" کہتی ہوئی بھاگ گئی۔ جبکہ پیچھے گم صم سی کھڑی نمل' کتنی ہی دیر اسی حالت میں رہی۔ پھر فضا میں گونجتی مغرب کی اذان سن کر چونک گئی۔ اندھیرا پھیلنے کے قریب تھا۔ نمل نے شکستہ قدموں سے نیچے کا رخ کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"کیا موحد دبئی چلا بھی گیا؟"

زرینہ نے حیرت کی زیادتی سے آنکھیں پھاڑتے ہوئے کہا تھا۔ وہ نمل کے گھر زردہ دینے آئی تھی۔ جب چپ چپ سی نمل نے اس کے پوچھنے پہ سرسری سے لہجے میں بتایا تھا۔

"تو نے اس سے بات کی تھی؟ کیا کہا پھر اس نے؟ اور وہ ایسے کیوں چلا گیا؟ کم از کم منگنی تو کروا کر جاتا اور۔" زرینہ سوال پہ سوال کر رہی تھی۔ جبکہ باورچی خانے سے پلیٹ دھو کر لاتی نمل افسردگی سے مسکرا کر بولی تھی۔

"میں کملی کی جانا ہنی'
رمزاں یار دیاں۔!!"

اور پھر نملی کملی کہلانے والی' ایک دم سے بہت سنجیدہ اور سمجھ دار سی ہو گئی تھی۔ بے بے سے ضد کرنا' الٹی سیدھی فرمائشیں اور حرکتیں' سب بھول سی گئی تھی جیسے! خاموشی سے سر جھکائے کتابوں میں گم رہتی یا سیڑھیوں پر بیٹھی گھنٹوں سوچتی رہتی۔ بے بے اس کے بدلاؤ پہ ہول جاتیں۔ طوطے سے چڑنا اور بحث کرنا سب بھول گئی تھی۔ اس خاموشی میں اکثر موبائل فون کی گھنٹی بجتی تھی مگر نمل اسے خالی خالی نظروں سے دیکھ کر رہ جاتی تھی۔ جیسے اسے اٹھانے اور سننے کا حوصلہ اس میں نہیں تھا۔

یہ چھوٹا سا موبائل فون' موحد دبئی جانے سے پہلے اسے دے کر گیا تھا۔ بہت سے وعدوں اور یقین کے ساتھ۔ مگر کملی سچ میں کملی تھی بجتے فون کو دیکھتی اور روتی جاتی مگر اس سے بات نہیں کرتی تھی۔ بے بے

کبھی بھی تو سختی سے نفی میں سر ہلا دیتی' پھر ایک دن ایسا ہوا "کملی رلی" کہنے والا' شور ڈالنے والا طوطا بھی مر گیا بالکل اچانک...! اور وہ بڑا سا صحن اور اس کا پنجرہ ویران ہو کر رہ گیا تھا۔ طوطے سے ہر وقت لڑنے اور چڑنے والی کملی' اس کے مرنے پہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور کئی دن کھانا پینا بھول گئی۔ اور اس کی حالت دیکھ کر بے بے بڑبڑا کر رہ جاتی تھیں۔

"سچ میں کملی ہے میری دھی!"

بے بے زبردستی اسے کھانا کھلاتیں۔ اور چادر کے پلو سے آنکھیں صاف کرتی' اس کے پاس سے اٹھ جاتیں۔ تمل نے ٹمی کو بھی اپنی دوست کے چھوٹے بھائی کو دے دیا تھا۔ جو کافی عرصے سے اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔ بے بے نے اس بات پہ بھی کافی احتجاج کیا تھا۔ مگر کملی کو کون سمجھاتا...! اسے سمجھنے اور سمجھانے والا تو میلوں دور جا بسا تھا۔

☼ ☼ ☼

"امی! میں نے اپنے دوست کے ہاتھ کچھ سامان اور بھیجا ہے۔ آپ دیکھ لیں۔ اور کسی چیز کی ضرورت ہے تو بھی بتا دیں۔"

موحد نے فرماں بردار بیٹے کی طرح ماں سے پوچھا تھا۔ اور جواب نفی میں سن کر اللہ حافظ کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔ راشدہ نے گہری سانس لے کر آنسوؤں پہ قابو پایا تھا۔ پچھلے گزرے پانچ سالوں میں موحد سے ان کی بات صرف سرسری سی اور کسی کام سے متعلق ہی ہوتی تھی۔ ارم اور فرح کی شادی دھوم دھام سے ہوئی تھی۔ موحد نے سب کچھ کیا تھا' سب کچھ بھیجا تھا۔ بہت ساری رقم بھی مگر خود نہیں آیا تھا...! راشدہ کا گھر نت نئے سامان سے بھر گیا تھا۔ بینک میں پیسے بھی بڑھ رہے تھے۔ تیسری بیٹی کا جہیز بھی تیار تھا۔ سب کچھ تھا اگر نہیں تھا تو بیٹے کا مان اور پیار نہیں رہا تھا۔ تینوں بہنیں بھی اب ماں کو اپنی ضد چھوڑنے کا کہتی تھیں۔ خدا بخش جس نے سب کچھ اپنی بیوی راشدہ پہ چھوڑ رکھا تھا وہ بھی اب اکثر اسے ٹوکنے لگا تھا۔

"بھلی لوکے! ابھی بھی وقت ہے' سمجھ جا' یہ نہ ہو تیرا بیٹا تجھ سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو کر اسی دیس میں بس جائے! پھر کیا کرے گی۔"

راشدہ' ہر بار موحد سے بات ہونے پہ یہ ہی کہتی کہ "پاکستان آجاؤ۔ میں ترس گئی ہوں تیرا چہرہ دیکھنے کے لیے۔"

اور موحد فرماں برداری سے کہتا۔

"امی میں آپ کے حکم پر سر کے بل چل کر ابھی جاؤں گا مگر پھر اپنے دل کو' اس کی گلیوں میں جانے سے نہیں روک پاؤں گا اور ایسا کروں گا تو آپ کی نافرمانی ہوگی۔ بہتر ہے کہ مجھے نہ ہی بلائیں۔"

موحد کے لہجے میں اتنی بے چارگی اور بے بسی ہوتی کہ راشدہ کا دل کٹ کر رہ جاتا تھا۔ اس کے اندر کی عورت کا تنتنا ٹوٹ چکا تھا۔ اب ماں تھی جو اکلوتے بیٹے کی جدائی میں ہر لمحے' ہر پل میں مر رہی تھی!

جبکہ میلوں دور بیٹھا موحد بے بسی سے رو پڑتا تھا۔ کسی کے ساتھ کیے وعدے اسے احساس جرم میں مبتلا رکھتے تھے۔

غلام فرید! او تھے کی وسنا
جتھے یار نظر نہ آوے!!

پانچ سال ہو گئے تھے۔ وہ اس سے بات نہیں کرتی تھی' پھر وہ کسی سے کیسے بات کر سکتا تھا؟ اس کی چپ مارتی تھی۔ اور موحد روز اپنی آگ میں جلتا اور بجھتا تھا۔ سچا اور کھرا تھا۔ کیسے خود سے نظریں ملا سکتا تھا؟ جس سے اتنے پیمان کیے' اب کیسے اسے بتاتا کہ ہار گیا تھا!

☼ ☼ ☼

موحد نے اپنے دوست کے ہاتھ' حسب معمول بے بے اور تمل کو بھی کچھ چیزیں بھیجی تھیں۔ اور ہمیشہ کی طرح ایک خط بھی جسے بغیر پڑھے تمل نے سنبھال کر رکھ لیا تھا۔ زرینہ کی شادی ہو چکی تھی۔ اپنے گھر میں خوش باش بسنے والی زرینہ' تمل سے اکثر جھگڑتی تھی۔

"دفع کر! اسے۔ آگے کی طرف دیکھ۔ ایم۔ اے تو کر چکی ہے۔ گاؤں میں اتنے لوگ تیرے رشتے کے لیے بے بے کو کہہ چکے ہیں۔ مگر ایک تو ہے کہ اس کا روگ بھی ہے اور اس نے کسی خط کو پڑھنا بھی نہیں۔ تو سچ میں کملی ہے!

جلا دے، پھاڑ کر پھینک دے ان خطوط کو۔ سنبھال کر کیوں رکھا ہوا ہے؟"

زرینہ یوں بول کر چلی جاتی اور نمل خاموشی سے، آنگن میں بکھری خاموشی کو چھتی، سوچتی رہتی۔

سجناں ولوں چھٹی آئی ہے

کیوں کھولاں ویر۔؟

کدھرے اے نا لکھیا ہووے

تیری میری بس۔!!

اس کے قول و اقرار کا یقین آج بھی دل کو گھیرے ہوا تھا۔ مگر جدائی کے بڑھتے سائے مایوسی کو بڑھانے لگے تھے۔ اس سے بہتر تو اسے یہ ہی لگا تھا کہ کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے بیٹھ جائے، اور اس نے یہ ہی کیا تھا مگر۔

تیز آوازوں اور شور پہ آنکھیں بند کیے سیڑھیوں بیٹھی نمل نے آنکھیں کھول کر دیکھا تھا۔ پھر ساکت ہوتی گئی۔ چچا خدا بخش، چاچی راشدہ، تینوں بہنیں اور سب سے آخر میں ہنستا مسکراتا موحد گھر کے اندر داخل ہو رہا تھا۔ مٹھائی کے ٹوکرے دیکھ کر بے بے کے خوشی اور حیرانی سے آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

راشدہ چاچی نے لپک کر، ساکت بیٹھی نمل کو گلے سے لگایا اور اس کا ماتھا چوما۔ چچا نے سر پہ ہاتھ رکھ کر دعا دی۔ پھر اس ہنستے بستے ماحول میں موحد کے نام کی انگوٹھی اس کی انگلی میں پہنا کر، چاچی نے فوراً" تاریخ بھی مانگ لی۔ بے بے کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

"اتنی جلدی کیسے؟"

"عائشہ بہن ہمیں صرف آپ کی کملی بیٹی ہی چاہیے جس نے میرے بیٹے کو بھی کملا بنا کر رکھ دیا ہے۔ ویسے بھی کچھ عرصے بعد یہ بھی موحد کے ساتھ دبئی چلی جائے گی، سامان وغیرہ کی لوڑ نہیں ہے۔"

چاچی راشدہ آج حیران کرنے پہ تلی ہوئی تھیں۔ وہ جانتی تھیں کہ نمل ہو گی تو موحد کو اس سرزمین اور اپنوں سے باندھ کر رکھے گی۔ اور ایک سمجھ دار ماں نے کھانے کا سودا نہیں کیا تھا۔ جبکہ موقع ملتے ہی موحد، نمل کے سر پہ کھڑا کہہ رہا تھا۔

"میرا فون اور سب خط واپس کرو۔"

"وہ تو میرے لیے ہیں ناں!"

نمل نے مسکراتے ہوئے اس کے پھولے منہ کو دیکھا تھا۔

"تمہارے کس کام کے! تم نے تو قدر ہی نہیں کی ان کی۔ میرے جذبات کو بے مول سمجھ کر لفافے میں ہی بند رہنے دیا۔ میں سب جلا کر پھینک دوں گا۔"

موحد نے تپے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

"قدر ہے ناں! اسی لیے سب سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اور جہیز میں اپنے ساتھ لاؤں گی۔ پھر تمہاری زبانی ہی سب خط سنوں گی۔ ہوں ناں سمجھ دار۔"

نمل نے فخریہ لہجے میں کہا، تو موحد بے ساختہ ہنس پڑا۔

"سچ میں کملی ہے تُو!"

"اور تم کملی دا ڈھولا۔"

دونوں کی ہنسی فضا میں بکھر گئی تھی۔

تیرے ملنے کا ایک لمحہ

مقدر کی لکیروں میں

دھنک بھرنے کا موسم ہے!!

عفت سحر طاہر

بن مانگی دعا

امتیاز احمد اور سفینہ کے تین بچے ہیں۔ معیز' زارا اور ایزد۔ صالحہ' امتیاز احمد کی بچپن کی منگیتر تھی مگر اس سے شادی نہ ہو سکی تھی۔ صالحہ دراصل ایک شوخ' الہڑ سی لڑکی تھی۔ وہ زندگی کو بھرپور انداز میں گزارنے کی خواہش مند تھی مگر اس کے خاندان کا روایتی ماحول امتیاز احمد سے اس کی بے تکلفی کی اجازت نہیں دیتا۔ امتیاز احمد بھی شرافت اور اقدار کی پاس داری کرتے ہیں مگر صالحہ ان کی مصلحت پسندی' نرم طبیعت اور احتیاط کو ان کی بزدلی سمجھتی تھی۔ نتیجتاً" صالحہ نے امتیاز احمد سے محبت کے باوجود بدگمان ہو کر اپنی سہیلی شازیہ کے دور کے کزن مراد صدیقی کی طرف مائل ہو کر امتیاز احمد سے شادی سے انکار کر دیا۔ امتیاز احمد نے اس کے انکار پر دلبرداشتہ ہو کر سفینہ سے نکاح کر کے صالحہ کا راستہ صاف کر دیا تھا مگر سفینہ کو لگتا تھا جیسے ابھی بھی صالحہ' امتیاز احمد کے دل میں بستی ہے۔

شادی کے کچھ ہی عرصے بعد مراد صدیقی اپنی اصلیت دکھا دیتا ہے۔ وہ جواری ہوتا ہے اور صالحہ کو غلط کاموں پر مجبور کرتا ہے۔ صالحہ اپنی بیٹی ایبہا کی وجہ سے مجبور ہو جاتی ہے مگر ایک روز جوئے کے اڈے پر ہنگامے کی وجہ سے مراد کو پولیس پکڑ کر لے جاتی ہے۔ صالحہ شکر ادا کرتے ہوئے ایک فیکٹری میں جاب کر لیتی ہے۔ اس کی سہیلی زیادہ تنخواہ پر دوسری فیکٹری میں چلی جاتی ہے جو اتفاق سے امتیاز احمد کی ہوتی ہے۔ اس کی سہیلی صالحہ کو امتیاز احمد کا وزیٹنگ کارڈ لا دیتی ہے۔ جسے وہ اپنے پاس محفوظ کر لیتی ہے۔ ایبہا میٹرک میں ہوتی ہے۔ جب مراد رہا ہو کر آ جاتا ہے اور پرانے دھندے شروع کر دیتا ہے۔ دس لاکھ کے بدلے جب وہ ایبہا کا سودا کرنے لگتا ہے تو صالحہ مجبور ہو کر امتیاز احمد کو فون کرتی ہے۔ وہ فوراً" آ جاتے ہیں اور ایبہا سے نکاح کر کے اسے اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ ان کا بیٹا معیز احمد باپ کے اس راز میں شریک ہوتا ہے۔ صالحہ مر جاتی ہے۔ امتیاز احمد' ایبہا کو کالج میں داخلہ دلا کر ہاسٹل میں اس کی رہائش کا بندوبست کر دیتے ہیں۔ وہاں حنا سے اس کی





دوستی ہے جو اس کی روم میٹ بھی ہوتی ہے مگر وہ ایک خراب لڑکی ہوتی ہے۔
معیز احمد اپنے باپ سے ابیہا کے رشتے پر ناخوش ہوتا ہے۔ زارا اور سفیر احسن کے نکاح میں امتیاز احمد، ابیہا کو بھی مدعو کرتے ہیں مگر معیز اسے بے عزت کرکے گیٹ سے ہی واپس بھیج دیتا ہے۔ زارا کی نند رباب ابیہا کی کالج فیلو ہے۔ وہ تفریح کی خاطر لڑکوں سے دوستیاں کرکے ان سے پیسے بٹور کر ہلا گلا کرنے والا مزاج رکھتی ہے اور اپنی سہیلیوں کے مقابلے اپنی خوب صورتی کی وجہ سے زیادہ تر ٹارگیٹ جیت لیا کرتی ہے۔ رباب، معیز احمد میں بھی دلچسپی لینے لگتی ہے۔ ابیہا کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے مگر وہ اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ وہ معیز احمد کی گاڑی سے ٹکرائی تھی کیونکہ معیز اپنے دوست عون کو آگے کر دیتا ہے۔ ایکسیڈنٹ کے دوران ابیہا کا پرس کہیں گر جاتا ہے۔ وہ نہ تو ہاسٹل کے واجبات ادا کرپاتی ہے۔ نہ ایگزامز کی فیس۔ بہت مجبور ہو کر وہ امتیاز احمد کو فون کرتی ہے مگر وہ دل کا دورہ پڑنے پر اسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ ابیہا کو بحالت مجبوری ہاسٹل اور ایگزامز چھوڑ کر حنا کے گھر جانا پڑتا ہے۔ وہاں حنا کی اصلیت کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ اس کی ماما جو کہ اصل میں "میم" ہوتی ہیں، زور زبردستی کرکے ابیہا کو بھی غلط راستے پر چلانے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا بہت سر پٹختی ہے مگر میم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ امتیاز احمد دوران بیماری معیز سے اصرار کرتے ہیں کہ ابیہا کو گھر لے آئے مگر سفینہ بھڑک اٹھتی ہیں۔ امتیاز احمد کا انتقال ہو جاتا ہے۔ مرنے سے قبل وہ ابیہا کے نام پچاس لاکھ گھر میں حصہ اور ماہانہ دس ہزار کر جاتے ہیں۔ اس بات پر سفینہ مزید تپ جاتی ہیں۔ معیز، ابیہا کے ہاسٹل جاتا ہے۔ کالج میں معلوم کرتا ہے مگر ابیہا کا کچھ پتا نہیں ملتا۔ وہ چونکہ رباب کے کالج میں پڑھتی تھی۔ اس لیے معیز باتوں باتوں میں رباب سے پوچھتا ہے مگر وہ لاعلمی کا اظہار کرتی ہے۔
عون، معیز احمد کا دوست ہے۔ ثانیہ اس کی منکوحہ ہے۔ مگر پہلی مرتبہ بہت عام سے گھریلو حلیے میں دیکھ کر وہ ناپسندیدگی کا اظہار کر دیتا ہے۔ جبکہ ثانیہ ایک پڑھی لکھی ذہین اور بااعتماد لڑکی ہوتی ہے۔ وہ عون کے اس طرح انکار کرنے پر شدید ناراض ہوتی ہے۔ پھر عون پر ثانیہ کی قابلیت کھلتی ہے تو وہ اس سے محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے مگر اب ثانیہ اس سے شادی سے انکار کر دیتی ہے۔ دونوں کے درمیان خوب تکرار چل رہی ہے۔
میم، ابیہا کو سیفی کے حوالے کر دیتی ہیں جو ایک عیاش آدمی ہوتا ہے۔ ابیہا اس کے دفتر میں جاب کرنے پر مجبور کر دی جاتی ہے۔ سیفی اسے ایک پارٹی میں زبردستی لے کر جاتا ہے، جہاں معیز اور عون بھی آئے ہوتے ہیں مگر وہ ابیہا کے یکسر مختلف انداز حلیے پر اسے پہچان نہیں پاتے تاہم اس کی گھبراہٹ کو محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ابیہا پارٹی میں ایک ادھیڑ عمر آدمی کو بلاوجہ بے تکلف ہونے پر تھپڑ مار دیتی ہے۔ جواباً سیفی بھی اسی وقت ابیہا کو ایک زوردار تھپڑ جڑ دیتا ہے۔ عون اور معیز کو اس لڑکی کی تذلیل پر بہت افسوس ہوتا ہے۔ گھر آکر سیفی میم کی اجازت کے بعد ابیہا کو خوب تشدد کا نشانہ بناتا ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ اسپتال پہنچ جاتی ہے۔ جہاں عون اسے دیکھ کر پہچان لیتا ہے کہ یہ وہی لڑکی ہے جس کا معیز کی گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ عون کی زبانی یہ بات جان کر معیز سخت حیران اور بے چین ہوتا ہے۔ وہ پہلی فرصت میں سیفی سے میٹنگ کرتا ہے۔ مگر اس پر کچھ ظاہر نہیں ہونے دیتا۔ ثانیہ کی مدد سے وہ ابیہا کو آفس میں موبائل بھجواتا ہے۔ ابیہا بمشکل موقع ملتے ہی باتھ روم میں بند ہو کر اس سے رابطہ کرتی ہے۔ مگر اسی وقت دروازے پر کسی کی دستک ہوتی ہے۔ حنا کے آجانے سے اسے اپنی بات ادھوری چھوڑنی پڑتی ہے۔ پھر بہت مشکل سے ابیہا کا رابطہ ثانیہ اور معیز احمد سے ہو جاتا ہے۔ وہ انہیں بتاتی ہے کہ اس کے پاس وقت کم ہے۔ میم اس کا سودا کرنے والی ہیں لہٰذا اسے جلد از جلد یہاں سے نکال لیا جائے۔ معیز احمد، ثانیہ اور عون کے ساتھ مل کر اسے وہاں سے نکالنے کی پلاننگ کرتا ہے اور یہیں اسے اپنا پراسرار راز کھولنا پڑتا ہے۔
وہ بتا دیتا ہے کہ ابیہا اس کے نکاح میں ہے مگر وہ نہ پہلے اس نکاح پر راضی تھا نہ اب۔ پھر ثانیہ کے آئیڈیا پر عمل کرتے ہوئے وہ اور عون میڈم رعنا کے گھر جاتے ہیں۔ میڈم ابیہا کا سودا معیز احمد سے طے کر دیتی ہے مگر معیز کی ابیہا سے ملاقات نہیں ہو پاتی کیونکہ وہ ڈرائیور کے ساتھ بیوٹی پارلر گئی ہوتی ہے۔ وہاں موقع ملنے پر ابیہا، ثانیہ کو فون کر دیتی ہے۔ ثانیہ بیوٹی پارلر پہنچ جاتی ہے۔ دوسری طرف تاخیر ہونے پر میڈم، حنا کو بیوٹی پارلر بھیج دیتی ہے مگر ثانیہ، ابیہا کو وہاں سے

نکالنے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ ثانیہ کے گھر سے معیز اسے اپنے گھر انیکسی میں لے جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر سفینہ بیگم بری طرح بھڑک اٹھتی ہیں مگر معیز سمیت زارا اور ابیہا انہیں سنبھالنے کی کوشش کرتے ہیں۔ معیز احمد اپنے باپ کی وصیت کے مطابق ابیہا کو گھر لے تو آتا ہے مگر اس کی طرف سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرا کر ثانیہ کو فون کرتی ہے۔ وہ اس سے ملنے چلی آتی ہے اور حیران رہ جاتی ہے۔ گھر میں کھانے پینے کو کچھ نہیں ہوتا۔ وہ عون کو فون کرکے شرمندہ کرتی ہے۔ عون نادم ہو کر کچھ اشیائے خورد و نوش لے آتا ہے۔ معیز احمد بزنس کے بعد اپنا زیادہ تر وقت رباب کے ساتھ گزارنے لگتا ہے۔

سفینہ بیگم اب تک یہی سمجھ رہی ہیں کہ ابیہا مرحوم امتیاز احمد کے نکاح میں تھی مگر جب انہیں پتا چلتا ہے کہ وہ معیز کی منکوحہ ہے تو ان کے غصے اور نفرت میں بے پناہ اضافہ ہو جاتا ہے۔ وہ اسے اٹھتے بیٹھتے بری طرح ٹارچر کرتی ہیں اور اسے بے عزت کرنے کے لیے اسے نذیراں کے ساتھ گھر کے کام کرنے پر مجبور کرتی ہیں۔ ابیہا ناچار گھر کے کام کرنے لگتی ہے۔ معیز کو برا لگتا ہے مگر وہ اس کی حمایت میں کچھ نہیں بولتا۔ یہ بات ابیہا کو مزید تکلیف میں مبتلا کرتی ہے۔ وہ اس پر تشدد بھی کرتی ہیں۔

پرانے شکوے شکایتیں دور کرنے کی خاطر عون کے ابا عون اور ثانیہ کو اسلام آباد نازیہ کی شادی میں شرکت کرنے کے لیے بھیجتے ہیں۔ جہاں ارم ان دونوں کے درمیان آنے کی کوششیں کرتی ہے اور ثانیہ اپنی بے وقوفی کے باعث عون سے شکوے اور ناراضیاں رکھ کر ارم کو موقع دیتی ہے۔ عون صورت حال کو سنبھالنے کی بہت کوشش کرتا ہے مگر ثانیہ اس کے ساتھ بھی زیادتی کر جاتی ہے۔ ارم کی بہن نیلم ایک اچھی لڑکی ہے۔ وہ ثانیہ کو سمجھانے کی کوشش کرتی ہے کہ اگر عون نے پہلے شادی سے انکار کرکے اس کی عزت نفس کو ٹھیس پہنچائی تھی تو اب اپنی عزت نفس اور انا کو چھوڑ کر آپ کو منانے کے لیے جتن بھی کر رہا ہے۔ عزت کریں عون کی' اور دوسروں کو اپنے درمیان آنے کا موقع نہ دیں۔ ثانیہ کچھ کچھ مان لیتی ہے۔ تاہم مہندی میں کی گئی ثانیہ کی بدتمیزی پر عون دل میں اس سے ناراض ہو جاتا ہے۔

رباب' سفینہ بیگم کے گھر آتی ہے تو ابیہا کو دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے۔ پھر سفینہ بیگم کی زبانی ساری تفصیل سن کر اس کی تضحیک کرتی ہے۔ ابیہا بہت برداشت کرتی ہے مگر دوسرے دن کام کرنے سے انکار کر دیتی ہے۔ سفینہ بیگم کو شدید غصہ آتا ہے۔ وہ انیکسی جا کر اس سے لڑتی ہیں۔ اسے تھپڑ مارتی ہیں' جس سے وہ گر جاتی ہے۔ اس کا سر پھٹ جاتا ہے اور جب وہ اسے حرام خون کی گالی دیتی ہیں تو ابیہا پھٹ پڑتی ہے۔ معیز آکر سفینہ کو لے جاتا ہے اور واپس آکر اس کی بینڈیج کرتا ہے۔ ابیہا کہتی ہے کہ وہ پڑھنا چاہتی ہے۔ معیز کوئی اعتراض نہیں کرتا۔ سفینہ بیگم ایک بار پھر معیز سے ابیہا کو طلاق دینے کا پوچھتی ہیں تو وہ صاف انکار کر دیتا ہے۔

۲۰
بیسویں قسط

ثانیہ پوری جان سے تھرا کر رہ گئی۔

سینڈلز کی تلاش میں سرگرداں نیگلے میں الجھ کر وہ منہ کے بل گرنے کو تھی جب دو ہاتھوں نے شانوں سے تھام کر سہارا دیا' نگاہ اٹھاتے ہی اس نے سامنے عون عباس کو پایا تو دل نے بے ترتیبی سے دھڑک دھڑک کر قیامت کر دی۔

"کون سا خزانہ ڈھونڈا جا رہا ہے بیڈ کے نیچے.....؟"

بجے سنورے چہرے پر ایک تفصیلی نگاہ ڈالتے ہوئے وہ بڑے سکون سے پوچھ رہا تھا۔

ثانیہ کسمسا کر تھوڑا پیچھے ہٹی اور بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یوں اچانک عون کی آمد ہو سکتی ہے۔ سو فطرتاً" وہ جتنی بھی پُر اعتماد سی مگر دلہناپے کے روپ اور عون عباس کے کمرے میں

اپنی موجودگی نے اسے حد درجہ نروس کر دیا تھا۔

عون اس کے بالکل ساتھ بیٹھ گیا تو ثانیہ کا رہا سہا اعتماد بھی جاتا رہا۔ وہ یونہی نروس سی نظریں جھکائے دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی انگلی میں موجود انگوٹھی کو گھماتی رہی۔

(اب یہ مجھ پہ برسے گا۔۔ ریجیکشن؟)

ثانیہ نے بہت کچھ سوچا تھا۔ یہ کروں گی وہ کروں گی۔۔ ایسا کہے گا تو یہ جواب دوں گی (منہ توڑ)

مگر وہ یوں ساتھ آکے بیٹھا تو گویا ثانیہ کی ساری ہمت جواب دے گئی۔

عون نے چہرہ گھما کے اس کی طرف دیکھا۔

یونہی پلکیں جھکائے انگلی کی انگوٹھی گھماتی۔ عون کے لبوں پہ خفیف سی مسکراہٹ آگئی۔ اس نے انگشت شہادت سے اس کے کان کے جھمکے کو ہلکے سے چھوا اور دھیمی آواز میں بولا۔ "ہوں۔ تو کیا کہہ رہی تھیں تم کیا کرنے والی تھیں شادی کے بعد۔۔ ہوں؟"

اف اس قدر ٹھنڈا طنز؟ کم از کم ثانیہ کو تو ایسا ہی معلوم ہوا۔ مگر فی الوقت تو اس کی قربت زبان گنگ کیے ہوئے تھی۔ اوپر سے اس کا پُراستحقاق انداز۔۔ یعنی جو چاہے کر سکنے والا انداز۔

عون نے دلچسپی سے دیکھا۔ روایتی سرخ رنگ کے عروسی لباس کی ہم رنگ لپ اسٹک نے اس کے اوپری ہونٹ کے خم کی خوب صورتی کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

"کیا بات ہے۔۔ زبان نہیں لائیں جہیز میں۔۔۔؟"

کیا وہ "چھیڑ" رہا تھا یا یہ اس کی عزت نفس پر حملہ تھا؟ ثانیہ کے پاس سوچنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ اگر یونہی اس کی قربت سے گھٹی چھوئی موئی بنی رہتی تو وہ اسے اس کی "ہار" ہی سمجھتا۔

طویل جنگ کے بعد بات "محبت" پر ختم ہوتی تو وہ مسکرا کر اس کی بانہوں میں سمٹ جاتی لیکن جنگ ابھی تک جنگ ہی تھی اور طویل جنگ کے آخر میں ہارنا۔۔۔ ثانیہ نے سیکھا ہی نہیں تھا۔

اس نے بڑے حوصلے سے اتنی دیر میں پہلی بار پلکیں اٹھا کر عون عباس کی طرف دیکھا۔

ان آنکھوں میں جیسے قندیلیں روشن تھیں۔ ان آنکھوں کا دیکھنا ایسا ہی تھا کہ جیسے کسی نابینا کو بینائی عطا کرنے کا شرف بخشا جائے۔

اور ابھی وہ ان آنکھوں کی گہرائی میں ڈوبتے اپنے دل ہی کو سنبھال رہا تھا کہ اس نے خوب صورت خم دار لبوں کی جنبش دیکھی۔

"بے فکر رہو۔ زبان ہی نہیں، عقل بھی ساتھ لائی ہوں عون عباس! اپنے متعلق بہت اچھے فیصلے کروں گی ان شاء اللہ۔" عون کا دماغ چکرا یا۔

معیز کتنی ہی دیر اس کا دماغ کھا کر گیا تھا۔

"لڑکیاں شادی سے پہلے یونہی نخرے دکھاتی رہتی ہیں۔ مگر شادی کے بعد موم کی گڑیا بن جاتی ہیں۔ شوہر کی آنکھ کے اشارے پہ چلنے والی۔ وہ تمہاری زندگی میں شامل ہو گئی ہے اس کی سوچ کچھ بھی تھی مگر اب وہ تمہارے گھر میں تمہارے نام سے آچکی ہے تو اس کی قدر کرنا۔ زندگی کی خوب صورتیوں کو "خوب صورتی" ہی سے انجوائے کرنا چاہیے۔ ورنہ بہت سی خالی جگہیں باقی رہ جاتی ہیں۔ جنہیں آپ دوبارہ زندگی میں کبھی۔۔۔ نہیں کر سکتے۔"

یہ معیز کی پُرمغز تقریر کے چیدہ چیدہ نکات تھے۔ جنہوں نے عون کا غصہ ٹھنڈا کرنے میں معاون کردار ادا کیا۔

اور وہ بڑے اچھے موڈ اور خیر سگالی کے جذبات لیے کمرے میں آیا تھا تو قدرتی بات... ثانیہ کو اپنے کمرے میں اپنی عروس کے طور پر (باضابطہ) پکڑ کر دل بے حد ترنگ میں دھڑکا۔ اس کا روپ قاتلانہ تھا تو خاموش انداز دلبرانہ۔

مگر اب جب یہ خوب صورت ہونٹ کھلے تو "برسٹ" ہی نکلا تھا۔ دل و جگر زخمی ہو کر رہ گئے۔ عون نے ایک بھرپور نظر کڑے انداز میں اس کا چہرہ گویا جانچا۔ (کیا عزائم ہیں بھئی؟)

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ عون نے بے اختیار چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

وہ تو پتا نہیں کب سے اس تیل چپڑے بالوں والی ثانیہ پر مرمٹا تھا۔ (بے چارہ) یہ تو کسی راجدھانی کی ملکہ کا سا روپ تھا۔ (عون کی قسمت) مگر ایسی ملکہ جو اپنی رعایا پر سخت خفا تھی۔

وہ بے ساختہ مسکراتے ہوئے اٹھ کر ثانیہ کے مقابل آگیا۔ اس نے سر پہ پہنا کلاہ تو اتار دیا تھا مگر شیروانی وہی تھی (جو خالہ نے ضد کر کے بطور خاص ثانیہ سے پسند کروائی تھی) ثانیہ نے بے اختیار نگاہ چرائی جو اس پہ نثار ہوئے جاتی تھی۔ رونا آیا۔

پہلے دل خالی تھا تو جینا مشکل ہوا جاتا تھا۔ اور اب جبکہ وہاں عون عباس براجمان ہو چکا تھا تو اور "وخت" پڑ گئے تھے۔

"اوہو۔ میرے کمرے میں موجود... ہاتھوں پہ میرے نام کی مہندی لگائے۔" بہانے سے اس کے دونوں ہاتھ تھام لیے) عون لطف لینے والے انداز میں کہتا اس کے مہندی سے سجے ہاتھوں کو دیکھتے ہوئے لمحہ بھر کو رکا پھر اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ "اور اتنا غرور... اتنی اکڑ...؟ اف۔"

کیا چاہتا تھا وہ۔ کیا میں اس کے قدموں میں گر کے اپنے کہے لفظوں کی معافی مانگوں؟ یا کسی مظلوم سی عورت کا روپ دھار کے "سرتاج" پہ نثار ہو جاؤں؟ ثانی کو فوراً "دو جمع دو" کر کے اصل جواب معلوم کرنا تھا اور اس نے کر لیا۔

اس سے پہلے کہ کوئی ہمیں جھٹکے... بہتر ہے اسی کو جھٹک دو۔

ثانیہ نے اپنے تمام تر جذبات اور احساسات کو بہ سرعت اس سوچ سے سرد ہوتے پایا۔ تو پھر آگے کیا مشکل تھی؟ اس نے آرام سے اپنے ہاتھ پیچھے کھینچے اور پلٹ گئی۔ لہنگے کو چٹکیوں میں تھام کر ذرا سا اوپر کیا اور بیڈ کے کنارے کے نیچے پڑی سینڈلز کو پاؤں کی مدد سے باہر گھسیٹا۔

"یہ جوتے پہننے کا کون سا وقت ہے؟"

عون نے اس کی مصروفیات ملاحظہ کرتے ہوئے تبصرہ کیا۔

"میں کپڑے تبدیل کرنے جا رہی تھی۔ تین گھنٹے کا ڈرامہ بھی ختم ہوا اور مووی بھی بن گئی... اب بس۔"

وہ اطمینان سے چلتی ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آگئی اور انگوٹھیاں اتار کے رکھنے لگی۔ اف آنسو اُمڈ کے آرہے تھے۔ جنہیں وہ پتا نہیں کتنی ہمت سے اندر دھکیلتی۔

وہ بہت انا پرست تھی... محبت میں ذلیل ہونا گوارا نہ تھا۔ وہ ہنستا اور کہتا بس یہ تھی تمہاری نفرت؟ ہار گئیں نا عون عباس کی محبت میں تو وہ مر ہی جاتی۔ اور ادھر عون کے دماغ میں خطرے کی گھنٹی بجی۔ تو خودکش حملے کی تیاری مکمل تھی۔ (یعنی میرا شک ٹھیک تھا۔ دہشت گردی کا جامع منصوبہ) عون نے اسے گھور کے دیکھا۔

وہ اب دوپٹے کی پنیں نکالنے میں مصروف تھی۔ جیسے بالکل اکیلی ہو (عون موجود نہ ہوتا تو شاید گنگنا بھی لیتی) عون کا یہیں جل بھن کر خاک ہو گیا۔

آگے بڑھ کے اس کا ہاتھ تھاما۔

"یہ کیا بے وقوفی ہے۔۔۔ کیا کر رہی ہو۔۔۔ بات تو کرنے دو مجھے۔۔۔" اس بے چارے کی بھی تو پہلی شادی تھی۔ اپنی طرف سے تو غصے سے ہی کہا۔ مگر کوئی خاطر میں لائے بھی تو نا؟

"میری بات تم نے سن لی نا۔۔۔؟ اب اس سے آگے کہو۔" ثانیہ نے تحمل سے کہا تو وہ بھک سے اڑا۔

"تم۔۔۔ یعنی کہ تم میری زندگی میں آنے کے بعد اپنے فیصلے خود کرو گی؟"

عون کے پیروں تلے تو جیسے کسی نے جلتے کوئلے بچھا دیے تھے۔ وہ پاؤں پٹختا اور بار بار پٹختا تو بھی جلن کم نہ ہوتی۔

"ہاں تو کیا۔۔۔؟ تمہاری نصف بہتر بن کے آئی ہوں۔ یعنی نصف تم ہو اور نصف میں۔۔۔ جتنا حق تمہارا ہے اتنا ہی میرا۔ اگر تم فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتے ہو تو میں کیوں نہیں؟" حد درجہ اطمینان اور سکون کی کیفیت دلہنوں کے سر شاید گولڈن نائٹ میں چکراتے ہوں مگر یہاں تو بے چارے دولہا کا سر تو کیا چکراتا چڑیاں طوطے سب اڑ گئے ہاتھوں سے۔

کیا دو کا پہاڑہ سنایا تھا راج کماری ثانیہ نے۔ سب کچھ برابر کا تقسیم کر کے رکھ دیا۔ وہ شال اتار کر اسٹول پہ رکھ کے وہ سارا زیور اتارنے کے بعد کپڑے تبدیل کرنے چلی گئی۔

اور ادھر عون صاحب لائحہ عمل طے کرنے ہی میں مصروف کھڑے تھے۔

کیا کرنا چاہیے۔۔۔ غصے سے چیخنا چلانا چاہیے۔۔۔ اونہوں۔ ایا کون سا بہرے ہیں۔ مہمانوں سے بھرا گھر ہے۔ زبردستی؟! احساس ہوا کہ وہ دولہا ہے کچھ بھی کر سکتا ہے تو دل کو تقویت ہی۔ مگر ساتھ ہی ثانیہ کا سنایا دو کا پہاڑا یاد آ گیا۔ وہ بتا چکی تھی کہ وہ بھی اتنی ہی با اختیار ہے جتنا کہ عون عباس۔ تو کیا وہ چیخ و پکار نہ مچا دے گی؟ یا اللہ۔۔۔ عون کا جی چاہا دیوار میں مکا دے مارے۔۔۔ ایسی بدمزہ شادی وہ مر کے بھی نہیں کرنا چاہتا تھا جیسی جیتے جی ہو گئی۔ ثانی ویسی ہی تھی۔ انا پسند، مغرور اور تنتنے والی۔ شادی جیسے لطیف بندھن نے بھی جسے نہ بدلا تھا۔

وہ ٹھنڈا سا ہو کر اوندھے منہ بستر پر گر گیا۔ ثانی کا انتظار بے کار تھا۔ وہ اپنا فیصلہ اپنے سرد انداز سے سنا چکی تھی۔ اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد میک اپ صاف کرنے اور بیسن پہ جھک کے منہ پہ مسلسل پانی کے چھینٹے مارتی اور آنسو بہاتی ثانیہ سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ "گربہ کشتن روز اول" (بلی کو پہلے ہی دن مار دو) کے محاورے پر عمل کرنے میں وہ بہت جلدی کر گئی تھی۔ اس نے عون کے رویے کو جانچنے کی زحمت کیے بغیر بہت عجلت میں اپنی انا کو بچانے کی کوشش کر ڈالی۔

اور اپنا کتنا بڑا نقصان کیا۔۔۔ یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ اکثر ہم اسی نقصان پر آنسو بہا رہے ہوتے ہیں۔ جس کے ذمہ دار در حقیقت ہم خود ہی ہوتے ہیں۔ مگر بے وقوفی میں سمجھ نہیں پاتے۔

☆ ☆ ☆

آج کی رات ابیہا پر بہت بھاری تھی۔

وہ سلگتی سانس۔۔۔ اور معیز احمد کے ملبوس سے اٹھتی مخصوص خوشبو۔۔۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ ابیہا کے وجود میں ضم ہو گئی ہو۔ ایسے کہ من و تو کا فرق مٹ گیا ہو۔ اسے رونا آئے جاتا۔

کیا تھا وہ لمس۔۔۔ وہ قربت۔ محض چند لمحے۔۔۔ مگر ان چند لمحوں نے ابیہا پہ در حقیقت واضح کر دیا کہ معیز احمد اس کی زندگی میں کیا حیثیت رکھتا تھا۔

(اف۔۔۔ معیز احمد۔ تمہیں قریب سے دیکھ کے یہ حال ہے تو تمہیں پا کے مر ہی نہ جاؤں)

کاش۔۔۔ میری زندگی بھی ثانیہ جیسی ہوتی۔ اس کی حسرت کا کوئی شمار نہ تھا۔ عون بھائی کتنی محبت سے بیاہ کے لے گئے ہیں انہیں۔ کاش معیز اور میری زندگی بھی ان ہی کی طرح گل رنگ ہوتی۔

زندگی میں ہم ایسے کتنے ہی کاش اپنی زندگی میں لگا لیتے ہیں۔ جن کا پورا ہو جانا در حقیقت زندگی کی بربادی ہوتا ہے۔ خدا سے ہمیشہ بہتری کی دعا مانگو "کسی جیسی" زندگی یا خوشی کے بجائے "بہتری"

وہ کروٹ پہ کروٹ بدلتی مگر نیند تھی کہ آ کے ہی نہیں دے رہی تھی۔

اور ادھر لان میں کھلنے والی ایک کھڑکی میں کھڑا سایہ۔۔۔ خود احتسابی کی کیفیت میں کھڑا اندھیرے میں گھور رہا تھا۔ یہ معیز احمد تھا۔ وہ رباب احسن سے شادی کرنا چاہتا تھا۔ دل و دماغ کی پوری رضامندی کے ساتھ۔ مگر ایمہا مراد۔۔۔ وہ راہ کا پتھر؟ وہ کیسے مزاحم ہونے کو تھا؟

وہ خود کو کتنی ہی بار لعنت ملامت کر چکا تھا۔

ایسی بھی کیا نیند اور اتنی بھی کیا بے اختیاری۔۔۔ اس کے ہاتھوں میں جیسے ریشمی تھان کی سی ملائمت گھلنے لگی۔ تو اس نے دونوں ہاتھ کھڑکی کی چوکھٹ پہ دے مارے۔ تکلیف کا ایک گہرا احساس۔ اس کا دھیان ایمہا مراد سے ہٹنا۔ وہ یہی چاہتا تھا۔ تو کیا اب "چاہنے سے" وہ خیال سے محو ہوا کرے گی؟! ایک نئے سوال نے اسے ڈنک مارا۔

ماما ٹھیک کہتی ہیں۔ مجھے جلد ہی رباب سے شادی کر لینی چاہیے۔

اس نے اپنی بھٹکتی سوچوں کو ایک مضبوط سہارا دیا۔۔۔ پھر اس نے آسمان پہ روشن چاند دیکھا اور کھل کے مسکرایا۔ رباب سیاہ آسمان کے وسط میں تنہا روشن چاند۔۔۔ سیاہ بادلوں کے ہالے میں جگمگاتا ایمہا مراد کا چہرہ معیز احمد کے دھیان میں روشن ہونے لگا۔ تو جھنجلا کر کھڑکی کی سلائیڈ کھینچ کر شیشہ برابر کرتا وہ اپنے بستر کی طرف پلٹ گیا۔

جب سے ایمہا مراد اس کی زندگی میں آئی تھی اس کی نیند ڈسٹرب تھی۔۔۔ آج تو شاید دل بھی۔

وہ تکیے میں منہ گھسیڑے سونے کی کوشش میں تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ اچھی طرح دل ہلکا کرنے کے بعد خود کو بہت کمپوز کرتی باہر آئی تو ٹھٹک سی گئی۔

کپڑے تبدیل کرنے کی زحمت کیے بغیر عون عباس اسی شیروانی میں اوندھا پڑا تھا۔ ثانیہ کو شک گزرا۔ وہ ذرا سا آگے بڑھی تو شک یقین میں بدل گیا۔ اس کے ہلکے ہلکے خراٹوں کی آواز آ رہی تھی۔ یعنی وہ گہری نیند میں تھا۔

ثانیہ کو رونا آنے لگا۔ عون کی ناراضی اور غصہ اپنی جگہ۔۔۔ مگر کیا اب مجھے روزانہ ہی "خراٹوں" کی آواز سن سن کے سونا پڑے گا۔۔۔؟

ثانیہ کے پاس رونے کا ایک اور جواز موجود تھا۔ بددلی سے لائٹ آف کر کے نائٹ بلب آن کرتی وہ اپنی جگہ پر آ کر دراز ہو گئی۔ آج کی رات آنکھوں میں کاٹنے والی وہ تیسرا فرد تھی۔۔۔ اس نے رشک سے خراٹے لیتے دنیا و مافیہا سے بے خبر سوئے عون عباس کو دیکھا اور گہری سانس بھر کے رہ گئی۔

✲ ✲ ✲

ثانیہ کی کزنز ناشتہ لے کے آ چکی تھیں۔

ثانیہ کی نیند تو ویسے ہی روٹھی ہوئی تھی، وہ فریش ہو کر ہلکی پھلکی تیاری کے ساتھ آٹھ بجے ہی سر پہ سلیقے سے دوپٹا اوڑھے لاؤنج میں جا پہنچی ایا اس کے سلام پر نہال ہی تو ہو گئے۔ عزیز تو وہ پہلے بھی تھی۔ اب تو لاڈلی بہو بھی بن

گئی تھی۔

باقاعدہ امی کو تو ازدے کر بلایا۔ وہ کچن میں ان کے لیے بیڈ ٹی بنا رہی تھیں۔ افشاں و خیزاں آئیں تو ان کے پاس صوفے پر نکھری نکھری گڑ قدرے جھینپی سی بیٹھی ثانی کو دیکھ کر حیران سی ہو گئیں۔

ثانیہ نے کھڑے ہوتے ہوئے انہیں شرمیلا سا سلام کیا تو وہ جیسے ہوش میں آئیں۔ آگے بڑھ کے اسے لپٹا کے پیار کیا۔ ان کے تو وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ دلہن صبح آٹھ بجے اتنی "ریڈی" حالت میں لاؤنج میں پائی جا سکتی ہے۔ مگر اب شوہر کے سامنے نہ پوچھتیں۔ (بیٹا خیر تو ہے اتنی جلدی اٹھ گئیں ہنسی خود کو ڈپٹا)

"مامی! آپ ناشتہ بنا رہی ہیں؟ میں بنا دوں؟"

ثانیہ نے خلوص کی مار مارتے ہوئے امی کو تو نڈھال ہی کر دیا۔

"ارے نہیں۔ ان کی بیڈ ٹی بنا رہی ہوں۔ جو یہ ہمیشہ بیڈ کے بجائے لاؤنج میں آ کر پیتے ہیں۔" وہ گڑبڑا گئیں۔ چھوٹی کے لیے دودھ گرم کرنے کے لیے آئی۔ بھابی کی آنکھوں کی نیند سامنے کا سین دیکھ کر اڑن چھو ہو گئی پھر انہوں نے گہری سانس بھری۔

"پچھ نہ پچھ گڑبڑ تو ضرور لگتی ہے۔" وہ کچن میں گھستے ہوئے سوچ رہی تھیں۔

وہ ابا کے پاس بیٹھ کے آج کے اخبار کی خبروں پر رائے دینے لگی۔ امی تو بس سسر اور بہو کی سیر حاصل گفتگو سنتیں یا پھر ان کا منہ دیکھے جاتیں۔

خدا خدا کر کے ثانیہ کے گھر سے فون آیا۔ ادھر سے ناشتہ آ رہا تھا۔

امی نے دل کی مراد بر آئی۔

"جاؤ ثانیہ۔ بیٹا عون کو بھی بلا لاؤ۔ ابھی سب آ جائیں گے۔" خود تو جا نہ سکتی تھیں بہانے سے بہو کو اٹھانا چاہا۔

"وہ تو ابھی سو رہے ہیں مامی۔" پلکیں جھکا کر بڑے ادب سے بتایا۔

ابا کی مونچھیں پھڑکیں۔ طنز سے ہنکارا ابھرا۔

"وہ تو دوسروں کی شادی سے ہو کے آئے تو دس بجے سے پہلے نہیں اٹھتا۔ یہ تو پھر اس نے اپنی شادی کا معرکہ مارا ہے۔" یا اللہ۔ اب یہ نئی نویلی بہو کے سامنے بیٹے کو جھاڑیں گے۔ امی کو نئی فکر لگی۔

بمشکل مسکرائیں۔ پھر ثانیہ کو اشارہ کیا۔

"تم جاؤ تو۔ جا کے دیکھو۔ اٹھ گیا ہو گا۔" ثانیہ فوراً "حکم" کی تعمیل میں اٹھ گئی۔

"اگر سویا پڑا رہا تو ناشتہ نہیں ملے گا۔ یہ بھی بتا دینا موصوف کو۔ زیادہ دولہا نہ سمجھے خود کو۔" ابا کی للکار ثانیہ نے پیچھے سے بخوبی سنی تھی اور امی کی جھڑکتی ہوئی دھیمی آواز۔

"اُف۔ آپ بھی نا۔ شادی کی پہلی صبح ہے۔ کچھ تو خیال کریں۔ بہو کے سامنے تو عزت رکھ لیں بیٹے کی۔"

"میری بھانجی بھی تو ہے۔ جی خوش کر دیا صبح صبح بزرگوں کی دعائیں لے کر۔" ابا کو تو فخر کا نیا موقع مل گیا تھا۔

سیڑھیاں چڑھتی ثانیہ کے ہونٹوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹنے کو تھا۔ جلتے جلتے دل کو بہت قرار آیا۔

احتیاط سے دروازہ کھول کے دیکھا۔ وہ پُرسکون ماحول میں بے پرواہ سو رہا تھا۔

چ۔۔۔ چ۔۔۔ ثانیہ نے اسے دیکھتے ہوئے تاسف سے سر ہلایا۔ کتنا برا ہو گا جب دولہا کو ناشتہ نہیں ملے گا۔

ثانیہ کا اسے جگانے کا قطعی کوئی ارادہ نہیں تھا۔ مگر یہ بھی خیال تھا کہ اگر مامی اسے جگانے آ گئیں تو اسے یوں شیروانی میں ملبوس سوئے دیکھ کر۔۔۔ اسے جھرجھری سی آئی۔ ایک نظر بے سدھ پڑے عون کو دیکھ کر وہ دروازے کی

طرف بڑھی۔ اندر سے لاک دبایا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔ اب کوئی بھی آئے، دروازہ تب ہی ان لاک ہوتا جب عون اندر سے دروازے کی ناب گھماتا۔

وہ ہاتھ جھاڑتی سیڑھیوں کے طرف بڑھی۔

"جی ممی جان۔ آپ کا پیغام ہوئے آئی ہوں۔"

ادب سے ان کے گوش گزار کیا اور ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ امی بے چاری کام والیوں سے الجھ رہی تھیں ورنہ شاید ایک بار تو اپنے لاڈلے کی خبر لے ہی آتیں۔

ثانیہ کی شہر میں موجود کزنز خالہ کے گھر سے اس کا ناشتہ لائی تھیں۔ امی اور بھابھی ناشتے کا سامان اور برتن لگانے میں مصروف۔ ایسے میں فقط ابا ہی تھے جو کڑی نظروں سے باربار گھڑی کی سوئیوں کو ساڑھے نو بجاتے اور پونے دس کی جانب بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

"وہ ناخلف ابھی تک نہیں اٹھا۔ سارا شہر جاگ گیا۔" وہ اندر ہی اندر تلملا رہے تھے۔

سالیاں کتنی بار دولہا بھائی کی بابت پوچھ چکی تھیں۔ امی نے ایک بار تو بھابی کو دوڑایا۔ ناشتہ بالکل ریڈی تھا۔ ایک بار ابا سب کے ساتھ ناشتے کے لیے پہنچ جاتے تو کسی کی مجال نہ تھی جو ناشتے کے بیچ اٹھ کے جاتا اور عون کو بلا کے لاتا۔

"دروازہ لاک ہے۔ میں نے تو کافی بجایا۔ آوازیں بھی دی ہیں۔"

بھابی نے آکر بتایا۔ امی کو اطمینان ہوا۔

"اچھا۔ تیار ہو کے آنے لگا ہو گا۔ تم سب کو ناشتے کی ٹیبل پہ بلاؤ۔"

مگر کہاں۔ سب ناشتے کی ٹیبل پر پہنچ گئے، ناشتہ شروع ہوا۔ باتیں ہنسی مذاق۔

امی کے دل کو تو گویا پنکھے ہی لگ گئے۔

ادھر بھابی کی آواز اور دھڑدھڑاتے دروازے نے عون کو بوکھلا کر اٹھنے پر مجبور کر دیا۔ اردگرد کے پھولوں سے سجے ماحول کو دیکھ کر خیال آیا کہ کل کے فنکشن میں وہ کس "عہدے" پر فائز ہو چکا ہے۔

مگر بھابی کی بلند للکار اور کھٹا کھٹ بجتے دروازے نے اسے مزید کچھ سوچنے نہیں دیا۔

"یہ شانی کی بچی کہاں ہے۔ دروازہ ہی کھول دیتی۔" اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ بستر خالی، کمرہ خالی۔ (واش روم میں ہو گی)

وہ کوفت زدہ سا اٹھ کے تبدیل کرنے کے لیے اپنے کپڑے نکالنے لگا۔ بھابی تھک ہار کے شاید واپس جا چکی تھیں۔ کافی دیر وہ ثانیہ کے واش روم سے نکلنے کا انتظار کرتا رہا، دس بجنے کو تھے۔

پھر کچھ شک سا گزرا۔ پانی تک گرنے کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ عون نے اٹھ کر دروازے کو ہاتھ لگایا تو خالی واش روم منہ چڑا رہا تھا۔ وہ تلملا سا گیا۔

رات سے سب کچھ عجیب ہی ہو رہا تھا۔ دروازہ لاکڈ ہے تو شانی اندر سے کیسے غائب ہو گئی۔۔۔؟

وہ نہاتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ مگر ثانی صاحبہ نے رات اور بھی۔ بہت دھماکے کیے تھے تو ذہن اس طرف متوجہ ہو گیا۔ وہ اطمینان سے تیار ہو کر ناشتے کے لیے پہنچا تو ثانیہ کی۔ کزنز باہر گیٹ پہ کھڑی تھیں اور سب انہیں سی آف کرنے گئے ہوئے تھے۔ البتہ کام والی کے ساتھ مل کے برتن اٹھاتی بھابی نے اسے خاصی معنی خیزی سے دیکھا اور کھنکھاریں۔ وہ ایسے ہی جھینپ سا گیا۔ (بے چارہ عون عباس!)

"آج ناشتے کا کوئی پروگرام نہیں۔ سب ابھی تک پڑے سو رہے ہیں؟"

جلدی سے بھابی کا دھیان پلٹنے کو کہا تو وہ جواب دینے کے بجائے ہنسنے لگیں۔ جواب کوریڈور سے آتے ابا کی طرف سے موصول ہوا۔

"بالکل ٹھیک فرمایا بیٹا جی! ایک تم ہی تو سحر خیز ہو اس گھر میں۔ باقی سب تو گیارہ بجے تک پڑے سو رہے ہیں۔"

ابا کا طنز کرارا تھا۔ مگر ان کا کرارا طنز اپنی جگہ۔ عون کی تمام تر حسیات تو ان کے پیچھے امی کے ساتھ آتی ثانیہ کی طرف متوجہ ہو چکی تھیں۔

"اب بندہ اپنی شادی پہ بھی گیارہ بجے نہیں اٹھ سکتا کیا؟" عون نے احتجاج کیا۔

"کیوں نہیں۔۔۔ بلکہ جب بندے کے بارہ بجیں تب اسے اٹھنا چاہیے۔" ابا نے تحمل سے کہا تو عون نے ثانیہ کو بے ساختہ منہ پہ ہاتھ رکھتے محسوس کیا۔ یقیناً اس نے اپنی ہنسی روکی تھی۔

"اچھا اب بس۔۔۔ نئی دلہن کے سامنے۔۔۔ ناشتہ تو کر لینے دیں اسے۔"

امی نے دبے اور آدھے ادھورے لفظوں میں ابا کو تمام صورت حال سمجھانے کی کوشش کی۔

مگر ابا پیسے ہی الحمد للہ کافی سمجھ دار تھے۔ عون کی طرف اشارہ کیا۔

"یہ بات تم اس نالائق کو سمجھاؤ۔ اچھے کام کرے گا تو ہی تعریف نئی دلہن کے سامنے بھی کروں گا۔"

عون۔۔۔ ولیمہ کا دولہا۔۔۔ بے چارہ۔ حق دق کھڑا تھا۔ یہ کیسا ولیمہ تھا جس میں ناشتے کے بجائے گوشمالی کی جا رہی تھی۔

"مگر ہوا کیا ہے؟" وہ ابا کے سامنے جتنے بھی پاؤں پٹختا۔۔۔ بے سود ہوتے۔ سو اس نے یہ عمل پھر کبھی کے لیے ٹال دیا۔ اور پُر زور احتجاج بھرے انداز میں پوچھا۔

"میں نے کہا تھا جو سویا رہا اسے ناشتہ نہیں ملے گا۔" ابا نے مونچھوں کو بل دیا۔

"میں نے تو جگایا تھا۔۔۔" ثانیہ کی مدھم آواز پر وہ پورے کا پورا ہی اس کی طرف گھوم گیا۔

وہ سلیقے سے سر پہ دوپٹا اوڑھے۔۔۔ بڑی نک سک سے تیار تھی۔

عون نے آنکھیں سکیڑ کر لحظہ بھر کو اس کا "پلان" دریافت کرنے کی کوشش کی۔ (چھا بھی گئی)

"ہاں بلکہ میں بھی اتنی دیر دروازہ بجاتی رہی آوازیں بھی دیں مگر تم تو پورا اصطبل ہی بیچ کر سو رہے تھے۔"

بھابھی نے ثانیہ کے بیان میں اپنا بیان شامل کر کے "وزن دار" بنا دیا۔ اب ان بے چاری کو کیا معلوم "اندرون خانہ" حالات۔

"تمہاری سسرال سے ناشتہ آیا تھا۔ ثانیہ کی کزنز آئی تھیں۔ سب تمہارا پوچھتی رہیں۔"

بھابھی اسے بتا رہی تھیں۔ ابا طنز سے ہنکارا بھرتے چلے گئے۔ وہ دھڑام سے صوفے پہ گرا۔

"میں ناشتہ لگاتی ہوں تمہارے لیے۔" امی تو راج دلارے کا "اترا سا" منہ دیکھ کے پسیج ہی گئیں۔

"مجھے نہیں کرنا ناشتہ۔۔۔ صبح صبح اتنی ملامت۔۔۔ بھر گیا ہے پیٹ میرا۔"

اف۔۔۔ ناراض ناراض عون عباس۔

ثانیہ کے پیٹ میں ہنسی کا گولا گھومنے لگا۔

امی اسے پچکارتے ہوئے ناشتہ لینے کچن میں چلی گئیں تو بھابی ثانیہ کے ساتھ آ بیٹھیں۔ ساتھ والے صوفے پر ہی تو عون بیٹھا تھا۔

"بات سمجھ میں نہیں آئی۔ بیگم تمہاری صبح آٹھ بجے کی باہر گھوم رہی ہے، تم گیارہ بجے تک کس کے ساتھ خوابوں میں ٹہلتے رہے ہو؟" بھابی نے شرارت سے ثانیہ کو دیکھتے ہوئے عون سے استفسار کیا تو ثانیہ کا چہرہ گل

رنگ ہونے لگا۔۔۔ ایویں بلاوجہ۔ (اب جو سن تو تھی نا) عون جھلایا۔

"اب بیگم بے خوابی کی مریضہ ہو تو لازمی ہے کہ شوہر بھی نجر پڑھ کے پورے گھر میں روح کی مانند ڈولتا پھرے۔"

لو جی۔ وہ نہاتو کوئی "جن" بھوت آیا تھا (خواب میں ہی) بھابھی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ ثانیہ کا دھیما انداز اور نرم سی مسکراہٹ وہ صبح سے دیکھ رہی تھیں۔ تو یہ عون عباس کو کیا ہوا؟

انہوں نے مشکوک نظروں سے عون کو دیکھا۔

"میرے خیال میں ناشتہ نہ ملنے کا دکھ سر چڑھ کے بول رہا ہے۔ میں تمہارے لیے ناشتہ لگاتی ہوں امی نے کر لیا ہے۔" وہ اٹھ گئیں۔

"رہنے دیں۔ اپنے سسر صاحب کا "فرمان عالی شان" نہیں سنا آپ نے۔" پیچھے سے عون نے طنز کیا تھا۔ مگر وہ لاپروائی سے ہاتھ ہلاتی چلی گئیں۔

ان کے جاتے ہی وہ پھنکارتے ہوئے بے حد اطمینان سے بیٹھی ثانیہ پر الٹ پڑا۔

"بڑا اچھا امیج بنا رہی ہو اپنے ماموں جان پر اپنا۔ ابھی میں بتادیتا کہ کمرہ تم لاک کر کے آئی تھیں تو پھر پتا چلتا تمہیں۔"

"اچھا۔۔۔؟ مگر دروازہ تو اندر سے لاک تھا۔" بڑی معصومیت سے آنکھیں پٹپٹا کر حیرت کا اظہار کیا گیا۔

کمبخت مارا عون عباس کا محبت میں ہارا دل۔۔۔ اس انداز پر فدا ہو گیا۔

"دیکھو۔۔۔ مجھ سے یہ کھیل کھیلنے کی کوشش مت کرو۔ بہت بری طرح پھنسو گی۔" دھیمی مگر سخت آواز میں دھمکی دی۔

"اوکے لیٹس سی۔" (چلو دیکھتے ہیں)۔ وہ محظوظ سا مسکرائی۔ "ایک دن ایسا آئے گا جب تم خود ماموں جان سے کہو گے کہ ان کا فیصلہ غلط تھا۔"

"خبردار جو میرے کندھے پہ بندوق رکھنے کی کوشش کی تو۔۔۔" عون نے دانت پیسے۔

"وہ تو رکھی جا چکی مسٹر عون عباس۔" ثانیہ کا انداز سراسر چڑانے والا تھا۔ ممکن تھا کہ غصے میں آکر عون ایک آدھ (ہلکا سا ہی) جھانپڑ اسے لگا ہی دیتا مگر امی اور بھابی ناشتہ لگنے کی اطلاع لے آئیں۔ تو یہ جھانپڑ بھی "آئندہ" کے لیے محفوظ ہوا۔

"چلو نا تم بھی ثانیہ۔" امی نے پیار سے اس سے بھی کہا تو ڈائننگ کی طرف بڑھتا عون ٹھٹکا پھر طنز سے بولا۔

"یہ تو نو بجے کی اٹھی ہوئی ہے شاید اسی لیے ابا نے انعام کے طور پہ دوبارہ کا ناشتہ "الاٹ" کیا ہو گا بھانجی کو۔"

امی نے عون کے "مذاق" پہ اسے گھرکا۔ "بکواس مت کرو۔"

پھر پیار سے اٹھتے ہوئے ثانی کو اپنے ساتھ لگایا۔

"اس بے چاری نے بھی تمہارے انتظار میں ناشتہ نہیں کیا۔ ایسے ہی اپنے ماموں کو دکھانے کے لیے سب کے ساتھ بیٹھ گئی تھی ٹیبل پہ۔"

"واہ۔۔۔ بے چاری ثانیہ کا ایک اور ہمدرد۔"

عون کڑھتے ہوئے ثانیہ کے اس ڈرامے پر غور کر رہا تھا۔

✲ ✲ ✲

وہ بست بجھے دل کے ساتھ عون اور ثانیہ کے ولیمہ کے فنکشن کے لیے تیار ہوئی۔ میک اپ کرنا تو آتا نہیں تھا۔ گھور سیاہ آنکھوں میں کاجل لگا کے ہلکی سی لپ اسٹک لگائی۔

لپ اسٹک لگاتے ہوئے آئینے میں خود کو دیکھتے اس کا ہاتھ رک سا گیا۔ اس کی ذہنی رو بھٹکی۔

اسے اپنی کلائی پہ معیز کے مضبوط ہاتھ کی گرفت یاد آئی۔ اس کے ملبوس سے اٹھتے کلون کی مہک ہمیشہ کے لیے ایہا کی سانسوں میں بس گئی تھی۔ اس نے بایاں ہاتھ اٹھا کر اپنے رخسار پہ پھیرا۔۔۔ وہ ابھی بھی اپنے چہرے پہ اس کی سانسوں کی تپش محسوس کر سکتی تھی۔ جب جب ایہا نے اس واقعے کے بارے میں سوچا تو اس نے قربت کے ان لمحات میں معیز کی بے اختیارانہ وارفتگی کو "نیند" کا شاخسانہ کبھی نہیں سمجھا تھا۔

اور وہ کہتا ہے کہ میں نیند میں تھا!

تم نیند میں تھے معیز احمد۔۔۔ میں تو خواب نہیں دیکھ رہی تھی نا۔ میرے لیے تو تمہارا وہ قرب ایک کڑی حقیقت ہے۔

پھر تمہارے نہ ماننے کی وجہ۔۔۔؟

ضبط سے اس کی آنکھیں گلابی ہونے لگیں۔

اتنی بڑی دنیا ہے۔ رباب کے لیے تو ہزاروں ہوں گے۔ میرے لیے تو بس معیز احمد۔۔۔ تو پھر تمہارے لیے صرف میں کیوں نہیں؟

یا اللہ۔۔۔ تو نے اس شخص کو میرے لیے اتارا۔۔۔ تو اس کے دل میں میرے لیے پیار بھی اتارتا۔ میں کیوں نہیں... رباب احسن ہی کیوں؟

اس کی کنپٹیاں سلگ اٹھیں۔ خفیف سے اشتعال کے تحت اس نے لپ اسٹک رکھ کر ٹشو پیپر کھینچا اور ہونٹوں کی لپ اسٹک صاف کر ڈالی۔

ثانیہ نے کہا تھا۔۔۔ شرعی رشتہ ہے تو پھر قسمت آزمانے میں کیا حرج ہے۔ ہارنے سے پہلے جیتنے کی کوشش ضرور کرنی چاہیے تو کیا میں جیت سکتی ہوں معیز کو؟

معیز کی مسلسل کال پر وہ بست بے دلی سے چادر اوڑھتی باہر نکلی۔ گیٹ سے باہر آکے وہ گاڑی میں بیٹھی تو آج کچھ نہیں تھا نہ وہ پہلی پہلی بار جیسا خوف نہ بعد میں معیز سے محسوس ہونے والی جھجک اور شرم۔ آج وہ اپنے دھیان کے دھاگوں میں ایسی الجھی تھی کہ بے حس سی آکر بیٹھ گئی۔

کسی کا نفظوں میں جھٹکنا تو برداشت ہو جاتا ہے شاید مگر یوں قربت میں جھٹکنا؟ اس طرح رد کرنا بست تکلیف دہ ہوتا ہے اور ایہا بھی کل رات سے اور پھر آج صبح سے اسی تکلیف کی زد میں تھی۔

"ماما کا آج پورا ارادہ تھا ولیمہ اٹینڈ کرنے کا مگر طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے نہیں آسکیں۔ ورنہ تم تو گھر ہی رہ جاتیں۔"

اس نے یونہی شاید گاڑی میں چھائی خاموشی توڑنے کے لیے بات برائے بات کی۔

"جی۔ میں رکشے یا ٹیکسی میں آجاتی۔" وہ سنجیدگی سے بولی۔ تو معیز چپ ہو گیا۔ ایہا نے مزید کہا۔ "ثانیہ میری ماں کے بعد وہ پہلی فرد ہیں، جو مجھ سے جڑا اپنا رشتہ صحیح معنوں میں نبھا رہی ہیں۔ میں انہیں ریٹرن ویسا ہی دینا چاہتی ہوں۔"

معیز و اس کی بات سراسر طنز لگی، سو برا مان کر خشک لہجے میں بولا۔

"شکر ہے، تمہیں کم از کم ثانیہ کا احسان تو یاد ہے۔"

ایبہا خاموشی سے ونڈ اسکرین کے پار گھورتی کچھ سوچتی اور جوڑ توڑ کرتی رہی۔

میرج ہال کی انڈر گراؤنڈ پارکنگ میں گاڑی پارک کر کے انہیں فرسٹ فلور پہ جانے کے لیے آٹھ دس سیڑھیاں طے کرنا تھیں۔ سات' آٹھ' نو... وہ آخری سیڑھی پر تھے۔ لحظہ بہ لحظہ ہم قدم۔ ایبہا نے رک کر معیز کو دیکھا۔

وہ ٹھٹکا۔ استفہامیہ نظروں سے اسے دیکھا۔ "کیا ہوا...؟"

معیز کو اس کی کیفیت عجیب سی لگی۔ چہرے کی رنگت مزید سفید ہو رہی تھی۔ سیاہ آنکھوں سے حزن چھلکا پڑتا تھا۔

"آپ نے تو اپنا فیصلہ سنا دیا... ایک بار نہیں بار بار سنایا آپ نے..." وہ خشک ہوتے حلق کے ساتھ بولی۔ تو الفاظ ٹوٹے پھوٹے تھے۔ معیز شعوری کوشش سے اس کی طرف متوجہ ہوا۔

ایبہا نے سوکھے لبوں کو زبان پھیر کے تر کیا پھر بڑی ہمت سے بولی۔

"یہاں مجھے لانے والے بھی آپ تھے اور یہاں سے نکالیں گے بھی آپ۔ میں آپ کی منزل نہ سہی۔ مگر راستے کا پتھر بن کے پڑی رہوں گی۔"

"واٹ...؟" معیز کے سر پہ دھماکا سا ہوا! "ایکسکیوزمی..." دانت پیس کر کہتا وہ اسے کہنی کے قریب سے بازو پکڑے... قدرے کونے میں لے آیا۔

"کیا بکواس ہے یہ... وقت اور موقع دیکھا ہے تم نے؟" معیز کا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا۔

"تو عورت کا کیا قصور ہے معیز... مرد جہاں چاہے' وقت اور موقع دیکھے بغیر اسے کوئی بھی بات سنا دے' کوئی بھی دفعہ لگا دے اور عورت وقت اور موقع کی نزاکت ہی دیکھتی رہے۔ بس۔"

وہ بے بسی سے کہتی پھپھک کر رو دی۔ جانے رات سے کتنا غبار اندر بھر چکا تھا۔ وہ تمام تر احتیاط اور بزدلی بالائے طاق رکھ کے آج ایک مرد سے اپنا حق مانگنے۔ کھڑی تھی۔

"جو بات طے ہے وہی ہو گی ایبہا! میری زندگی میں تمہاری کوئی جگہ نہیں ہے۔"

معیز نے سنگ دلی کی حد کر دی تھی۔ آنسوؤں سنگ کاجل بہاتی آنکھوں کا گلابی پن اور بڑھ گیا۔

"اور جس کی زندگی ہی آپ ہو گئے ہوں معیز...؟"

بلا ارادہ و بے اختیار وہ اتنی بے بسی اور بے چارگی سے اظہار محبت کر گئی کہ اگر واقعتاً "بیوی کے "عہدے" پر فائز ہوتی تو بھی شاید اتنے کم عرصے میں ایسا بے تکلفانہ اعتراف نہ کرتی۔

معیز کو اس کے انداز نے ساکت کر دیا۔ مگر ایبہا تو شاید آر یا پار والے انداز میں تھی۔ یوں جیسے دماغی رو پلٹ چکی ہو۔ چہرے کو رگڑ کر چادر سے صاف کرتے ہوئے وہ بست باغیانہ انداز میں بولی۔

"آپ اپنی زندگی اپنی مرضی سے گزارنا چاہتے ہیں۔ گزاریں میری طرف سے آپ کو کوئی دکھ نہیں ملے گا۔ آپ رباب کو پرپوز کرنا چاہتے ہیں اٹس اوکے۔ لیکن میں بھی اپنی زندگی کے فیصلے اپنی مرضی سے کرنا چاہتی ہوں معیز!"

وہ جو متحیر سا اس کا یہ باغی روپ دیکھ رہا تھا۔ غصے بھری دھیمی آواز میں بولا۔

"تو کرو۔ میری طرف سے تم آزاد ہو۔ جو چاہے فیصلہ کرو۔"

"ہاں۔ کر لیا ہے میں نے فیصلہ..."

ایبہا نے ہلکے سے جھٹکے سے اپنا بازو معیز کے ہاتھ کی گرفت سے چھڑایا۔ اپنی چادر اتاری اور تہہ کر کے

شولڈر بیگ میں ٹھونس لی۔ ٹخنوں تک آتی فیوزی اور پنک فراک کا ہم رنگ دوپٹہ اس نے شانوں پہ پن اپ کر رکھا تھا۔

میڈم نے جو اس کے بال ترشوائے تھے وہ اب دوبارہ کمر کو چھو رہے تھے' ایمہا نے محض کلپ کر کے انہیں یونہی چھوڑ دیا تھا۔ معیز کے ذہن میں خطرے کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ ایمہا کے انداز و الفاظ سے چھلکتی بغاوت نظر انداز کیے جانے والی نہ تھی۔

ایک ایسی لڑکی جو بالکل "زمین" سے اٹھ کے آئی ہو اور جس میں اعتماد اور جرات رتی بھر نہ ہو۔ اس کا یوں بے خوفی سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بات کرنا۔۔۔ اچنبھے کی بات تھی۔

ہاتھ کی پشت سے نم آنکھیں پونچھ کر ایمہا نے معیز کی طرف دیکھا۔

وہ اب رو نہیں رہی تھی۔ مگر بہت تھکی ہوئی اور پژمردہ دکھتی تھی۔ پھر وہ بہت بے خوفی سے بولی۔

"آپ نے مجھے آزاد کرنا ہے تو کریں۔ مگر میں خود سے کبھی اپنا نام آپ کے نام سے الگ نہیں کروں گی۔ اور نہ ہی یہ گھر چھوڑ کے جاؤں گی۔"

معیز بھک سے اڑا۔

وہ اپنی بات مکمل کر کے پلٹی اور متوازن قدموں سے چلتی ہال کا دروازہ کھول کے اندر داخل ہو گئی۔ جبکہ زمین اور آسمان کے درمیان معلق معیز احمد وہیں منجمد ہوا کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

وہ ثانیہ سے ملی تو دل چاہا دھاڑیں مار مار کے روئے مگر ضبط کر کے رہ گئی۔ ثانیہ نے اسے اسٹیج پر ہی اپنے پاس بٹھا لیا۔

"اتنی لیٹ۔۔۔ سارے مہمان آچکے ہیں۔" ثانیہ نے مصنوعی خفگی سے کہا تو وہ محض مسکرا دی۔

"کیا بات ہے۔۔۔ طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی تمہاری۔"

اف۔۔۔ یہ محبت کرنے والے۔۔۔ ایمہا کو ٹوٹ کر احساس ہوا کہ ثانیہ اس کی بہت فکر کرتی تھی۔

"ہاں۔۔۔ تھوڑا سا بخار ہو گیا تھا رات کو۔ اسی کی وجہ سے ویک نیس ہو رہی ہے۔" اسے تسلی دینے کے لیے بے ضرر سا جھوٹ بول دیا۔ ورنہ تو ایمرجنسی نافذ کر کے پورا اسٹیج اتھل پتھل کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ ثانیہ عون عباس۔ اور یہ کمزوری۔ ایمہا نے ثانیہ کے کسی رشتے دار خاتون کی طرف متوجہ ہونے کے بعد گہری سانس بھری۔ یہ تو معیز احمد کے سامنے بے جا بہادری دکھانے کے بعد کی کمزوری تھی۔ (وہی۔۔۔ بخار کے بعد کی کمزوری)

وہ سوچتی تو اس کا ذہن چکرا تا۔ ابھی چند لمحے پہلے وہ کیا کر آئی تھی۔ اسے خود یہ یقین نہ ہو پا کہ وہ معیز سے وہ سب کہہ چکی ہے۔ جو دل و دماغ پہ ساری رات ہیجان برپا کیے رہا تھا۔ معیز کو ہال میں عون کے ساتھ محو گفتگو دیکھ کر ایمہا نے نگاہ پھیر لی۔

وہ ابھی تک طے نہیں کر پائی تھی کہ اس کا اٹھایا جانے والا قدم راست تھا یا نہیں۔۔۔ اور یہ کہ اب معیز احمد کیا حکمت عملی اپنائے گا؟ پورے فنکشن میں وہ گم صم سی رہی۔ کھانا بھی برائے نام کھایا۔ ثانیہ ہی اس کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈالتی رہی اور وہ۔ بس چڑیا کی طرح ٹونگتی رہی۔

فنکشن ختم ہوا تو لوگ واپس جانے کو تھے۔ ثانیہ نے صاف اعلان کر دیا کہ وہ امی اور دادی کے ساتھ جائے گی۔ عون کی تیوری چڑھی۔ مکلاوے کی رسم تھی۔ اصولاً عون کو بھی ساتھ جانا پڑتا۔ جو کہ وہ ہرگز نہیں چاہتا تھا۔

"کل ہی تو ہو کے آئے ہیں وہاں سے آج پھر چلا جاؤں۔ امی! آپ کی بہو رخصت ہو کے آئی ہے یا میں جا رہا ہوں۔"
اس نے امی کے سامنے دانت پیسنے اور پاؤں پٹخنے کی ساری حسرت پوری کرلی۔ جواباً "انہوں نے ہلکی سی گھوری کے ساتھ "اونہوں" کیا اور بس۔
"خوشی سے جاؤ۔ منہ لٹکا کے آنا کانی کرو گے تو اپنے ابا کو جانتے ہو "سارا" پروٹوکول "بھول کے گردن سے پکڑ کر دولہا کی گاڑی میں بٹھا دیں گے۔"
معیز نے اس کی حالت کا لطف لیتے ہوئے نقشہ کھینچا تو وہ اسے گھورنے لگا۔
معیز نے اچٹتی نگاہ چادر اوڑھے واپسی کو تیار کھڑی ایمہا کو دیکھا۔ ثانیہ بڑے پیار سے اس سے ملی۔
"اوکے ایمہا۔ واپس آؤں گی تو پھر تمہاری طرف بھی چکر لگاؤں گی۔" اس نے ایمہا کا ہاتھ دبایا، پھر معیز کو دیکھ کر سنجیدگی سے بولی۔
"اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے معیز بھائی! خیال رکھیے گا اس کا۔"
معیز کے اعصاب اس "یاددہانی" پر کشیدہ ہونے لگے۔ ہر کسی کے لیے وہ بے چاری تھی۔ اور معیز ظالم — بلکہ شاید ظالم ہو۔ جو ایک رحم دل پری کو قید کیے بیٹھا تھا۔
وہ اندر ہی اندر سلگتا ان سے رخصت لیتا۔ گاڑی میں آ بیٹھا۔ ایمہا کا دل سہم سہم کر دھڑک رہا تھا۔ ابھی اگر گرجتا برستا معیز اس پر الٹ پڑتا تو وہ بے ہوش ضرور ہو جاتی۔ کچھ ایسی ہی کیفیت ہو رہی تھی دل کی۔ مگر اللہ کا شکر کہ وہ خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کرتا رہا۔ پورچ میں گاڑی کر کے معیز نے گاڑی کی اندرونی لائٹس آن نہیں کی تھیں۔ ایمہا گاڑی سے اتری تو اپنی طرف کا دروازہ بند کرتا معیز اس سے پہلے اندر چلا گیا۔
ایمہا کے انیکسی کی طرف بڑھتے قدم مدھم پڑ گئے۔ اسے اچھی طرح سے اس ان دیکھی دیوار کا احساس ہو رہا تھا جو اس کے اور معیز کے بیچ آج پھر سے آن کھڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

ولیمہ کا فنکشن اور پھر سے سید پور تک کا پھر سے سفر عون کا تو اپنے بال نوچنے کو جی چاہ رہا تھا۔ ابا کی ایک کڑی نگاہ نے اسے کان دبائے گاڑی میں بیٹھنے پر مجبور کر دیا تھا۔
تھکاوٹ سے اس کا برا حال تھا۔
اگر ثانیہ کے ساتھ تعلقات صحیح جا رہے ہوتے تو وہ بھی ساری رسموں کو دل کھول کر انجوائے کرتا مگر ابھی تو فی الحال ٹینشن پہ ٹینشن رہ کے اس سے ہر کام کرایا جا رہا تھا۔ یہ مکلاوے کی رسم تو نری فضول اور بے ہودہ لگ رہی تھی اسے اپنے آپ سے۔
دولہا کم اور کسی ننھی سی بچی کا گڈا زیادہ لگ رہا تھا جسے جی چاہے الٹ پٹ دو۔ جہاں جی چاہے سلا دو۔ اٹھا دو۔ سید پور تک پہنچ کر رات ہو گئی مزید آدھی رات نہیں بنایا گیا۔ کولڈ ڈرنکس سے تواضع کے بعد انہیں کمرے میں بھیج کر باقی سب بھی سونے کے لیے اٹھ گئے۔ گاؤں میں تو ویسے بھی رات جلدی ہو جاتی ہے۔
عون نے اپنے اعصاب کو مسلسل کسی شکنجے میں کسا محسوس کیا تھا۔ وہ دونوں ثانیہ ہی کے کمرے میں تھے۔ مگر اب وہاں پلنگ کے بجائے خوب صورت سا ڈبل بیڈ بچھا کر نئی سیٹنگ کر دی گئی تھی۔ یقیناً "دولہا کے اعزاز میں۔
عون نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے جوتے اتار کے ادھر ادھر پھینکے 'ٹائی کو کھینچ کر بستر پر پھینکا۔
"ارے۔ ارے۔"
ثانیہ جو آئینے کے سامنے کھڑی اپنا "ہار سنگھار" اتارنے کے طریقہ کار پر غور کر رہی تھی جیسے تڑپ کر پلٹی۔

"یہ میرا کمرہ ہے جناب۔ اور میں اس کی اتنی بے عزتی برداشت نہیں کر سکتی۔"

بس جی۔۔۔ عون کو تو تلووں میں لگی سر پہ جا بجھی۔ اچھل کے بیڈ سے کھڑا ہوا۔

"اچھا۔ اب یہ جتاؤ گی تم مجھے۔۔۔ اور وہاں جو میرے کمرے میں میرے بیڈ پہ قبضہ کیا ہوا تھا تم نے وہ کیا تھا؟"

"اچھا۔۔۔ تم نے دیکھا تھا مجھے وہاں سوتے؟" ثانیہ نے استہزائیہ انداز میں پوچھا اور پھر سر جھٹک کر کانوں کے جھمکے اتارنے لگی۔

"میں واش روم سے نکلی تو پورے کمرے میں تمہارے خراٹے گونج رہے تھے۔"

طنز۔۔۔ طنز۔۔۔ عون کا بس نہ چلتا تھا وہ پیٹ لیتا سر۔ اور یہ بھی کہ اپنا یا ثانیہ کا۔ وہ بڑے اطمینان سے ساتھ دوپٹے کی پنیں اتار رہی تھی۔ اس کے بعد سارا زیور اور پھر اسی سکون کے ساتھ ہاتھوں پہ کریم مل کے چہرے پر لگائی اور ٹشو سے چہرہ صاف کرنے لگی۔

عون عباس جل کڑھ کے رہ گیا۔ اس شادی نے ابھی تک تو کچھ نہ دیا تھا سوائے خسارے کے۔

"زہر لگتی ہیں مجھے شادی کی یہ رسمیں۔ اور خاص طور پہ یہ مکلاوا۔۔۔ بلکہ دکھلاوا کہو تو زیادہ بہتر ہو گا۔ مجھے تو دنیا دکھاوا ہی کرنا پڑا نا۔"

وہ کپڑے تبدیل کر کے آئی تو وہ ابھی تک اسی کیفیت میں تھا۔ ثانیہ نے نرمی سے کہا۔

"تمہارے کپڑے امی نے واش روم میں لٹکا دیے ہیں۔ چینج کر لو۔"

سوال گندم، جواب چنا۔

عون نے دانت کچکچائے مگر وہ بے نیازی سے آئینے کے سامنے جا کے اپنے بال برش کرنے لگی (اپنا کمرہ ہے جی)

وہ مارے بندھے واش روم میں چلا گیا۔۔۔ اور جب باہر نکلا تو نائٹ بلب کی سبز مدھم روشنی میں خواب ناک سا ماحول بنائے وہ اپنی جگہ پر لیٹ چکی تھی۔ عون جل بھن کے رہ گیا۔

بڑی مہربانی کہ اپنے بیڈ پہ جگہ دے دی محترمہ نے وہ اپنی طرف دراز ہوا تو کسی کپڑے کو ہاتھ لگا۔ اس نے بغور دیکھا تو سن سا ہو گیا۔

دونوں کے درمیان تہہ شدہ چادر لمبی بنائی گئی تھی یعنی۔۔۔ بارڈر لائن۔۔۔ کنٹرول لائن جو بھی سمجھ لیں۔ مگر اس وقت عون کو تو وہ چادر کی تہہ دیوار چین لگی تھی۔

ہنہ۔۔۔ ہنہ بلکہ ایک بار پھر سے ہنہ۔

عون کی انا پہ تازیانہ پڑا تو اس نے بھی تنفر سے سر جھٹکا۔

وہ اس کی قربت نہیں چاہتی تھی۔ چادر کی یہ دیوار عون کے لیے ایک پیغام تھی کہ اس کی قربت ثانیہ کے لیے پسندیدہ نہیں ہے سو عون نے اس سے زیادہ ڈھیلا پن دکھایا اور کروٹ لے کر ثانیہ کی طرف پشت کر لی۔

پلکوں کی جھری سے دیکھتی ثانیہ نے سینے میں دبی سانس خارج کرتے ہوئے آنکھیں کھول کر عون کی پشت کو دیکھا۔

وہ مرد تھا۔ ایک معمولی سی چادر کی دیوار اس کے لیے کیا معنی رکھتی تھی۔ یہ چادر ثانیہ کی "انا" تھی اس کی عزت نفس تھی۔

وہ خود سے عون کی طرف ہاتھ بڑھانا نہیں چاہتی تھی۔۔۔ بس وہ ہاتھ بڑھا کے تھام لے اور یہ اس کی بانہوں میں سمٹ جائے اور یہ اسے ساری عمر ناک چڑھا چڑھا کے طعنہ دے سکے میں کب راضی تھی۔۔۔ تم ہی نے ہاتھ بڑھایا۔۔۔ نخرا تو عورت ہی پہ جچتا ہے نا۔ ہائے ری عورت۔۔۔ ثانیہ کی پلکیں نم ہونے لگیں۔ اور شاید باوجود ضبط

نے سسکاری بھی نکل گئی۔

عون سویا ہی کہاں تھا۔ اس کے اعصاب چوکنے ہوئے۔ پھر ہلکی سی سسکی کی آواز۔۔۔؟

اس نے آہستہ سے چہرہ موڑ کے دیکھا' وہ ہاتھوں سے چہرہ رگڑ رہی تھی۔

"تم رو رہی ہو۔۔۔؟" عون نے بے یقینی بھری حیرت سے سوال کیا تو وہ دم سادھے یونہی پڑی رہ گئی۔

عون نے اٹھ کر لائٹ آن کی تو ثانیہ نے کروٹ بدل لی۔

"کیا تماشا ہے۔۔۔ کیا ہوا ہے تمہیں۔۔۔"

وہ پروا نہیں کرنا چاہتا تھا۔۔۔ مگر خود کو مجبور پاتا تھا اس کی پروا کرنے پر۔ ابھی بھی قدرے اکھڑے ہوئے انداز میں پوچھا۔

"کچھ نہیں۔۔۔ لائٹ آف کر دو پلیز۔" رندھی آواز' روہانسا لہجہ۔ عون کی حیرانی بڑھی۔ وہ چلتا ہوا ثانیہ کی طرف آیا۔

"بے وقوف نہیں ہوں میں۔ ابھی تو تم اپنے کمرے اور بستر کا حق دعوا کر رہی تھیں اور اب آنسو بہا رہی ہو۔ اتنے ڈرامائی ماحول میں میں کیا خاک سوؤں گا۔" وہ ناراضی سے بولا۔

وہ یوں سمٹتی اٹھ بیٹھی۔

"ہاں نا۔۔۔ تو میرا کمرہ ہے' میں جو جی چاہے کروں۔" نظریں ملائے بغیر کہا۔ تو عون نے تیز نظروں سے اسے گھورا اور غصے سے بولا۔

"تمہاری اسی اکڑ نے تمہیں اور مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔" عجیب ہی اثر ہوا۔ ایک دم سے دونوں ہاتھوں میں منہ چھپا کے رونے لگی تو عون ہونق سا اسے دیکھنے لگا۔ پھر خجل سا ہو کر سر پہ ہاتھ پھیرا۔ ایسا کیا کہہ دیا بھئی۔۔۔

"خود تو کل شادی کی پہلی رات ہی تیر تلوار چلا رہی تھیں۔ میں نے کچھ کہا کیا؟ شوہر کی تو ذرا سی بات برداشت نہیں ہوتی عورتوں سے۔"

عون کو گلا ہوا۔ ثانیہ نے ہاتھوں سے چہرہ پونچھا۔ شاید رو رو کے تھک گئی تھی۔

"لائٹ آف کر دو پلیز۔۔۔"

"میں آدھی رات کو تمہاری شکل دیکھنے کے لیے نہیں جاگا تھا' کیوں رو رہی تھیں تم۔۔۔؟" عون نے اسے گھورا۔

"دل چاہ رہا تھا میرا۔۔۔ بس یا اور کچھ؟" وہ چڑ کر بولی اور غصے سے اسے دیکھا۔

چہرے کے اطراف بکھری لٹیں اور رونے سے گلابی ہوتی آنکھیں۔ عون کا دل بے اختیار ہی دھڑکا۔

ثانیہ کے معاملے میں اس کا دل اتنا ہی کمینہ تھا۔ ہمیشہ اسی کی سائیڈ لیا کرتا تھا۔ اب نرے دماغ کا ایک عاشق کیا کرے؟ وہ ثانیہ کے قدموں میں بیٹھ گیا۔ سمٹے ہوئے پیروں کے بالکل پاس۔

عون نے ہاتھ بڑھا کر دل کی خواہش پر لبیک کہتے ہوئے اس کے بالوں کی لٹوں کو کان کے پیچھے اڑسا۔ تو ثانیہ کا غصہ اڑن چھو ہو گیا۔ پلکیں بوجھل ہو کر رخساروں پر سجدہ ریز ہونے کو تھیں۔

اللہ اللہ۔۔۔ اب میں عون عباس سے شرماؤں گی؟ اس کی انا گوارا نہ کر رہی تھی۔ عون نے کہا تھا۔۔۔ شادی سے انکار کر دو۔۔۔ تو کیا عون کے دل سے ثانیہ کی محبت ختم ہو گئی تھی؟ اب دوبارہ سے عون کے لبوں سے اعتراف محبت سنے بغیر وہ اس کی زندگی میں شامل نہیں ہونا چاہتی تھی۔

"کیوں رو رہی تھیں۔۔۔ سچ بتاؤ۔۔۔؟" نرمی سے پوچھا۔ تو وہ بے بسی سے بولی۔

"یونہی۔۔۔ خیال آیا! اب تم میرے کمرے میں بھی ساری رات خراٹے لیتے رہو گے۔"

"ہیں۔۔۔!" عون نے کرنٹ کھا کر ہاتھ پیچھے کھینچا۔ پھر بدک کر اٹھا۔

"تم۔۔۔" کچھ کہنا چاہا مگر غصے کی شدت سے کچھ کہا نہیں گیا۔ دھم دھم کر کے جا کے لائٹ آف کی اور دھڑام سے اپنی جگہ پہ گر گیا۔ ثانیہ نے زور سے آنکھیں میچ لیں۔

یہ تو پیار کرنے والے بے وقوفوں کی کہانی تھی۔

☼ ☼ ☼

بھاڑ میں گئی دوستی اور مصلحت۔

معیز نے کمرے میں آکر ٹائی نوچتے ہوئے ایک طرف پھینکی اور بیڈ پر بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا۔

ایمہا کے انداز کی بے خوفی اسے رہ رہ کر سلگا رہی تھی۔ یعنی اب وہ مجھے بلیک میل کرے گی۔ ثانیہ نے یقیناً" اسے بتا دیا ہوگا کہ۔۔۔ ابو نے مجھے ایمہا کو طلاق دینے سے منع کیا تھا اور اپنے آخری خط میں بھی اس بات کا پابند بنایا کہ ایمہا اپنی مرضی کا فیصلہ کر کے کسی بھی اچھے انسان سے شادی کر لے۔

وہ شاور لے کے کپڑے تبدیل کر کے آیا تو سر ابھی بھی بوجھل تھا۔

ماما تو طوفان کھڑا کر دیں گی۔۔۔ اگر "بالفرض" میں ایسا سوچ بھی لوں۔ پہلے ہی جب سے ایمہا آئی ہے ان کا بی پی بائی رہنے لگا ہے۔ اس کی ماں کی وجہ سے میری ماما نے ساری ازدواجی زندگی کانٹوں پہ گزاری ہے اور بابی کی وجہ میں بن جاؤں۔۔۔ ایمہا کے ذریعے۔

وہ اوندھے منہ بستر پر گر سا گیا۔ در حقیقت ایمہا کے اس اظہار نے اسے ہلا کے رکھ دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

سفیر احسن کی پاکستان واپسی نے دونوں خاندانوں میں خوشیوں کی لہر دوڑا دی تھی۔ زارا تو کھلا ہوا پھول بنی ہوئی تھی۔ حسین نمک اور وہیں رباب بہت محتاط ہو گئی۔ چوکنی بلی۔

فوراً" ہی اپنے رکھ رکھاؤ اور بے وقت آنے جانے کے آداب بدلے دونوں چھوٹے بھائیوں کو تو وہ چٹکیوں میں اڑاتی تھی۔ مگر سفیر اس سے بہت پیار کرتا تھا مگر اپنی کوئی بات منوانے پہ آتا تو سختی بھی برت لیتا تھا۔ امی نے اللہ کا شکر ادا کیا۔ ابو کو تو وہ رباب کی حرکتوں کی بھنک بھی نہ پڑنے دیتی تھیں ان کا ارادہ تھا کہ سفیر سے سارا معاملہ ڈسکس کریں گی لیکن رباب اسی پرانے چولے میں لوٹی کہ امی نے اطمینان کی سانس لی۔

کئی دنوں سے سفینہ بیگم اپنی طبیعت میں بوجھل پن سا محسوس کر رہی تھیں۔ مگر اب سفیر کے آنے کی خوشی میں وہ چیک اپ کے سلسلے کو ٹالے ہوئے تھیں۔ کل سفیر اور اس کی فیملی کو ڈنر پہ انوائیٹ کیا گیا تھا۔ زارا بے چاری کی کوئی بہن تو تھی نہیں کہ اس سچویشن پہ اس سے کوئی ڈسکشن کرتی مگر ایراز اور عمر اس کو چھیڑنے میں پیش پیش تھے۔

"اوفوہ۔ شاہی ڈنر۔ عزت ماب سفیر احسن۔ صاحب کے اعزاز میں۔ تم تو بہت مس کرو گی زارا۔"

بات کرتے کرتے آخر میں عمر کا انداز پُر تاسف ہو گیا تھا۔ فرنچ فرائز ٹونگتی زارا نے اس "انکشاف" پر گھور کر عمر کو دیکھا۔

"کیوں میں کون سا کل مریخ کی سیر کو جا رہی ہوں۔"

"غور کریں زارا۔ اس ڈنر کے لیے تو یہ مریخ کی سیر بھی ملتوی کر سکتی ہے۔" ایراز نے لقمہ دیا۔

وہ تینوں ٹی وی لاؤنج میں موجود تھے۔ ٹی وی کے ساتھ فرنچ فرائز اور ہوم میڈ نگٹس سے بھی لطف اٹھایا جا رہا تھا۔

"نہ بھئی، تمہارا تو سخت قسم کا پردہ ہوگا سفیر سے۔" عمر نے قطعیت سے ہاتھ اٹھا کر کہا، وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ زارا جل کر رہ گئی۔

"ہاں تو میں عبایا پہن کے بیٹھ جاؤں گی۔ بلکہ کہیں گے تو درمیان میں پردہ لٹکا لیں گے۔"

"بہت عقل مند ہے ہماری گڑیا۔" عمر کو دونوں تجاویز بہت پسند آئی تھیں، ایراز کی طرف دیکھتے ہوئے سراہنے والے انداز میں بولا۔ "اس نے تو پہلے سے ہی سوچ رکھا ہے۔ ویری رائٹ۔"

"بالکل بھی نہیں۔" زارا کا چہرہ لال پڑنے لگا تو وہ فرنچ فرائز کی پلیٹ ٹیبل پہ پٹختی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"خبردار جو آپ نے درمیان میں "اماں" بننے کی کوشش کی ہو تو۔" عمر کو گھورا۔

"تم شاید "ظالم سماج" کہنا چاہتی ہو مگر احترام کے مارے کہہ نہیں پائیں۔"

ایراز نے اس کا حوصلہ بڑھایا بھی تو کس انداز میں۔ زارا کا دل چاہا ان مسکراتی آنکھوں والے دونوں بندوں کے سروں پر گرم گرم نگٹس اور فرنچ فرائز الٹ دے۔

"ماما کو بتاتی ہوں جا کر۔ پھر دیکھنا، وہ بتائیں گی اچھے سے آپ لوگوں کو۔" خود کو ان کے مقابلے میں بے بس پا کر وہ پاؤں پٹختی سفینہ کے کمرے کی طرف بڑھی تو پیچھے سے ان دونوں کی ہنسی نے اور تپایا۔

"یہ ہے فرنچ فرائز حاصل کرنے کا صحیح طریقہ۔" زارا کی پلیٹ تھام کر عمر نے داد طلب نظروں سے ایراز کو دیکھا۔ اسی وقت سفینہ بیگم کے کمرے سے زارا کی چیخوں کی آواز نے انہیں بوکھلا کر اٹھنے اور ان کے کمرے کی طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

زارا مسلسل چلا کر ان دونوں کو پکار رہی تھی۔ دروازہ کھول کر اندر کا منظر دیکھتے ہی وہ دونوں ہل کے رہ گئے۔

☼ ☼ ☼

مکلاوے سے اگلے روز ہی عون نے ریسٹورنٹ جانے کی تیاری پکڑ لی۔

"دعوتیں تو رات کو ہوتی ہیں امی۔ ان کے لیے چھٹی کر کے سارا دن گھر میں پڑے رہنے کی کیا ضرورت ہے۔"

امی کے اعتراض پر عون نے آرام سے جواب دیا۔ پھر انہیں یاد دلایا۔

"اور ہاں۔ میں ثانی سے کہہ آیا ہوں۔ میرا ناشتہ وہی بنائے گی۔ آپ آرام کریں اب۔"

امی کی آنکھیں حیرت سے پھیلیں۔ "دو دن کی دلہن سے کام کرواؤ گے تم؟"

"شکر ہے آپ نے دو دن کی بچی نہیں کہہ دیا امی۔" عون نے مذاق میں بات اڑائی۔ اندر کمرے میں ثانی نے ناشتے کا آرڈر سن کے جس طرح مکھی اڑائی تھی، اس سے عون کو اندازہ ہو گیا کہ وہ کس طرح ابا کی نظروں میں ثانیہ کے نمبر کم اور اپنے زیادہ بنا سکتا ہے۔

"اپنے ابا کو جانتے ہو نا۔" انہوں نے دھمکایا۔

"جی۔ بچپن سے جانتا ہوں۔ آپ ہی نے تعارف کرایا تھا۔" عون کے جواب الٹے ہی ہوتے تھے۔ انہیں ہنسی آ گئی۔

"ابھی تو اس کے ہاتھوں کی مہندی بھی پھیکی نہیں پڑی عون۔"

"تو ایسے ہی پھیکی پڑے گی نا۔ کام کرنے سے۔"

ابا بھی ناشتے کی میز پر تشریف لے آئے۔ "کیا بات ہے بھئی۔ ناشتہ نہیں کرنا آج۔" انہوں نے خالی برتنوں کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

امی فوراً اٹھیں۔

"چائے تو میں کب کی بنا آئی۔ یہی مجھے باتوں میں لگائے ہوئے ہے۔"

سارا غبار عون پر ڈالا اور واقعی حقیقت یہی تھی۔ وہ چاہتا تھا "آج امی ناشتہ نہ بنائیں اور ثانیہ تو یہ کام کسی طور نہ کرتی۔ ابا یقیناً "اس پہ خفا ہوتے۔ کم از کم اس روز کمرہ لاک کرنے والی۔۔۔ حرکت کا بدلہ تو پورا ہو جاتا۔

"ظاہر ہے۔ باتوں کے علاوہ آتا کیا ہے تمہارے لاڈلے کو۔" ابا نے ہنکارا بھرتے ہوئے اخبار سیدھا کیا عون تڑپ اٹھا۔ ابا کا انداز ایسا تھا جیسے بس کسی پاکستانی سیاست دان پر بھبھو کیا ہو اور بس۔

"اچھا اور وہ آپ کی لاڈلی۔ آج دیکھیے گا کیا ملتا ہے ناشتے میں۔ معذرت اور افسوس کے علاوہ۔"

مارے غصے کے عون کے منہ سے سیدھی بات نہ نکلی تھی۔

اسی وقت چوڑیاں کھنکیں اور ایک جانی پہچانی سی خوشبو عون کے گرد چکرائی۔ مہندی والے ہاتھوں نے گرما گرم پراٹھے کی ایک پلیٹ ابا کے سامنے رکھی اور دوسری عون کے۔ عون کی باقی بات منہ میں ہی رہ گئی۔ بھابھی پھرتی سے چائے لگا رہی تھیں۔ ثانیہ نے ٹرالی میں رکھی پلیٹیں ٹیبل پہ رکھیں۔ چکن کا بھنا ہوا قیمہ اور سنہری آملیٹ۔ خوشبوؤں کا طوفان عون کے نتھنوں میں گھسا تھا۔ ابا نے کچھ اچنبھے سے ثانی کو اور پھر تفاخر اور طنز سے عون کو دیکھا۔

"بھئی میں نے تو بہت منع کیا۔ مگر ثانیہ کی ضد تھی کہ آج کا ناشتہ یہی بنائے گی۔ میں تو بطور مددگار ہی کھڑی رہی کچن میں۔"

بھابی کے لہجے میں کھنک سی تھی۔ بھئی ان کا پورا پورا ساتھ دینے والی جو آ گئی تھی۔ آج کا ناشتہ دونوں نے مل کے بنایا تھا۔ مگر انہوں نے فراخ دلی سے سارا کریڈٹ نئی دولہن کو دے دیا۔

امی کے دل میں بھی سکون اتر آیا۔ ثانیہ کے ماتھے پہ کوئی بل نہ تھا۔ وہ سامنے ابا کے ساتھ والی کرسی پہ بیٹھی تھی۔

تب ہی عون کو خیال آیا' حیرت سے کھلا منہ لیے وہ کلاً ہونق لگ رہا ہو گا تو وہ چونک کر حال میں لوٹا۔

یہ عون کا پسندیدہ ترین ناشتہ تھا۔ یقیناً "بھابی نے ہی اس کے گوش گزار کیا ہو گا۔ مگر بہرحال۔ اس کے نمبر کم کرنے کا عون کا منصوبہ کھٹائی میں پڑ گیا۔ وہ سر جھٹک کر ناشتہ کرنے لگا۔ وہ بڑے لاڈ پیار کے ساتھ ابا کو ناشتہ کروا رہی تھی۔

"اوفوہ۔۔۔ دیکھیں ماموں جان! اسپیشلی آپ کے لیے۔۔۔ اونہوں۔ آپ نے قیمہ نہ چکھا تو میری محنت ادھوری رہ جائے گی۔۔۔ مجھے امی نے بتایا تھا' ہری مرچوں والا آملیٹ آپ کو کتنا پسند ہے۔ مگر رنگت سنہری ہونی چاہیے۔" پیار' ناز' کھلکھلاہٹ۔ عون کا دل ان جملوں پر جل جل گیا۔

نئی نویلی دلہن کے یہ جملے تو "ادھر" ہونے چاہیے تھے اور وہ "ادھر ادھر" نثار رہی تھی۔ عون کو تو اس وقت ابا بھی "ایرے غیرے" لگ رہے تھے اور خود وہ "نتھو خیرا" جس کی طرف کسی کا دھیان ہی نہ تھا۔ ابا تو ابا۔ آج تو امی بھی نئی بہو کی "کارکردگی" پر فدا ہو گئیں۔

وہ آدھا پونا ناشتہ مرے دل کے ساتھ کر کے چائے ختم کرتا اٹھ کر تیار ہونے کے لیے کمرے کی طرف جانے لگا۔

"اچھا۔۔۔ عون! میں نے آپ کے کپڑے نکال کے بیڈ پہ رکھ دیے تھے اور شوز بھی جو آپ نے کہے تھے وہی پالش کیے ہیں۔ ٹائی مجھے ملی نہیں' وہ میں آ کے نکال دیتی ہوں۔"

"آپ۔۔۔؟ عون اور آپ؟"

اس اندازِ تخاطب پہ کون نہ مر جائے اے خدا۔

اس کی فرماں برداری سب ہی کے دل کو بھائی۔

ونی۔ ہونہہ سو میں سے ایک سو پچاس نمبر۔ عون تقریباً "سیڑھیاں روندتا ہوا اپنے کمرے میں پہنچا۔

دروازے کے بند ہونے کی زوردار آواز سن کر ابا کی پلیٹ میں آملیٹ کا ٹکڑا رکھتی ثانیہ کے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی وقت ریلنگ تک آکر عون نے اسے اونچی آواز میں پکارا تھا۔

"ثانیہ۔۔۔ ثانیہ۔"

"میں دیکھوں۔۔۔ شاید رومال اور جرابیں بھول گئی تھی۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں کہتی اٹھ گئی۔

"دیکھ لو۔ تمہارے نالائق بیٹے کی زندگی تو جنت بن گئی۔"

بابا کی فخر بھری آواز پر ثانیہ نے بمشکل ہنسی روکی اور وہ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی۔۔۔ کمرے میں آئی تو وہ لڑاکا عورتوں کی طرح کولہوں پہ ہاتھ جمائے کمرے کے وسط میں کھڑا اسے گھورنے لگا۔

"کیا ہے۔ ایسے شور کیوں مچا رہے ہو؟" ثانیہ نے ناگواری سے پوچھا تو وہ طنزاً گویا ہوا۔

"اچھا جی۔ تو یہاں یہ کون سا لباس فاخرہ رکھا ہے۔ آپ نے غیر مرئی یا شاید مجھ عقل کے اندھے کو ہی دکھائی نہیں دے رہے۔"

ثانیہ کی ہنسی چھوٹی۔ عون کا انداز ہی ایسا تھا۔ وہ اطمینان سے اندر آئی اور بولی۔

"دیکھو عون! اب اگر تم بار بار میرے ماموں جان کے سامنے میری پوزیشن ڈاؤن کرنے کی کوشش کرو گے تو میرا فرض بنتا ہے تاکہ میں اس پوزیشن میں بہتری لاؤں۔"

عون عباس تو ایک پاؤں پہ ناچ اٹھا۔ اس قدر تلملایا۔ بھئی اس کی بیوی کوئی عام عورت تھوڑی تھی۔ بڑا اعلا دماغ دیا تھا محترمہ نے بڑی آسانی سے عون کی چال اسی پر الٹ دی۔

"تو اب تم ابا سے جھوٹ بولا کرو گی۔۔۔؟" عون کو غصہ آیا۔ ثانیہ بیڈ کے کنارے ٹک گئی۔

"اور جو تم کر رہے ہو اسے کیا کہتے ہیں؟" جتا کر پوچھا۔

"تو پھر! اتنے ڈرامے کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ آپ۔۔۔ جناب اپنے ماموں صاحب کے سامنے بھی تو تڑاخ سے بات کرو تو پتا چلے تمہاری بہادری کا۔"

وہ اب اس سے مایوس ہو کر الماری میں سے اپنے کپڑے نکال رہا تھا۔ وہ مزے سے بیڈ پہ بیٹھی ٹانگیں لٹکائے پاؤں جھلا رہی تھی۔

عون نے کڑھتے ہوئے شرٹ پہنی۔

وہ حد درجہ خفا دکھائی دیتا تھا۔ ثانیہ کا پاؤں جھلانا اب بند تھا۔ اسے اپنی بدتمیزی پر افسوس ہونے لگا۔

وہ اپنی پینٹ لیے واش روم میں چلا گیا۔ ثانیہ کو پہلے اس کی اتری ہوئی شکل دیکھ کر ترس آیا تھا۔ پھر پیار آنے لگا اور اسی پیار کے مارے اس نے عون کے نکلنے سے پہلے ہی اس کی ٹائی اور جرابیں ڈھونڈ کے نکالیں۔ ریک میں سے شوز نکالے اور ہلکا سا کپڑا پھیر کر بیڈ کے پاس رکھ رہی تھی جب وہ واش روم سے نکل آیا۔ آئینے کی طرف بڑھتے ہوئے وہ ٹھٹکا۔ نظر اپنی ٹائی اور جرابوں پر پڑی تھی۔

"بڑی مہربانی۔۔۔" طنزیہ لہجہ۔

"کوئی بات نہیں۔۔۔" وہ شانے اچکا کر ایسے بولی جیسے بہت بڑا احسان کیا ہو اور اب جتانا بھی نہ چاہتی ہو۔

عون بڑبڑاتے ہوئے شیشے کی طرف مڑ گیا۔ ثانیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆ ☆ ☆

سفینہ بیگم کا بی پی شوٹ کر گیا اور نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ ایراز نے اپنی پریشانی پر قابو پاتے ہوئے فوراً" معیز کو کال کی اور پھر ایمبولینس کال کی۔

معیز کے پہنچنے تک ایمبولینس ہسپتال کے لیے نکل رہی تھی۔ زارا کا رو رو کر برا حال تھا۔

"مجھے بھی ساتھ جانا ہے۔۔۔"

اس کی ایک ہی ضد تھی۔ ایراز اور عمر ایمبولینس میں چلے گئے۔ معیز نے تسلی کے لیے زارا کو ساتھ لگاتے ہوئے ایبہا کا نمبر ملایا اور مختصر لفظوں میں اسے صورت حال بتا کر زارا کے پاس آنے کا کہا۔

"تم اس پہ اعتماد کر سکتی ہو۔ بری لڑکی نہیں ہے وہ۔ میں جا کے تم سے رابطہ رکھوں گا۔"

معیز اسے دلاسا دیتا فوراً" ہی نکل گیا تھا۔ زارا ہاتھوں میں منہ چھپائے زور زور سے روتی وہیں صوفے پر گر گئی۔ درحقیقت معیز کا حوصلہ ہی نہ پڑا تھا زارا کو ساتھ لے جانے کا۔ اس کی حالت دگرگوں تھی۔ ہسپتال میں وہ ماما کو سنبھالتا یا زارا کو۔ اسی لیے عجلت میں بھی معیز کو یہی بہتر فیصلہ لگا تھا۔

ایبہا لاؤنج میں جھجکتے ہوئے داخل ہوئی۔ نذیراں بھی چھٹی پر تھی۔ اس کے بدلے میں جو کام والی آتی وہ کام ختم کر کے واپس جا چکی تھی۔ ورنہ اس وقت زارا تنہا نہ ہوتی۔

زارا کو بے تحاشا روتے دیکھ کر وہ تیزی سے اس کی طرف بڑھی۔

"زارا۔۔۔ کیا ہوا آنٹی کو۔۔۔؟"

ایبہا متوحش سی اس کے پاس آ کے ٹِک گئی۔ زارا نے آنسوؤں سے بے حال چہرہ اٹھا کے اسے دیکھا۔ ایبہا نے دلاسے کے لیے اس کا ہاتھ تھام کر گویا تسلی دی۔ زارا بے اختیار ہی اس کے شانے سے لگ کے رونے لگی۔

"میری ماما۔۔۔ ایبہا۔۔۔ وہ بہت بیمار ہیں۔ ان کے لیے دعا کرنا۔"

ضبط کرتے ہوئے بھی ایبہا کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ اس نے بے ساختہ ہی زارا کو بانہوں کے گھیرے میں لے لیا۔ ماں کے جانے کا دکھ۔۔۔ اس جدائی کا دکھ ایبہا سے بڑھ کے اور کون جانتا تھا۔

وہ دل ہی دل میں دعا مانگتی سفینہ بیگم کی ہر خطا معاف کرنے لگی۔

اسی وقت ایبہا کا موبائل بجنے لگا۔

معیز کی کال تھی۔ زارا کا دل خوف کے مارے بند ہونے لگا۔ ایبہا نے جھپٹ کر کال اٹینڈ کی۔

"زارا کو مت بتانا ایبہا۔۔۔ ماما۔"

معیز کی تھکی تھکی آواز دکھ سے بوجھل تھی۔ ایبہا کی سماعتیں جیسے ہر آواز سے بے نیاز ہو گئیں۔ دکھ کی لہر نے اسے کاٹ ڈالا تھا اور زارا۔۔۔ پُرامید برستی آنکھوں سے اس کا چہرہ دیکھ رہی تھی۔

☆ ☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نبیلہ ابر راجہ

ہاں سیکھا ہے میں نے جینا

گھر میں مرگ کا سا سماں تھا۔ عالیہ سر منہ لپیٹے پڑی تھیں۔ عاشر نگاہیں چراتا کمرے میں بند ہو گیا تھا۔ عالیہ کی ڈبڈبائی آنکھیں اور افسردہ صورت دیکھنا اس کے بس سے باہر تھا۔ ان کی نگاہیں بار بار سامنے تخت پہ رکھے شاپنگ بیگ پہ جاتیں اور پلٹ کر ہاتھ کی لکیروں سے الجھنے لگتیں۔ وہ ان میں ماضی کو تلاش کر رہی تھیں۔

بہت دیر بعد وہ نڈھال سی اٹھیں اور شاپر اپنی طرف گھسیٹا اور ہمت کر کے اس کے اندر رکھی چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالیں۔ سب سے اوپر سرخ رنگ کے جیولری کیس میں سونے کی انگوٹھی تھی۔ یہ ہلکے سے وزن کی نگ لگی سونے کی عام سی انگوٹھی تھی۔ لیکن عالیہ کے نزدیک یہ انگوٹھی اتنی عام اور کم قیمت نہیں تھی۔ اس انگوٹھی سے تو ان کے خواب جڑے تھے۔ کتنے ارمانوں سے انہوں نے یہ انگوٹھی چار سال پہلے ماہ نور کی انگلی میں پہنائی تھی۔ وہ دن یاد آتے ہی ان کے دل میں ہوک سی اٹھی اور آنکھوں میں رکا ساون جھر جھر برسنے لگا۔ کچھ دیر بعد عالیہ نے کپکپاتے ہاتھوں سے شاپر میں ایک بار پھر ہاتھ ڈال کر ریشمی کپڑوں کے چار سوٹ باہر نکالے۔ یہ چار سوٹ چار عیدوں پہ ماہ نور کے لیے بڑے چاؤ سے خریدے گئے تھے ساتھ ہم رنگ چوڑیاں، ہیر کلپ اور امیٹیشن جیولری تھی۔ کپڑے جوں کے توں تھے بغیر سلے۔ لگتا تھا انہیں ایک بار بھی نہیں دیکھا گیا ہے جیسے انہوں نے بھیجے تھے ویسے ہی واپس آ گئے تھے۔

ماہ نور ایک سے ایک مہنگا کپڑا پہنتی تھی، یہ عام سے ہزار پندرہ سو کے چار سوٹ اس کے اعلیٰ ذوق کے سامنے کوئی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ وہ سب چیزوں کو آنکھوں سے لگا لگا کر رو رہی تھیں جیسے اپنے اجڑے

مکمل ناول





خوابوں کا ماتم کر رہی ہوں۔ رافعہ ان کی بڑی بہن ان کی امیدوں کا قتل کرکے واپس جا چکی تھیں۔ لفظ تھے یا سلگتے انگارے جو ان کی زبان سے ادا ہوئے تھے۔

سالوں کی محبت اور بھرم پر ایک لمحے نے پانی پھیر دیا تھا۔ ماہ نور اور عاشر کا رشتہ جو بڑی خالہ نے سالوں پہلے مذاق مذاق میں محبت سے باندھا تھا ٹوٹ گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

طارق اور امین کی بیویاں آپس میں بہنیں تھیں۔ طارق کاروباری سوجھ بوجھ رکھنے والے بہت ہوشیار شخص تھے انہوں نے اپنا تمام سرمایہ کپڑے کے کاروبار میں لگایا تھا۔ چھوٹے پیمانے پہ شروع کیا جانے والا کام کچھ ہی عرصے میں ان کے لیے نفع بخش بن گیا تھا۔ انہوں نے دونوں بیٹوں کو بھی اپنے ساتھ شامل کر لیا۔ باپ بیٹے تینوں محنتی تھے' دیکھتے ہی دیکھتے کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

طارق اور امین دونوں ایک ہی محلے میں رہائش پذیر تھے۔ گھر بھی ساتھ ساتھ تھے۔ معیار زندگی اور کاروبار میں ترقی کے بعد طارق تو شہر کے ایک اور اچھے علاقے میں شفٹ ہو گئے جبکہ امین وہیں پہ تھے۔ طارق ان کا گہرا دوست تھا۔ اس کے مشورے پہ امین نے بھی اپنی جمع پونجی کپڑے کے کاروبار میں جھونک دی' لیکن قسمت نے ان کا ساتھ نہ دیا۔ کاروبار نے ترقی کیا کرنی تھی الٹا مالی مشکلات نے گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ پہلے ادھار اور پھر گھر بکنے کی نوبت آ گئی۔ کسی نہ کسی طرح امین نے قرض خواہوں کا منہ کچھ عرصے کے لیے بند کیا' لیکن تمام عمر تو ایسے نہیں گزاری جا سکتی تھی۔ انہیں لیے گئے قرض لوٹانے ہی تھے۔ اللہ کے سوا بیوی اور بیٹے کا آسرا نہ تھا۔ دور دور تک کوئی ہاتھ پکڑنے والا نہ تھا۔ امین نے خاموشی سے رہنے کا ٹھکانہ فروخت کرکے قرض اتارا۔

وہ عاشر اور عالیہ کے ساتھ ایک چھوٹے سے کرائے کے گھر میں اٹھ آئے۔ عرصہ پہلے عالیہ اور رافعہ کی بڑی بہن شافعہ نے ایک دن ان کے گھر بیٹھے بیٹھے ہی اپنے سب بھانجے بھانجیوں کے رشتے آپس میں جوڑے۔ عاشر کا جوڑ انہوں نے ماہ نور کے ساتھ جوڑا۔ باتوں باتوں میں کیا جانے والا یہ رشتہ دونوں خاندانوں کو ہی پسند آ گیا۔ طارق اور امین کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ عالیہ نے بڑے چاؤ سے ماہ نور کی انگلی میں عاشر کے نام کی انگوٹھی پہنائی۔ اس رشتے کو مضبوط حیثیت مل گئی تھی۔

عاشر اور ماہ نور رشتہ ہونے سے پہلے ایک دوسرے کے دوست بھی تھے۔ گھنٹوں ہر موضوع پہ باتیں ہوتیں' چھوٹی موٹی لڑائیاں بھی چلتیں۔ ان کے تعلق پہ کسی کو اعتراض نہ تھا۔ رافعہ اور عالیہ خوش ہوتیں۔ منگنی کے بعد ان کی دوستی میں اور گہرائی آ گئی تھی۔ عاشر نے کبھی اس سے اظہار محبت نہیں کیا تھا اور نہ ماہ نور ان باتوں کو اہمیت دیتی تھی' لیکن درپردہ دونوں ہی ایک دوسرے کے جذبات سے واقف تھے۔ ان کا قلبی تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہو گیا تھا۔

عاشر نے لمبے چوڑے وعدے نہیں کیے نہ خواب دکھائے تھے' نہ آتے جاتے معنی خیز نگاہوں سے شرارتیں کی تھیں۔ اسے پتا تھا ماہ نور خالہ کی بیٹی ہے' منگنی ہو چکی ہے شادی ہوگی تو ایک نئی زندگی کا آغاز ہوگا تب ماہ نور کو حال دل سناتے اسے کسی بھی قسم کی کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوگی۔

یہی وجہ تھی کہ ماہ نور کو ان کے ہاں آنے میں کوئی ہچکچاہٹ نہیں ہوتی۔ وہ تقریباً روز ہی خالہ کے گھر آتی۔ کبھی وہ گھر میں نہیں بھی ہوتیں تو ماہ نور بیٹھ جاتی۔ اسے عاشر کے پاس اکیلے بیٹھ کر کبھی بھی ڈر نہیں لگا تھا۔ وہ دونوں دنیا جہان کے موضوعات پہ بولتے' بحث کرتے لڑنے کی نوبت بھی آ جاتی ایسے میں عاشر خاموش ہو کر ہار مان لیتا کیونکہ اسے ماہ نور کی شکست پسند نہیں تھی۔ عید تہوار پہ عالیہ بڑے چاؤ سے چوڑیاں' مہندی اور کپڑے ماہ نور کے لیے بھیجتیں۔ وہ اب کرائے کے گھر میں دوسرے محلے میں آ گئے تھے' لیکن پھر بھی چار پانچ ماہ بعد عالیہ بہن اور

بہنوئی کی طرف چکر لگا لیتیں۔ رافعہ اور طارق کا آنا کم ہو گیا تھا۔ ایک تو وہ بہت دور چلے گئے تھے دوسرے طارق کے پاس مصروفیت کا بھی جواز تھا۔

امین نے ایک پرائیویٹ فرم میں نوکری کرلی تھی۔ عاشر کالج میں پڑھ رہا تھا۔ پڑھائی سے فارغ ہو کر وہ ایک آٹو ورکشاپ میں کام سیکھنے جاتا۔ استاد جاوید کو خاموش طبع سنجیدہ متین چہرے والا عاشر بہت پسند تھا۔ کام سیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ استاد جاوید کے تینوں بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتا۔ استاد جاوید خود تو ان پڑھ تھا' لیکن اپنے بچوں کو اعلا تعلیم دلوانا چاہتا تھا۔ عاشر بچوں کو محنت سے پڑھاتا' اس وجہ سے استاد جاوید اس پہ خصوصی طور پر مہربان تھا۔

عاشر کی کالج کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی۔ تلاش بسیار کے باوجود اسے اچھی جاب نہیں ملی تھی۔ وہ استاد جاوید کی ورکشاپ میں ہی لگا ہوا تھا۔ میٹرک میں اس نے استاد جاوید کے پاس جانا شروع کیا تھا۔ ساڑھے چار سال کے دوران اس نے گاڑیاں ٹھیک کرنے کا سب کام بخوبی سیکھ لیا تھا۔ اب اسے گاڑیوں کے نیچے لیٹ کر ہاتھ منہ کالے نہ کرنے پڑتے تھے۔ استاد جاوید نے اسے چھوٹا سا آفس بنا دیا تھا جہاں ایک عدد کمپیوٹر بھی تھا۔ عاشر ورکشاپ میں مرمت ہونے والی گاڑیوں میں کی خرابیوں اور مرمت کا تخمینہ لگا کر کمپیوٹر میں فائل بناتا' ریکارڈ بناتا۔ آمدنی اور خرچ کے گوشوارے بناتا۔ اگر کوئی ورکشاپ میں نہ ہوتا تو مرمت کے لیے آنے والی گاڑیوں کو بھی دیکھتا۔

امین صاحب نے اسے آٹو ورکشاپ میں کام سیکھنے کے لیے راضی کیا تھا۔ انہوں نے آنے والے وقت کی مشکلات کو شاید بھانپ لیا تھا۔ عاشر اعلا تعلیم حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اسے ڈاکٹر بننے کا شوق تھا' لیکن امین صاحب کے وسائل میڈیکل جیسی مہنگی تعلیم افورڈ نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے عاشر کو کام سیکھنے کے لیے استاد جاوید کی ورکشاپ میں بھیجا تھا۔ وہ حساس تھا اور گھر کے حالات سے اچھی طرح واقف تھا'

اس نے کوئی احتجاج نہیں کیا تھا۔ استاد جاوید کے حالات زندگی اس کے سامنے تھے۔ آٹو ورکشاپ سے وہ اتنا کما لیتے کہ تینوں بچوں کی مہنگی تعلیم کا خرچا بخوبی پورا ہو رہا تھا' اچھا گھر بنا لیا تھا' گاڑی بھی تھی' خوشحالی تھی۔ شہر کے نمایاں علاقے میں تین دکانیں بنا کر کرائے پہ دے دی تھیں۔ عاشر بہت محنت سے کام سیکھ رہا تھا۔ استاد جاوید نے اسے کبھی بھی "اوئے چھوٹے" کہہ کر نہیں بلایا تھا۔ وہ وابجی سا پڑھا لکھا تھا' لیکن زمانہ شناس اور اچھے اخلاق کا مالک ایمان دار آدمی تھی۔ وہ گاڑی میں چار سو کا پرزہ ڈال کر چار ہزار کا بل نہیں بناتا تھا۔ اس لیے اس کی ورکشاپ میں کام کا رش ہی رہتا۔ اس کی ایمان داری کے سبب اس پہ اللہ کی خاص رحمت تھی۔ عاشر نے استاد جاوید سے بہت کچھ سیکھا تھا۔ کام کے ساتھ ساتھ اس نے زندگی کے تجربات بھی عاشر کو تحفہ دیے تھے۔

❀ ❀ ❀

خالہ باہر تخت پہ بیٹھی رو رہی تھیں جبکہ اندر کمرے میں لیٹے عاشر کے آنسو اس کے دل پہ گر رہے تھے۔ رافعہ خالہ نے جلے دل پہ چھریاں چلائے تھے۔

"ماہ نور کے ابا کا ارادہ بدل گیا ہے۔ سچ پوچھو تو ہمارے گھر میں کوئی بھی راضی نہیں ہے۔ ماہ نور کہتی ہے کہ عاشر اس کے سہارے ترقی کرنا چاہتا ہے کیونکہ شادی کے بعد ماہ نور کے ابا جہیز میں بیٹی کو فلیٹ اور گاڑی بھی دیں گے۔ اب میں کیا کروں' ماہ نور کی سوچ بدل گئی ہے۔ میں تمہاری انگوٹھی اور کپڑے لے آئی ہوں۔ ماہ نور نے تو ان کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہے۔ تم برا مت ماننا' عاشر اور ماہ نور کا جوڑ نہیں ہے۔ میری بیٹی یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے جبکہ عاشر صرف چودہ جماعتیں پاس ہے۔ خیر تک اپنا نہیں ہے۔ ماہ نور کے ابا بیٹی سے بہت پیار کرتے ہیں۔ تمہیں پتا تو ہے۔"

رافعہ خالہ کا ایک ایک لفظ عاشر نے اپنے کانوں سے سنا تھا۔ بے اختیار دل نے تمنا کی تھی کہ کاش یہ

سب جھوٹ ہو۔ جو خالہ کہہ رہی ہیں وہ سچ نہ ہو۔ بھلا! ماہ نور یہ سب کیسے کہہ سکتی ہے۔ عاشر کا دل چاہ رہا تھا خالہ سے کہے کہ خالو اگر فلیٹ اور گاڑی جہیز میں بیٹی کو دے رہے ہیں تو وہ کیا کرے۔ اسے ان کا لالچ نہیں ہے۔ یہ تو وہ سالوں سے سنتا آ رہا تھا کہ خالو ماہ نور کو گاڑی اور فلیٹ دیں گے۔ ماہ نور کا خیال تھا کہ جہیز میں ملنے والے فلیٹ اور گاڑی کا سن کر عاشر کی نیت بدل گئی ہے اس لیے وہ ڈھنگ سے کوئی بھی جاب نہیں ڈھونڈ رہا ہے، صرف ڈرامہ کر رہا ہے۔ برسوں پہلے قائم کیا گیا رشتہ رافعہ خالہ توڑ گئی تھیں۔ ابھی امین صاحب آفس سے نہیں آئے تھے۔ گھر لوٹنے پہ اس روح فرسا حقیقت کا سامنا انہیں بھی لازمی کرنا تھا۔ صبح سے شام تک جان توڑ مشقت اور محنت نے انہیں بری طرح تھکا ڈالا تھا۔ ان کی سب امیدیں عاشر سے وابستہ تھیں وہ ڈیڑھ سال سے باہر جانے کی کوششوں میں لگا ہوا تھا، لیکن بات بن کے نہیں دے رہی تھی۔ اس کوشش میں استاد جاوید پوری طرح اس کا ساتھ دے رہے تھے۔

☆ ☆ ☆

دوپہر کا سورج سر پہ آگ برسا رہا تھا۔ افراح اپنے قدموں کو گھسیٹتی ہوئی گھر کے اندر داخل ہوئی تھی۔ صحن اور برآمدہ سنسان پڑا تھا کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ قیامت خیز گرمی تھی پسینہ دھاروں کی شکل میں سر سے پاؤں تک بہہ رہا تھا۔ سب اپنے اپنے کمروں میں دبکے ہوئے تھے۔ جنریٹر کی پر شور آواز ظاہر کر رہی تھی کہ بجلی حسب معمول نہیں ہے۔

اس نے تھکے تھکے انداز میں اپنے کمرے میں قدم رکھ کر سب سے پہلے سوئچ بورڈ ٹٹول کر پنکھے کا بٹن آن کیا اور پرس پھینکنے والے انداز میں بیڈ پہ رکھا، چادر کو جسم سے الگ کیا۔ ذرا حواس بحال ہوئے تو فریج کا رخ کیا صد شکر کہ ٹھنڈے پانی کی تین چار بوتلیں موجود تھیں۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے پیاس بجھائی۔

اب پیٹ کی آگ ستا رہی تھی۔ اسے سرد کرنے کے لیے افراح نے باورچی خانے کا رخ کیا۔

وہاں تو ایسا لگ رہا تھا جیسے دشمن کی فوجیں سب کچھ اجاڑ کر تباہ و برباد کر گئی ہیں۔ سنک گندے برتنوں سے بھرا تھا۔ کچن کی شیلف پہ ایک پانی کا گلاس تک رکھنے کی گنجائش نہ تھی۔ یہی حال فرش کا تھا۔ دو بڑے پتیلے وہاں محو استراحت تھے۔ اس نے ایک کا ڈھکن اٹھا کر اندر جھانکا۔ تہہ میں کنارے کے ساتھ بچے کھچے چاول نظر آ رہے تھے۔ شیلف پہ دو پتیلیاں پڑی تھیں اس نے مایوسی سے ڈھکن اٹھایا۔ تھوڑی سی دال لگی پڑی نظر آ رہی تھی۔ پہلی بار اس کی آنکھوں میں خوشی نمودار ہوئی۔ فریج سے آٹا نکال کر اس نے فالتو شیلف سے برتن ہٹا کر اپنے لیے روٹی پکائی۔ پتیلے کی تہہ میں بچ جانے والے چاول اس نے پلیٹ میں ڈالے اور کمرے میں واپس آ گئی۔ پنکھا اپنی مخصوص رفتار کے ساتھ گھرر گھرر کی آوازیں پیدا کرتا چل رہا تھا۔ "تنخواہ ملے تو نیا پنکھا لوں گی۔" اس نے روٹی کھاتے ہوئے دل میں ارادہ کیا۔ اس کا دل کر رہا تھا کھانے کے بعد پاؤں پسار کے ادھر ہی سو جائے، لیکن باورچی خانے کی حالت زار سونے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

خالی برتن لے کر وہ دوبارہ واپس آ گئی۔ سب سے پہلے اس نے شیلف صاف کیا پھر برتنوں کے ساتھ نبرد آزما ہوئی پسینہ ایک بار پھر پورے جسم پہ رینگنے لگا تھا۔

برتن دھو کر باورچی خانے کو صاف حالت میں لانے میں ایک گھنٹے سے زیادہ وقت صرف ہوا، لیکن ہر چیز اب دھل دھلا کر صاف ہو گئی تھی۔ کام والی ماسی دن میں اپنے حساب سے صفائی کر کے چلی جاتی تھی۔ بعد میں جو گند مچتا اس کی بلا سے۔ صاف کرنے کی ذمہ داری اس کی نہیں تھی۔ اس نے تو دوسرے دن ہی آنا ہوتا تھا۔ افراح اسکول سے آ کر کھانا کھا کر بہت سے کام نمٹا لیتی تھی۔ دونوں بھابھیاں بتولہ اور عادلہ شام میں اپنی آل اولاد سمیت باہر نکلتیں۔ پھر چائے کا دور چلتا۔ چائے بنانے کی ذمہ داری افراح کی ہی تھی اور ظاہر ہے،

چائے کے بعد برتن بھی دھونے پڑتے۔

فارغ ہوتے ہوتے اسے کافی دیر ہو جاتی تھی۔ وہ ٹی وی لاؤنج میں سب کے ساتھ بیٹھتی تو چلتی زبانیں سرد مہری اوڑھ لیتیں۔ حالانکہ اس کے آنے سے پہلے ماحول اچھا خاصا خوش گوار ہوتا۔ اس کے آنے کی دیر ہوتی اسے لگتا کوئی آدم بو آدم بو کرتا سب کو پتھر کا بنا گیا ہو۔ چند دیر وہ بھی جبر کرتی خود پہ۔ لیکن پھر اٹھ آتی۔ اس کے غائب ہوتے ہی پھر سے آوازیں زندہ ہو جاتیں۔

وہ اپنے کمرے میں آکر عشاء کی نماز پڑھ کر چھت چلی جاتی۔ ٹہلتے ہوئے وہ استغفار اور درود شریف کی تسبیح پڑھ لیتی۔ جب پاؤں اور جسم تھک جاتا تو سیڑھیاں اتر کر کمرے میں آجاتی۔ اس کے چھوٹے سے بک شیلف میں کئی کتابیں تھیں جو اس نے پیسے بچا بچا کر خریدی تھیں۔ کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں اٹھاتی تو سارے دن کی تھکن ہوا میں تحلیل ہو جاتی۔

یہ بک شیلف ابا کا تھا جو انہوں نے بڑے شوق سے برسوں پہلے لکڑی خرید کر خود بنوایا تھا جب وہ حیات تھے تب یہ ان کے کمرے میں تھا۔ ابا اماں کے یکے بعد دیگرے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد افراح بک شیلف اپنے کمرے میں لے آئی تھی۔ انہیں کتابیں خریدنے، پڑھنے، جمع کرنے کا بہت شوق تھا۔ ان سے یہ شوق افراح میں منتقل ہوا تھا۔ تنخواہ ہاتھ میں آتے ہی وہ سب سے پہلے بک اسٹور کا رخ کرتی تھی جہاں سے کتابیں بیس تیس فی صد کم قیمت میں مل جاتی تھیں۔ ابا کی وفات کے بعد ان کی تمام کتابیں کمرہ صاف کروانے کے بہانے بڑی بھابھی نے ردی والے کو اونے پونے داموں دے دی تھیں۔ اس دن افراح بہت روئی تھی اسے ایسے لگ رہا تھا آج ابا دوسری بار مرے ہیں۔ ان کا بک شیلف خالی ہو چکا تھا۔ افراح نے اسی زمانے میں اسے اپنے کمرے میں منتقل کروایا تھا۔ ابا کی یاد اب اس کے ساتھ تھی اپنی یادگار کے ساتھ۔ ہر مہینے وہ کتابیں خرید کر اس میں سجاتی۔ آہستہ آہستہ وہ بھرتا جا رہا تھا۔

پچھلے مہینے وہ صرف "کولن اینڈ ریوز" کا ناول "دی فاؤنڈیشن" ہی خرید پائی تھی۔ کیونکہ کچھ ہنگامی ضروریات پیش آگئی تھیں۔ باؤلہ اور عادلہ بھابھی اس شوق پہ اس کا مذاق اڑاتیں بلکہ انہیں افراح کا ہر شوق، عادت، چیز مضحکہ خیز ہی لگتی۔ وہ سب باتوں سے اچھی طرح آگاہ تھی، لیکن کبھی پلٹ کر انہیں جواباً" کچھ نہیں کہا تھا۔ ابا کے بعد اس کے ہونٹ جیسے کچے دھاگے سے سل گئے تھے۔ اسے لگتا تھا جیسے آہستہ آہستہ وہ باتیں کرنا بھی بھولتی جا رہی ہے۔ گھر آنے کے بعد اس کا زیادہ وقت خاموشی میں ہی کٹتا۔ ابا اماں کی زندگی میں ایسا کچھ نہ تھا بلکہ اس گھر میں سب کے قہقہے گونجا کرتے تھے۔ دونوں بھابھیاں' ان کے بچے

بھائی اماں، ابا اور خود افراح ہنس کر رونق لگاتے۔ تب افراح زور زور سے ہنسا بھی کرتی تھی اور اماں اسے ایسے ہی ہنستے رہنے کی دعا دیا کرتیں۔

ابا کتابیں پڑھنے اور سب میں محبتیں بانٹنے کے شوقین۔ شام میں آفس سے لوٹتے تو افراح کے لیے کھانے کو کچھ نہ کچھ ضرور لاتے۔ وقاص اور عدنان بھائی ہر ماہ اسے پاکٹ منی دیتے۔ ابا اس کے علاوہ الگ سے پیسے دیتے۔ کالج میں پورا ماہ گھوم پھر کے بھی اس کے پاس پیسے بچ جاتے۔

ابا نے اسی زمانے میں اسے ساتھ لے جا کر اس کا بینک اکاؤنٹ کھلوا دیا تھا۔ اکاؤنٹ کھلوانے کے بعد وہ برابر اسے ہر ماہ پیسے دیتے۔ سال کے اختتام پہ افراح نے حساب کیا تو اس کے اکاؤنٹ میں اچھے خاصے پیسے جمع ہو گئے تھے۔ جتنی وہ بلا شرکت غیرے ان پیسوں کی مالک تھی۔ ایک عجیب سی خوشی ہوئی تھی اسے۔ اس کے پاس جو بھی پیسے بچ جاتے وہ بینک میں لے جا کر جمع کروا دیتی۔ اپنی ملکیت کا احساس ہی کچھ اور تھا۔

اس کے پیارے ابا ہر خاص موقع پہ اسے کتابوں کا تحفہ دیتے۔ ان ہی کتابوں نے اس میں کتب بینی کے شوق کو پروان چڑھایا۔ ابا جب تک زندہ رہے اس کی مطلوبہ کتابیں لا کر دیتے رہے۔ ابا اپنی اس لاڈلی اکلوتی بیٹی کی حساسیت سے بخوبی آگاہ تھے۔ چپکے چپکے اپنے جاننے والوں میں انہوں نے اس کے رشتے کا کہا ہوا تھا۔ وہ افراح کے لیے اسی جیسا پیار کرنے والا ہمدرد حساس پر خلوص ہم سفر ڈھونڈ رہے تھے۔ افراح کالج کی تعلیم مکمل کر کے یونیورسٹی میں آ گئی تھی۔ رشتے آتے پر اتفاق تھا کہ قسمت کوئی ابا کی نگاہ میں جچتا ہی نہیں تھا وہ اس کے لیے خوب سے خوب تر کی تلاش میں تھے۔ اسی تلاش میں وہ ایک دن منوں مٹی تلے جا سوئے۔ ان کے پیچھے پیچھے اماں کو بھی جانے کی جلدی تھی۔ دونوں نے ایک بار بھی نہیں سوچا ان کی لاڈلی نازوں پلی بیٹی پہ ان کے جانے کے بعد کیا گزرے گی۔

تبدیلی اتنی جلدی آئی تھی کہ افراح کو سوچنے کی، بولنے کی احتجاج کرنے کی مہلت بھی نہیں ملی تھی۔

اماں ابا اور اس کا کمرا پہلو بہ پہلو ساتھ ساتھ تھا۔ بازلہ بھابھی نے اماں ابا کا کمرا ان کا سامان نکال کر بچوں کے لیے سیٹ کر دیا۔ عادلہ بھابھی بھی ان سے پیچھے نہیں رہیں۔ انہوں نے اسٹور روم کے ساتھ والے کمرے کو افراح کی جائے پناہ بنا کر اسے اس کے اپنے کمرے سے محروم کر دیا۔ افراح کا کمرا، عادلہ بھابھی کے جہیز کے برتنوں کی الماری اور ڈائننگ ٹیبل و کرسیوں سے سج گیا تھا۔ انہوں نے اسے مزید اضافہ تزئین و آرائش کر کے ڈائننگ روم کی صورت دے دی تھی۔ افراح کا بیڈ، کپڑوں کی الماری، ڈریسنگ ٹیبل سب اسٹور روم کے ساتھ والے کمرے میں منتقل ہو گئے تھے۔ یہ کمرا اس کے اپنے کمرے کے مقابلے میں خاصا چھوٹا تھا، لیکن اس نے طریقے سلیقے سے فرنیچر سیٹ کر کے گھٹن اور جگہ کی تنگی کے احساس کو کم کر دیا تھا، لیکن دلوں میں جو جگہ تنگ پڑ گئی تھی اس کا وہ کچھ نہ کر سکی۔

پہلے عادلہ اور بازلہ بھابھی نے اس سے بات کرنا بند کیا، پھر بچوں کو بھی اپنی راہ پہ لگا لیا۔ وقاص اور عدنان بھائی بھی اس کے لیے اجنبی ہو گئے تھے۔ پہلے ہر ماہ وہ دونوں اسے پاکٹ منی دیتے تھے "کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتانا" کہنا بھولتے نہیں تھے، لیکن اماں، ابا کے بعد اب تو وہ بھولے سے بھی اسے پوچھتے نہیں تھے۔

افراح کے بینک اکاؤنٹ میں موجود رقم کا حجم سکڑتا جا رہا تھا۔ اسے مانگنے کی عادت نہیں تھی نہ واویلا کرنے کی۔ ابا کی تربیت نے اس کے اندر دو چیزیں بہت اندر تک اتار دی تھیں۔ ایک ہر چیز کا روشن پہلو دیکھنا، مثبت انداز میں سوچنا اور دوسرے خودداری۔ ابا کی زندگی میں اسے خودداری اور عزت نفس کا حقیقی مفہوم سمجھ میں نہیں آیا تھا تب وقت رشتے اور پیار اس پہ مہربان تھا۔ ہر ضرورت بن کہے پوری ہوتی۔ اس خودداری اور عزت نفس نے تب اپنے وجود کا احساس دلایا جب اس کی گھر میں پہننے والی چپل پھٹ گئی۔ وہ پورے چار دن اس پھٹی ہوئی چپل کے ساتھ پورے گھر میں پھرتی رہی۔ کسی بھائی بھابھی نے توجہ نہیں

دی۔

ضرورت بیان کرتے ہوئے اس کی زبان بھی لڑکھڑانے لگتی تب اس نے پہلی بار اپنے اکاؤنٹ سے چیک بھر کر پیسے نکالے اور بازار سے دو سلیپر خرید لائی اور خوشی خوشی بھابھیوں کو دکھائے۔

"میری گھر میں پہننے والی چپل پھٹ گئی تھی نا اس لیے لائی ہوں۔" افراح نے زندگی میں پہلی بار ایسے کوئی چیز خریدی تھی اس لیے اس کی خوشی دیدنی تھی۔

"تمہارے کہنے کا مطلب ہے کہ ہم تمہارا خیال نہیں رکھتے نہ ضرورت کی کوئی چیز لا کر دیتے ہیں۔" بازلہ بھابھی کے تیور بہت جارحانہ تھے۔ وہ منہ بنا کر رہ گئی حالانکہ وقاص بھائی پاس بیٹھے ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ عادلہ بھابھی بھی لفظی گولہ باری کی اس جنگ میں کود گئیں۔ افراح اپنے اندر اور بھی سمٹ سکڑ کر بیٹھ گئی۔ جواب دینا، صفائی پیش کرنا، کسی کو جھٹلانا اسے آتا ہی نہیں تھا۔

٭ ٭ ٭

اس سے اگلی صبح افراح نے ڈرتے ڈرتے دونوں بھائیوں سے اسکول میں جاب کی اجازت مانگی۔ اسے اس وقت شدید حیرت ہوئی جب با آسانی اجازت مل گئی ورنہ وہ سوچ رہی تھی کہ بھائی کبھی بھی اسے جاب کے لیے گھر سے نکلنے نہیں دیں گے۔ وہ کوئی ایسے گئے گزرے نہیں تھے جو اس کا بوجھ اور خرچہ نہ اٹھا سکتے۔ اچھے خاصے کھاتے پیتے خوش حال خاندان میں ان کا شمار تھا، لیکن اماں ابا کے بعد بہن کے معاملے میں ان کا دل اور ظرف دونوں ہی مر چکے تھے۔

افراح ایک پرائیویٹ اسکول میں سیکنڈری کلاسز کو پڑھا رہی تھی۔ یہ ایک اعلیٰ درجے کا معیاری انگلش میڈیم اسکول تھا۔ اس کی قابلیت کی بنا پر اچھی تنخواہ ملتی تھی۔ افراح نے آنرز میں فرسٹ ڈویژن میں ماسٹرز کیا تھا۔ اپنی ساتھی ٹیچرز میں وہ ممتاز تھی۔

ابو نے اپنی زندگی میں ہی اسے پانچ وقت کا نمازی اور مذہب سے وابستگی رکھنے والی بنا دیا تھا۔ وہ فجر میں اٹھ جاتی۔ نماز کے بعد ایک تسبیح درود شریف کی پڑھتی اور ناشتے کے لیے باورچی خانے کا رخ کرتی۔ جہاں عادلہ اور بازلہ بھابھی اپنے اپنے شوہروں کا ناشتا بنا رہی ہوتیں۔ اسے کبھی کسی نے چائے کے ایک کپ کا بھی نہ پوچھا۔ وہ سکون سے ان کے فارغ ہونے کا انتظار کرتی اور رات کے بچے سالن اور چپاتی کے ساتھ ناشتا کر کے اسکول کے لیے سدھارتی۔ اکثر رات کا بچا ہوا سالن بھی اس کے نصیب میں نہ ہوتا۔ برتن صاف کرنے کے بہانے کچرے میں چلا جاتا۔

وہ سہ پہر ڈھائی بجے وہ اسکول سے گھر آتی تو خود ہی اپنی روٹی بناتی۔ باقی سب کھا پی کے اپنے اپنے کمروں میں آرام کر رہے ہوتے۔ سالن بچ جاتا تو ٹھیک ورنہ جلدی جلدی بھوک میں وہ ٹماٹر پیاز باریک باریک کاٹ کر ان میں ایک انڈا ڈال کر فٹافٹ سالن بنا لیتی۔ اس کے بعد کچن صاف کرنے برتن دھونے کا مرحلہ آتا۔ وہ اس کے بعد گرمی سردی کمرے کا رخ کرتی۔

گھنٹہ دو گھنٹہ آرام کے بعد وہ پھر باورچی خانے میں آتی۔ سب کے لیے چائے بنانے کی ذمہ داری اس نے از خود اپنے سر لی ہوئی تھی۔ پھر رات کے کھانے کے لیے وہ تازہ آٹا بھی گوندھ دیتی اور کئی ایک کام بھی نمٹا دیتی۔

اسی معمول کے مطابق دن رات مخصوص رفتار سے گزر رہے تھے۔ وہ آنے والے جون میں پورے ستائیس سال کی ہونے والی تھی۔ جاب شروع کیے ہوئے بھی اسے پانچ سال پورے ہو گئے تھے۔ بازلہ اور عادلہ بھابھی نے کئی رشتے کرانے والیوں کو اپنی اسکول میں پڑھانے والی نند کے رشتے کا بولا ہوا تھا۔ اکثر رشتے پتے میں ہی اتنے نامناسب اور بے جوڑ لگتے کہ جھٹ انکار ہو جاتا۔ کم سے کم اس معاملے میں دونوں بھابھیوں نے اس کے ساتھ نیکی کی تھی کہ اپنے سر سے بوجھ اتارنے کے لیے اسے کسی ایسے ویسے کے سر منڈھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

٭ ٭ ٭

دھوپ دیواروں سے ڈھل رہی تھی۔ ادھ کھلی

کھڑکی سے افراح نے باہر جھانکا۔ پاؤں میں چپل پہنتی وہ باورچی خانے میں چلی آئی۔ موسم ویسے کا ویسا ہی تھا۔ البتہ دھوپ کی تمازت میں خاصی حد تک کمی آگئی تھی۔ اس نے چائے کا پانی چڑھایا۔ بازلہ بھابھی نے باورچی خانے میں جھانکا۔ باورچی خانے میں چائے بناتی افراح کو دیکھ کر انہوں نے اطمینان کا سانس لیا اور آگے بڑھ گئیں۔ افراح نے چائے بنا کر اپنے لیے ایک کپ نکالا اور چیزیں سمیٹنے لگی۔ اتنے میں عادلہ بھابھی آگئیں انہوں نے دو کپوں میں اپنے اور بازلہ کے لیے چائے نکالی۔ انہوں نے چھوٹے بیٹے روی سے چائے کے ساتھ کھانے کے لیے چیزیں منگوائی تھیں۔ اس لیے چائے لے کر پھر سے کمرے میں چلی گئی تھیں۔

افراح نے کام کرتے ہوئے اپنی چائے ختم کی۔ ساتھ اس نے آٹا گوندھنے کا کام بھی کر لیا۔ اتنے میں چائے کے برتن پھر سے دھونے کے لیے جمع ہو گئے تھے۔ وہ دھو کر باہر نکلی ہی تھی کہ وقاص بھائی کی گاڑی کا ہارن سنائی دیا۔ بچے بھاگ کر گیٹ کی طرف جا رہے تھے۔ کبھی ابا کے آفس سے گھر آنے پہ وہ بھی ایسے ہی خوش ہو ہو کر گیٹ کی طرف جایا کرتی تھی۔ ابا کے ہاتھ میں کھانے پینے کی جو چیز بھی ہوتی' وہ افراح کے ہاتھ میں تھماتے۔ وہ لے جا کر کچن کے شیلف پہ رکھ دیتی۔ پھر بازلہ یا عادلہ بھابھی میں سے کوئی بھی چائے بنا کر اس کے ساتھ رکھ کر لے آتیں۔ تب وہ سب شام کی چائے کھلے آسمان تلے بیٹھ کر صحن میں پیا کرتے تھے۔ وقاص اور عدنان بھائی بھی ابا کے ساتھ شریک ہوتے۔ اب تو وہ سب قصہ پارینہ تھا۔ وقاص بھائی ہنستے مسکراتے بچوں کی معیت میں اندر آ رہے تھے' تبھی سی مسکراہٹ افراح کے لبوں پہ جگمگائی ورنہ وہ تو جیسے ہنسنا ہی بھول گئی تھی۔

مغرب کی نماز اس نے بہت سکون کے ساتھ ادا کی۔ عصر اور مغرب کا درمیانہ وقت اسے بے پناہ پسند تھا۔ عصر کی نماز پڑھ کر وہ لان میں چلی آتی۔ شمالی دیوار کے ساتھ لگائے گئے تمام پودے اماں کے ہاتھ کے تھے' چمن کی کرسی پہ بیٹھے بیٹھے وہ بہت پیچھے پہنچ جاتی تھی۔ مغرب کی اذان کے ساتھ وہ اٹھ کر وضو کرتی۔ نماز کے بعد اگر اسکول کا کوئی کام ہوتا' جو وہ اکثر گھر لے آتی ہو تا تو کرتی۔ ورنہ چپ چاپ پڑی رہتی۔ وقاص کے بعد عدنان بھی گھر آجاتا تو رونق سی لگ جاتی۔ خاموش باورچی خانے میں تو آوازوں کا شور جمع ہو جاتا۔ بازلہ اور عادلہ دونوں اپنے اپنے شوہروں کے لیے ان کی پسند کے کھانے پکاتیں۔ وہ سب ایک ساتھ بیٹھ کر کھاتے۔ کبھی کسی نے اس کا نہیں پوچھا نہ اس کی غیر حاضری محسوس کی۔ اماں' ابا کے بعد اس نے اکیلے ہی کھانا کھایا تھا۔ کھانے کے ساتھ ساتھ اس نے بہت سے آنسو بھی کتنی بار اپنے اندر اتارے تھے۔

اپنے اندر کی خاموشی سے گھبرا کر وہ ٹی وی لاؤنج میں چلی جاتی۔ جہاں بھائی' بھابھیاں' بچے ٹی وی دیکھ رہے ہوتے' ساتھ باتوں کا دور چل رہا ہوتا۔ وہ حتی الامکان خاموشی سے آکر بیٹھا کرتی تھی کیونکہ اسے سخت شرمندگی ہوتی جب اسے دیکھتے ہی سب خاموش ہو جاتے۔ وقاص بھائی اپنے موبائل کے ساتھ لگ جاتے' عدنان بھائی تو وہاں سے چلے ہی جاتے۔ باقی بھابھیاں اور بچے بھی اسے نظر انداز کر دیتے۔ تب سناٹے بہت دور تک اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ وہ ان میں اجنبی تھی مس فٹ۔ وہ سب ایک فیملی کا حصہ تھے۔ جب کہ اماں' ابا کے بعد اس کی فیملی اس کا خاندان تو جیسے ختم ہی ہو گیا تھا۔ وہ اس فیملی میں واحد اجنبی تھی۔

پورے سال میں دو دن ایسے آتے جب وہ حقیقی معنوں میں خوش ہوتی۔ یہ دو دن عید کے تھے' عرف عام میں چھوٹی اور بڑی عید۔ تب وقاص بھائی اور عدنان بھائی کو یاد آتا کہ ان کی ایک چھوٹی بہن بھی ہے۔ دونوں اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے اور ہزار ہزار عیدی دیتے۔ اس دن دونوں بھابھیوں کے چہروں پہ بھی مسکراہٹ ہوتی۔ عید کا دن خوشی کا دن' لیکن اس دن افراح روتی' لیکن یہ خوشی کے آنسو ہوتے۔ پورے سال میں دو بار اس کے بھائی اس کی خیریت دریافت کرتے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے۔ تب دستر

خوان پہ وہ ان کے ساتھ کھانا کھاتی۔ مارے خوشی کے حلق میں نوالے ہی اٹکنے لگتے۔

وہ اکثر دعا کرتی کہ کاش پورا سال ہی عید رہے۔ پھر اپنی اس بچکانہ دعا پہ اسے خود ہی ہنسی آتی۔ ان دو دنوں کا انتظار وہ پورا سال کرتی۔ یہ دو دن اس کے لیے واقعی عید تھے۔ اس کے بعد پھر ان سب کے اور افراح کے درمیان بیگانگی اور اجنبیت کی چادر تن جاتی۔

ٹی وی لاؤنج سے آتی آوازیں بتا رہی تھیں کہ کھانا کھایا جا چکا ہے۔ اطمینان کر لینے کے بعد اس نے باورچی خانے کا رخ کیا۔ ہاٹ پاٹ میں دو روٹیاں بچی ہوئی تھیں۔ رات کی روٹی باہر سے آتی تھی۔ سالن گھر میں بنتا تھا۔ افراح نے ذرا سا سالن کٹوری میں نکال کر ایک روٹی ہاٹ پاٹ سے نکالی۔ اس کی بھوک اتنی ہی تھی۔ ایک روٹی سے اوپر کھانا اس کے لیے محال تھا۔ کھانے میں قورمہ اور چکن کڑاہی تھی۔ اس نے ذرا سا قورمے کا شوربا نکالا۔ بھوک اتنی خاص نہیں تھی۔ کھانے کے بعد عشا کی نماز پڑھ کر اس نے تسبیح لے کر چھت کا رخ کیا۔

ایک سے دوسرے کونے کے چکر اس نے تسبیح پڑھتے ہوئے طے کرنے شروع کیے۔ چلتے چلتے اسے نیند آنا شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ اس نے سیڑھیاں اتر کر کمرے کا رخ کیا۔ پنکھا فل اسپیڈ پہ چلاتے ہوئے اس نے کھڑکی کھول دی۔ آج سخت نیند آ رہی تھی اس لیے اس نے مطالعے سے احتراز برتا۔

گھٹن زدہ موسم میں وہ گہری نیند سو چکی تھی۔ جبکہ گھر کے دوسرے مکین اے سی کے فل کولنگ والے کمروں میں بھی کروٹیں بدل رہے تھے۔

افراح تو جیسے صبر و رضا کے گہرے بادلوں تلے سوتی تھی۔ پرسکون اور گہری نیند۔

☆ ☆ ☆

عاشر کو اپنی سماعتوں پہ شک ہو رہا تھا۔

"جاوید بھائی! پھر سے کہیے گا میری سمجھ میں نہیں آئی آپ کی بات۔"

"تمہارے ویزے کا بندوبست ہو گیا ہے۔ تم اب جانے کی تیاری پکڑو لیکن اس سے پہلے میرا منہ تو میٹھا کراؤ۔"

استاد جاوید نے اسے گلے لگا لیا تھا۔ وہ شروع میں جب کام سیکھنے ان کے پاس آیا تو دوسروں کی دیکھا دیکھی اس نے بھی انہیں استاد جاوید کہہ کر پکارنا چاہا' لیکن اس کم عمری میں بھی عاشر کے چہرے پہ ایسا وقار اور متانت تھی کہ استاد جاوید نے اسے خود کو استاد جاوید کہنے سے روک دیا تھا۔ دوسروں کے استاد جاوید اس کے لیے جاوید بھائی تھے۔ وہ دل سے اس کی قدر کرتے تھے۔ اس کے گھرانے کے مصائب و آلام ان سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ تب ہی تو انہوں نے مڈل ایسٹ میں اپنے ایک دوست کو بطور خاص عاشر کے لیے کوئی کام ڈھونڈنے کے لیے بولا ہوا تھا۔ یہ دوست ملٹی نیشنل کمپنی میں جاب کرتا تھا۔ یہ کمپنی گاڑیوں کی تھی۔ کمپنی میں نئی آسامیاں نکلی تھیں۔ استاد جاوید کے اس دوست نے عاشر کے لیے سروس ایڈوائزر کا ویزہ لیا تھا۔

عاشر کے ساتھ استاد جاوید کی ورکشاپ کا ہی ایک اور لڑکا بھی جا رہا تھا۔ بیٹھے بٹھائے ہی عاشر کی ایک مشکل حل ہو گئی تھی' لیکن ویزے' پاسپورٹ اور ٹکٹ کے لیے پیسے کی ضرورت تھی۔ استاد جاوید کے دوست نے ان کی زبانی عاشر کے حالات جان کر ویزے کے پیسوں کی ادائیگی کے لیے مہلت دے دی تھی۔ عاشر باہر جا کر کام کر کے ان کا ادھار چکا دیتا۔ پاسپورٹ استاد جاوید نے اسے ساتھ لے جا کر بنوا کر دیا تھا جبکہ ٹکٹ کے پیسے بھی انہوں نے اس کے نہ نہ کرنے کے باوجود خود تحفتاً دیے تھے۔ باقی چھوٹی موٹی چیزوں کی خریداری عاشر نے خود کی تھی۔

آنکھوں میں ڈھیروں خواب سجائے وہ مڈل ایسٹ آیا تھا۔ جانے سے پہلے کافی رشتہ دار ملنے آئے' لیکن رافعہ خالہ کے گھر سے کوئی بھی نہیں آیا تھا۔ انہوں نے خود ہی رشتہ توڑ کر ملنا جلنا ختم کیا تھا۔ ورنہ عالیہ اور امین نے صبر کر لیا تھا۔ انہوں نے زبان سے کسی رشتہ

دار کے سامنے ایک لفظ بھی نہ نکلا تھا۔ عاشر کے باہر جانے کی خبر کسی طرح بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی۔ تب رافعہ نے عاشر کے جانے کے بعد عالیہ کو فون کیا۔ یہ عام سی بات چیت تھی۔ رافعہ کے لہجے میں شرمندگی یا ندامت نہیں تھی۔ عالیہ کے دل میں بھی کوئی بات نہ تھی۔ بس ایک دکھ تھا جو اپنی جگہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اس ملٹی نیشنل کمپنی کے ساتھ عاشر کے بہت سے خواب جڑے تھے۔ وہ اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کا عزم لے کر یہاں آیا تھا۔ بہت جلد اپنی محنت اور ایمان داری سے اس نے کمپنی میں جگہ بنالی۔ پاکستان کے مقابلے میں یہاں جدید انداز میں کام ہو رہا تھا۔ عاشر ہوشیار تھا اس نے گریجویشن کے ساتھ لینگویج کورس بھی کیا تھا اس لیے اسے بات چیت میں مشکل نہیں ہوئی لیکن عربی سے وہ نابلد تھا۔ یہاں آکر اس نے عربی سیکھنے پہ توجہ دی۔ چھ ماہ میں ہی وہ عرب لوگوں کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی عربی بولنے لگا۔

عاشر نے ادھار چکا دیا تھا۔ وہ خرچے بھیجنا شروع کر چکا تھا۔ امین صاحب نے نوکری چھوڑ دی تھی اور ایک نسبتاً "بہتر علاقے میں تین کمروں کے ایک اور گھر میں کرائے پہ اٹھ آئے تھے۔ عالیہ نے اب عاشر کی شادی کے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ عاشر پائی پائی جوڑ رہا تھا۔ جتنے کو سب لڑکے جو کمپنی میں اس کے ساتھ کام کرتے 'رات کا کھانا ہوٹل میں کھاتے' لیکن وہ یہاں بھی کنجوسی دکھاتا' معذرت کر لیتا۔ وہ یہاں کمانے کے لیے آیا تھا اڑانے کے لیے نہیں۔ اس لیے دو گھنٹے کا اوور ٹائم بھی روز لگاتا۔ اس اوور ٹائم کے اضافی پیسے اسے ملتے تھے۔ مہینے کی تنخواہ اور اوور ٹائم کے پیسے ملا کر اس کے پاس ہینڈسم اماؤنٹ آجاتی تھی۔ امی ابو کو پاکستان بھیجنے کے بعد باقی وہ بینک میں جمع کروا دیتا۔ عالیہ کفایت شعار خاتون تھیں اس کے بھیجے گئے پیسے کو کفایت سے خرچ کرتیں۔ یوں عاشر کو اچھی خاصی بچت ہو رہی تھی۔ وہ اپنے ذاتی گھر کو حاصل کرنے کے لیے جان توڑ محنت کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

چھٹی کا دن تھا۔ افراح نے اپنے کمرے کی تفصیلی صفائی اور جھاڑ پونچھ کی تھی۔ کمرے کے بعد لان کی باری آئی۔ کام سے فارغ ہو کر وہ نہانے چلی گئی۔ نہا کر بال سلجھائے بغیر لیٹ گئی تھی۔ ابھی شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر بالوں میں برش کر رہی تھی۔

کتنے ماہ بعد اس نے خود کو غور سے آئینے میں دیکھا تھا۔ آنکھیں کاجل سے خالی' کان بالیوں سے محروم تو لب سرخی سے دور۔

کیسا سادہ اور خالی سا چہرا تھا بغیر کسی آرائش کے۔ وہ بالوں میں برش پھیر کر ان کی لمبائی چیک کر رہی تھی۔ اس کی ساتھی ٹیچرز نت نئے فیشن کے کپڑوں میں ملبوس تیار ہو کر اسکول آتیں جبکہ افراح کی سادگی پورے اسکول میں ضرب المثل تھی۔ اس کی کلائی میں کسی نے کانچ کی چوڑی تک نہ دیکھی تھی۔ وہی افراح اپنے بال دیکھ رہی تھی۔ کمر سے نیچے جاتے گھنے براؤن بال سیدھی مانگ بانکل کسی سیدھی سپاٹ رہ گزر کی مانند۔

صاف ستھری جلد' ترشے ہوئے چھوٹے چھوٹے ناخن' سانچے میں ڈھلا سراپا۔ اسے اپنا آپ کبھی اتنا خاص اور اہم نہیں لگا تھا۔ بس ابا اسے میری پیاری بیٹی کہتے تھکتے نہ تھے۔

ابا کی یاد آتے ہی اس کے لبوں پہ مسکراہٹ آگئی۔ بال سمیٹ کر اس نے چٹیا بنائی اور سرے پہ ربربینڈ لگا دیا۔ اس کی یونیورسٹی فیلوز اکثر اس کے لمبے بالوں کی تعریف کرتی تھیں اب اس نے ان کا بھی خیال رکھنا چھوڑ دیا تھا۔

عادلہ بھابھی نئے سرے سے اس کے لیے رشتہ ڈھونڈنے کی تگ و دو کر رہی تھیں۔ اب جو بھی اس کا امیدوار بن کر آتا' عمر رسیدہ ہونے کے ساتھ ساتھ طلاق یافتہ' رنڈوا یا ایک دو بچوں کا باپ لازمی ہوتا۔ رشتے والی ماسی منہ در منہ یہ سنا کے جاتی۔

"اپنی نند کو بھی تو دیکھو اس میں آج کل والی لڑکیوں جیسی کوئی بات ہی نہیں ہے۔ اتنی سی عمر میں خود پہ صدیوں کا بڑھاپا طاری کر کے بیٹھی ہے۔ نہ کوئی فیشن نہ ٹیک نہ مسکنہ ادا نہ نخرا۔"

اب ان دونوں کو اس سے کوئی دلچسپی نہ تھی کہ افراح ایسی کیوں ہے۔ انہیں لگتا جیسے افراح کا کوئی جوڑ بنا ہی نہیں ہے، وہ اکیلی آئی ہے اور اکیلی ہی جائے گی۔

❋ ❋ ❋

ماہ نور کی یونیورسٹی فیلو ثمامہ جو ماسٹرز کرنے کے بعد اپنے سسرال کو پیاری ہو گئی تھی وہ اس کے لیے اپنے بھائی کا رشتہ لائی تھی۔ ثمامہ اس وقت سے ماہ نور میں دلچسپی لے رہی تھی جب وہ نئی نئی یونیورسٹی میں آئی تھی۔ اس کے کچھ اپنے گھریلو مسائل تھے۔ پھر اس کی شادی ہو گئی۔ اب جبکہ ماہ نور تعلیم سے فارغ ہو کر اپنے نت نئے شوق پورے کر رہی تھی۔ ثمامہ اپنے بھائی کا رشتہ لے کر آدھمکی۔ ماہ نور کے اس وقت سے اچھے اچھے رشتے آ رہے تھے جب وہ نئے نئے اس علاقے میں شفٹ ہوئے تھے، لیکن تب وہ عاشر سے منسوب تھی۔ کئی ایک رشتے تو اتنے اچھے تھے کہ طارق اور رافعہ کو بے انتہا دکھ ہوا تھا کہ کاش اس کا رشتہ شروع سے ہی عاشر سے طے نہ ہو چکا ہوتا تو وہ ان میں سے کسی ایک کو آنکھ بند کر کے ہاں کر دیتے۔

بعد میں خود ہی ماہ نور کی سوچ بدلی اور اب تو عاشر والا باب بند ہو چکا تھا۔ اس لیے ثمامہ جب اپنے بھائی عمر کا رشتہ لائی تو اسے خوشی سے ویلکم کہا گیا۔

ماہ نور ایک بار ثمامہ کے گھر اس کی سالگرہ کی تقریب میں گئی تھی۔ سالگرہ کی تقریب کسی چھوٹی موٹی شادی کی تقریب سے کم نہیں تھی۔ ماہ نور متاثر ہو گئی تھی۔ ثمامہ ایک سے ایک مہنگا سوٹ پہن کر یونیورسٹی آتی تھی۔ وہ ڈرائیور کے ساتھ آتی تھی۔ ڈرائیور کو آنے میں ذرا سی بھی دیر ہوتی تو وہ اس پہ برستی۔ وہ لوئر مڈل کلاس کی بچی تھی پر ماہ نور کو اچھی لگتی کیوں کہ اس میں اسٹائل تھا۔ اس کے پاس پیسہ تھا، غرور تھا جو اکثر پیسے والوں کی پہچان تھا۔ وہی ثمامہ اس کے گھر آئی تھی۔

ثمامہ نے اپنی شادی میں اسے بھی انوائٹ کیا تھا طبیعت کی خرابی کی وجہ سے ماہ نور شرکت نہ کر سکی تھی، لیکن باقی کلاس فیلوز نے اس کے شوہر اور شادی کا آنکھوں دیکھا جو حال بیان کیا تھا اس نے ماہ نور کو متاثر کر دیا تھا۔ وہ ایک کاروباری خاندان میں بیاہ کر گئی تھی۔ شادی کے بعد ثمامہ میں اور بھی نخرہ اور نزاکت آ گئی تھی۔ وہ سراونچا کیے بیٹھی تھی۔ ماہ نور اور رافعہ دل میں اس سے مرعوب ہو رہی تھیں۔ ثمامہ اپنے خاندان اور بھائی کے بارے میں بتا رہی تھی۔

"عمر بھائی کا اسلام آباد میں اپنا بزنس ہے۔ میں اور مما کب سے بھائی کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے تھے لیکن بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔ ماہ نور تجھے بھول ہی گئی تھی۔ میں میکے آئی تو یاد آیا کہ گوہر مقصود ہم سے دور نہیں۔ ماہ نور شروع سے ہی مجھے پسند ہے۔ اب اگلی بار پوری فیملی کے ساتھ آؤں گی۔" ثمامہ بڑے آرام سے آئندہ کے عزائم بتا رہی تھی۔ ماہ نور کو وہاں مزید بیٹھنا مناسب نہیں لگا۔ رافعہ نے طارق صاحب اور دونوں بیٹوں کو فون کر دیا تھا۔ وہ تھوڑی دیر میں گھر پہنچ رہے تھے۔ ثمامہ کی آمد نے گھر بھر میں ہلچل دوڑا دی تھی۔

❋ ❋ ❋

عاشر کو مڈل ایسٹ گئے ڈیڑھ سال ہو چکا تھا۔ عالیہ کو اس کی شادی کی فکر ستانے لگی۔ ان کی عاشر سے فون پہ بات ہوئی تو انہوں نے دلی خواہش بتادی۔ وہ اس کے لیے لڑکی دیکھنا چاہ رہی تھیں۔ وہ ہنس دیا تھا، یہ ہنسی کسی خوشی اور جذبے سے خالی تھی، مردہ خالی ہنسی۔

"مجھے تمہاری شادی کرنی ہے کاکا۔" عالیہ لاڈ میں اسے کاکا پکارتی تھیں۔

"شادی۔" وہ خالی خالی لہجے میں بولا۔ شادی کے لفظ پہ اس کے اندر جیسے اندھیرے اتر آئے تھے۔ مہیب خلا اور تاریکی۔ روشنی کا نام و نشان تک نہیں۔

"ہاں شادی۔ مجھے اپنے لیے بہو اور تمہارے لیے

دولہن چاہیے۔ میرا گھر تمہارے جانے کے بعد خالی خالی سا ہے۔ اب تمہاری شادی ہو جانی چاہیے کیونکہ ماہ نور کی بھی منگنی ہو چکی ہے۔ سنا ہے رافعہ اور طارق بھائی بہت جلد اس کی شادی کرنے والے ہیں۔" عالیہ بہت محتاط لہجے میں بتا رہی تھیں۔ عاشر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ماہ نور کی منگنی ہو چکی تھی وہ عاشر کی کبھی منگیتر رہ چکی تھی۔ عالیہ دل گرفتہ تھیں انہیں دکھ بھی ہوا تھا سو رافعہ کے بلاوے پہ نہ چاہتے ہوئے بھی منگنی میں شرکت کے لیے گئی تھیں اور تحفے میں ماہ نور کو پیسے اور قیمتی جوڑا بھی دیا تھا' لیکن خوشی کی اس محفل میں وہ بجھی بجھی ہی رہیں۔ دولہن بنی ماہ نور بہت خوش نظر آرہی تھی۔ ایسی خوشی تو عاشر سے منسوب ہونے کے بعد بھی عالیہ نے اس کے چہرے پہ نہیں دیکھی تھی۔

عالیہ تو بجھے دل سے اس میں گئی تھیں۔ دولہن بنی ماہ نور نے سب گجروں کے پیسے اور آتش کے جگنو ایک ایک کر کے جمع کر دیے تھے۔ عاشر نے ان سے کبھی بھی خالہ' ماہ نور یا ان کے گھر والوں کے بارے میں خود سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔ ابھی بھی وہ خود ہی بتا رہی تھیں۔

"میں نے سلامی میں پانچ ہزار کا لفافہ اور ایک قیمتی سوٹ دیا۔ یقین مانو رافعہ حیران ہو گئی تھی کہ میں بھی اتنے پیسے اور ایسا سوٹ دے سکتی ہوں۔" اس بار عالیہ کے انداز میں خوشی تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی عاشر مسکرا دیا۔

"امی! آپ بس دعا کیا کریں میرے لیے۔"

"اللہ تیری ہر مراد پوری کرے عاشر۔" عالیہ نے پورے خلوص سے دعا دی۔

⁂ ⁂ ⁂

عمر کے ساتھ ماہ نور کی منگنی دھوم دھام سے ہو چکی تھی۔ شمیم عمر اور ان کی فیملی شادی کے لیے بار بار زور ڈال رہی تھی۔ اس سے پہلے انہوں نے منگنی کے لیے بھی ایسا ہی شور مچایا تھا۔ مشکل سے وہ لوگ تین بار ان کے گھر آئے تھے اور رشتہ پکا کرنے کی رٹ لگا دی تھی۔ بظاہر عمر یا اس کے خاندان میں کوئی خرابی نہ تھی۔ اچھے کھاتے پیتے خوش حال لوگ تھے۔ عمر کا اسلام آباد میں اپنا بزنس تھا۔ وہ پڑھا لکھا اور دیکھنے میں مہذب تھا۔ پھر وہ پیسے میں بھی طارق صاحب کے ہم پلہ تھے۔ ماہ نور نہیں چاہتی تھی کہ ابو اور بھائی عمر کے رشتے سے انکار کریں کیوں کہ عمر کے ساتھ شادی کی صورت میں اس کا مستقبل محفوظ اور شاندار تھا۔ عمر اسلام آباد میں ہی مقیم تھا کیوں کہ اس نے اپنا کاروبار وہیں سیٹ کر رکھا تھا جبکہ اس کے ماں باپ اور دیگر گھر والے لاہور میں مقیم تھے۔

ماہ نور اکلوتی اور لاڈلی بیٹی تھی۔ رافعہ اور طارق کی بھی یہی مرضی تھی کہ ماہ نور شادی کے بعد ساس سسر سے دور الگ گھر میں رہے۔ عمر کے ساتھ شادی کی صورت میں ان کی دیرینہ خواہش باآسانی پوری ہو سکتی تھی۔ اس لیے عمر کے گھر والوں کو اثبات میں جواب دیتے ہوئے انہیں مشکل پیش نہیں آئی تھی۔

عالیہ نے خلوص سے ماہ نور کو سکھی رہنے کی دعا دی تھی۔ کیا ہوا جو وہ ان کے عاشر کے نصیب میں نہ تھی۔

⁂ ⁂ ⁂

"کیا بتاؤں عالیہ بہن! ایسی ہیرا صفت لڑکی ہے۔ بہت اچھے خاندان سے ہے۔ باپ کسی کالج میں پروفیسر تھا بہت پہلے مر گیا ہے۔ دو بھائی ہیں شادی شدہ ہیں اور اپنا اپنا کاروبار کر رہے ہیں۔ ماں کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ لڑکی خود اسکول میں وقت گزاری کے لیے پڑھاتی ہے۔" بوا رحمت لڑکی کی خوبیاں گنوا رہی تھیں۔ عالیہ نے ہی بوا رحمت سے عاشر کے لیے رشتہ تلاش کرنے کے لیے کہا تھا۔ بوا رحمت ان کے پرانے محلے میں ان کی پڑوسی تھیں۔ وہ تا حال وہیں مقیم تھیں۔ وہ ان کے حالات سے بخوبی واقف تھیں۔ اس لیے انہوں نے خوب چھان بین کر کے عالیہ کے بیٹے کے لیے لڑکی کا انتخاب کیا تھا۔

"بوا! کیا لڑکی دونوں بھائیوں سے چھوٹی ہے؟" عالیہ نے سوال کیا۔

"ہاں چھوٹی ہے۔" بوا نے اثبات میں جواب دیا۔

"پھر ابھی تک اس کی شادی کیوں نہیں ہوئی ہے؟" عالیہ نے عام سے لہجہ میں استفسار کیا۔

"ماں باپ مرچکے ہیں۔ دو بھائی ہیں لڑکی کے رشتے تو بہت آئے ہیں، مگر کوئی ان کے معیار کا نہیں ہے۔" بوا رحمت نے عادلہ اور باذلہ سے حاصل ہونے والی معلومات کی روشنی میں جواب دیا۔

"تو کیا عاشر انہیں پسند آجائے گا؟" عالیہ کے لہجے میں دھڑکا تھا۔

"کیوں نہیں پسند آئے گا۔" بوا کو عالیہ کا سوال اچھا نہیں لگا تھا۔

"بس ذرا تو مجھ بھی پتا کرانے کا ہے۔ عاشر اپنے گھر کے لیے پیسے جمع کر رہا ہے۔ ہزار اور بہت جلدی اپنا گھر لینے کا ہے۔ آپ لڑکی کے بھائیوں کو ہمارے بارے میں سب کچھ بتا دیجیے گا۔ ایسا نہ ہو ہم کوئی بات چھپائیں اور کل کو انہیں ناگوار ہو۔"

"بیٹا! بہن آپ بے فکر رہو۔ میں نے آج تک جتنے بھی رشتے کروائے ہیں کسی بھی پارٹی کے ساتھ بے ایمانی نہیں کی ہے۔ میرے طے کروائے ہوئے سب رشتے اپنے اپنے گھروں میں خوش و خرم آباد ہیں۔ جو بھی سچ ہوتا ہے میں جوں کا توں بتا دیتی ہوں، آگے دونوں پارٹیوں کی مرضی ہاں کریں یا ناں، اس میں میری کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔" واقعی وہ سچ کہہ رہی تھیں۔ شوہر کے مرنے کے بعد انہوں نے فی سبیل اللہ لڑکے لڑکیوں کے رشتے طے کروانے کا کام شروع کیا تھا۔ کام میں خلوص اور ایمان داری تھی۔ اس لیے آج تک کسی کو بھی ان سے شکایت نہیں ہوئی تھی۔ عالیہ انہیں اس وقت سے جانتی تھیں جب وہ بیوہ نہیں ہوئی تھیں۔ فطرتاً" بااخلاق اور ہمدرد تھیں۔ بس اپنے عاشر کے لیے لڑکی ڈھونڈنے کا کام انہوں نے بوا رحمت کے سپرد کیا تھا۔ انہیں پوری امید تھی کہ بوا انہیں مایوس نہیں کریں گی۔

"ویسے عاشر کب تک آئے گا؟"

"کہتا ہے گھر خریدنے کا انتظام کرلوں پھر آؤں گا۔"

اس میں اندازاً "کتنا ٹائم لگ جائے گا؟" بوا نے سوال کیا۔

"عاشر سے میری بات ہوگی تو پوچھوں گی۔" عالیہ نے صاف گوئی سے جواب دیا۔ بوا سر ہلا کر رہ گئیں۔ انہیں اب لڑکی کے گھر جانا تھا۔ یہاں سے لڑکی کا گھر بہت دور تھا۔

☆ ☆ ☆

اوورسیز پاکستانیوں کے لیے ایک رہائشی اسکیم میں عاشر نے قسطوں پہ گھر بک کروایا تھا۔ یہ کام اس نے یہاں آنے کے کچھ عرصے بعد ہی شروع کیا تھا۔ اسی فیصد ادائیگی کے بعد اسے گھر کا قبضہ مل جانا تھا۔ جبکہ ساٹھ فیصد ادائیگی اس نے کردی تھی۔ بقایا چالیس فیصد ادائیگی اس نے یکمشت کرنے کے بعد گھر کا مالک بن جانا تھا۔ یہ کام اس نے عالیہ اور امین کے علم میں لائے بغیر کیا تھا۔

چالیس فیصد ادائیگی کے بعد اس نے امی ابو کو بتانا تھا۔ تب وہ کتنا خوش ہوتے۔ اس کا مڈل ایسٹ میں آنا پردیس کاٹنا رائیگاں نہیں گیا تھا۔ اس کے ایک دیرینہ خواب کی تکمیل ممکن ہو رہی تھی۔ بہت سال پہلے قرض اتارنے کے لیے امین صاحب نے اپنے رہنے کا ٹھکانہ اونے پونے داموں فروخت کردیا تھا۔ تب سے ہی عاشر نے دل میں عہد کیا تھا کہ زندگی میں اپنے پاؤں پہ کھڑا ہونے کے بعد سب سے پہلے امی ابو کے لیے گھر بنائے گا۔ اپنے ذاتی گھر کی ملکیت سے وہ صرف چالیس فیصد ادائیگی کے فاصلے پہ تھا۔

☆ ☆ ☆

بوا رحمت عادلہ اور باذلہ کے پاس بیٹھی تھیں۔ وہ اپنے ساتھ عاشر کی فوٹو بھی لائی تھیں۔ دونوں اس وقت وہی دیکھ رہی تھیں۔ بوا نے عاشر کی شان میں زمین آسمان کے قلابے ملائے تھے۔ تصویر دیکھ کر دونوں مطمئن تھیں۔

وہ دونوں بوا سے عاشر کے بارے میں سوال جواب کر رہی تھیں۔ وہ فی الحال نارمل تھیں۔ بوا کے جانے

کے بعد عادلہ نے ایک بار پھر عاشر کی فوٹو غور سے دیکھی۔

"لڑکا دیکھنے میں شریف اور مہذب لگ رہا ہے۔" بازلہ نے اس کے ہاتھ میں تھامی گئی فوٹو پہ تبصرہ کیا۔

"دعا کرو یہ لوگ اچھے ہوں۔ افراح کا گھر بس جائے تو ہمیں بھی سکون ہو گا۔" بازلہ نے دعائیہ انداز میں کہا۔

"ہاں یار! مجھے بھی افراح کی شادی کی بہت فکر ہے۔ افراح کی شادی ہو جائے تو اسٹور روم اور افراح کا کمرا تڑوا کر میں وہاں گیسٹ روم بنواؤں گی۔" عادلہ نے ارادہ ظاہر کیا۔

"ہاں افراح کے ہوتے ہوئے تو جیسے کوئی پرائیویسی ہی نہیں ہے۔" بازلہ نے ناک بھوں چڑھائی۔

٭ ٭ ٭

سر پر دوپٹہ اوڑھے ہلکے رنگ کے کپڑوں میں ملبوس لڑکی کی آنکھیں گہری اداسی کی دھند میں لپٹی ہوئی تھیں۔ عالیہ اور طارق صاحب پہلی بار افراح کے گھر اسے دیکھنے آئے تھے۔ اور واقعی چائے کی ٹرالی لاتی افراح کو عالیہ دیکھتی رہ گئی تھیں۔ اداسی اس کے پورے وجود سے جھانک رہی تھی۔ اس نے آہستہ آواز میں انہیں سلام کیا تھا۔ عالیہ نے اسے اپنے پاس ہی بٹھا لیا تھا۔ اس کے ایک طرف عالیہ اور دوسری طرف امین صاحب بیٹھے تھے۔ ان کے تاثرات بتا رہے تھے کہ انہیں افراح اور اس کے گھر والے بہت پسند آئے ہیں۔

"مجھے تو لڑکے کے ماں باپ بہت پسند آئے ہیں۔" عادلہ اپنے کسی بھی جذبے کا اظہار کرنے میں بخل سے کام نہیں لیتی تھی۔

"لڑکے کی ماں بہت باوقار اور کم گو ہے۔" یہ تبصرہ بازلہ کا تھا۔

"ہاں اچھے اور شریف لوگ ہیں" عدنان نے بھی بولنے کی ابتدا کر کے خاموشی توڑنے میں پہل کی۔

"میں چھان بین کرواتا ہوں۔" وقاص متانت سے گویا ہوا۔

"پہلی بار افراح کے لیے کوئی ڈھنگ کا رشتہ آیا ہے۔ لڑکا بالکل مناسب عمر کا اور افراح کے جوڑ کا ہے۔" عادلہ کی بات پہ بازلہ نے اس کی طرف دیکھا جیسے خاموش تائید کر رہی ہو۔

٭ ٭ ٭

عالیہ نے لرزتے کانپتے ہاتھوں سے دروازے کو اندر کی طرف دھکیلا تھا۔ ان کے ساتھ امین صاحب بھی تھے۔ ان کے ہاتھ میں بے یقین انداز میں گھر کے دروازوں کی چابی دبی ہوئی تھی۔ کھلے گیٹ سے دونوں اندر داخل ہوئے۔ انٹرنس بہت خوب صورت تھی۔ اندر قدم رکھتے ساتھ ہی جابجا کھلے پھول نظروں کو تراوٹ بخش رہے تھے۔ پھولوں کے گملے بڑی خوب صورتی سے پینٹ کیے گئے تھے۔ کار پورچ کے ساتھ گھر کا باقی دروازہ تھا۔

عالیہ نے گھر کا چپہ چپہ شوق و بے یقینی کی ملی جلی کیفیت سمیت دیکھا۔ انہیں یقین کرنا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ گھر اب ان کا ہے۔ اتنا اچھا اور خوب صورت علاقہ تھا۔ صاف ستھری کشادہ گلیاں چوڑی سڑکیں اور درمیان میں گرین بیلٹ۔ ایسے علاقے اور گھر کا تصور تو انہوں نے صرف خواب میں ہی کیا تھا۔

عاشر نے بقایا ادائیگی کر دی تھی اب وہ اس گھر کا قانونی مالک تھا۔ کمپنی میں اس کے ساتھ کام کرنے والے جس کولیگ نے اس کے ساتھ شریک کروایا تھا وہ پاکستان آیا ہوا تھا۔ وہی اپنی گاڑی میں عالیہ اور امین صاحب کو ان کا گھر دکھانے لایا تھا۔ بہت خوب صورت اور کشادہ گھر تھا۔ حماد ان دونوں کے ساتھ ساتھ تھا۔ وہ بھی کچھ ہی دن میں اس علاقے میں اپنے بیوی بچوں کے ساتھ شفٹ ہو رہا تھا۔ عاشر نے اس کے ذمہ کچھ کام لگائے تھے۔ حماد اس کا اچھا دوست بن گیا تھا۔ عاشر اس پہ اعتبار کر سکتا تھا۔ اس نے فرنیچر کی خریداری کا کام اس کے سپرد کیا تھا۔

عالیہ نے افراح کے دونوں بھائیوں اور بھابھیوں

کو اس گھر میں چائے پہ بلایا تھا۔

امین نے اپنے بارے میں ہر ایک بات بتائی۔ وہ گردش دوراں کی منہ بولتی تصویر تھے۔ عاشر نے یہ گھر جس محنت اور مشکل سے خریدا تھا انہوں نے وہ جدوجہد بھی عدنان اور وقاص کو بتائی۔ وہ متاثر نظر آرہے تھے۔

افراح کے بھائیوں نے مشورہ کرنے کے بعد امین صاحب کو عاشر کے رشتے کے لیے ہاں کردی تھی۔ بہت سادگی سے بات پکی کرنے کی رسم ہوئی۔ عالیہ نے افراح کے لیے ایک سوٹ اور انگوٹھی لی اور مٹھائی کے ہمراہ ان کے گھر لے گئیں۔ ان کے سامنے افراح وہ سوٹ پہن کر آئی تو انہوں نے انگوٹھی اس کی مخروطی انگلی میں ڈالی۔ عاولہ اور بتولہ نے انہیں مبارک باد دی تو وہ بہت خوش ہوئیں۔ افراح اب ان کے عاشر کی امانت تھی۔ انہوں نے بات پکی کرنے کے بعد سب رشتہ داروں کے گھر مٹھائی بھجوائی۔ اکثر ناراض تھے کہ ہمیں کیوں نہیں بلایا۔ امین صاحب نے مشورہ دیا کہ گھر پہ ہی ایک سادہ سی تقریب کا اہتمام کرکے سب خاندان والوں کو مدعو کرلیتے ہیں اس بہانے سب ہمارا نیا گھر بھی دیکھ لیں گے۔ عالیہ نے نیم رضامندی دے دی۔

☼ ☼ ☼

وہ کسی خواب کی صورت اپنا سوٹ اور انگلی میں سجی انگوٹھی دیکھ رہی تھی۔ عاولہ اور بتولہ بھابھی اس کے دائیں بائیں بیٹھی تھیں۔ وہ افراح سے ہنس ہنس کر باتیں کررہی تھیں۔

بہت دیر بعد اس نے کمرے کا رخ کیا۔ وہ آئینے کے سامنے کھڑی خود کو غور سے دیکھ رہی تھی۔ وہ سادہ سے نقوش اور عام سے حلیے والی۔ کیا اسے بھی کوئی پسند کرسکتا ہے۔ پہلے وہ خود سے سوال کیا کرتی تھی، آج اسے خود کو جواب دینے کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ اس کی انگلی میں سجی انگوٹھی گواہی کے لیے کافی تھی۔

وہ خوش گوار حیرانی میں کھڑی تھی۔ اس کا پورا چہرہ خوشی سے منور تھا اور لمبی گھنیری پلکوں والی آنکھیں بھی تو مسرور تھیں۔ اس نے کبھی خود پہ توجہ نہیں دی تھی نہ اپنے نقوش پر غور کیا تھا۔ آج آئینے میں اپنا سراپا اسے قابل توجہ لگ رہا تھا۔ ذرا سی خوشی نے اس کے اندر انقلاب برپا کردیا تھا۔

رات کے آخری پہر وہ کھلے آسمان تلے مصلیٰ بچھائے سجدہ شکر ادا کررہی تھی۔ وہ سادہ اور عام سی لڑکی شکر گزاری کے جذبات سے لبریز تھی۔ خدا کی رحمت اس پہ امنڈ کر رہی تھی۔ عالیہ آنٹی اور امین انکل جب پہلی بار اسے دیکھنے کے لیے آئے تھے تو اسے بہت اچھے لگے تھے۔ سادہ اور بے ضرر سے بالکل اپنی طرح۔ عاولہ بھابھی نے اسے عاشر کی تصویر دی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے رات کی تنہائی میں دروازہ لاک کرکے دیکھی تھی۔

جاذب نظر نقوش اور ذہانت سے چمکتی آنکھیں اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر تصویر ڈریسنگ ٹیبل کی دراز میں ڈال دی تھی۔

☼ ☼ ☼

عالیہ خود اپنی بہن رافعہ کے گھر مٹھائی لے کر آئی تھیں۔ اپنے ہاتھوں سے انہوں نے رافعہ کا منہ میٹھا کروایا۔ "اس اتوار کو تم سب میرے گھر آنا" انہوں نے خلوص سے پورے گھر والوں کو دعوت دی۔ "اتوار کو تو ہم سب نے ماہ نور کی ہونے والی سسرال کی طرف جانا ہے۔" رافعہ نے فوراً عذر پیش کیا تو عالیہ کا چمکتا چہرہ بجھ سا گیا۔ پر اگلے ہی لمحے انہوں نے خود کو سنبھال لیا۔

"چلو پھر کسی دن آجانا تم سب۔" وہ مسکرا کر گویا ہوئیں۔

"ہاں ماہ نور کی شادی سے فارغ ہوجاؤں تو ضرور چکر لگاؤں گی۔" رافعہ نے جیسے انہیں سنایا۔

"کب ہے ماہ نور کی شادی؟"

"اس مہینے کے آخر میں ہے۔ عمر کے گھر والے پیچھا پکڑ کر بیٹھے ہوئے تھے سو ہم نے تاریخ دے دی

ہے۔" رافعہ نے بتایا۔

"لیکن مجھے تو نہیں پتا نہ کسی نے بتایا" عالیہ کو دکھ ہوا۔

"ابھی کارڈ چھپنے کے لیے دیے ہوئے ہیں سب کو خبر ہو جائے گی ہے۔" رافعہ نے جیسے ناک پر سے مکھی اڑائی تھی۔ عالیہ اس وار کو بھی حوصلے سے سہہ گئیں۔ رافعہ یا ان کے گھر میں سے کسی نے بھی ان سے عاشر یا اس کے طے ہو جانے والے رشتے کے بارے میں نہیں پوچھا تھا نہ مکان کی مبارکباد دی تھی۔ حالانکہ عالیہ نے خوش خوش سب کچھ بتایا تھا۔ رافعہ اور سب کا رویہ عام سا تھا۔ ماہ نور اس پوری گفتگو کے دوران صوفے پر بیٹھی اپنے ناخن فائل کرتی رہی۔ اس نے بس اجنبی سے انداز میں خالہ کو سلام کیا تھا۔

"اچھا میں چلتی ہوں۔" عالیہ شانوں پہ چادر برابر کرتی اٹھیں تو تب رافعہ کو جیسے خیال آیا۔ "میں ماہ نور کے فرض سے فارغ ہو کر تمہاری طرف چکر لگاؤں گی" انہوں نے عالیہ پہ احسان کرنے والے انداز میں کہا۔ وہ بے دلی سے سر ہلا کر رہ گئیں۔ ماہ نور آج خدا حافظ کہنے پہلے کی طرح اٹھ کر گیٹ تک نہ آئی۔ وہیں سے دھیمی آواز میں انہیں الوداع کہا۔

☆ ☆ ☆

ماہ نور کی شادی دھوم دھام سے عمر کے ساتھ ہوئی تھی۔ طارق صاحب نے دل کھول کر بیٹی کی شادی پہ پیسہ لٹایا تھا۔ نمود و نمائش کا ایسا مظاہرہ ہوا تھا کہ کم حیثیت والوں نے اپنی انگلیاں دانتوں تلے داب لی تھیں۔ انہوں نے ماہ نور کو جہیز میں ایک سے ایک اعلا چیز دی تھی۔ اس کی ساس اور نند کو سونے کے کنگن چڑھائے گئے تھے۔ شہر کے مہنگے علاقے میں طارق صاحب نے ماہ نور کو فلیٹ جہیز میں دیا تھا۔ گاڑی اس کے علاوہ تھی۔ حقیقی معنوں میں انہوں نے بیٹی کے گھر کو بھر دیا تھا۔

عام سی شکل و صورت والی ماہ نور کو بیوٹیشن کے جادوئی ہاتھوں نے آسمان سے اتری کوئی حور بنا دیا تھا۔

اب تو اس کا ایک پاؤں آسمان اور دوسرا آسمان سے بھی آگے جانے کی کوشش میں تھا۔

عاشر کے ساتھ شادی میں بھلا اسے کیا ملنا تھا۔ ایک عام سا گھر اور مسائل سے بھری زندگی۔ اس عام زندگی سے اس نے خود کو بروقت عقل مندی کا فیصلہ کر کے چھٹکارا دلا دیا تھا۔ عمر کے ساتھ خواب جیسی ہر آسائش زندگی اس کا انتظار کر رہی تھی۔

ولیمہ کے بعد کا پورا ہفتہ دعوتیں نمٹاتے گزرا۔ اب عمر کو واپس اسلام آباد جانا تھا۔ ماہ نور بھی اس کے ساتھ تھی۔ گھر والوں سے وہ پہلی بار دور جا رہی تھی، اس لیے قدرے اداس اور پریشان تھی ایسے میں عمر کی بے پناہ محبت اور تسلی نے اس کے لیے جادو اثر دوا کا کام کیا تھا۔ وہ اس کے ساتھ اسلام آباد آگئی۔

عمر کا گھر لاہور والے گھر کے مقابلے میں کچھ خاص نہ تھا۔ شادی کے شروع شروع کے دن تھے۔ اس نے خاص غور نہیں کیا۔ وہ اسے آتے ساتھ ہی گھر میں چھوڑ کر نکل گیا تھا۔ اس کی واپسی رات گئے ہوئی۔ ماہ نور کو اچھی خاصی بھوک ستا رہی تھی۔ عمر اپنے ساتھ پزا، برگر اور کولڈ ڈرنک لایا تھا۔ وہ سخت غصے میں تھی۔ وہ اسے یہاں لاتے ہی گھر میں اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ عمر نے اس کی منتیں کر کے اسے منایا۔ تب جا کر اس کے منہ کے زاویے ٹھیک ہوئے۔

وہ صبح دس بجے اٹھتا اور ناشتا کر کے آفس کے لیے روانہ ہوتا۔ صفائی کے لیے گیارہ بجے ماسی آتی، وہ ان دونوں کے لیے کھانا بناتی اور برتن بھی دھوتی۔ رات کے لیے عمر آتے ہوئے کھانا پیک کروا کے لے آتا۔

درمیان میں دس دن کے لیے وہ اسے گھمانے پھرانے کے لیے مری، ایبٹ آباد، سوات کالام اور مالم جبہ بھی لے گیا۔ اس نے ماہ نور سے اسے ہنی مون منانے کے لیے موریشس لے جانے کا وعدہ کیا تھا۔ اس کا رویہ ماہ نور کے ساتھ بہت محبت آمیز تھا۔ وہ بے دریغ اس پہ اپنی چاہتیں لٹا رہا تھا۔ اور وہ آسمانوں میں اڑ رہی تھی۔ پورے ایک ماہ بعد وہ اسے امی ابو سے ملوانے میکے لایا تو اس کی آنکھوں میں چمک اور گالوں پہ

گلاب کھلے ہوئے تھے۔ رافعہ اور طارق اسے خوش دیکھ کر خود بھی خوش تھے۔ قدرت نے کیسا اچھا دلا دیا تھا انہیں۔

وہ ایک ہفتہ امی ابو کے پاس میکے میں رہی پھر عمر کے ساتھ سسرال آگئی۔ یہاں گھر میں صرف اس کی ساس اور چھوٹا دیور تھا۔ باقی سب الگ الگ اپنے گھروں میں تھے۔ شادی کے موقعے پہ طارق صاحب نے ماہ نور کو جو کار دی تھی وہ اس کی سسرال کے گیراج میں کھڑی تھی۔ ماہ نور وہ گاڑی اپنے ساتھ اسلام آباد لے جانا چاہ رہی تھی۔ لیکن پہلی بار عمر نے اس کی مخالفت کی۔

"وہاں میرے پاس اپنی گاڑی جو ہے۔ میری مانو تو یہ گاڑی فروخت کر کے پیسے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروا دو۔ اتنی اچھی گاڑی ہے تمہاری، ہر وقت چوری کا ڈر رہے گا۔ اسلام آباد میں کار چوری کی بہت وارداتیں ہوتی ہیں۔" عمر نے اسے ڈرایا تو وہ فوراً اپنے ارادے سے باز آگئی۔ لیکن گاڑی فروخت کرنے پہ اس کا دل راضی نہیں تھا۔ عمر نے دلائل سے اسے رام کر لیا۔ یوں وہ گاڑی فروخت ہو گئی۔ رقم عمر نے اس کے ہاتھ پہ رکھی۔

"میں کہاں سنبھالوں گی اسے۔ اپنے پاس ہی رکھیں۔"

"چلو ٹھیک ہے اسلام آباد جا کر تم اسے اپنے بینک اکاؤنٹ میں جمع کروا دینا۔ تمہاری رقم ہے جس طرح مرضی چاہے رکھو۔" عمر نے لاپروائی سے کہا۔ شادی کے شروع کے دنوں میں فلیٹ کی ملکیت کے کاغذات بھی ماہ نور نے اسے دے دیے تھے۔ عمر نے انہیں بینک لاکر میں رکھوا دیا تھا۔ وہ جب چاہتی لے سکتی تھی۔ سلامی میں اس کے پاس لاکھوں روپے جمع ہوئے تھے ماہ نور نے وہ بھی عمر کو دے دیے تھے۔

"یہ سب کچھ تمہاری امانت ہے اسلام آباد جا کر خود سنبھالتی رہنا۔" شادی کے بعد اسلام آباد آنے سے پہلے عمر نے اسے کہا تھا۔ وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ اس کا ہم سفر کتنا ایمان دار اور خود دار تھا۔

"یہ الگ بات کہ اسلام آباد آنے کے بعد عمر نے پیسے اسے نہیں دیے تھے۔ نہ ماہ نور کو مانگنے یاد تھے۔ اسلام آباد شفٹ ہونے کے بعد عمر نے ماہ نور سے اس کے سب زیورات بھی لاکر میں رکھوا دیے تھے۔

☼ ☼ ☼

رافعہ اور طارق پہلی بار ان کے گھر آئے تھے۔ عالیہ کی خوشی دیدنی تھی جبکہ امین بالکل نارمل تھے۔ وقت اور حالات نے ان کے اندر بے پناہ قوت برداشت اور صبر پیدا کر دیا تھا۔ رافعہ کی نگاہوں میں ستائش کے ساتھ ساتھ ایک اور جذبہ بھی تھا جسے رشک کا نام رعایت کے ساتھ دیا جا سکتا تھا۔ عالیہ نے بہن کو اپنی ہونے والی بہو کی تصویر بھی دکھائی جو رافعہ نے خاص عدم دلچسپی اور عجیب تیوروں کے ساتھ دیکھی۔

"اوہ! ماں یہ تو اچھی خاصی عمر کی لگ رہی ہے۔"

"نہیں تو عاشر کے جوڑ کی ہے۔" عالیہ نے فوراً تردید کی۔

"پھر بھی لڑکی کو لڑکے سے کم سے کم پانچ سال چھوٹا ہونا چاہیے۔ میری ماہ نور تو اپنے شوہر سے چار سال چھوٹی ہے یا پھر اس سے بھی دو سال نیچے ہی ہوگی، کیونکہ مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں ہے عمر کے بارے میں۔ اور عاشر کے لیے تم نے جو لڑکی ڈھونڈی ہے، ٹھیک ٹھاک بڑی لگ رہی ہے۔ ایسی بھی کیا آفت تھی تمہیں۔" رافعہ نے بہن کو ایسے لتاڑا جیسے حق رکھتی ہو۔ عالیہ کا خوشی سے چمکتا چہرا اتر گیا تھا۔ اس بار وہ کوئی وضاحت ہی نہ دے سکیں۔

"تم نے لڑکی کے کردار کے بارے میں چھان بین کروائی ہے۔" انہوں نے مزید گوہر افشانی کی۔

"چھان بین کیسی۔ اچھے گھر کی ہے اور اچھی لڑکی ہے۔" عالیہ ان کا حقیقی مفہوم جانے بغیر سادگی سے بولیں۔

"اس لڑکی کی اتنی عمر ہو گئی ہے، ابھی تک شادی کیوں نہیں ہوئی اس کی؟ یہ معلوم کروانے کی کوشش کی ہے تم نے؟" انہوں نے کھل کر مطلب واضح کیا۔ پہلی بار عالیہ کو ان کی سوچ کی پستی پہ غصہ آیا۔

"ہم نے آس پاس پڑوس سے ہر طرح کی تسلی کروائی ہے تب ہی افراح کے ساتھ عاشر کا رشتہ پکا کیا ہے۔ اس کے بھائیوں کا اپنا کاروبار ہے۔ افراح نے سولہ جماعتیں پڑھی ہیں اور ایک انگلش میڈیم اسکول میں پڑھانے بھی جاتی ہے۔" عالیہ نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔

"اچھا تو استانی ہے۔" رافعہ نے عجیب سے انداز میں کہا۔ ادھر طارق بھی امین سے کرید کرید کر عاشر کے بارے میں سوال کر رہے تھے۔ اس کی نوکری کی نوعیت کیا ہے' تنخواہ کتنی ہے' کون سی کمپنی میں کام کرتا ہے' وہ کب آئے گا' گھر کتنے پیسے بھیجتا ہے' اس نے یہ گھر کتنے کا خریدا ہے' وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے بہت سے سوال انہوں نے پوچھے تھے۔

صاف لگ رہا تھا ان میاں بیوی کو امین صاحب کے حالات کی تبدیلی اور معاشی خوشحالی برداشت نہیں ہو پا رہی ہے۔

امین صاحب سے ان کے یہ احساسات مخفی نہ رہ پائے تھے۔ ہاں عالیہ اپنی سادگی میں ایک بار پھر نظر انداز کر گئی تھیں۔ آخر کو رافعہ ان کی ماں جائی تھی۔

☼ ☼ ☼

...نور نیند میں ڈوبی ہوئی تھی جب عمر نے اس کا کندھا پکڑ کر ہلایا۔ اس نے بہت مشکل سے آنکھیں کھولیں۔ عمر آفس جانے کے لیے تیار کھڑا تھا اس کی وائنی سائیڈ پہ بریف کیس پڑا تھا' ماہ نور کو آنکھیں کھولتے دیکھ کر اس نے بریف کیس کھول کر کچھ کاغذات نکالے۔

"ڈارلنگ! یہاں سائن کر دو۔ میں تمہارا اور اپنا جوائنٹ اکاؤنٹ کھلوا رہا ہوں۔" اس نے بہت پیار سے ماہ نور کے ہاتھ میں پین پکڑا دیا۔ اور پیپرز اس کے سامنے رکھے۔ ماہ نور کا ذہن نیند میں ابھی بھی ڈوبا ہوا تھا۔ اس نے عمر سے کچھ بھی نہیں پوچھا اور ان پیپرز پہ سائن کر دیے۔

عمر نے سائن کروانے کے بعد اس کا سر تھپتھپایا۔

"سو جاؤ ڈارلنگ!" وہ بریف کیس میں کاغذات رکھ کر بیڈ روم سے نکل گیا۔ ماہ نور دوبارہ سو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"عاشر! تم کب آؤ گے؟ ہمیں تمہاری شادی بھی کرنی ہے۔" امین فون پہ بیٹے سے بات کر رہے تھے۔

"ابو! چھ ماہ تک آ جاؤں گا پکا پکا۔ پھر آپ کے پاس ہی رہوں گا۔"

"پکا پکا کیوں۔ دوبارہ نوکری پہ واپس نہیں جانا کیا؟"

"نہیں ابو! میں آپ اور امی کو اکیلا نہیں چھوڑ سکتا۔ پاکستان میں ہی چھوٹا موٹا کاروبار کر لوں گا۔ اس مقصد کے لیے میں پیسے جمع کر رہا ہوں تین برس سے۔" عاشر نے تفصیل سے بتایا۔

"اللہ تمہیں کامیاب کرے' ہمیں بھی ساری عمر تمہاری پردیس کی کمائی نہیں کھانی۔ ہم مل جل کر رہیں گے۔ اچھا برا وقت کاٹ لیں گے۔"

"ابو! برا وقت گزر گیا ہے۔ اب اچھے دن شروع ہو گئے ہیں۔ میں پاکستان آ کر اپنے کاروبار کے لیے جگہ دیکھوں گا۔ حماد بھی میرے ساتھ ہے۔ ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔"

"جو بھی ہے تم جلدی آؤ۔ میں اور تمہاری ماں تمہیں دیکھنے کے لیے ترس رہے ہیں۔ افراح کے بھائی بھی دو تین بار پوچھ چکے ہیں تمہارے آنے کا۔" ابو نے اس کی زندگی میں آنے والی تبدیلی کے حوالے سے بات کی تھی۔ وہ ٹھٹک سا گیا جیسے۔

"افراح۔" اسے تو نام بھی یاد نہیں تھا حالانکہ امی جب بھی اس کے ساتھ بات کرتی تھیں افراح کا نام لیتی تھیں' پر وہ اسے ابھی تک یاد نہیں ہوا تھا۔ وہ اکثر اس نام پہ چونک جاتا۔ حالانکہ اب اس کے ساتھ زندگی بھر کا ناتا جڑنے والا تھا۔ اسے حیران ہونا چھوڑ دینا چاہیے تھا۔

"ابو! میں آ جاؤں گا جلدی۔" وہ کھوئے کھوئے لہجے میں بولا۔

عاشر کی طرح حماد بھی باہر تھا۔ دونوں ایک ہی کمپنی

میں تھے۔ اس کی بیوی فری اپنے بوڑھے سسر کے ساتھ عالیہ اور امین صاحب کے گھر کے پاس ہی رہتی تھی۔ اس کی موجودگی سے عالیہ کو وہ سراہٹ کا آسرا ہو گیا تھا۔ وہ اہم موقعوں پہ عالیہ کے ساتھ عاشر کے ہونے والی سسرال جاتی۔ افراح سے مل کر اسے بہت خوشی ہوئی تھی۔ حماد اس کے ساتھ عاشر کی بہت باتیں کرتا تھا سو وہ ہمیشہ اس کے لیے اچھے الفاظ استعمال کرتی۔ فری' ہمیشہ عاشر کے حوالے سے افراح کو دیکھتی' ویسے تو وہ اسے بہت اچھی لگی تھی لیکن اس میں کسی کمی کا احساس ہوتا تھا۔ افراح ٹھیک ٹھاک خوب صورت تھی۔ اس کی جلد ہموار اور بے داغ تھی۔ ساتھ ہی وہ بالکل صاف ستھرے' ستواں ناک' موٹی موٹی آنکھیں۔ وہ ناک میں لونگ ڈال کر اسے اور بھی توجہ بنا سکتی تھی۔ اس کی موٹی موٹی آنکھیں کسی بھی قسم کی آرائش سے بے نیاز تھیں۔ لمبے گھنے بال سیدھی مانگ کے ساتھ چٹیا میں گندھے رہتے۔ وہ چاہتی تو با آسانی سب کی توجہ حاصل کر سکتی تھی۔ فری اسے آہستہ آہستہ اپنے ڈھب پہ لانے کی کوشش کر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

تین دن سے کام والی ماسی نہیں آرہی تھی۔ نہ رات کو عمر کھانا پیک کروا کے لا رہا تھا۔ فریج میں جو کچھ تھا ماہ نور نے زہر مار کر لیا تھا۔ عمر نے آفس سے آتے ہوئے ہنستے ہوئے کہا تھا کہ خود گھر پہ کھانا بناؤ ہم نوکر افورڈ نہیں کر سکتے۔

"کیوں' ہم نوکر افورڈ نہیں کر سکتے؟" پہلی بار اس کے ساتھ بات کرتے ہوئے ماہ نور کا لہجہ تلخ ہوا۔

"میرا بزنس ڈاؤن جا رہا ہے۔" وہ آرام سے بولا۔

ماہ نور نوٹ کر رہی تھی کہ عمر کا رویہ اس کے ساتھ سرد رہنے لگا ہے۔ ایسا اس دن سے تھا جب سے لیڈی ڈاکٹر نے ماہ نور کا چیک اپ کر کے اسے باپ بننے کی خوش خبری سنائی تھی۔ ایسا لگتا تھا اسے خوشی نہیں ہوئی ہے حالانکہ ماہ نور بہت خوش تھی۔ اس دن سے اس کا رویہ بدل گیا تھا۔ پہلے وہ اس کے ناز نخرے اٹھاتا' گھمانے پھرانے لے جاتا لیکن اب ایسا نہیں تھا۔ باپ بننے کی خبر کے ساتھ ہی اس میں جیسے کوئی نئی روح سرائیت کر گئی تھی۔ یہی وجہ ہے جب ماہ نور نے اسے لاہور امی ابو کی طرف چھوڑنے کا کہا تو وہ فوراً" راضی ہو گیا۔

"ایسا کریں لاکر سے میرا زیور تو لا دیں۔" وہ مصروف سے انداز میں بولی۔

"کیوں؟"

"میں لاہور جا رہی ہوں پہن کر جاؤں گی۔ زیادہ نہیں ایک سیٹ دو کڑے اور تین چار انگوٹھیاں لا دیں۔ باقی امی کے گھر کا ہلکا پھلکا زیور تو میرے پاس ہی ہے۔ چوڑیاں اور بریسلیٹ بھی گھر میں ہے۔" وہ بیگ کھول کر چیک کر رہی تھی۔ عمر نے اسلام آباد آکر اس کا زیور حفاظتی نقطہ نگاہ سے اپنے بینک لاکر میں رکھوا دیا تھا۔ ماہ نور کے پاس وہی زیور تھا جو اس نے پہن رکھا تھا یا پھر ہلکی پھلکی چیزیں تھیں۔

"ہاں لا دوں گا۔ تم کب جاؤ گی؟" وہ لاپروائی سے بولا۔

"کل چلے جاتے ہیں' مجھے امی ابو بھائیوں بھابھیوں اور آنٹی کے لیے شاپنگ بھی کرنی ہے اس کے لیے پیسے چاہیے تھے۔"

"چھوڑو شاپنگ کو لاہور سے ہی کر لینا۔ اور میری مانو تو آج ہی چلتے ہیں کل مجھے بہت ضروری بزنس میٹنگ اٹینڈ کرنی ہے۔ تمہیں تم چھوڑ کر میں رات کو بائی ایئر آجاؤں گا۔" اس کا لہجہ قطعی اور حتمی تھا۔ کچھ تھا اس کے انداز میں کہ ماہ نور کو انکار کی ہمت ہی نہیں ہوئی۔ وہ فقط سر ہلا کر رہ گئی۔

عمر ماہ نور کو اس کے میکے چھوڑ کر خود اپنے گھر آ گیا تھا۔ یہاں ثمامہ اس کا چھوٹا بھائی اور امی تھیں۔ ثمامہ کو اسلام آباد سے نکلتے ہی اس نے فون کر دیا تھا وہ اس کی فون کال سننے کے بعد امی کے گھر پہنچ گئی تھی۔

"کیسا رزلٹ ہے؟" ثمامہ اسے دیکھتے ہی چہکی۔

"رزلٹ شاندار ہے بس تھوڑی گڑبڑ ہو گئی ہے۔" ثمامہ سمجھ گئی تھی۔

"وہ ذرا دردِ سر نہیں ہے۔ یہ بتاؤ اب کیا کرنا ہے؟"

"ماہ نور اگلا اسٹیپ لے تو پھر ہی سوچا جا سکتا ہے۔"

"لے لی اگلا اسٹیپ بھائی! فکر مت کرو۔" ثمینہ نے اسے تسلی دی۔

"گاڑی تو میں نے پہلے چکر میں ہی فروخت کر کے پیسے کھرے کر لیے تھے۔ زیور بھی ٹھکانے لگ گیا ہے، باقی ماہ نور کو جہیز میں ملنے والا فلیٹ بھی میرے نام ہو چکا ہے۔" عمر حمید مسکراہٹ سمیت بتا رہا تھا۔ ثمینہ اور اس کی ماں کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"میرے حساب سے تو اب دی اینڈ ہو جانا چاہیے؟" ثمینہ اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

"دی اینڈ بھی ہو جائے گا، فکر مت کرو۔ میں نے اس بار پکا کام کیا ہے۔" عمر نے تسلی دی۔

☆ ☆ ☆

"کیا حال بنا رکھا ہے تم نے۔ نہ کوئی زیور پہنا ہے نہ ڈھنگ کے کپڑے۔ عمر تمہارے ساتھ ٹھیک ہے ناں۔" رافعہ ماہ نور کے چہرے پر نظر پڑتے ہی ٹھٹک گئی تھیں۔ موسم ٹھیک ٹھاک گرم تھا، وہ جہیز ہی کے ایک فینسی امبرائیڈرڈ سوٹ میں ملبوس تھی جو موسم کے لحاظ سے قطعی نامناسب تھا۔ عمر کے ساتھ وہ جب بھی آتی، نک سک سے تیار ہنستی مسکراتی آتی لیکن اس بار رنگ ڈھنگ ہی بدلے ہوئے تھے۔ رافعہ اور طارق نے اسے ایک سے ایک ڈائمنڈ اور پتھروں کی قیمتی جیولری دی تھی لیکن اس وقت اس کا گلا، کان اور ہاتھ تقریباً خالی نظر آ رہے تھے۔ اس کا چہرہ بھی اترا اترا لگ رہا تھا۔ رافعہ پریشان ہو گئیں۔ انہیں کسی غیر معمولی تبدیلی کا احساس ہو رہا تھا۔ ماہ نور ان کے گلے سے لگی رو رہی تھی۔

"میں پوچھتی ہوں عمر اور اس کی ماں سے۔ کیا حال بنا دیا ہے تمہارا۔ ابھی تک تم جہیز کے کپڑے پہنے پھر رہی ہو، ان لوگوں سے اتنا نہ ہوا کہ تمہیں موسم کے لحاظ سے کپڑے دلا دیں۔" رافعہ بیٹی کے آنسو دیکھ کر بپھر گئی تھیں۔

"ابھی فون کرتی ہوں تمہارے ابو کو۔" ماہ نور نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی تھی۔ پہلی بار اس کی چھٹی حس کسی گڑبڑ کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ عمر ایک دم سے ہی اجنبی ہو گیا تھا۔ اس نے شاپنگ کا بولا تو عمر نے کوئی دھیان ہی نہیں دیا۔ اسے باہر گیٹ پہ ہی ڈراپ کر کے وہ چلا گیا تھا۔ جاتے وقت اس نے ماہ نور سے یہ پوچھنے کی بھی زحمت نہیں کی کہ تم کب آؤ گی یا میں تمہیں لینے کب آؤں؟ وہیں سے گاڑی زن سے موڑ کر لے گیا تھا۔

رافعہ کے ایک فون پہ طارق فوراً گھر آ گئے۔ وہ بھی لاڈلی بیٹی کو اداس اور خاموش دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

"کیا بات ہے میرے بچے۔" انہوں نے پیار سے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"ذرا دیکھیں تو سہی اس کو۔" رافعہ نے جانے کس طرف ان کی توجہ دلائی تھی انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے بیوی کی طرف دیکھا۔

"اس سے پوچھیں تو سہی زیور کہاں ہے۔ گلا خالی کلائیاں سونی پڑی ہیں خدانخواستہ جیسے بیوہ ہے ہی نہیں۔" رافعہ کو رہ رہ کر قلق ہو رہا تھا۔ انہوں نے ماہ نور کو سختی سے تاکید کی ہوئی تھی کہ جب بھی میکے آؤ یا کسی ملنے جلنے والے کے گھر جاؤ تو اپنے زیور پہن کر جاؤ۔ وہ خواتین کی اس کیٹگری سے تعلق رکھتی تھیں جن کے نزدیک سونے کے زیورات عورت کی عزت میں چار چاند لگاتے تھے۔ چار تو کیا اس وقت ماہ نور ایک بھی چاند سے محروم تھی۔

"ماہ نور! کیا بات ہے۔ تم کیوں پریشان ہو اتنی۔" انہوں نے ایک بار پھر پیار سے پوچھا۔

"عمر اسے گیٹ سے چھوڑ کر چلا گیا ہے، اندر سلام کرنے تک نہیں آیا۔" رافعہ نے ایک بار پھر دخل دیا تو طارق صاحب نے انہیں ناپسندیدگی سے دیکھا۔

"ابو! پہلے تو سب کچھ ٹھیک تھا لیکن اب مجھے نہ

جانے کیوں عجیب عجیب سے خیال آرہے ہیں۔" اضطراب اس کی آواز اور سراپے تک سے ظاہر ہو رہا تھا۔

شادی کے شروع دنوں کا خمار اتر چکا تھا اور اب بہت کچھ واضح ہو رہا تھا۔ عمر نے کبھی بھی اس کے ہاتھ پہ پیسے نہیں رکھے تھے نہ ہی اس نے ماہ نور کو شادی کے بعد شاپنگ کروائی تھی۔ منہ دکھائی میں اس نے ماہ نور کو ڈائمنڈ کا بریسلیٹ دیا تھا وہ بھی لے کر لاکر میں رکھ دیا تھا کہ "حالات ٹھیک نہیں ہیں' گھروں میں بہت چوریاں ہوتی ہیں۔" اس کے تمام زیورات روپے پیسے سب کے سب عمر کے قبضے میں تھے۔ اس کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی۔ اب اسے یاد آرہا تھا اس نے جب بھی عمر سے زیورات واپس مانگے اس نے ٹال دیا۔ ماہ نور نے گاڑی فروخت کرکے پیسے عمر کو دینے کی بات ابھی ابھی ابو کو بتائی تھی۔ اس نے سب خدشات امی ابو کو بتا دیے تھے۔ اس کے اسلام آباد آنے کے بعد اس کی ساس' نندیا دیوروں نے کبھی بھی اس سے رابطہ نہیں کیا تھا' وہ خود ہی فون کرتی تھی۔ بظاہر سب کچھ دیکھنے میں ٹھیک تھا لیکن رہ رہ کر کوئی چیز کھٹک رہی تھی۔

طارق اور رافعہ دونوں پریشان ہو رہے تھے۔ ماہ نور نے انہیں جو کچھ بتایا تھا' وہ نظر انداز کرنے والا نہیں تھا اور اب تو ایک اور زندگی اس کے وجود میں سانس لینے لگی تھی۔

جب طارق نے ماہ نور اور عمر کا رشتہ طے کیا تو سب خاندان والوں نے دبے دبے الفاظ میں منع کرنے کی کوشش کی تھی۔ عمر یا اس کے خاندان سے کوئی بھی واقف نہیں تھا۔ طارق صاحب اور دونوں بیٹوں نے اپنے طور پہ چھان بین کی تھی۔ لاہور آنے سے پہلے یہ لوگ کراچی میں رہائش پذیر تھے۔ کراچی میں بقول عمر کی والدہ کے ہمارا تمام خاندان آباد ہے۔ مگر تمام خاندان سے طارق' واقف نہیں تھے۔ رافعہ نے اتنا شور مچایا پھر ان کی لاڈلی بیٹی ماہ نور کی بھی یہی مرضی تھی' انہیں ہاں کرتے ہی بنی۔ رافعہ کی فرمائش پہ انہوں نے بیٹی کو دنیا جہان کی چیزیں جہیز میں دی تھیں۔

ماہ نور پریشان ان کے سامنے بیٹھی تھی۔ اسے آرام و سکون کی ضرورت تھی۔ رافعہ طارق کے اشارے کرنے۔ ماہ نور کو کمرے میں لے آئیں۔

"تم آرام کرو تھوڑا۔ میں ذرا کھانے پینے کا انتظام کرواؤں۔" اسے بیڈ پہ لٹا کے وہ طارق صاحب کے پاس آگئی تھیں۔

"میں ایک دو دن تک عمر کی والدہ سے بات کرتا ہوں۔" وہ رافعہ کو دیکھ کر بولے۔

"آپ عمر سے بات کریں پہلے۔ ممکن ہو تو اسے فون کرکے یہاں بلوالیں۔" رافعہ نے مشورہ دیا۔

"میرے خیال میں یہ فوراً "مناسب نہیں ہوگا۔ ہو سکتا ہے ان میاں بیوی میں جھگڑا ہوا ہو اور ہمیں ماہ نور مس گائیڈ کر رہی ہو۔"

"توبہ توبہ۔" آپ کو اپنی بیٹی پہ اعتبار نہیں ہے وہ کیوں

غلط بیانی کرنے لگی۔ اس کا اترا ہوا چہرا اور ماند پڑتی رنگت نہیں دیکھی، آپ نے ایسے لگتا ہے ڈھنگ سے کھاتی پیتی تک نہیں ہے اب تو وہ دو سرے جی سے ہے۔ اس کے سسرال اور شوہر کو خیال رکھنا چاہیے ماہ نور کا۔" رافعہ تڑپ ہی تو گئی تھیں۔ بیوی کے شور کرنے پہ طارق صاحب نے چپ سادھ لی۔ ویسے ان کا دل بھی بیٹی کی ہی طرف داری کر رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

عالیہ کتنی دیر بے یقینی کے عالم میں اسے تکتی رہیں پھر جھپٹ کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔ ممتا کی پھوار میں وہ پور پور بھیگ چکا تھا۔

"تم نے اپنے آنے کی اطلاع تک نہیں کی۔" امین نے بھی شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔ عالیہ نثار ہو جانے والی نگاہوں سے عاشر کو دیکھ رہی تھیں۔ خالص خوراک نے اس کی صحت پہ اچھا اثر ڈالا تھا۔ اس کی گندمی رنگت اور بھی صاف ہو گئی تھی، دبلا پتلا جسم بھر گیا تھا۔ چہرہ مزید پرکشش ہو گیا تھا۔ کلائی پہ بندھی قیمتی گھڑی، سامنے ٹیبل پہ رکھا مہنگا اسمارٹ فون اور برانڈڈ کپڑوں میں ملبوس عاشر دیکھنے والوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہا تھا۔ عالیہ نے کتنی بار ہی تو اسے نظر بد سے بچنے کی دعا دی۔

حماد اس سے دو ہفتے پہلے آیا تھا اس کے آنے کی اطلاع صرف سلو کو ہی تھی۔ وہی اسے ایئرپورٹ سے گھر لے کر آیا تھا۔ امی ابو اسے دیکھ کر حیران ہوئے تھے پر ان کی نگاہوں میں خوشی کے رنگ بہت گہرے تھے۔

عالیہ نے اس کی پسند کے کھانے بنائے۔ قیمہ اور شملہ مرچ، چاولوں کی کھیر، پالک گوشت وہ یہ سب بہت شوق سے کھاتا تھا۔ آج انہوں نے اس کے لیے بہت شوق اور محنت سے کھانا بنایا تھا۔ اس نے ہر ہر لقمے پہ تعریف کی تھی۔

"امی میں آپ کے ہاتھ کے بنے پراٹھے اور چائے پینے کو ترس گیا ہوں۔" کھاتے کھاتے اسے کچھ یاد آیا تھا۔

"میں صبح ناشتے میں اپنے بچے کو بنا دوں گی۔" عالیہ خوشی سے نہال ہو رہی تھیں۔ رات کھانے سے فارغ ہو کر عاشر نے امی ابو کے لیے خریدی گئی چیزیں نکالیں۔ امی کے لیے وہ سونے کے کنگن، جھمکے اور ایک انگوٹھی لایا تھا۔ ابو کے لیے گھڑی، سوٹ پیس اور ایک موبائل فون تھا۔ باقی کچھ چھوٹی موٹی اشیاء دیگر رشتہ داروں کے لیے تھیں۔

"تم یہ سونے کے کڑے میرے لیے کیوں لائے ہو۔ اس عمر میں کہاں اچھے لگیں گے مجھ پر۔ میں افراح کے لیے رکھ دیتی ہوں۔" انہوں نے کڑے اٹھا کر ایک طرف رکھنے چاہے تھے پر عاشر نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔

"نہیں امی! یہ آپ پہنیں گی۔ میری برسوں سے خواہش تھی کہ آپ بھی میری خالاؤں اور چچیوں کی طرح سونے میں لدی پھندی نظر آئیں۔" عاشر نے کڑے خود ان کی کلائی میں ڈالے تھے۔ عالیہ کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔

"افراح کے لیے بھی کچھ لیا ہے کہ نہیں؟؟"

"امی! جو سامان آپ نے مجھے لانے کو کہا تھا وہ سب اس کالے سوٹ کیس میں پڑا ہے "آپ دیکھ لیں۔" عاشر نے سوٹ کیس کھول کر ان کے آگے رکھ دیا تھا۔ سب کچھ دیکھنے کے بعد وہ مطمئن تھیں۔

"صبح تمہارے سسرال والوں کو تمہارے آنے کی اطلاع کرتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ادھر کا ایک چکر بھی لگا لیتے ہیں۔" امین صاحب کہتے جا رہے تھے۔ وہ غائب دماغی سے سر ہلا کر رہ گیا۔ ان کے منہ سے "تمہارے سسرال والوں" سن کر اسے عجیب سا لگا تھا۔

☼ ☼ ☼

ٹیبل پہ انواع و اقسام کی کھانے کی ڈھیروں اشیا سجی تھیں۔ مدیحہ اور رو قاص بصد اصرار ایک ایک چیز ہاتھ سے اٹھا کر اس کی پلیٹ میں خود ڈال رہے تھے۔

گندمی رنگت، موٹی آنکھوں اور باوقار قد کاٹھ والا

عاشر انہیں بے پناہ پسند آیا تھا۔ اب وہ بالکل مطمئن تھے۔ یہی حال عادلہ اور باذلہ کا بھی تھا۔ افراح باورچی خانے میں تھی۔ فری افراح کو زبردستی پکڑ کر ڈرائنگ روم کی کھڑکی کی طرف لائی تھی۔ تاکہ وہ عاشر کو ایک نظر دیکھ لے۔ پر افراح بری طرح جھینپ گئی تھی۔ اس کے چہرے پہ اترے شرم و حیا کے رنگ اتنے خوب صورت تھے کہ فری یک ٹک دیکھتی رہ گئی۔

"عاشر بھائی اور تم دونوں بہت خالص ہو۔ انوکھے اور منفرد۔ کوئی دونوں سا اور نہیں ہوگا۔" فری نے پورے یقین سے کہا۔

عاشر ہونے والی سسرال سے ملنے آیا تھا مگر یہاں شادی کی تاریخ بھی مل گئی تھی کیونکہ افراح کی فیملی اب پوری طرح مطمئن تھی۔

☆ ☆ ☆

افراح اپنی کتابیں گتے کے کارٹن میں پیک کر رہی تھی۔ یہ سب اسے ساتھ لے کر جانی تھیں۔ شادی میں ہفتے سے بھی کم دن باقی رہ گئے تھے۔

اس کے پاس موجود اشیاء میں سب سے قیمتی کتابیں ہی تھیں۔ اس نے اپنے اکثر کپڑے، جوتے اور استعمال کی چیزیں گھر میں کام کرنے والی ماسی کو دے دی تھیں۔ وہ غریب عورت بہت خوش ہوئی۔ کیونکہ افراح کے کپڑے، جوتے صاف اور اچھی حالت میں تھے۔ اس نے کچھ پیسے بھی ہمیشہ کی طرح سب سے چھپ کر اس کی مٹھی میں تھمائے تھے۔ وہ ایسے ہی اس کی مدد کرتی تھی۔

اس نے بہت سے لوگوں کی خاموش بے آواز دل سے نکلی دعائیں لی تھیں۔

☆ ☆ ☆

رافعہ خالہ کے گھر کے باہر عاشر، عالیہ کو ڈراپ کر گیا تھا۔ وہ گیٹ سے اندر آئیں تو خاموشی نے استقبال کیا۔ رافعہ بہت تھکن زدہ اور افسردہ نظر آرہی تھیں، عالیہ کا ماتھا ٹھنکا ماہ نور بھی وہیں تھی۔ اس کا رنگ زرد اور چہرے پہ چھائیاں نمایاں ہو رہی تھیں۔ حالانکہ چند ماہ پہلے اپنی شادی پہ وہ بے پناہ خوب صورت اور حسین لگ رہی تھی۔ وہ عالیہ سے اچھے طریقے سے ملی اور وہیں ان کے پاس ہی بیٹھ گئی۔ عالیہ کی گود میں عاشر کا لایا ہوا قیمتی لیدر کا ہینڈ بیگ پڑا تھا اور دونوں کلائیوں میں سونے کے کڑے جگمگا رہے تھے۔ وقت نے یک دم کیسا پلٹا کھایا تھا۔ قسمت اس سے پہلے عالیہ پہ ایسے مہربان نہیں ہوئی تھی۔ وہ عید تہوار پہ ہی نئے کپڑے بنایا کرتی تھیں کیونکہ امین کی تنخواہ زیادہ اجازت نہیں دیتی تھی۔ سونے کا ان کے پاس کوئی زیور تک نہ تھا اور اب ان کے گلے میں سونے کی چین، کانوں میں جھمکے، انگلیوں میں انگوٹھیاں اور کلائیوں میں کڑے تھے۔ عالیہ نے قیمتی کپڑے کا نفیس سوٹ زیب تن کر رکھا تھا۔ ساتھ چکن کڑھائی کی بہت خوب صورت چادر تھی۔ ماہ نور اور رافعہ کی آنکھوں میں دلچسپی تھی۔ انہوں نے یعنی رافعہ نے عالیہ کا گھر دیکھا ہوا تھا۔ ماہ نور کو آکر انہوں نے پورے گھر کی ایک ایک چیز کی تفصیل بتائی تھی۔

"تم سب شادی میں آنا اور ماہ نور! تم بھی۔" انہوں نے بطور خاص ماہ نور کی طرف دیکھا تھا۔ اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلایا۔ عالیہ کو وہ بہت بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ دونوں ماں، بیٹی افسردہ نظر آرہی تھیں۔ پر انہوں نے خود سے کرید نہیں کی۔ جاتے جاتے انہوں نے ماہ نور اور عمر کا کارڈ بھی رافعہ کو تھمایا اور ایک بار پھر آنے کی یاد دہانی کروائی۔

"عالیہ کا رہن سہن، رنگ ڈھنگ بالکل بدل گیا ہے۔ دیکھا تم نے سونے کے کیسے خوب صورت ڈیزائن والے زیور پہنے ہوئے تھے تمہاری خالہ نے۔ اب تو پہننے اوڑھنے کا سلیقہ بھی آگیا ہے میری بہن کو۔" رافعہ کے لہجے میں چبھن تھی۔

"امی! خدا جب حسن دیتا ہے تو نزاکت آہی جاتی ہے۔" ماہ نور نے تائید کی تو وہ خاموش ہو گئیں۔

"لگتا ہے عاشر خوب کما رہا ہے۔ گھر بھی اتنا اچھا لے لیا ہے ان لوگوں نے۔ اب شادی بھی کر رہے ہیں۔ پر سچ پوچھو تو لڑکی ایویں ہی ہے۔"

"امی، خالہ نے بھی آپ سے شکوہ کیا انکار کے بعد؟" ماہ نور کو آج تجسس ہو رہا تھا۔

"نہیں۔ کبھی بھی نہیں کہا نہ اچھا' نہ برا' نہ لڑائی نہ جھگڑا۔ تمہاری خالہ بہت گھنی ہے' تمہاری اور عمر کی شادی پہ خود کو جان کر خوش ظاہر کر رہی تھی۔ اتنی جھوٹی بھر بھر دعائیں دیں سب کے سامنے۔"

"واقعی امی! خالہ نے آپ سے کچھ بھی نہیں کہا؟ اتنے برس میری اور عاشر کی منگنی رہی۔ اس حساب سے تو انہیں دکھ ہونا چاہیے تھا۔" ماہ نور کو آج قلق ہو رہا تھا۔

"نہیں' بالکل سچ کہہ رہی ہوں عالیہ اور امین بھائی نے ہمیں ایک لفظ تک نہیں کہا' بس یہی بولے کہ نصیب میں نہیں تھی ہمارے ماہ نور' اسی میں اللہ کی مصلحت ہوگی۔"

"یعنی میری اور عاشر کی منگنی ٹوٹ گئی تو اس میں اللہ کی مصلحت تھی۔" عجیب سا پچھتاوا تھا اس کے لہجے میں۔

"اب بس بھی کرو۔ پرانے قصے دہرانے کا فائدہ نہیں ہے۔ تم اپنی صحت کو دیکھو۔ ڈاکٹر نے بہت احتیاط بتائی ہے۔"

"امی! کیا فائدہ احتیاط کا۔" مایوسی اور بے بسی اس کے لہجے میں نمایاں تھی۔

"اللہ بہتر کرے گا' تم نا امید نہ ہو۔ ایسا کرو تیار ہو جاؤ' عاشر کی شادی میں پہننے کے لیے خریداری کرتے ہیں کپڑے' جوتے' آخر سب کو پتا چلنا چاہیے کہ تم عاشر کی منگیتر رہ چکی ہو۔ بہت اچھے کپڑے پہن کر جانا سب کو جلانا۔ تمہاری خالہ بہت ہواؤں میں اڑ رہی ہیں آج کل۔" رافعہ کی ذہنی رو بہک گئی تھی۔

"امی مجھے تو عاشر کی دلہن دیکھنے کا شوق ہے بس۔"

"ہاں دیکھ لینا دلہن بھی' دیکھتے ہیں کون سی حور پری ہے۔" رافعہ کے لہجے میں طنز نمایاں تھا۔

⁂ ⁂ ⁂

مدثر اور وقاص نے بارات کے استقبال کے لیے اچھے شادی ہال میں انتظامات کیے تھے۔ رافعہ' ماہ نور' طارق صاحب اور ان کے دونوں بیٹے سب ہی شادی میں آئے تھے۔ عاشر کی بدلتی معاشی ترقی کو وہ بھی خود دیکھنا چاہ رہے تھے۔ عاشر کی سسرال پڑھی لکھی اور مہذب لگ رہی تھی۔ افراح کا پورا خاندان ہی خوش حال اور اعلا تعلیم یافتہ تھا۔ یہ بات ان کے رکھ رکھاؤ سے بھی نمایاں تھی۔

ماہ نور کی نگاہیں عاشر کو تلاش کر رہی تھیں۔ نکاح کے بعد افراح کو ہال میں سجے اسٹیج پہ لایا گیا۔ عاشر بھی اس کے ساتھ آیا تھا۔ ماہ نور جی جان سے ان دونوں کی طرف متوجہ تھی۔ اس کی دلہن آتشی اور ریڈ کلر کے امتزاج شرارے میں بے انتہا حسین لگ رہی تھی۔ اس کے سامنے ماہ نور کی شادی ماند پڑ گئی تھی اور عاشر اس کے ساتھ بیٹھا کتنا خوش اور پرسکون نظر آرہا تھا۔ اس کا دبلا پتلا جسم بھر کر اور بھی پروقار ہو گیا تھا۔ گندمی رنگت میں ہلکی سی سرخی چھلک رہی تھی۔ بے اختیار ہی ماہ نور نے عمر اور عاشر کا موازنہ کیا۔ وہ کسی بات پہ دھیرے دھیرے مسکرا رہا تھا۔ اس کے ہموار سفید دانت چمک رہے تھے۔ سرخ ہونٹ صحت مند مسکراہٹ کو نمایاں کر رہے تھے۔ جبکہ عمر چین اسموکر تھا۔ اسموکنگ کی وجہ سے اس کے دانت پیلے پڑ گئے تھے اور پتلے پتلے ہونٹ سیاہی مائل ہو کر عجیب بدہیت سے ہو گئے تھے۔ عمر کے سامنے کے بال بھی چھدرے تھے۔ ماتھا چوڑا لگنے لگا تھا۔ شادی کے بعد اس کی توند بھی خاصی نمایاں ہو گئی تھی۔ شادی سے پہلے ہی وہ موٹاپے کی طرف مائل تھا۔ اسے اپنی فٹنس اور اسمارٹ نیس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ کھانے پینے کا شوقین تھا اور ڈٹ کے کھاتا تھا۔ خود وہ کتنا بدل گئی تھی۔ اچھی خاصی صاف رنگت جو اس نے مختلف ٹوٹکوں اور کریموں سے حاصل کی تھی۔ اس پہ چھائیاں اور زردیاں نمایاں ہو گئی تھیں۔ آنکھوں کے گرد حلقے اور عجیب طریقے سے بے ڈول ہوتا جسم۔ حالانکہ شادی سے پہلے وہ اچھی خاصی تھی۔ انواع و اقسام کی کریموں اور کاسمیٹکس سے اس کی ڈریسنگ

نیلیں بھری ہوئی تھی۔ کپڑے وہ مہنگے ٹیلر سے سلواتی تھی جس کی فٹنگ اور سلائی کمال کی تھی۔ بالوں کو دھونے کے لیے وہ امپورٹڈ شیمپوز اور کنڈیشنر استعمال کرتی۔ خود کو اتنی توجہ دینے کے بعد وہ خود بھی قابل توجہ نظر آتی تھی۔

پوش علاقے میں قیام پذیر ہونے کے بعد خود بخود ہی اس میں اسٹائل بھی آگیا تھا۔ عمر کے ساتھ شادی کے بعد اس کی توجہ خود پر سے کم ہوگئی تھی۔ لاہور میں اسے اچھے بیوٹی پارلرز کا پتا تھا۔ راستوں سے آگاہی تھی۔ مہینے میں ایک بار وہ لازمی پارلر جاتی۔ بالوں کی ٹریمنگ، ہیر ماسک، فیشل، مینی کیور پیڈی کیور، اسکن پالش، ویکسنگ اس کے ماہانہ معمولات میں شامل تھی۔ عمر شادی کے بعد اسے اسلام آباد کیا لے کر گیا کہ وہ تو پارلر کا نام تک ہی بھول گئی تھی۔ خود وہ صبح ناشتا کرکے اپنے آفس کے لیے نکلتا تو واپسی رات کو ہی ہوتی۔ شادی کے بعد ماہ نور کی چند رف اور ڈل ہوگئی تھی۔ حالانکہ آج وہ مہنگے پارلر سے میک اپ کروا کے آئی تھی۔ پھر بھی عاشر کی دلہن کے سامنے اپنا آپ اسے پھیکا پھیکا سا ہی لگ رہا تھا۔

"امی! عاشر کی دلہن کتنی پیاری لگ رہی ہے۔" ماہ نور کے لہجے میں شاید رشک ہی تھا یا متاثر ہو جانے والی کیفیت کیونکہ جب اس نے عاشر کے ساتھ منگنی توڑی تھی تو اس کا خیال تھا کہ وہ عاشر کی زندگی میں حرف آخر ہے۔ ماہ نور جیسی لڑکی ملنا ناممکن ہی تھا۔ نہ صرف افراز کی فیملی بلکہ وہ خود بھی اعلا تعلیم یافتہ تھی۔ ایم اے انگلش گولڈ میڈلسٹ تھی۔ جبکہ ماہ نور نے تھرڈ ڈویژن میں بہت مشکل سے ماسٹر کیا تھا۔ تھرڈ کلاس میں ماسٹر ڈگری لینے کے باوجود اسے بے انتہا غرور تھا کیونکہ عاشر صرف گریجویٹ تھا۔ اس کے لیے قطعی طور پہ ناموزوں اور بے جوڑ۔ وہی گریجویٹ عاشر افراز کے ساتھ دولہا کے روپ میں بیٹھا تھا۔

"ارے سب میک اپ کا کمال ہے۔ میک اپ اترے تو دیکھنا۔" رافعہ نے بیٹی کے ساتھ ساتھ اپنے دل کو بھی تسلی دی تھی۔

ماہ نور کے معاملے میں ان کا کام اب صرف تسلی دلاسوں سے ہی چل رہا تھا۔ طارق اور وہ دونوں عمر کی والدہ کے پاس گئے تھے۔ اتفاق سے عمر وہیں پہ تھا۔ ماہ نور کے زیورات اور دیگر چیزوں کے متعلق جب انہوں نے استفسار کیا تو عمر سنتے ہی اکھڑ گیا کہ یہ اس پہ سراسر الزام ہے۔ اسے ماہ نور کے پیسے یا زیورات لینے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ یعنی وہ صاف صاف ان چیزوں کی موجودگی سے ہی انکار کر رہا تھا۔ بقول اس کے ماہ نور نے اسے زیور اور ایک روپیہ تک نہیں دیا ہے۔ طارق نے بہت رسان سے ماہ نور کو دی جانے والی گاڑی کے بارے میں پوچھا تب بھی اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

اس صورت حال پہ بے چارے طارق حیران و پریشان تھے۔ عمر کسی صورت کچھ بھی ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ جبکہ اس کی والدہ خاموش تماشائی بنی ہوئی تھیں۔

اب یہ معاملہ درمیان میں لٹکا ہوا تھا۔ عمر ہر چیز سے انکاری تھا۔ جبکہ ماہ نور بضد تھی کہ اس کی ہر چیز عمر کے پاس ہے اسے واپس دلائی جائے۔

عمر اسے واپس گھر لے جانے کے لیے بھی نہیں آیا۔ دونوں خاندانوں میں لڑائی چل رہی تھی۔ یہ معاملہ کسی کروٹ بیٹھتا نظر نہ آرہا تھا۔ ماہ نور حاملہ تھی۔ ڈاکٹر نے اسے خوش رہنے کی ہدایت کی تھی اور یہی کام آج کل اسے مشکل لگ رہا تھا۔

سسرال میں کوئی سیدھے منہ بات کرنے کے لیے ہی تیار نہ تھا۔ اس کی عزیز ترین دوست اور نند ثمینہ بھی بدل گئی تھی۔ رہا عمر تو وہ اس کا فون تک سننے کا روادار نہ تھا۔ عجیب سے حالات ہوگئے تھے۔ عمر اسے بتلا رہا تھا کہ ماہ نور نے اپنے زیورات اور پیسوں کے حوالے سے اس پہ الزام لگایا ہے۔ اب اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ عدالت کا رخ کرے گا۔ اس نے ماہ نور کو ہراساں کرنے کا پورا پورا پروگرام بنایا ہوا تھا۔

ثمینہ اس کی نند کم کم تھی۔ ماہ نور یہ بات سمجھ ہی نہ پائی تھی۔ طارق صاحب اس کے لیے بے حد پریشان تھے۔ زیور روپیے کے ساتھ ساتھ ماہ نور کو دیا جانے والا گھر بھی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ بلکہ اب اسنا بیٹی کا گھر

اجڑتا نظر آرہا تھا۔ کیونکہ عمر بہت غصے میں تھا۔ وہ مڑ کے ماہ نور کو لینے بھی نہیں آیا۔ نہ اس کے گھر میں سے کسی نے ماہ نور کی خیر خیریت پوچھی۔ تذبذب کے عالم میں وہ سب عاشر کی بارات میں آئے تھے۔ وہ اپنے کزنز سے اسی خلوص سے ملا تھا جو اس کا وتیرہ رہا تھا۔ اس کی جھکی دراز پلکوں والی دلہن سب کی توجہ اپنی طرف مبذول کروا رہی تھی۔ وقت کتنی جلدی بدل گیا تھا۔ یہ خیال ماہ نور کو ابھی ابھی آیا تھا۔ رخصتی ہو رہی تھی۔ عاشر کی روتی دھوتی دلہن سب سے مل کر پھولوں سے سجی کار میں بیٹھ رہی تھی۔ ماہ نور کو اپنی رخصتی کا منظر یاد آ گیا۔

امی ابو بھائیوں بھابھیوں سے ملتے ہوئے اس کا ایک آنسو تک نہ نکلا تھا۔ کیونکہ اسے اپنے میک اپ کی فکر تھی۔ جبکہ افراح تو رو رو کر بے حال ہوتی جا رہی تھی۔ ماہ نور کو یقین تھا۔ میک اپ اترنے کے بعد جب عاشر اس کی شکل دیکھے گا تو ڈر جائے گا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا وہ خالہ عالیہ کے گھر جائے۔ رخصتی کے بعد سب رسمیں دیکھے مگر اس کی طبیعت خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ ہال کی سیڑھیاں اترتے ہوئے وہ تیسری سیڑھی سے گری تو رہی سہی کسر پوری ہو گئی۔ اس کے پیٹ میں شدید درد ہونا شروع ہو گیا تھا۔

گھر جانے کے بجائے اسے اسپتال لے جایا گیا۔ جہاں فوری طور پہ ڈاکٹر نے چیک اپ کے بعد اس کا اسٹرا ساؤنڈ کروایا۔ ماہ نور کا مس کیرج ہو چکا تھا۔ اسے فوری طور پہ ایڈمٹ کیا گیا۔ رافعہ اب اس کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہی تھیں۔

٭ ٭ ٭

افراح کو رخصت کروانے کے بعد عالیہ اور امین صاحب عاشر کے ساتھ اسپتال آئے تھے۔ ماہ نور کے گرنے کا منظر بہت سوں نے دیکھا تھا۔ عالیہ سے رہا نہیں گیا۔ آخر کو ماہ نور ان کی بھانجی تھی۔ طارق پریشانی کے عالم میں بار بار عمر کو کال کر رہے تھے۔ اس نے احسان کرنے والے انداز میں ان سے بات کی۔ طارق نے اسے ماہ نور کے گرنے اور طبیعت کی خرابی کا بتایا تو اس نے رسمی افسوس کرنے کے بعد کال کاٹ دی۔ فون ان کے ہاتھ میں تھا اور وہ شاک کی حالت میں تھے۔ ماہ نور عمر کی بیوی تھی۔ ان دونوں کا بچہ دنیا میں آنے سے قبل ہی واپس اپنی دنیا میں لوٹ گیا تھا اور عمر کو ذرا بھی دکھ نہیں تھا۔ اس نے تو اپنی بیوی کی خیریت دریافت کرنا بھی گوارا نہیں کیا تھا۔ طارق صاحب کا بس چل رہا تھا ابھی جا کر عمر کا گریبان پکڑیں۔ ایک ماہ سے ماہ نور میکے میں تھی۔ مڑ کر نہ اس نے خیریت پوچھی تھی نہ اسے لینے آیا تھا۔ بازپرس کیے جانے پہ وہ اور بھی اکڑ گیا تھا۔ اب تو طارق نے ہر حال میں اس سے ملاقات کرنی تھی۔ چاہے اس کے لیے انہیں اسلام آباد ہی کیوں نہ جانا پڑتا۔

ماہ نور کی خیریت پوچھنے کے بعد وہ تینوں گھر واپس جا رہے تھے۔ عاشر جب سے پاکستان آیا تھا۔ اس کے بعد اس نے اب اسپتال میں ماہ نور کو دیکھا تھا۔ وہ اسپتال میں بے ہوش پڑی تھی اور بالکل ہی بدل گئی تھی۔ وہ تو پہچاننے میں ہی نہیں آرہی تھی۔ عاشر کو بے پناہ دکھ ہوا۔ اس نے کبھی ماہ نور کا برا نہیں چاہا تھا۔ اسپتال میں طارق خالو اور رافعہ خالہ کی حالت بہت دگرگوں تھی۔ خالہ رافعہ دبی دبی زبان میں ماہ نور کے شوہر اور اس کے سسرال کو کوسنے بددعائیں دے رہی تھیں۔ عالیہ بہن سے اس بارے میں پوچھ رہی تھیں۔ رافعہ کو بھی کوئی ہمدرد درکار تھا۔ عالیہ نے بہن کو گلے سے لگا لیا تھا۔ اس کے آنسو صاف کر کے حتی الامکان اس کا دکھ بانٹنے کی کوشش کی۔ حالانکہ وہ بیٹے کی شادی کر کے آج ہی بہو گھر میں لائی تھیں، پر اس کے پیچھے پیچھے اسپتال میں آئیں۔ ادھر امین اور عاشر طارق کے ساتھ لگے ہوئے تھے۔ انہیں تسلی دلاسے دینے کے بعد وہ گھر واپس گئے۔

"پتا نہیں ماہ نور کا کیا ہو گا۔ پھول سی بچی مرجھا کر رہ گئی ہے۔" عالیہ دکھ سے بولیں۔

"عاشر بیٹا! جلدی گھر پہنچنے کی کرو، افراح کیا سوچ

رہی ہوگی کہ ہم تینوں اسے چھوڑ کر کہاں غائب ہو گئے ہیں۔" امین صاحب نے عالیہ کی بات کاٹی تھی۔ عاشر نے اسپیڈ بڑھا دی تھی۔

افراح کے پاس فری بھابھی اور خاندان کی دیگر عورتیں موجود تھیں۔ ان کے آنے پہ سب اس کے پاس سے اٹھ گئیں۔

عاشر نے دھیمی آواز میں اسے سلام کیا تھا۔ جواب بھی اسے دھیمی آواز میں ملا تھا۔ عاشر نے اس کی تعریف کی تھی۔ منہ دکھائی میں سونے کا لاکٹ چین کے ساتھ پہنایا تھا۔ ساتھ اپنی اور ماہ نور کی منگنی ٹوٹنے کا احوال بھی کہہ سنایا۔

"افراح! میں اپنی نئی زندگی کا آغاز ماضی کے سایوں کے ساتھ نہیں کرنا چاہتا۔ ایمان دار آدمی ہوں' اس لیے تمہیں ماضی کی اس حقیقت سے روشناس کروا رہا ہوں۔ ماہ نور اور میرا رشتہ کافی سال رہا' لیکن ہم ایک دوسرے کے نصیب میں نہیں تھے۔ میں تمہارے ساتھ ایمان داری اور محبت سے چلوں گا۔ تمہیں مجھ سے کوئی شکایت نہیں ہوگی۔" عاشر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر یقین دلانے والے انداز میں کہا۔

افراح کے دل میں "ماہ نور" نامی پھانس گڑ کر رہ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

طارق صاحب اور ان کے دونوں بیٹے عمر کی امی کے گھر میں تھے۔ عمر بھی وہیں تھا۔ جب طارق صاحب نے کال کر کے اسے بتایا کہ میں تم سے ملنے اسلام آباد آ رہا ہوں تو اس نے فوراً کہا میں لاہور میں ہوں۔

ماحول میں گرما گرمی تھی۔ کیونکہ طارق صاحب نے ایک بار پھر زیورات' نقد رقم اور مکان کے بارے میں استفسار کیا تھا۔

"میں انکل! میں پہلے بھی آپ سے کہہ چکا ہوں کہ مجھے نہیں معلوم' اپنی بیٹی سے پوچھیں' جانے اس نے کس کو یہ سب دے دیا ہے۔ اب مجھے پھنسانے کی کوشش کر رہی ہے۔" عمر کا لہجہ کسی بھی ادب اور لحاظ سے خالی تھا۔

"میں اس سے پوچھ چکا ہوں برخوردار۔" طارق غصے پہ قابو پا کر بولے۔

"آپ اس سے پوچھ چکے ہیں تو یہاں کیا لینے آئے ہیں۔" وہ اسی ٹون میں بولا۔ ماہ نور کے دونوں بھائی اس پہ جھپٹے۔ طارق نے تینوں کو الگ کرنے کی کوشش کی۔ وہاں تو ہنگامہ مچ گیا تھا۔ آس پڑوس کے لوگ بھی جمع ہو گئے تھے۔ عمر کی ماں نے شور مچا کر سب کو جمع کر لیا تھا۔ عمر دھمکیاں دے رہا تھا۔

"تم لوگوں کے پاس کوئی ثبوت ہے تو بتاؤ۔ ورنہ میں تم لوگوں کی عزت کا فالودہ کر دوں گا۔" عمر جاہلانہ انداز میں دھمکیاں دے رہا تھا۔ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ بزنس مین ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے اس نے ماہ نور کو اکٹھی تین طلاقیں دی تھیں۔

طارق صاحب کے گھرانے کی شرافت وہ کائیاں آدمی پہلے ہی تاڑ چکا تھا۔ ایسے لوگ ہی تو اس کا شکار بنتے تھے جو اپنی عزت کے خوف سے قانونی چارہ جوئی بھی نہ کر سکیں۔ اس کی بہن ثمینہ نے اپنی کلاس فیلو ماہ نور کی دولت مندی کے بے پناہ قصے سنا کر اسے متاثر کر دیا تھا۔ ماہ نور کے گھر تک پہنچنے اور پھر رشتہ مانگنے میں کوئی دشواری نہیں ہوئی تھی انہیں۔

عمر پہلے بھی دو بار ایسے کر چکا تھا۔ ماہ نور کی فیملی ان کا تیسرا شکار تھی۔ تب ہی تو کسی بدمزگی سے بچنے کے لیے عمر اسلام آباد چلا گیا تھا۔ جبکہ ماہ نور کے گھر والوں کو کہانی سنائی گئی تھی کہ وہ وہاں بزنس کر رہا ہے۔ حالانکہ اس میں کوئی حقیقت نہیں تھی۔ وہ وہاں کرائے پہ گھر لے کر رہ رہا تھا۔ ماہ نور کو مطمئن کرنے اور اپنے جھوٹ پہ پردہ ڈالنے کے لیے وہ دکھاوے کے لیے ناشتا کر کے گھر سے نکل جاتا اور رات کو لوٹ آتا۔

ماہ نور اس لحاظ سے اس کے لیے آسان شکار ثابت ہوئی تھی کہ اس نے خود ہی ہر چیز عمر کے سپرد کر دی تھی۔ اسے ذرا بھی محنت نہیں کرنی پڑی تھی۔ ماہ نور کے گھر والے ان کی عارضی چمک دمک اور چاروں کی شو آف سے متاثر ہو گئے تھے۔ بہت آرام سے سب

کام ہو گیا تھا۔ ماہ نور کی کوکھ میں پلنے والا عمر کا بچہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ وہ اسے آسانی سے اپنی زندگی سے الگ کر سکتا تھا اور وہ ایسا کر چکا تھا۔

طارق صاحب اور ان کے دونوں بیٹوں کے کندھے اور سر جھکے ہوئے تھے۔ یہ بالکل وہی منظر تھا جب انہوں نے ماہ نور اور عاشر کا رشتہ ختم کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ تب عالیہ اور امین کی بھی یہی حالت ہوئی تھی۔ انہیں بھی چپ لگ گئی تھی۔ اب وہی چپ ماہ نور کو بھی لگنے والی تھی۔

☼ ☼ ☼

"لعنت بھیجو ان کمینے کم ظرف لوگوں پہ میری بچی! وہ تمہارے قابل ہی نہیں تھے۔ شکر کرو جان چھوٹ گئی' آگے چل کر نہ جانے کیا کرتے تمہارے ساتھ۔" رافعہ روتی ماہ نور کو گلے سے لگا کر خاموش کروانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ جب سے اسے طلاق ہوئی تھی' تب سے رشتہ داروں میں سے روز ہی کوئی نہ کوئی چلا آتا' ہمدردی جتانے والے کم اور کچوکے لگانے والے طنز کرنے والے زیادہ تھے۔ یہاں سے اٹھ کر عالیہ کے گھر کا رخ کیا جاتا اور ان سے ہمدردی جتائی جاتی۔ انہوں نے سب کی طبیعت صاف کر دی تھی۔ ویسے سب ہی ایک بات کہہ رہے تھے کہ رافعہ اور طارق کو ان کی لالچ کی سزا ملی ہے۔ خوش حالی آئی روپے پیسے کی ریل پیل ہوئی تو انہوں نے نظریں ہی پھیر لیں اور امین کی معاشی حالت کو بنیاد بنا کر رشتہ ہی ختم کر ڈالا۔ یہ مکافات عمل تھا جو بھی ماہ نور کو اس اجڑی حالت میں دکھنا ترس کھاتا' ہمدردی جتاتا۔

"امی! میرے ساتھ ہی ایسا کیوں ہوا ہے' لاکھوں کروڑوں لڑکیاں ہیں ان کے ساتھ کیوں نہیں ہوا۔" روتے ہوئے وہ اول فول بک رہی تھی۔

"یہ اللہ کی آزمائش ہے ماہ نور۔" رافعہ نے اسے سمجھانا چاہا۔

"اللہ کی آزمائش میرے لیے ہی رہ گئی تھی۔ وہ ذلیل' دھوکے باز' فراڈی' لوٹ لی میرا زیور' روپے پیسے' فلیٹ سب کچھ اپنے نام کروا کے مجھے کنگال کر گیا ہے۔" ماہ نور کا واویلا اتنی جلدی ختم ہونے والا نہیں تھا۔

☼ ☼ ☼

شادی کے بعد زندگی میں ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ عاشر اور افراح ایک دوسرے کے ساتھ آشنائی کی اولین منزل پہ تھے۔ افراح نے نئے سرے سے تمام گھر کی سیٹنگ کی تھی۔ چھوٹے سے لان میں خود محنت کی تھی اور وہاں مزید پھولوں کے پودے لگائے تھے۔ عالیہ کے بغیر کہے اس نے گھر کے کام سنبھال لیے تھے۔ عاشر نے نرمی سے اسے اسکول میں پڑھانے سے منع کر دیا تھا۔

"میں تمہاری تمام ذمہ داریاں بخوبی اٹھا سکتا ہوں۔ اس کے علاوہ تمہیں جو بھی چاہیے ہو' مجھے بتاؤ۔"

"بتاؤں گی۔" افراح کے لہجے میں خوشی تھی۔ زندگی اپنے نئے مفہوم کے ساتھ اس کے سامنے آئی تھی۔ جہاں صرف خوشی اور سکون تھا۔ عاشر بے پناہ اچھا شریک سفر ثابت ہوا تھا۔ نرم مہذب اور دھیمے مزاج کا مالک۔ افراح جو بھی کہتی' جھٹ مان لیتا' اس کی کسی بات سے انکار کرنا اس نے جیسے سیکھا ہی نہیں تھا۔ شادی کے بعد صرف چند ہفتے میں ہی افراح اس سے شدید محبت کرنے لگی تھی۔ ایسے لگتا تھا عاشر کی محبت جانے کب سے اس کی رگوں میں خون کے ساتھ رواں دواں ہے۔ عاشر نے خود اپنی زبان سے کبھی اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ حالانکہ وہ افراح کا خیال رکھتا' خود وہ پکاتی کھا لیتا۔ رات کو اگر وہ جلدی سو جاتی تو عاشر اس کی نیند خراب ہونے کے ڈر سے دروازہ بھی دھیرے سے بند کرتا' لائٹ بھی نہ جلاتا۔

وہ جب اکیلی ہوتی تو عاشر اور ماہ نور کے بارے میں سوچتی۔ اتنے سال ان کی منگنی رہی تھی۔ یقیناً" قلبی تعلق بھی رہا ہو گا۔ (کیا جانے اب بھی ہو) وہ اندازے لگاتی۔ بیاہ کر سسرال میں آتے ہی عاشر کے رشتہ داروں کی زبانی اس نے ان دونوں کی دوستی اور بے تکلفی کے بارے میں بہت کچھ جان لیا تھا۔ عالیہ

بتاتیں کہ۔ عاشر بہت ہنس مکھ اور زندہ دل تھا' پر اس کے سامنے تو وہ اونچی آواز میں ہنستا بھی نہیں تھا۔ رافعہ خالہ نے اس کی اور عاشر کی دعوت کی تھی۔ وہ پہلی بار اس کے ساتھ گئی تھی۔ ماہ نور سے اس کی پہلی بار آشنائی ہوئی تھی۔ انہوں نے ایک ٹیبل پہ اکٹھے بیٹھ کر کھانا کھایا تھا۔ ماہ نور کی تمام تر توجہ عاشر کی سمت تھی۔ اس کا ہنستا مسکراتا عاشر کو خاص نگاہ سے دیکھنا افراح کو ڈسٹرب کر رہا تھا۔

"عاشر بیٹا! کبھی کبھی چکر لگایا کرو۔ تمہارے آنے سے ماہ نور بہت خوش ہوئی ہے۔ ورنہ تو کمرے سے ہی نہیں نکلتی ہے۔" رافعہ خالہ لگاوٹ سے بولیں۔ عاشر نے سر ہلایا۔ پتا نہیں اس نے کس بات پہ اثبات میں سر ہلایا تھا۔

واپسی میں افراح بالکل خاموش تھی۔ عاشر بھی خاموش تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کچھ سوچ رہے تھے۔ عاشر نے ایک' دو بار اس کی سمت دیکھا' پر وہ اس کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی۔

عاشر نے کار پورچ میں گاڑی روکی تو وہ اس کی طرف دیکھے بغیر اندر آگئی۔ عاشر گاڑی لاک کر کے اندر آیا تو وہ باتھ روم میں تھی اور پانی گرنے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے شوز اور جرابیں اتاریں۔ الماری کھول کر اس نے ہلکی سی بانٹ شرٹ نکالی۔ خالہ کے گھر سے ان کی واپسی کافی دیر سے ہوئی تھی۔ وہ جیسے ہی اٹھنے کا قصد کرتا ماہ نور روک لیتی۔ وہ گھر آئے تو عالیہ اور امین دونوں سو چکے تھے۔ وہ اضافی چابی سے گیٹ کھول کر گھر میں داخل ہوا تھا۔

افراح گیلا چہرا ہاتھ سے تھپ تھپاتی باتھ روم سے نکلی تو عاشر کپڑے بیڈ پہ رکھے انتظار میں تھا۔ افراح نے دوپٹہ اتار کر دوسری چادر لوڑھی اور مصلی بچھا کر نماز پڑھنے کھڑی ہو گئی۔

اس کے نماز ختم کرنے سے پہلے ہی عاشر فریش ہو کر چینج کر کے بیڈ پہ لیٹ چکا تھا۔ اس نے نماز سے فارغ ہو کر چادر اتار کر دوسرا دوپٹا اوڑھا۔ عاشر اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔ وہ نظریں چراتی تکیہ سیٹ کر کے لیٹ گئی۔ عاشر اسی کی طرف متوجہ تھا۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اس کے اگلے ردعمل کا انتظار کر رہی تھی۔

"تھک گئی ہو نا۔" عاشر نے اپنی انگلیاں اس کے بالوں میں پھنسا دی تھیں۔ وہ اسے بچوں کی طرح تھپک رہا تھا۔ کوئی جواب نہ ملنے پہ وہ سمجھا کہ افراح سچ میں سو گئی ہے۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر بیڈ لیمپ آف کر دیا تھا۔

وہ عاشر کے دائیں بازو پہ سر رکھے لیٹی تھی' جبکہ بائیں بازو عاشر نے اس کے اوپر رکھا ہوا تھا۔ وہ محفوظ تھی۔ نیم اندھیرے میں اس نے عاشر کی طرف دیکھنے کی کوشش کی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ وہ گہری نیند میں تھا۔ افراح نے بھی آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کی' لیکن نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے ہلکے سے عاشر کا بازو اپنے اوپر سے ہٹایا اور بیڈ سے اتری۔

پانچ منٹ بعد وضو کر کے وہ رب کے آگے سجدہ ریز تھی۔ یہ اس کی شروع سے عادت تھی۔ جب بہت زیادہ پریشان ہوتی تو تہجد کی نماز پڑھ کر اللہ کے آگے گریہ و زاری کرتی۔ ابھی بھی اس کے دل کو بے پناہ سکون ملا تھا۔ عاشر کی آنکھ اچانک کھلی تھی کوئی عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس کا بائیں پہلو خالی تھا۔ عاشر نے بیڈ لیمپ آن کیا تو وہ کونے میں مصلیٰ پہ سجدہ ریز تھی۔ اس نے لیمپ فوراً" آف کر دیا کیونکہ افراح نے بیڈ روم کی کھڑکی کھول دی تھی۔ چاندنی میں سب کچھ واضح تھا۔ وہ رازداری اور خاموشی سے اٹھی تھی۔ عاشر خلل نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے فوراً" لائٹ آف کی تھی۔

☆ ☆ ☆

عاشر نے افراح کی کتابوں کے کارٹن ڈرائنگ روم میں رکھے۔ وہ خود ہی تھوڑی تھوڑی کتابیں لے جا کر وہاں بک شیلف کے پاس رکھ رہی تھی۔ عاشر نے دیکھا تو سب کارٹن ایک ایک کر کے وہاں رکھ دیے۔ اس کے چہرے پہ ہلکی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

عاشر نے کارٹن سے ایک ایک کر کے کتابیں نکالنی شروع کی تھیں۔ وہ کتابوں کے عنوان اور رائٹرز کے نام پڑھ رہا تھا۔ "سڈنی شیلڈن' ارل اسٹینلے گارڈنر' مائیکل شولوخوف' اشفاق احمد' ناصر کاظمی' جون گریشم' ابن انشا... بہت ورائٹی ہے تمہارے ذوق میں۔" عاشر اس کے ساتھ مل کر کتابیں الماری میں سجا رہا تھا۔

"ہاں مجھے بکس پڑھنا بہت پسند ہے۔ پتا ہے میں اپنی سب فرینڈز کو بکس گفٹ کرتی ہوں۔" وہ خوشی سے بتا رہی تھی۔ "آپ کو بھی کتابیں پڑھنا پسند ہیں؟"

"ہاں 'کبھی کبھی ٹائم ملے تو پڑھ لیتا ہوں۔ لیکن اب کوشش کروں گا کہ تمہاری طرح میں بھی پڑھوں اور بکس بھی خریدوں۔" عاشر نے مسکراہٹ دانتوں تلے دبائی تھی۔

"کیوں؟" افراح کی سوالیہ حیران نگاہیں اس کی طرف اٹھیں۔

"کیونکہ تمہیں جو پسند ہیں۔" عاشر کے اس جواب سے اسے بے پناہ خوشی ہوئی تھی' کیونکہ اس کا پورا چہرا آنکھوں سمیت چمک اٹھا تھا۔

ہاں سیکھا میں نے جینا جینا
کیسے جینا جینا' ہاں سیکھا
میں نے جینا میرے ہمدم

کتابیں رکھتے ہوئے وہ بے خیالی میں افراح کے سامنے گنگنا رہا تھا۔ وہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف متوجہ تھی۔

"اچھی آواز ہے میری؟" عاشر نے اچانک پوچھا تو وہ گڑبڑا گئی اور ریک میں رکھی کتابیں' پھر سے ٹھیک کرنے لگی۔

☼ ☼ ☼

رافعہ خالہ کا فون عاشر کے سیل نمبر پہ آیا تھا۔ انہوں نے رات کا کھانا اسے اپنے گھر کھانے کی دعوت دی تھی۔ جانے اس کے جی میں کیا سمائی اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور کسی کو بتائے بغیر خالہ کی طرف آگیا۔

ماہ نور جیسے اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر پھول کی طرح کھل اٹھی۔

"دیکھو کیا حال ہو گیا ہے میری بچی کا۔" رافعہ خالہ نے عاشر کو دیکھتے ہی دہائی دی۔ "اسے تم ہی سمجھاؤ۔ ہر وقت اپنے کمرے میں گھسی رہتی ہے' نہ ہنستی ہے' نہ بولتی ہے۔ میں چائے بنواتی ہوں تمہارے لیے' پہلے' پھر کھانا اکٹھے کھائیں گے۔" خالہ اٹھ کر کچن کی طرف جا چکی تھیں۔

"عاشر! تم تو بالکل اجنبی بن گئے ہو۔ میں شرعی عذر کی وجہ سے فی الحال تمہارے گھر نہیں آسکتی' لیکن تم تو آسکتے ہو نا۔" وہ شکوہ کناں لہجے میں بولی۔ اس کا اشارہ عدت کی جانب تھا۔ کچھ لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ خالہ واپس آگئی تھیں۔ گلاس ونڈو سے باہر بادل گرج رہے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا ابھی بارش شروع ہو جائے گی۔

"اچھا خالہ! میں چلتا ہوں' ایک ضروری کام یاد آگیا ہے۔" اس نے ٹیبل پہ پڑا اپنا اسمارٹ فون اور کی چین اٹھائی۔ ماہ نور اور خالہ ہکا بکا اسے دیکھنے لگیں۔

"ابھی چائے بن رہی ہے' میں نے تمہاری پسند کی ڈشز تیار کروائی ہیں۔ ایسے نہیں جانے دوں گی۔" خالہ نے اسے روکنے کی کوشش کی۔

"خالہ! چائے اور کھانا ادھار رہا' پھر سہی۔" وہ ان کے روکنے کے باوجود بھی نہیں رکا۔

وہ گاڑی میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ اس کے سیل فون کی میسج ٹیون بجی۔ بادل ہنوز زور و شور سے گرج رہے تھے۔ عاشر نے میسج اوپن کیا۔

کانوں سے ہینڈز فری اتار دو
اور کھڑکی کی باہیں کھول دو
سماعت کو بھی تو بھیگ جانے دو

اور سنو...
ہوا کیسے ادھر سے ادھر
اور ادھر سے ادھر سرکوں
یہ سیٹیاں بجاتی دوڑتی بھاگتی ہے
فطرت کیسے آسمانوں کے گیت

زمین تھی گنگناتی ہے

افراح کی طرف سے میسج تھا اوپر بارش لکھا ہوا تھا۔ اسے ہنسی آگئی۔ عاشر نے گاڑی گھر کی طرف جانے والی سڑک پہ موڑلی۔ بارش کی بوندیں اس کی گاڑی کو بھگو چکی تھیں۔ گھر واپسی پہ افراح اسے لان میں ملی۔ بارش کی بوندوں کو وہ اپنی ہتھیلی میں سمونے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ اس کوشش میں وہ خود بھیگ چکی تھی۔ عاشر کو دیکھ کر وہ اس کی طرف آئی۔

”کہاں تھے آپ؟ بغیر بتائے کیوں گئے آپ۔ اتنا اچھا موسم ہے میں پکوڑے بنارہی ہوں۔ آپ چلیں، میں چائے کے ساتھ آتی ہوں۔“ وہ اپنا گیلا دوپٹا جھٹکتے ہوئے بولی۔ نہ جانے کیوں اسے عاشر سے حجاب آرہا تھا۔ وہ اس کے آگے کھڑا تھا۔ بارش کی بوندیں عاشر کے پاؤں بھگو چکی تھیں۔

”آپ بھیگ رہے ہیں؟“ افراح نے توجہ دلائی۔

”تم بھی تو بھیگ رہی ہو۔“ وہ برجستہ بولا۔

”مجھے تو بارش میں بھیگنا بہت پسند ہے۔ یہ کیا کہ بارش کو کھڑکی اور دریچوں سے دیکھو۔ میں بارش کو محسوس کرتی ہوں روح کی گہرائیوں سے۔“ وہ جذب کے عالم میں بول رہی تھی۔ پھر عاشر کی نظروں کے ارتکاز کو محسوس کرکے جھینپ گئی۔

”میں بھی بارش کو روح کی گہرائیوں سے محسوس کرنا چاہتا ہوں۔“ عاشر نے اپنی ہتھیلی سامنے آسمان کے نیچے پھیلادی۔

”اچھا میں چائے اور پکوڑے بنانے جارہی ہوں۔ ویسے آپ گئے کہاں تھے اچانک؟“ وہ اسے آگے سے بتاکر مڑی تو جاتے جاتے خیال آیا۔

”رافعہ خالہ کی طرف گیا تھا اور چائے بناؤ جلدی، میں آرہا ہوں۔“ عاشر کے جواب نے افراح کے قدموں کی رفتار سست کردی تھی۔

عاشر کپڑے تبدیل کرکے اس کے پیچھے باورچی خانے میں ہی آگیا۔ عالیہ اور امین چھوٹے چچا کی طرف گئے ہوئے تھے۔ ان کے پوتے کی طبیعت خراب تھی۔ عاشر گھر پر نہیں تھا وہ ٹیکسی سے گئے تھے۔ عاشر اسٹول کھینچ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ چائے دم پہ تھی اور وہ ایک بار کے پکوڑے پلیٹ میں نکال چکی تھی۔

”آپ کھائیں، میں اور بنارہی ہوں۔“ افراح نے اس کے سامنے پکوڑوں کی پلیٹ، کیچپ اور چٹنی کے لوازمات سمیت رکھی۔

”تم بنالو میں پھر کھاؤں گا۔“ عاشر نے پلیٹ سرکا دی۔ افراح کی آنکھوں کے گوشے بھیگے بھیگے سے تھے۔

”آؤ سٹنگ روم میں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں۔“ وہ پکوڑے تل کر فارغ ہوئی تھی، عاشر نے ٹرے خود ہی اٹھائی۔ کھلی کھڑکی سے باہر برستی بارش صاف نظر آرہی تھی۔ سرمئی دھند ہر سو چھائی ہوئی تھی۔ عاشر اس کے سامنے بیٹھا چائے کے ہلکے ہلکے گھونٹ لے رہا تھا۔

”تم بہت اچھی چائے بناتی ہو۔“ وہ تعریف کررہا تھا، پر اسے خوشی نہیں ہوئی۔

”اور سنو!“ وہ چائے کی خالی پیالی ٹرے میں رکھ کر اس کی طرف جھکا۔

”تم بالکل بارش جیسی ہو۔“ عاشر نے اس کے بال دھیرے سے چھوئے۔

”چلو آؤ میرے ساتھ۔“ عاشر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھڑا کیا۔

”کہاں؟“

”جہاں لے جاؤں۔“ گاڑی کی چابی اس کی پینٹ کی جیب میں تھی۔ اس نے افراح کو فرنٹ سیٹ پہ ساتھ بٹھایا۔ باہر بارش کی تیزی میں اضافہ ہوگیا تھا۔ دونوں طرف کے شیشے کھلے تھے۔ بارش کی بوچھاڑ اندر آرہی تھی اور سرد ہوا کے ساتھ مل کر جسم میں پھریری دوڑا رہی تھی۔

”آؤ بارش کو محسوس کرتے ہیں۔“ عاشر نے اسپیڈ بڑھادی تھی۔ آدھے گھنٹے سڑکوں پہ سرگشت کرنے کے بعد وہ دونوں چھوٹے چچا کی طرف گئے، جہاں عالیہ اور امین پہلے سے بیٹھے ہوئے تھے۔

❀ ❀ ❀

حماد نے اپنے آفس کے لیے مناسب جگہ دیکھ کر بسم اللہ کردی تھی۔ وہ دونوں لیدر گڈز کا کاروبار ایک دوسرے کی شراکت میں شروع کر چکے تھے۔ پہلے دن جب وہ تیار ہو کر ڈائننگ ٹیبل پہ پہنچا تو افراح گرما گرم ناشتا پہلے ہی لا کر رکھ چکی تھی۔ جب وہ گھر سے نکلنے لگا تو اس نے کچھ پڑھ کر عاشر کے سینے پہ پھونک ماری اور بند مٹھی اس کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟" عاشر حیرانی سے ہاتھ میں دبے دس، بیس، پچاس اور سو کے نوٹوں کے رول کو دیکھ رہا تھا۔

"آپ گاڑی میں جاتے اور آتے ہیں، راستے میں چوراہوں اور اشاروں پہ بہت سے مانگنے والے ملیں گے، ان میں سے ایک ایک دیتے جانا آپ۔ میں خود اسکول جاتی تھی تو پہلے جمع نہیں ہوتے تھے، شادی کے بعد میرا گھر سے نکلنا ہی نہیں ہوا تو یہ قرض چڑھ گیا ہے مجھ پہ۔" وہ بہت ہی آہستہ آواز میں بول رہی تھی جیسے کوئی سن لے گا۔ عاشر کو ایک بار پھر حیرانی نے آ لیا۔ کیا تھی یہ لڑکی۔ وہ سمجھ ہی نہیں پایا تھا۔ راستے میں جہاں جہاں گاڑی رکتی چاروں طرف سے مانگنے والوں کی یلغار ہو جاتی۔ عاشر نے چپکے سے اپنا بٹوا کھول کر کچھ پیسے نکال کر افراح کے دیے پیسوں میں شامل کر لیے۔ جب اس نے پہلا نوٹ دس گیارہ سال کے معصوم سے بچے کو دیا جو آس بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا تو وہ بہت خوش ہوا۔ عاشر بھی اپنا قرض اتار رہا تھا۔ دل کو جو طمانیت اور سرور آج ملا تھا اس سے پہلے ایسا احساس اسے کبھی نہیں ہوا تھا۔

☼ ☼ ☼

عاشر اپنی سب جمع پونجی کاروبار میں جھونک چکا تھا، اب اس کے پاس کچھ بھی نہیں تھا اور اچھے خاصے پیسوں کی ضرورت تھی۔ وہ قدرے پریشان تھا۔ رات وہ بستر پہ لیٹا ہوا رقم کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا جب افراح نے اس کا بازو ہلایا۔

"کیا بات ہے، آپ کیوں پریشان ہیں؟" وہ بلا کی ذہین تھی۔ اس کا چہرہ دیکھتے ہی تاڑ گئی تھی کہ وہ اپ سیٹ ہے۔

"میں نے سب کچھ کاروبار میں انویسٹ کر دیا ہے۔ ابھی بھی مزید پیسوں کی ضرورت ہے۔ سمجھ میں نہیں آرہا کہ کیا کروں؟" افراح کا لہجہ اتنا مہربان تھا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے بتانے لگا۔ وہ الماری کی طرف گئی۔ کھٹر پٹر کی آوازیں آرہی تھیں۔ عاشر دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھے لیٹا تھا۔ پتا نہیں وہ کیا کر رہی تھی۔ عاشر نے اٹھ کر نہیں دیکھا۔ کچھ دیر بعد وہ اس کے پاس آئی۔ ہاتھوں میں پوٹلی دبی تھی۔

"یہ لیں، ہو سکتا ہے اس سے آپ کا کام چل جائے۔" افراح نے پوٹلی میں بندھے سونے کے زیورات اس کی طرف بڑھائے۔ وہ سمجھ چکا تھا، پر اس نے ہاتھ آگے نہیں کیے۔

"میرے بینک اکاؤنٹ میں بھی کچھ پیسے پڑے ہیں، حق حلال کی کمائی ہے، دو لاکھ سے اوپر ہی ہوں گے۔"

"واہ تم تو بہت امیر ہو۔" عاشر کا انداز وہی تھا۔

"ہاں الحمدللہ میں بہت سوں سے اچھے حال میں ہوں اور امیر ترین ہوں۔" افراح کے لہجے میں شکر گزاری کا جذبہ نمایاں تھا۔

"تم یہ زیور مجھے کیوں دے رہی ہو کیونکہ میں نے سنا ہے سونا عورتوں کو بہت عزیز ہوتا ہے۔" عاشر کسی کھوج میں تھا۔

"آپ کو ضرورت ہے نا پیسوں کی، اس لیے دے رہی ہوں۔ بعد میں اور بنوا دیجیے گا۔"

"لیکن زیور کے ساتھ عورت کی وابستگی ضرب المثل ہے۔" وہ اصرار کر رہا تھا۔

"مجھے آپ سے زیادہ کچھ بھی عزیز نہیں ہے۔" افراح کا جواب واضح تھا۔ عجیب سی خوشی عاشر کے رگ و پے میں دوڑنے لگی تھی۔ وہ اس خوشی اس جذبے کو نام دینے سے قاصر تھا۔

"اللہ نے چاہا تو کوئی نہ کوئی سبب بنا دے گا۔ تم اپنا زیور سنبھالو۔ ویسے میں تمہاری آفر کی قدر کرتا ہوں۔" عاشر مسکرا رہا تھا۔ افراح مایوسی سے سب زیور دوبارہ ڈبوں میں رکھ رہی تھی کیونکہ اسے اچھی

طرح ختم تھا، عاشر کا انکار اقرار میں نہیں بدلے گا۔

☆ ☆ ☆

ماہ نور کی عدت ختم ہو چکی تھی۔ وہ رافعہ کے ساتھ ان کے گھر آئی ہوئی تھی۔ عاشر آفس میں تھا۔ عالیہ نے فون کر کے اسے بھی بلوا لیا تھا۔ افراح کچن میں مہمانوں کی خاطر مدارات کا انتظام کر رہی تھی۔ ظہر کی نماز پڑھ کر اس نے کھانے کی ٹیبل سجائی اور سب کو بلایا۔ عاشر کے ساتھ رکھی کرسی پہ ماہ نور بیٹھی تھی، جبکہ افراح خود عالیہ کے ساتھ بیٹھی تھی۔ افراح ڈش اٹھا اٹھا کر سب کی پلیٹ میں کچھ نہ کچھ ڈال رہی تھی۔

ماہ نور نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا۔ افراح نے نماز کے اسٹائل میں دوپٹا اوڑھا ہوا تھا۔ اس کا چہرا دھلا دھلایا سا کسی قسم کے میک اپ کے بغیر تازگی بھرا تاثر دے رہا تھا۔ وہ سادگی و پرکاری کی مثال تھی، جیتی جاگتی۔

کھانے کے بعد عاشر واش بیسن پہ ہاتھ دھو رہا تھا، وہ تولیہ لیے اس کے پاس کھڑی تھی۔ عاشر کے کندھے سے اس کا سر تھوڑا نیچے تھا، لیکن اس کے پاس کھڑی وہ اس کا پرفیکٹ میچ نظر آ رہی تھی۔ ماہ نور حسد کی تیز پھوار میں بھیگ گئی تھی۔ اس نے مایوس نگاہوں سے رافعہ کی طرف دیکھا۔ وہاں امید کا پیغام واضح تھا۔

کھانے کے بعد افراح چائے بنانے باورچی خانے میں گئی تو ماہ نور، عاشر کے ساتھ بیٹھ گئی۔ وہ پرانے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھی۔

"پرسوں میری برتھ ڈے ہے، تم ضرور آنا، ورنہ میں سیلیبریٹ نہیں کروں گی۔" وہ دھونس جما رہی تھی۔

"کیوں؟"

"کیونکہ میں نے صرف تمہیں ہی انوائیٹ کیا ہے۔"

"اوکے میں ضرور آؤں گا۔" عاشر نے وعدہ کیا۔

عاشر کے سیل فون پہ ماہ نور کی کالز اور میسجز کی تعداد بڑھنے لگی تھی۔ ہر گھنٹے بعد وہ اسے کال کرتی کہ کہاں ہو، کیا کر رہے ہو؟ تھوڑی تھوڑی دیر بعد اس کے میسج آتے۔ وہ رات لیٹتا ہوتا تو ماہ نور کی کال آجاتی۔ وہ آہستہ آواز میں بات کرتا۔ ایک لفظ بھی افراح کے پلے نہ پڑتا۔ ماہ نور روز اسے ملنے کے لیے بلاتی۔ کبھی کبھی وہ ٹائم نکال کر چلا جاتا۔ آج بھی ماہ نور نے اسے لانگ ڈرائیو پہ چلنے کو کہا تھا۔ وہ آفس سے جلدی اٹھ آیا تھا۔ خالہ نے گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ ماہ نور تیار ہو کر اس کے انتظار میں بیٹھی تھی۔

ماہ نور نے ایک آئس کریم پارلر سے اپنے فیورٹ فلیور کی آئس کریم کھائی۔ اس نے ڈھیروں باتیں کیں۔

"عاشر! میں بہت شرمندہ ہوں، اپنے گزرے کل کے فیصلے پہ۔ میں اپنے غلط فیصلے کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔"

"تم کیسے تلافی کرو گی؟" عاشر کے انداز میں دلچسپی تھی۔

"دیکھو میں مانتی ہوں اس وقت کچھ غلط ہوا تھا۔ امی، ابو کی وجہ سے میں پریشان ہو گئی تھی، کیونکہ ہر والدین کی طرح ان کی خواہش تھی کہ میری شادی اچھے کھاتے پیتے گھر کے لڑکے کے ساتھ ہو۔ اس لیے انہوں نے منگنی توڑی تھی۔ میں کیا کرتی ان کے کہے کا مان رکھنا ضروری تھا۔ ورنہ میرے دل میں تم ہی تھے۔ مجھے آج بھی وہ سب باتیں یاد ہیں۔ مجھے سب پتا ہے تمہارے دل کی خبر ہے، آج بھی یہاں میں ہی ہوں۔"

ڈرائیو کرتے عاشر کے سینے پہ ماہ نور نے انگلی رکھی تھی۔ عاشر نے نہ انکار کیا نہ اقرار، اس کی ساری توجہ ڈرائیونگ کی طرف تھی۔ ماہ نور پرانی یادیں دہرا رہی تھی۔ ان کا گھنٹوں ایک دوسرے کے ساتھ بحث کرنا، ماہ نور کا ان کے گھر چکر لگانا۔ بھاگ بھاگ کر اس کی مدد کرنا۔ اسے سب یاد تھا سوائے اس کے کہ عاشر کے ارمانوں کا خون کیسے ہوا تھا۔ اس کے خواب کیسے ٹوٹے تھے۔ وہ ٹوٹ کر پھر کیسے جڑا تھا۔ اسے سنبھالنے والے ہاتھ کس کے تھے۔ ماہ نور بالکل بے خبر تھی۔

٭ ٭ ٭

"ماہ نور کیا کہتا ہے عاشر؟" رافعہ نے بے تابی سے پوچھا۔

"امی! ابھی تک تو اس نے کچھ بھی نہیں کہا ہے۔"

"اس کا رویہ کیسا ہے تمہارے ساتھ؟"

"امی! رویہ تو بہت اچھا ہے عاشر کا۔ لیکن ہم نے اچھا نہیں کیا اس کے ساتھ۔ کتنی جلدی کی نا منگنی توڑنے میں۔ آج عاشر کے پاس سب کچھ ہے۔" ماہ نور وہ پچھتاوے مار دوا سے جا رہے تھے۔

"میں عالیہ سے بات کروں گی۔ تمہاری خالہ بہت پیار کرتی ہیں تم سے۔ تمہارے ساتھ قسمت نے عجیب کھیل کھیلا ہے۔ ہمیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے۔ میں بہن بھائی سے بھی معافی مانگ لوں گی۔ پرانے رشتے پھر سے جڑنے کی امید رکھی جا سکتی ہے۔ مرد دو دو شادیاں بھی تو کرتے ہیں۔" رافعہ کا انداز بہت خود غرضانہ اور سنگ دلانہ تھا۔

"سچ امی! ایسا ممکن ہے؟" ماہ نور نے ان کے ہاتھ پکڑ لیے تھے۔

"ہاں ہاں عورت کے آنسوؤں اور میٹھے بولوں میں بہت بڑی طاقت ہوتی ہے۔ تم اپنا ہنر اور طاقت عاشر پہ آزماؤ۔ افراح کی طرف سے وہ خود ہی بے زار ہو جائے گا۔" رافعہ اسے سمجھا رہی تھیں۔

٭ ٭ ٭

رافعہ دوپہر کھانے کے بعد سے عالیہ کے ساتھ کمرا بند کر کے بیٹھی تھیں۔ افراح بھی کمر سیدھی کرنے لیٹ گئی۔ سو کر اٹھی تو دھوپ ڈھل رہی تھی۔ اس نے کچن میں آکر چائے کا پانی چولہے پہ رکھا اور خود عالیہ کو اٹھانے ان کے کمرے کی طرف آئی۔ ان کے کمرے کا دروازہ ذرا سا کھلا ہوا تھا اور باتیں کرنے کی آواز باہر تک آ رہی تھی۔ وہ دونوں یہی سمجھ رہی تھیں کہ افراح سو رہی ہے۔ اس لیے بے فکری سے اونچی آواز میں مصروف گفتگو تھیں۔

"مرد کو چار شادیوں کا حق حاصل ہے۔ پھر ماہ نور تمہارا اپنا خون ہے۔ عاشر اور وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ کیا ہوا جو دونوں کی شادی ہو جاتی ہے۔ افراح بھی ایک کونے میں پڑی رہے گی۔ میں ظالم نہیں ہوں جو اسے طلاق دلوانے کا مطالبہ کروں گی۔ پھر ماہ نور تمہاری اپنی ہے اور اپنا آخر کار اپنا ہی ہوتا ہے۔ خالہ سمجھ کر ساری عمر تمہاری خدمت کرے گی۔ مجبور ہو کر تمہارے پاس آئی ہوں۔ میری بیٹی اجڑ گئی ہے، رحم کرو میری بچی پہ۔"

رافعہ کی آواز درد بھری، آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جواب میں عالیہ نے کیا کہا، افراح کو سنائی نہیں دیا۔ اس کے کان سائیں سائیں کر رہے تھے۔ اسے زور کا چکر آیا تھا۔ کھڑکی کے پٹ کو تھام نہ لیتی تو یقیناً گر جاتی۔ بے رحمی اور سنگ دلی کی انتہا کیا ہوتی ہے یہ آج جانا تھا اس نے۔ خود غرضی اور طوطا چشمی کیا ہوتی ہے، یہ عقدہ بھی آج کھلا تھا اس پہ اور دل کی تڑپ رگیں کیسے ٹوٹتی ہیں۔ یہ حقیقت بھی آشکار ہوئی تھی اس پہ۔

وہ ڈولتے لڑکھڑاتے قدموں سے واپس باورچی خانے میں آئی جہاں چولہے پہ چائے کا پانی کھول کھول کر سیاہ ہو رہا تھا۔ پانی کافی حد تک سوکھ گیا تھا۔ اس نے پتیلی اٹھا کر سنک کے نیچے رکھی اور نئی پتیلی میں پھر سے چائے کا پانی رکھا۔ آنکھوں پہ لگاتار ٹھنڈے پانی کے چھینٹے مارے تو سرخی کچھ کم ہوئی اور وہ اس قابل ہوئی کہ چائے کی ٹرے اندر لے جا سکے۔ ان دونوں کو چائے دے کر وہ لان میں بیٹھ گئی تھی۔ آج بہت دنوں بعد ابا پھر اسے یاد آ رہے تھے۔

رات عاشر گھر آیا تو وہ بیڈ روم بند کیے لیٹی ہوئی تھی۔ عالیہ نے اسے بتا دیا تھا کہ افراح کی طبیعت خراب ہے۔ وہ فوراً اس کے پاس آیا۔

"کیا ہوا ہے تمہیں؟" عاشر کا ایک ہاتھ اس کے ماتھے پہ تھا۔ وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ وہ یک ٹک عاشر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ سادہ و جاذب نظر چہرا، بے ریا آنکھیں بھلا اس کے ساتھ کیسے دھوکا کر سکتی ہیں۔ کیا اس کے ساتھ محبت سے بتائے گئے پل جھوٹ تھے،

کیا اس کی چاہتیں، وارفتگی، والہانہ پن، فریب تھا۔ لیکن کیسی محبت، کیسی چاہت، کیسا والہانہ پن، کیونکہ عاشر نے شادی کے بعد سے آج تک ایک بار بھی اظہار محبت نہیں کیا تھا۔ وہی محبت کا تاج محل بنا کر پوجا کر رہی تھی۔ اس نے عاشر کی کزنز کی زبانی عاشر اور ماہ نور کی طوفانی محبتوں کے قصے سنے تھے، یہ قصے صرف اسے ہی خاص طور پہ زیب داستان کے لیے بڑھا چڑھا کر بیان کیے گئے تھے۔

"کچھ نہیں، بس ایسے ہی تھوڑی تھکن ہو گئی تھی۔" وہ پھیکے انداز میں مسکرائی اور اٹھ کر بیڈ سے اترنے کی کوشش کی، عاشر نے اسے روک دیا۔

"تم ریسٹ کرو، باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ممی مینج کر رہی ہیں۔" وہ جان گیا تھا کہ وہ کیوں باہر جانا چاہ رہی ہے۔ افراح فرماں بردار بچے کی طرح چادر تان کر لیٹ گئی تھی۔

عاشر اس کے چادر میں چھپے ہلتے وجود کو دیکھ رہا تھا۔ وہ رو رہی تھی۔ کچھ دن سے اس کی یہی حالت تھی۔ اس کی آنکھیں روئی روئی نظر آتیں اور وہ اسے کھوئے کھوئے انداز میں دیکھتی جیسے آخری بار دیکھ رہی ہو۔ عاشر پہلے ہی بے حد الجھا ہوا تھا۔ کھانا کھانے کے دوران امی نے اسے رافعہ خالہ کی آمد کے سبب کے بارے میں مطلع کر دیا تھا۔

☆ ☆ ☆

ماہ نور ان کے گھر رہنے کے لیے آ رہی تھی۔ عالیہ بہت خوش تھیں۔ افراح نے اپنے بیڈ روم کے برابر والا کمرا صاف کر کے تیار کر دیا تھا۔ عالیہ نے مختلف اشیا کی لسٹ امین صاحب کو بنا دی تھی۔ نئے سرے سے گوشت، سبزی سے فریج بھر گیا تھا۔ مختلف اقسام کے اچار، چٹنیاں، مربے، پاستا، میکرونی، کولڈ ڈرنک منگوا کر انہوں نے رکھ دی تھیں۔ عالیہ نے کچے قیمے کے کباب خود اپنے ہاتھ سے بنا کر فریز کیے تھے، کیونکہ ماہ نور کو پسند تھے۔

افراح خاموشی سے سب دیکھ رہی تھی۔ عالیہ آنٹی نے آج تک اس کے ساتھ ساس، بہو والا روایتی رویہ نہیں اپنایا تھا۔ ہمیشہ شفقت سے پیش آتیں، لیکن ابھی اسے لگ رہا تھا اس معاملے میں وہ اس کے ساتھ امتیازی سلوک کر رہی ہیں۔ ماہ نور کو خصوصی پروٹوکول دیا جا رہا تھا۔ امین صاحب مرد تھے، اکثر گھر سے باہر رہتے۔ اس لیے ان معاملات سے قریب قریب لاتعلق تھے۔ لیکن عاشر تو بے خبر نہیں تھا کہ خالہ پھر سے کیوں مہربان ہو رہی ہیں۔ وہی ماہ نور کیوں پروانے کی طرح اس کے گرد چکرانے لگی ہے۔ وہ کس مقصد کے لیے ان کے گھر رہنے آ رہی تھی، وہ اچھی طرح جانتا تھا۔

سب کام ختم کر کے افراح باہر لان میں بیٹھ گئی تھی۔ اس کے لگائے گئے پودوں میں ننھی ننھی شاخیں اور پتے سر ابھار رہے تھے۔ درخت سبزے کی چادر پھر سے اوڑھنے کی تیاری کر رہے تھے۔ موسم بدل رہا تھا، بہار کی آمد آمد تھی۔ آسمان پہ بادلوں کے جھنڈ مسلسل تین دن سے جمع ہو رہے تھے، پر برس نہیں رہے تھے۔ بادلوں اور دھوپ کی آنکھ مچولی سے اس کا دل گھبرانے لگا تھا، حالانکہ ابر آلود موسم چھم چھم برستی گھٹا اس کی کمزوری تھی۔ اب یہ ہی موسم اسے وحشت پہ اکسانے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

ڈرائیور اس کا بیگ اور چھوٹا سا سوٹ کیس گاڑی میں رکھ چکا تھا۔ رافعہ نے کامیابی کے احساس سے چمکتی آنکھوں سمیت اسے خدا حافظ کہا تھا۔ ماہ نور اپنی خالہ کے گھر رہنے جا رہی تھی۔ اسے عالیہ خالہ سے شروع سے ہی محبت تھی۔ وہ ایک کماؤ پوت بیٹے کی ماں تھیں۔ عاشر ذاتی گھر کا مالک تھا۔ اب تو اس کا معاشرے میں ایک مقام تھا اور وہ ماہ نور کے معیار کے عین مطابق بھی ہو چکا تھا۔ تو دل میں سوئی محبت یا غرض ایک بار پھر انگڑائی لے کر بیدار ہو چکی تھی۔ اس نے رات ہی عاشر کو فون پہ بے حجابانہ کھل کر کہا تھا۔

"میں تم سے جواب لینے آ رہی ہوں۔"

عدت کے بعد سے وہ عاشر کے ساتھ گھوم پھر رہی تھی۔ تقریباً" ہر تیسرے دن خالہ اسے فون کرکے اپنی طرف بلالیتیں اور کھانا کھائے بغیر جانے ہی نہ دیتیں۔ خون کی محبت نے اب کہیں جاکر جوش مارا تھا جب عاشر اپنا کاروبار شروع کرچکا تھا۔ اب وہ ان کی بیٹی ماہ نور کو زندگی کی تمام سہولیات دے سکتا تھا۔ اب وہ پہلے والا بے روزگار نکما استاد جاوید کی ورکشاپ پہ معمولی معاوضہ لینے والا عاشر نہیں تھا۔ وہ اپنی ذاتی کمائی سے گھر بنا چکا تھا۔ کاروبار کررہا تھا۔ اس کے پاس گاڑی تھی اور بیوی بھی تھی۔ لیکن بیوی کا کیا تھا۔ ایک بار ماہ نور کے ساتھ اس کی شادی ہوجاتی تو ماہ نور نے خود ہی افراح کا پتا صاف کردینا تھا۔ مسکین سی منحنی مرنجان سی تو لڑکی تھی۔ جسے سوائے نماز پڑھنے اور گھر کے کاموں کے کچھ آتا ہی نہیں تھا۔ ان کی ماہ نور جیسا ناز نخرا اس میں کہاں تھا۔ ماہ نور بڑے آرام سے افراح کو چاروں خانے چت کرسکتی تھی۔ رافعہ کو اپنی اور اپنی بیٹی کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔ ماہ نور ہاتھ ہلاتی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی۔ آسمان پہ گھٹائیں برسنے کی تیاری میں تھیں۔ ماہ نور کو یہ موسم بہت پسند تھا۔ بارش انجوائے کرنے کے لیے اس کے پاس بہت سے پلان تھے۔

آج چھٹی تھی۔ عاشر نے سارا دن گھر پہ ہی ہوتا تھا۔ ماہ نور نے اس کے ساتھ لانگ ڈرائیو پہ جانا تھا' محبت کی تجدید کرنی تھی۔ اپنے خیالوں میں مگن وہ مطلوبہ گھر تک پہنچ گئی تھی۔ ڈرائیور ہارن دے رہا تھا' گیٹ کھل چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

سلسلہ نہ ختم کرو
یہ ناطہ توڑ کے دیکھو
نظر پھر تم کو نہ آئے گا
محبت چھوڑ کے دیکھو
اذیت کیا ہے گر یہ جاننے کا شوق ہے تم کو
سب حسین خواب یکجا کرو
اور توڑ کے دیکھو

اندیشے وسوسے اور وحشتیں بندھ جائیں گی اس میں

جو اس نے توڑا تھا تعلق اسے تم جوڑ کے دیکھو
اگر چھنا ہو اس کے غم
مگر کیسے نہ سمجھے تو
کتاب زیست میں ورق محبت موڑ کے دیکھو

ماہ نور آرہی تھی۔ عالیہ آنٹی' عاشر خوش نظر آرہے تھے' امین انکل کے دل میں کیا تھا اسے خبر نہیں تھی۔ کل کے لنچ اور ڈنر کا مینو عالیہ آنٹی نے اسے بتا دیا تھا۔ ویسے بھی اتوار تھا۔ عاشر نے گھر پہ ہی ہونا تھا۔

اسے پتا تھا ماہ نور کیوں آرہی ہے۔ وہ اپنے سابقہ منگیتر اور محبت کو حاصل کرنے آرہی تھی' عاشر کے دل میں کیا تھا' وہ جان ہی نہیں پائی تھی۔

وہ سخت دل گرفتہ تھی۔ رات عاشر کے گھر آنے سے پہلے ہی اس نے اپنے کپڑوں کے تین' چار جوڑے اور کچھ پیسے الگ سے رکھ لیے تھے' اسے ماہ نور کے آنے سے پہلے یہاں سے چلے جانا تھا۔ اپنی ہار کا تماشا کم سے کم وہ ماہ نور کے سامنے برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ پہلے اس کا دل چاہا آخری بار عاشر کے سامنے اپنا حال دل کھول کر رکھ دے۔ اس مقصد کے لیے اس نے دو بار قلم اٹھایا تھا' پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ اپنے پندار اور خودداری کی توہین اسے گوارا نہیں تھی اور پھر جب بھیک میں کچھ نہ ملتا تو خالی دامن دیکھ کر اسے ہی دکھ ہوتا۔

رات وہ عاشر کی طرف سے کروٹ لے کر قدرے دور ہو کر سوئی۔ ایک دو بار اس نے افراح کو جگانے کی کوشش کی' لیکن پھر کوشش ترک کر دی۔ وہ بہت پراسرار سی لگ رہی تھی۔ عاشر کو نیند ہی نہیں آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے سے باہر آگیا' اس کا رخ کتابوں کی سمت تھا۔ وہ کتاب نکال رہا تھا۔ جب اس کی نظر الماری میں کتابوں کے پیچھے رکھے گئے بیگ پہ پڑی۔ اس نے کھولا تو اندر افراح کے کپڑے اور پیسے پڑے تھے۔ وہ پلک جھپکتے ہی اس بیگ کے راز تک پہنچ گیا تھا۔ اس نے نکالی گئی کتاب واپس وہیں رکھ دی۔ باہر

تیز ہوا چل رہی تھی۔ آسمان پہ بادل تھے۔ موسم بہار کی پہلی بارش متوقع تھی' کیونکہ ہوا میں پانی سا بھاری پن تھا۔ عاشر بیگ نے کر واپس بیڈ روم میں آیا اور نظر بچا کر ایک جگہ رکھ دیا۔ افراح آسانی سے نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ عاشر کو نیند نہیں آرہی تھی۔ اس نے احتیاطاً" ساڑھے پانچ بجے کا الارم لگا دیا۔

افراح اپنے وقت پہ بیدار ہوئی۔ نماز اور دیگر معمولات سے فارغ ہو کر اس نے ناشتا تیار کر کے امین انکل' عالیہ آنٹی اور عاشر کو دیا۔ خود اس نے صرف چائے پی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس نے سب کام بھی نمٹا لیے۔ وہ اب تیار تھی۔ کتابوں کے پیچھے کتنی بار بیگ دیکھ آئی تھی وہ ہوا تو سہی۔ وہ دوبارہ کمرے میں آئی تو عاشر کھڑکی کے پاس کھڑا لحہ بہ لحہ گہرے ہوتے بادلوں کو دیکھ رہا تھا۔ افراح کی متلاشی نگاہیں کمرے میں چاروں طرف گردش کر رہی تھیں۔

"اس کی تلاش ہے تمہیں پہ تو۔" عاشر نے اچانک پلٹ کر بیگ اس کے سامنے کیا تو وہ ہکا بکا ہو کر خوف زدہ نگاہوں سے اسے تکنے لگی۔ عاشر نے بازو بڑھا کر اسے خود سے قریب کیا۔

"تم مجھے جینا سکھا کر اب اکیلا چھوڑ کر کس کے آسرے پہ جا رہی ہو۔ تمہارے بغیر میں پاگل ہو جاؤں گا۔ کہیں کا نہیں رہوں گا۔ میں سچ کہہ رہا ہوں اعتبار کر لو میرا۔" عاشر کے لفظ لفظ میں سچائی تھی۔

"آپ تو ماہ نور سے محبت کرتے ہیں' وہ پھر سے ٹوٹے رابطے بحال کرنے آرہی ہے۔" اس وقت وہ عاشر کو رعایت دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔

میں نے اس سے کبھی محبت کی ہی نہیں' ایک عمر دھوکے میں گزاری' یہی سمجھتا تھا کہ اس سے محبت کرتا ہوں' لیکن ماہ نور کی خود غرضی نے بہت جلد مجھے اس خوش فہمی کے خمار سے نکال دیا۔ میرا ضمیر خود غرضی' مادہ پرستی کی مٹی سے نہیں گوندھا گیا ہے۔ میں ایک عام سا محبت کرنے والا بے لوث انسان ہوں۔ محبت کیا ہوتی ہے' کیسے ہوتی ہے' میں نے اس لڑکی سے سیکھا' جو میری پریشانی تک برداشت نہیں

کر سکتی اور اپنے زیورات تک میرے سپرد کر دیتی ہے۔ اپنی محنت کی کمائی کے دو لاکھ روپے تک بخوشی مجھے دینے کے لیے تیار ہو جاتی ہے۔ وہ لڑکی محتاجوں' غریبوں' ضرورت مندوں کے ساتھ اپنے فرض ایمان داری سے چکاتی پھرتی ہے۔ میں اس معصوم 'سادہ دل' بے لوث لڑکی سے محبت کرتا ہوں' جس کے دل میں نیکی کے چھوٹے چھوٹے دیے روشن ہیں۔ روتی دھوتی افراح کو عاشر نے ننھے بچے کی مانند سینے سے لگا لیا تھا۔

"اور وہ جو ماہ نور ہمارے گھر آرہی ہے' رافعہ آنٹی نے جو باتیں کی تھیں خالہ آنٹی سے۔" وہ روتے ہوئے پوچھ رہی تھی۔

"وہ دونوں بہنیں ہیں۔ امی نے انہیں جواب دے دیا ہے۔ ابو کو بھی یہ سب پسند نہیں ہے' باقی رہ گئی ماہ نور تو وہ غلط فہمی کا شکار ہے۔ ابھی اس کی خوش فہمی دور ہونے والی ہے' تم فورا" تیار ہو جاؤ' ہم پورے ایک ہفتے کے لیے آؤٹ آف سٹی جا رہے ہیں۔ ہنی مون منانے' وہ بھی بائی روڈ' اب دیر مت کرنا۔"

"آنٹی کو بتا ہے۔"

"ہاں بابا' امی کو میں نے رات کو ہی بتا دیا تھا۔ تم فورا" امی سے مل کر تیار ہو کر گاڑی میں بیٹھو۔" عاشر نے اسے خود سے الگ کر کے کی چین اٹھائی۔ ماہ نور کا میسج آیا تھا' اس کے فون پہ۔ وہ تھوڑی دیر میں پہنچ رہی تھی۔

عاشر اور افراح گاڑی میں بیٹھ رہے تھے۔ جب باہر گیٹ پہ گاڑی کا ہارن بجا۔ عاشر نے ہی اتر کر گیٹ کھولا' کیونکہ اسے اپنی گاڑی بھی تو لے جانی تھی۔ ماہ نور حیرانی سے دونوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے گاڑی باہر گیٹ پہ ہی چھوڑ دی تھی۔ افراح تیار ہو کر عاشر کے پاس کھڑی تھی' مسافر لگ رہا تھا وہ کہیں جا رہے ہیں۔

"تت ــــ تم کہاں جا رہے ہو؟" ماہ نور کی زبان پوچھتے ہوئے لڑکھڑائی۔

"میں نہیں' ہم جا رہے ہیں ہنی مون کے لیے بائی روڈ اسلام آباد سے مری اور پھر وہاں سے دیگر جگہوں پہ ــــ کیونکہ میری بیوی کو بائے روڈ سفر کرنا پسند ہے۔" عاشر نے پاس کھڑی افراح کے کندھے پہ اپنا بازو پھیلایا تھا۔ وہ جھینپ سی گئی تھی۔ پر عاشر کے چہرے پہ محبت کے رنگ بکھرے تھے۔

"تم جاؤ اندر' امی تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔" عاشر گھوم کر ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھا۔ اس کے ساتھ افراح بھی بیٹھ چکی تھی۔ گاڑی گیٹ سے نکل رہی تھی۔ ماہ نور شکست خوردہ انداز میں ان دونوں کو جاتا دیکھ رہی تھی۔

عاشر مین روڈ پہ آتے ہی میوزک پلیئر کا بٹن آن کر چکا تھا۔ موسم خطرناک حد تک حسین ہو رہا تھا۔ افراح نے ہتھیلی شیشے سے باہر نکالی۔ بارش کی پہلی بوند اس کے ہاتھ پہ گری تھی۔

دھڑکن پہ میرے دل کی
بور ہتا ہے تیرے قدم
تیرے نام پہ میری زندگی
لکھ دی میرے ہمدم
ہاں سیکھا میں نے جینا جینا
کیسے سیکھا جینا جینا
میں نے جینا میرے ہمدم

عاطف اسلم کے ساتھ عاشر خود بھی گنگنا رہا تھا۔ افراح نے بے اختیار اس کے بالوں کو چھوا۔ اس نے ڈرائیونگ کرتے ہوئے ایک ثانیے کے لیے افراح کی طرف محبت پاش نگاہوں سے دیکھا۔

باہر سڑک پہ بوندوں کا رقص شروع ہو چکا تھا۔ اسٹیئرنگ پہ رکھے عاشر کے ہاتھ پہ افراح نے اپنا ہاتھ یقین دلانے والے انداز میں رکھا تھا۔ زندگی کا سفر محبت کی شاہراہ پہ بہت آسان ہو گیا تھا۔

تنزیلہ ریاض

عہدِ الست

نور محمد برطانیہ میں رہائش پذیر ہے اور لوٹن کی جامع مسجد میں موذن ہے۔ پیسے والا اور خوب جذبے والا ہے۔ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں رہتا ہے۔ جس کا ایک کمرا ایک عربی طالب علم اپنے دوست کے ساتھ شیئر کرتا ہے جبکہ دوسرے کمرے میں اس کے ساتھ ایرانی زین العابدین رہتا ہے اسے اپنے ایرانی ہونے پر فخر ہے۔ وہ برطانیہ میں اسٹڈی ویزے پر جاب کرتا ہے۔ سخت محنتی ہے مگر پاکستان میں موجود بارہ افراد کے کنبے کی کفالت خوش اسلوبی سے نہیں کرپارہا۔

عمر شہوز کا کزن ہے جو اپنی فیملی کے ساتھ انگلینڈ میں مقیم ہے۔ وہ لوگ تین چار سال میں پاکستان آتے رہتے ہیں۔ عمر اکثر اکیلا بھی پاکستان آجاتا ہے۔ وہ کافی منہ پھٹ ہے۔ اسے شہوز کی دوست امائمہ اچھی لگتی ہے۔ شہوز کی کوششوں سے ان دونوں کی منگنی ہوجاتی ہے۔

ڈاکٹر زارا شہوز کی سادہ مزاج منگیتر ہے۔ ان کی منگنی بڑوں کے فیصلے کا نتیجہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان محبت ہے لیکن شہوز کے کھلنڈرے انداز کی بنا پر زارا کو اس کی محبت پر یقین نہیں ہے۔

اس کے والد نے اسے گھر پر پڑھایا ہے اور اب وہ اسے بڑی کلاس میں داخل کرانا چاہتے ہیں۔ سر شعیب انہیں منع کرتے ہیں کہ ان کا بچہ بہت چھوٹا ہے۔ اسے چھوٹی کلاس میں ہی داخل کروائیں مگر وہ مصر رہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے بچے پر بہت محنت کی ہے۔ وہ بڑی کلاس میں داخلے کا مستحق ہے۔ سر شعیب اسے بچے پر ظلم سمجھتے ہیں مگر اس کے باپ کے

مکمل ناول





اصرار پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ وہ بچہ بڑی کلاس اور بڑے بچوں میں ایڈجسٹ نہیں ہو پاتا۔ اسکالر شپ حاصل کرنے والے اس بچے سے حیرت انگیز طور پر ٹیچرز اور فیلوز میں سے بیشتر ناواقف ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے باپ کی طرف سے غیر نصابی سرگرمیوں میں حصہ لینے پر سخت مخالفت ہے۔

وہ خواب میں ڈر جاتا ہے۔

73ء کا زمانہ تھا اور روپ نگر کا علاقہ۔

لِلی انڈیا میں اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ آیا تھا۔ اس کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ برطانیہ کے رہنے والے تھے۔ گرینڈ پا یہاں کسی پروجیکٹ کے سلسلے میں آئے تھے۔ گرینی نے یہاں کوچنگ سینٹر کھول دیا تھا۔ جیتا راؤ اس کے ہاں پڑھنے آتی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ماس مچھی کھانے والے کسی کے دوست نہیں بن سکتے۔ وہ وفادار نہیں ہو سکتے۔ گرینڈ پا کو بتایا تو وہ اسے سمجھاتے ہیں کہ قدرت نے ہمیں بہت محبت سے تخلیق کیا ہے اور ہماری فطرت میں صرف محبت رکھی ہے۔ انسان کا اپنی ذات سے اخلاص ہی اس کی سب سے بڑی وفاداری ہے۔

امائمہ کے کسی رویے پر ناراض ہو کر عمر اس سے انگوٹھی واپس مانگ لیتا ہے۔ زارا شہوز کو بتاتی ہے۔ شہوز اور عمر کا جھگڑا ہو جاتا ہے۔

اس کی کلاس میں سلیمان حیدر سے دوستی ہو جاتی ہے۔ سلیمان حیدر بہت اچھا اور زندہ دل لڑکا ہے۔ سلیمان کے کہنے پر پڑھائی کے ساتھ ساتھ کھیل میں بھی دلچسپی لینے لگتا۔ وہ اپنے گھر جا کر اپنی سے بیٹ کی فرمائش کرتا ہے تو اس کے والد یہ سن لیتے ہیں۔ وہ اس کی بری طرح پٹائی کر دیتے ہیں۔ ماں بے بسی سے دیکھتی رہ جاتی ہیں۔ پھر اس کے والد اسکول جا کر منع کر دیتے ہیں کہ سلیمان حیدر کے ساتھ نہ بٹھایا جائے۔ سلیمان حیدر اس سے ناراض ہو جاتا ہے اور اسے ابنارمل کہتا ہے۔ جس سے اس کو بہت دکھ ہوتا ہے۔

کلاس میں سلیمان حیدر پہلی پوزیشن لیتا ہے۔ پانچ نمبروں کے فرق سے اس کی سیکنڈ پوزیشن آتی ہے۔ یہ دیکھ کر اس کے والد غصے سے پاگل ہو جاتے ہیں اور کمرا بند کر کے اسے بری طرح مارتے ہیں۔ وہ وعدہ کرتا ہے کہ آئندہ پینٹنگ نہیں کرے گا۔ صرف پڑھائی کرے گا۔

اس کے والد شہر کے سب سے خراب کالج میں اس کا ایڈمیشن کراتے ہیں۔ تاکہ کالج میں اس کی غیر حاضری پر کوئی کچھ نہ کہہ سکے اور اس سے کہتے ہیں کہ وہ گھر بیٹھ کر پڑھائی کرے۔ باہر کی دنیا سے اس کا رابطہ نہ ہو۔ اس کا کوئی دوست نہیں ہے۔

امائمہ کی والدہ شہوز کو فون کرتی ہیں۔ شہوز کے سمجھانے پر عمر کو عقل آجاتی ہے اور وہ اپنے والد کو فون کرتا ہے۔ جس کے بعد عمر کے والد امائمہ کے والد کو فون کر کے کہتے ہیں کہ بچوں کا نکاح کر دیا جائے۔ دونوں کے والدین کی رضامندی سے عمر اور امائمہ کا نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے چند دن بعد عمر لندن چلا جاتا ہے۔

نکاح کے تین سال بعد امائمہ عمر کے اصرار پر اکیلے ہی رخصت ہو کر لندن چلی جاتی ہے۔ لندن پہنچنے پر عمر اور اس کے والدین امائمہ کا خوشی خوشی استقبال کرتے ہیں۔

امائمہ عمر کے ساتھ ایک چھوٹے سے فلیٹ میں آجاتی ہے جبکہ عمر کے والدین اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ امائمہ اتنے چھوٹے فلیٹ میں رہنے سے گھبراتی ہے اور عمر سے اپنی خواہش کا اظہار کرتے ہوئے عمر کے والدین کے گھر رہنے کو کہتی ہے جسے عمر یہ کہہ کر رد کر دیتا ہے کہ وہ اپنے والدین پر مزید بوجھ نہیں ڈالنا چاہتا۔

اس شخص کے شدید اصرار پر نور محمد اس سے ملنے پر راضی ہو جاتا ہے۔ وہ اس سے دوستی کی فرمائش کرتا ہے۔ نور محمد انکار کر دیتا ہے لیکن وہ نور محمد کا پیچھا نہیں چھوڑتا ہے۔ وہ نور محمد کی قرات کی تعریف کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس نے نماز پڑھنا نور محمد سے سیکھا ہے۔ پھر وہ بتاتا ہے کہ اسے نور محمد کے پاس کسی نے بھیجا ہے۔ نور محمد کے پوچھنے پر کہتا ہے۔ خضر الٰہی نے بھیجا ہے۔

روپ نگر سے واپس برطانیہ آنے پر گرینڈ پا کا انتقال ہو جاتا ہے اور گرینی مسز ایرک کی دوستی بڑھنے لگتی ہے۔ وہ لِلی سے

کہتی ہیں کہ وہ اپنی ممی سے رابطہ کرے۔ وہ اسے اس کی ممی کے ساتھ بھجوانا چاہتی ہیں۔ بلی انکار کے باوجود وہ کوہو کو بلوالیتی ہیں اور اسے ان کے ساتھ روانہ کردیتی ہیں۔

میری کالج میں طلحہ اور راشد سے واقفیت ہوجاتی ہے۔

عمر نے اسے پبلک لائبریری کا راستہ بتا دیا ہے۔ عمر کو آرٹ سے کوئی دلچسپی نہیں۔ لیکن وہ امائمہ کی خاطر دلچسپی لیتا۔ دونوں بہت خوش ہیں۔ لیکن امائمہ وہاں کی معاشرت کو قبول نہیں کرپارہی۔ عمر کی دوست مارتھا کے شوہر نے امائمہ کو گلے لگا کر مبارک باد دی تو اسے یہ بات بہت ناگوار گزری گھر جاکر دونوں میں جھگڑا ہوگیا۔

کرینی کے انتقال کے بعد بلی کوہو کے ساتھ رہنے پر مجبور تھا۔ کوہو پہلے بھی کرینی سے اچھا خاصا معاوضہ وصول کرتی رہی تھی۔ بلی کو اپنے پاس رکھنے کے معاملے پر کوہو نے مسٹر ایرک سے جھگڑا کیا کیونکہ کرینی نے انہیں بلی کا نگراں مقرر کیا تھا۔ پھر دونوں نے سمجھوتا کرلیا اور کوہو نے مسٹر ایرک سے شادی کرلی۔

نور محمد احمد معروف کو اپنے ساتھ گھر لے آیا تھا۔ احمد معروف کے اچھے اطوار عمدہ خوشبو نفیس گفتگو اعلا لباس کے باعث وہ سب اسے پسند کرنے لگے تھے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد بھی اس سے گھل مل گیا تھا۔ احمد نے کہا تھا کہ وہ جہاں رہتا ہے وہاں سے مسجد کافی دور ہے اس لیے وہ اس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے۔ نور محمد اس سے کہتا ہے اسے دنیا سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اس کے لیے اللہ کا دین کافی ہے۔ احمد معروف کہتا ہے۔ "اللہ کا دین تو کیا دنیا اللہ کی نہیں ہے۔" "اسلام کی سب سے اچھی بات یہی ہے' اس میں دنیا کا انکار نہیں ہے۔ آپ دنیا کے ساتھ وہ مت کریں جو انہیں نے آپ کے ساتھ کیا تھا۔

صبا نورین کالج کی ذہین طالبہ ہونے کے ساتھ ساتھ بہت چالاک بھی تھی۔ صبا نے اس سے صرف نوٹس حاصل کرنے کے لیے دوستی کی تھی۔ اکیڈمی کے لڑکوں طلحہ اور راشد نے اسے دوسرا رنگ دے کر اس کا مذاق بنالیا۔ اس مسئلہ پر لڑائی ہوئی اور نوبت مارپیٹ تک پہنچ گئی۔

امائمہ اور عمر میں دوستی ہوگئی لیکن دونوں کو احساس ہوگیا تھا کہ ان کے خیالات بہت مختلف تھے۔

کوہو کے ساتھ رہتے ہوئے بھی زندگی کا محور صرف کتابیں اور اسکول تھا۔ ایک دوست کے ہاں پارٹی میں ایک عرصے بعد اس کی ملاقات جینا راؤ سے ہوئی۔ وہ اب نیا کہلاتی تھی۔ اس کا تعلق ہندوستان کے ایک بہت اعلا تعلیم یافتہ گھرانے سے تھا۔ وہ رقاصہ کے طور پر اپنے آپ کو منوانا چاہتی تھی اس لیے گھر والوں کی مرضی کے خلاف یہاں چلی آئی تھی۔

احمد معروف کی باتوں سے نور محمد عجیب الجھن میں مبتلا ہوجاتا ہے اور اپنے ذہن میں اٹھنے والے سوالوں سے گھبرا کر احمد معروف کو سوتے میں سے جگا دیتا ہے۔ نور محمد معروف کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا ہے اور اسے اپنے ماضی کے بارے میں بتانے لگتا ہے۔

اکیڈمی میں ہونے والی لڑائی کے بعد جنید اور طلحہ کے والدین کے ساتھ نور محمد کے والد کو بھی بلوایا گیا تھا۔ طلحہ اور جنید کے والدین اپنے بیٹوں کی غلطی ماننے کے بجائے نور محمد کو قصور وار ٹھہراتے ہیں جبکہ نور محمد کے والد اس کو مورد الزام ٹھہرا کر لاتعلقی ظاہر کرتے ہیں۔ اکیڈمی کے چیئرمین حمید کاوانی جنید اور طلحہ کے ساتھ نور محمد کو بھی اکیڈمی سے فارغ کر دیتے ہیں۔ نور محمد اکیڈمی سے نکالے جانے سے زیادہ اپنے والد کے رویے سے ٹوٹ جاتا ہے۔ وہ اسٹیشن کی طرف نکل جاتا ہے۔ ٹرین میں سفر کے دوران نور محمد کی ملاقات سلیم نامی جیب کترے سے ہوجاتی ہے۔ سلیم کو پکڑنے کے لیے پولیس چھاپہ مارتی ہے تو سلیم بھاگنے میں کامیاب ہوجاتا ہے' جبکہ نور محمد کو پکڑ کر پولیس تھانے لے آتی ہے اور پھر نور محمد کے والد پولیس کو رشوت دے کر اسے چھڑا کر گھر لے آتے ہیں۔

بھائی پھیرو سے لاہور تک کے پورے راستے میں نور محمد سے اس کے والد کوئی بات نہیں کرتے۔ لیکن گھر آکر وہ اونچی آواز میں چلا کر غصے کا اظہار کرتے ہوئے اس سے کہتے ہیں کہ "وہ آج سے اس کے لیے مرچکے ہیں اور اس سے ان کا کوئی

تعلق نہیں ہے۔" پہلی بار اس کی ماں بھی کہہ اٹھتی ہیں کہ اس سے بہتر تھا کہ وہ مرجاتا۔ نور محمد' احمد معروف کو اپنے بارے میں سب بتا رہا ہے۔ جسے سن کر احمد معروف کا دل بوجھل ہو جاتا ہے اور اسے نور محمد کو سنبھالنا مشکل لگتا ہے۔

بلی ثنا کو بے حد چاہتا ہے 'لیکن وہ انتہائی خود غرض 'مطلب پرست اور چالاک لڑکی ہے۔

بلی کے گھر فیملی فرینڈ عوف بن سلمان آتا ہے۔ جس کا تعلق سعودی عرب سے ہے۔ عوف کو فوٹو گرافی کا جنون کی حد تک شوق ہوتا ہے۔ بلی عوف سے ثنا کو ملواتا ہے۔ ثنا' عوف سے مل کر بہت خوش ہوتی ہے۔ عوف اپنے کیمرے سے رقص کرتی ثنا کی بہت سی خوب صورت تصویریں کھینچ لیتا ہے۔ عوف اور ثنا تصویروں کو فرانس میں ہونے والی کسی تصویری مقابلے میں بھیج رہے تھے۔ بلی ثنا کو ایسا کرنے سے روکنا چاہتا ہے۔ لیکن ثنا اس بات پہ بلی سے ناراض ہو جاتی ہے۔ عوف بتاتا ہے کہ وہ ثنا جیسی بناوٹی 'خود پسند لڑکی کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

بلی کو پتا چلتا ہے کہ اس کی ماں کو ہو کے عوف سے تعلقات ہیں 'زارا کے والدین زارا اور شہوز کی شادی جلد از جلد کرنا چاہتے ہیں 'جبکہ شہوز ایک ڈیڑھ سال تک شادی نہیں کرنا چاہتا ہے 'کیونکہ اس نے ایک مشہور اخبار کا چینل جوائن کر لیا ہے اور اسے اپنی جاب کے علاوہ کسی چیز کا ہوش نہیں رہا ہے۔ شہوز' زارا سے کہتا ہے کہ جب تک وہ اسے شادی کرنے کے لیے گرین سگنل نہیں دیتا اس وقت تک وہ پھپھو (یعنی اپنی والدہ) کو اس کے ڈیڈی سے شادی کی بات کرنے سے روک کر رکھے۔ زارا کے لیے یہ ساری صورت حال تخت اذیت کا باعث بن رہی ہے۔

امائمہ نور محمد کی بہن ہے۔ امائمہ کی ماں نے اس کی شادی عمر سے اسی لیے کی تھی کہ وہ لندن جاکر بھائی کو ڈھونڈے۔ وہ عمر کے علم میں لائے بغیر بھائی کو ڈھونڈنے کی کوششیں کرتی ہے 'مگر عمر کو پتا چل جاتا ہے۔ امائمہ یہ جان کر حیران رہ جاتی ہے کہ عمر' نور محمد کو جانتا ہے۔ وہ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ ثنا' رقاصہ بن چکی ہے مگر غلط ہاتھوں میں چلی جاتی ہے اور اپنا بہت نقصان کر کے بلی کو ملتی ہے۔ بلی اس وقت تک ایک کامیاب ناول نگار بن چکا ہے۔ وہ دونوں شادی کر لیتے ہیں۔ ثنا کو بچوں کی خواہش ہوتی ہے۔ کافی علاج کے بعد انہیں خوش خبری ملتی ہے 'مگر ثنا کے مس کیرج ہو جاتا ہے۔ ثنا خود کشی کر لیتی ہے۔

بلی کو کچھ لوگ مجبور کرتے ہیں کہ مسلمان دہشت گردوں کے خلاف ناول لکھے۔ وہ لوٹن کی مسجد کے موذن کے خلاف بات کرتے ہیں کہ وہ مسلمان دہشت گرد ہے۔ بلی اس موضوع پر ناول لکھنے کی تیاری کرتا ہے اور اس سلسلے میں نور محمد سے ملتا ہے۔ نور محمد سے احمد معروف کے نام سے ملنے والا شخص بلس کرانٹ ہی ہے 'مگر نور محمد سے مل کر اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس کے خلاف کی گئیں ساری باتیں غلط ہیں۔ وہ نور محمد سے متاثر ہونے لگتا ہے۔ کیونکہ وہ اسے اپنے سارے حالات بتا چکا ہوتا ہے کہ کس طرح اس کا باپ اس پر پڑھائی کے معاملے میں سختی کرتا تھا۔ کس طرح اکیڈمی سے نکالنے پر وہ لیبوا شتہ ہوا' پاگل ہوا۔ پھر اس کے ماموں اپنے ساتھ لندن لے آئے۔ وہاں انہوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور اپنی بگڑی ہوئی بیٹی ثریا سے شادی کردی' جو پانچ ماہ بعد ہی ماں بن گئی۔ نور محمد نے سب کچھ سمجھنے کے باوجود اس بچی سے محبت کی۔ اسے پالنے لگا۔ مگر جب ثریا نے بخار کی وجہ سے بچی کو برانڈی پلانے کی کوشش کی اور نور محمد کے منع کرنے کے باوجود باز نہ آئی تو تھپڑ مار دیا۔ جس پر ماموں نے اسے خوب لعن طعن کی اور وہ ان کا گھر چھوڑ کر یہاں آگیا۔ ماموں نے اس کے گھر والوں کو کہہ دیا کہ نور محمد ان کے گھر سے چوری کر کے بھاگ گیا ہے۔ تب سے نور محمد اور امائمہ کی ماں پریشان ہیں اپنے شوہر سے بھی بائیکاٹ کر چکی ہیں۔ زارا کی زندگی میں اتفاق سے نیپو نامی لڑکا آتا ہے۔ وہ بہت اچھا ہے۔ زارا اس پر بہت بھروسا کرتی ہے۔ شہوز خوب ترقی کر رہا ہے۔ اس کی ملاقات عوف بن سلمان سے ہوتی ہے۔ وہ شہوز کو اپنے ساتھ کام کرنے کی آفر دیتے ہیں۔ شہوز بہت خوش ہوتا ہے۔

۱۵
پندرہویں قسط

یہ 2007ء کا زمانہ تھا اور تب کئی ایک معروف نجی نیوز چینلز فیلڈ میں سکہ جما چکے تھے مگر وہ نیٹ ورک جسے سلمان حیدر منظر عام پر لانا چاہتا تھا وہ بھی کافی مضبوطی سے اپنا شکنجہ کسنے میں مگن تھا۔ اسے جہاں جہاں سے مثبت جواب کی توقع تھی وہاں اسے ٹالا جانے لگا اور ایک دو جگہوں سے مثبت جواب ملا بھی تو ان کی شرائط جو اس رپورٹ کی بلاوجہ ایڈیٹنگ سے متعلق تھیں اسے قبول نہیں تھیں۔

ان دنوں فنڈز اور انویسٹمنٹ کے نام پر ڈالرز اور یوروز کی بارش نے ہر نظام کو بوکھلا کر رکھ دیا تھا۔ معیشت کو ٹیکے لگا کر پھولا ہوا دکھانے کی کوشش میں اتنی محنت صرف کی جا رہی تھی کہ ہر وہ شخص جس کے دل میں ملک و قوم کا درد تھا وہ جذباتیت کا مارا ہوا قرار دیا جانے لگا اور سلمان تو واقعی پاکستان کے لیے بہت جذباتی تھا۔ اس کے اردگرد رہنے والے لوگوں کے غیر سنجیدہ رویے اسے بہت تکلیف دینے لگے تھے مگر وہ ڈٹا رہا لیکن اس کے باوجود اس کی کوششیں رنگ لانے میں ناکام رہی تھیں۔

آنے والا ہر دن اس کے لیے ناکامی کا ایک نیا در وا کرتا چلا گیا تھا۔ 2007ء کے آخر تک ملکی حالات میں کئی اتار چڑھاؤ آئے۔ ملک میں ایمرجنسی کا نفاذ ہو گیا۔ پھر ایک بڑی لیڈر کا سیاسی قتل ہر خبر پر حاوی ہو گیا۔ خواص اپنی الجھنوں اور عیاشیوں میں گم ہو گئے اور عوام کو اپنی پریشانیاں لاحق ہو گئیں۔ پاکستان کی سیاست کو نقصان پہنچانے والے عناصر اتنے سرگرم کبھی نہیں تھے جتنے ان ایام میں ہو گئے۔

مل گرانٹ عرف نور محمد کے کہنے کے عین مطابق رفاہی اداروں نے امداد کے نام پر جو چھوٹے چھوٹے بم قوم کے سر پر پھوڑے تھے، وہ پھٹنا شروع ہو گئے تھے۔ ملک میں دھڑا دھڑ غیر ملکی امداد آنے لگی اور پھر جانے بھی لگی۔ کیا آ رہا تھا کہاں سے آ رہا تھا۔ اس بارے میں کوئی بات سننے کو تیار نہیں تھا۔ کہاں جا رہا تھا۔ کون لے جا رہا تھا۔ اس بارے میں کوئی بات کرنے کو تیار نہیں تھا۔

امداد کے نام پر فنڈز آ رہے تھے۔ بدن بھر رہے تھے۔ روحیں مر رہی تھیں۔ ملک تاریکیوں کے اور قوم ٹیکنالوجی کے نام پر محبت کے گہرے دلدل میں غوطے لگانے لگی۔ غربت اپنے پنجے تیزی سے گاڑنے لگی۔ امارت ملک کے ایک کونے میں پر پھیلا کر مطمئن ہو کر بیٹھ گئی۔ ایک امیر شخص کے بیٹے کا سیل فون ایک غریب کے بچے کے پیٹ سے زیادہ بھرا رہنے لگا۔ لوڈشیڈنگ کا بحران۔۔۔ وکلا تحریک اور سیاسی کشمکش "افراط زر۔ زرعی اجناس کی مصنوعی قلت۔۔۔ جس کا دل جو چاہنے لگا۔ وہ اپنی من مانی کرنے لگا۔۔۔ جن کے دلوں میں ملک کا درد تھا وہ دعاؤں میں مصروف ہو گئے اور معجزوں کا انتظار کرنے لگے۔۔۔ ان ہی دنوں اس واقعہ سے متعلق دو اہم باتیں ہوئیں۔

☼ ☼ ☼

"مجھ بدبخت کے لیے کوئی اچھی خبر ہے آپ کے پاس۔"

سر آفاق نے ملتجی متلاشی منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھا تھا اور اسے لگا کہ بس اب وہ بول نہیں پائے گا۔ وہ اسی لیے دوبارہ ان سے ملنے کے لیے نہیں آیا تھا لیکن وہ جو سمجھ رہے تھے اس کا اظہار انہوں نے اپنی آنکھوں میں دھیرے دھیرے چھلکتی بے چینی کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے بھی کر دیا تھا۔

وہ کچھ عرصہ کراچی رہنے کے بعد ایک بار پھر لاہور آ گیا تھا اور اب اس کا ارادہ دوبارہ جلدی کراچی جانے کا نہیں تھا کیونکہ ملکی حالات نے ایسی کروٹ بدلی تھی کہ اب رکاوٹیں مزید بڑھ گئی تھیں۔ اس کا خیال تھا کہ وہ انہیں سب کچھ بتا دے گا لیکن اب ان کے لہجے کی آس و نراس والی کیفیت اور ان کی آنکھوں سے چھلکتی مدھم سی امید نے ہی اسے ڈگمگا کر رکھ دیا تھا۔ وہ انہیں کیا بتائے گا۔ وہ اس رپورٹ کو تو تیار کر رہا تھا۔ اس کے دل میں ملک کے لیے تو درد اٹھتا رہا تھا۔ حالات اسے بے چین و مضطرب بھی کرتے رہے تھے لیکن نور محمد کی موت کو اس نے عام سا واقعہ سمجھ کر

اہمیت دینے کی کوشش ہی نہیں کی تھی۔

یہ اس نے جان بوجھ کر نہیں کیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ ملک کے وسیع تر مفاد میں وہ جی جان سے جتا رہا تھا اور اتنے مسائل میں الجھا رہا تھا کہ اس کے دل میں نور محمد کا خیال آیا ہی نہیں تھا اور اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کے ماں باپ بھی تھے جو انتظار میں ہیں اور نجانے کب سے انتظار میں ہیں۔ سر آفاق نے اسے خود فون کر کے گھر بلوایا تھا۔ وہ خود کافی حیران تھا کہ انہوں نے اسے اتنے مہینوں بعد کیوں بلوایا ہے۔ اس نے سر آفاق کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ اسے ہی دیکھ رہے تھے۔ اس کے دیکھنے پر مسکرائے اور بولے۔

"میں جانتا ہوں آپ لندن میرے بیٹے کو تلاش کرنے ہی نہیں گئے تھے۔ آپ کی اپنی مصروفیات بھی ہوں گی۔۔۔ لیکن دراصل میں نے ایک امید سی باندھ لی تھی کہ شاید۔۔۔ کوئی خیر خبر کوئی اطلاع۔۔۔ میں اور میری اہلیہ لندن سے عجیب سی انسیت رکھتے ہیں۔۔۔ کوئی شناسا وہاں سے آ گیا جائے ہم خود ہی امید باندھ لیتے ہیں کہ شاید کچھ اچھی خبر سننے کو مل جائے" وہ رک رک کر بات مکمل کر رہے تھے اور سلمان لفظوں کے معاملے میں مزید تنگ ہونے لگا۔ انہیں کیا بتائے، کیسے بتائے۔

"میں آپ کے آنے سے پہلے اپنے ملازم کو با آواز بلند کہہ آیا ہوں کہ چائے تیار کرے۔ لندن سے مہمان آ رہے ہیں اب میری اہلیہ چائے لے کر خود آ جائیں گی اور جب تک آپ موجود رہیں گے، وہ یہاں بیٹھی رہیں گی۔۔۔ چہرے پر سوال ہوں گے اور آنکھوں میں امید و ناامیدی کا عکس ہے۔۔۔ لیکن بولیں گی کچھ نہیں۔۔۔ پوچھیں گی کچھ نہیں بلکہ پوری سماعتیں آپ کی جانب مبذول کیے اس ایش ٹرے کی طرف دیکھتی رہیں گی۔۔۔ جس میں کوئی سگریٹ ہے نہ راکھ۔۔۔ بس امیدیں ہیں' آس ہے۔۔۔ مجھے ان کی اس خاموش تفتیش سے خوف محسوس ہوتا ہے" وہ کافی الجھے ہوئے سے نظر آ رہے تھے۔ سلمان نے محسوس کیا تھا کہ نور محمد کے تفصیلی تذکرے کے بعد سے ان دونوں کے درمیان جھجک کا ان دیکھا پردہ خود بخود ہٹ گیا تھا۔ آفاق صاحب پہلے کی نسبت زیادہ کھل کر اپنے بیٹے کے متعلق بات کرنے کے لیے رضامند نظر آتے تھے۔ اس کی وجہ بھی سلمان نے خود ہی فرض کر لی تھی۔ وہ یقیناً "سلمان کے منہ سے کوئی امید افزا خبر سننے کی توقع کر رہے تھے" کیونکہ انہیں پہلے سلمان نے اس قدر پرامید نہیں دیکھا تھا۔ سلمان کا دل مزید بوجھل ہوا۔ اس کے پاس انہیں بتانے کے لیے کوئی بات نہیں رہی تھی۔

"میں جانتا ہوں وہ شاید ہم سے ملنے کا خواہش مند نہیں ہے ورنہ اتنے عرصے میں کبھی ایک بار تو پلٹ کر دیکھتا۔۔۔ لیکن آپ اسے میرا ایک پیغام دے دیجئے گا۔ بھلے سے مجھ سے نہ ملے۔ لیکن اپنی ماں سے ایک بار ضرور مل لے۔ وہ بہت اذیت میں ہے مجھ سے اس کی تکلیف دیکھی نہیں جاتی۔ میں اسے تڑپتا دیکھتا ہوں تو اپنا سر پھوڑ لینے کو دل چاہتا ہے۔۔۔ اس کی اس حالت کا ذمہ دار میں ہی تو ہوں۔ میں نے ایک ماں کے صبر کو آزمایا ہے۔ مجھ سے اللہ کبھی خوش نہیں ہو گا۔"

وہ جیسے بے خودی کے عالم میں اپنے کسی بہت قریبی شناسا شخص سے بات کر رہے تھے اور یہ بھروسا سلمان کو مزید خائف کر رہا تھا۔ اس کے پاس انہیں دینے کے لیے کوئی اچھی خبر نہیں تھی۔

"میرا تجربہ ہے۔ اولاد کے دکھ ماں کو انسان نہیں رہنے دیتے۔۔۔ کچھ اور بنا دیتے ہیں۔۔۔ دراصل کوئی بھی درد انسان سے بڑا نہیں ہوتا' درد کتنا بھی بڑا کیوں نہ ہو۔۔۔ انسان جس وقت اسے برداشت کرنے کا حوصلہ کرتا ہے وہ درد خود بخود چھوٹا ہو جاتا ہے اور ماں تو بہت ہمت والی مخلوق بنائی ہے اللہ نے۔۔۔ وہ باپ کی نسبت بہت ہمت سے درد برداشت کرتی ہے لیکن اولاد کا بچھڑ جانا درد نہیں رہتا یہ تو زرا کرب ہے۔ کیونکہ جب ہم درد کو برداشت کرنے کی صفت کھو دیتے ہیں تو وہ کرب بن جاتا ہے اور کرب انسان کے اندر اوندھے منہ جا گرتا ہے پھر وہ آسانی سے اپنی جگہ نہیں چھوڑتا۔۔۔ کرب زدہ ماں پھر دنوں میں بھی یا اللہ نہیں

سکتی بلکہ یا اولاد پکارتی رہتی ہے۔۔۔ میں نے نور محمد کی ماں کو ماں نہیں رہنے دیا "کرب زدہ" کر دیا ہے۔"

وہ بات کرتے ہوئے رو نہیں رہے تھے۔ کاش وہ رو لیتے۔ سلمان نے سوچا تھا۔ اسے کسی بہانے کی تلاش تھی۔ وہ اپنی آنکھیں پونچھنا چاہتا تھا۔ وہ انہیں نہیں خود کو دلاسا دینا چاہتا تھا۔

"وہ جہاں ہے، ٹھیک ہے۔ آپ پریشان مت ہوں۔ اللہ نے اس کے لیے ایک بہتر جگہ کا انتخاب کیا ہے۔"

اس نے دل ہی دل میں ہمت جمع کرنے کی کوشش کی تھی تاکہ اس انکشاف کو کیا جا سکے جو اس کے سامنے بیٹھے شخص کے اعصاب پر بہت بھاری پڑ سکتا تھا۔

"مجھے اللہ پر ہی تو بھروسا ہے، ورنہ میں نے تو زندگی میں غلطیوں کے سوا کیا ہی کچھ نہیں۔۔۔ مجھے امید ہے۔ میرا بیٹا جہاں ہو گا بہت حفاظت سے خوش باش اور مطمئن ہو گا۔۔۔ لیکن اچھا ہوتا وہ ایک بار اپنی ماں، بہن سے مل لیتا۔۔۔ آپ اس سے درخواست کریں کہ ایک بار مل لے۔۔۔ وہ اگر چاہے تو اس کی والدہ اور بہن وہاں جا کر بھی اس سے ملاقات کر سکتی ہیں۔۔۔ وہ ایک بار ہی تو بھرے۔"

ان کا لہجہ اس قدر گلوگیر تھا کہ سلمان کو اپنی آنکھیں بھیگتی ہوئی محسوس ہوئیں۔ اس نے اپنے باپ کو بہت چھوٹی عمر میں کھو دیا تھا۔ اس نے باپ کی محبت کو ان کی بے چینی کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ اسے نہیں پتا تھا کہ جب باپ کو جوان اولاد کا غم توڑتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔ لیکن سر آفاق کے انداز، ان کے الفاظ نے اسے جھنجوڑ ڈالا تھا۔ اس کے اندر وہ ہمت نہیں تھی کہ وہ انہیں کیا بتاتا اور کیسے بتاتا۔

"آپ فکر نہ کریں۔۔۔ میں اپنی پوری کوشش کروں گا۔۔۔ آپ پلیز سنبھالیں خود کو۔۔۔ تسلی رکھیں۔" اس کے منہ سے الفاظ بھی بمشکل ادا ہو رہے تھے۔

"میں ناامید نہیں ہوں۔۔۔ بخدا نہیں ہوں۔" سر آفاق اس کے لہجے کے بوجھل پن سے بھی کچھ اخذ نہیں کر پائے تھے۔

"میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ ایک بار اپنی ماں سے مل لے۔۔۔ اس کے دل میں بے شک میرے لیے گنجائش نہ ہو لیکن اپنی ماں سے اسے بہت لگاؤ ہے ورنہ وہ اتنے سالوں بعد وہ اپنی ماں کو پوسٹ کارڈز نہ بھیجتا۔" وہ مزید پرجوش ہوئے تھے۔ سلمان نے چونک کر ان کا چہرہ دیکھا۔

"پوسٹ کارڈز۔۔۔ کس نے بھیجے، کب؟" وہ بھی اتنا متجسس نہیں ہوا تھا اور اگر ہوا بھی تھا تو ظاہر نہیں کرنا تھا۔

سر آفاق نے اس کے سوال پر سامنے رکھی میز پر اخبارات ہٹا کر ایک فولڈر نکالا تھا پھر اس میں سے چند پوسٹ کارڈز برآمد کیے۔ سلمان نے ان کے ہاتھ سے وہ کارڈز جھپٹ لیے تھے۔ وہ عام سے پوسٹ کارڈز تھے جو گفٹ شاپس پر عام ملتے ہیں۔ وہ انہیں الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا اور پھر اس کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

"یہ۔۔۔ یہ تو ایک ہفتے پہلے ہی موصول ہوئے ہیں۔" وہ ہکا بکا تھا۔

"جی۔۔۔ اسی لیے تو میں نے آپ کو بلوایا ہے۔۔۔ ان کارڈز کو دیکھ کر اس کی ماں مزید بے چین ہو گئی ہے۔۔۔ مجھ سے اس کی حالت مزید نہیں دیکھی جاتی۔۔۔ آپ سے التجا ہے میری کہ ہمیں اس کے ایڈریس کا کچھ تو بتائیں۔۔۔ میرے خاندان کو اس جلتے توے سے اتارنے میں کچھ تو مدد کریں۔" وہ رو دینے کو ہو رہے تھے۔ سلمان تو حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا۔ ان کارڈز پر لوٹن پوسٹ کی اسٹیمپ تھی۔ ان پر واضح انداز میں نور محمد کا نام لکھا تھا۔ سلمان سے اپنی حیرانی چھپائے نہیں چھپ رہی تھی۔ سر آفاق تو لاعلم تھے۔ لیکن وہ تو جانتا تھا کہ نور محمد یہ کارڈز نہیں بھیج سکتا تھا۔ کارڈز کس نے بھیجے تھے؟

وہ خاموش ہو گیا تھا اور پھر اس نے خاموش ہی رہنے کا تہیہ کیا تھا۔ ان کارڈز کو دیکھنے کے بعد وہ ایک دم سے سر آفاق سے یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ آپ کا بیٹا

مر چکا ہے' سو فی الوقت اس کا چپ رہنا مناسب تھا۔ یہ پہلی اہم بات تھی۔

☼ ☼ ☼

"فورتھ جنریشن وار فیر ملٹری ڈاکٹرائن" اس کے سامنے بیٹھے شخص نے ایک ہی لفظ میں گویا اس کی بولتی بند کر دی تھی۔ وہ ریٹائرڈ میجر اظہر رشید تھے اور انہوں نے نجانے کس طرح اس کا فون نمبر حاصل کر کے اسے ملنے کے لیے بلوایا تھا۔

"بنیادی طور پر یہ وہ محاذ ہوتا ہے جو کسی بھی ملک کی فوج یا سیکیورٹی ایجنسیز کو اپنے ہی ملک کے اندر کھولنا پڑتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں لیسے محاذ میں ملکی سلامتی کے ادارے اپنے ہی لوگوں سے نبرد آزما ہوتے ہیں۔ بظاہر یہ محاذ کتنا ہی قدرے سہل اور غیر اہم لگتا ہو لیکن قوموں کی زندگی میں اس کا کردار نہایت اہم ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ محاذ سرحد کے پار نہیں' بلکہ سرحدوں کے اندر ہی کھولا جاتا ہے۔ اس محاذ میں جنگ لڑنے والے بھی اپنے ہوتے ہیں اور جن سے جنگ لڑی جاتی ہے' وہ بھی اپنے ہی ہوتے ہیں۔ لیکن کوئی بھی فوج اس محاذ پر کبھی بھی کامیاب نہیں ہو پاتی کیونکہ اپنے علاقے میں اپنے ہی لوگوں کے خلاف لڑنا آسان نہیں ہوتا۔ اس میں کامیابی کا مارجن بہت ہی کم ہوتا ہے۔ مجھے افسوس کے ساتھ یہ بات تسلیم کرنی پڑ رہی ہے کہ پاکستان میں بھی یہ فورتھ جنریشن وار فیر ملٹری ڈاکٹرائن اپنی پوری قوت کے ساتھ موجود ہے۔ یہ ایک ایسی اصطلاح ہے جسے آپ نے دانستہ یا نادانستہ اپنی اس رپورٹ میں استعمال کر لیا ہے۔ جو ہر طرف سے ریجیکشن سہہ کر اب ایک فائل میں بند ہے۔ میں صحیح کہہ رہا ہوں نا" انہوں نے تمہید باندھنے کے بعد مدعے کی طرف آتے ہوئے کہا تھا۔

سلمان کو ان کے منہ سے یہ سن کر زیادہ حیرانی نہیں ہوئی تھی کہ ایک ایکس آرمی مین اس کی رپورٹ کے متعلق اتنی اچھی طرح سے جانتا تھا۔ اسے اتنے مہینے خوار ہونے کے بعد یہ اندازہ تو ہو ہی چلا تھا کہ یہ کوئی ایسا گورکھ دھندا نہیں تھا اور جن باتوں کو وہ ڈھکی چھپی سمجھتا آیا تھا وہ اب اتنی ڈھکی چھپی نہیں تھیں۔

"میں آپ کے ساتھ کام کرنا چاہتا ہوں' لیکن میں چاہتا ہوں آپ اس رپورٹ پر کام ضرور کریں مگر تصویر کے دونوں رخ دکھائیں۔ بیرونی عناصر کے ساتھ ساتھ اندرونی عناصر کا پردہ بھی فاش ہونا چاہیے' جو پاکستان کی جڑیں کاٹنے میں پیش پیش ہیں۔ ورنہ وہ مقاصد حاصل نہیں ہو پائیں گے جو آپ کرنا چاہتے ہیں۔" سلمان فقط سر ہلا سکا۔ میجر اظہر رشید نے اس کے سامنے ایک فائل رکھی تھی۔

"میں چاہتا ہوں... آپ یہ فائل دیکھ لیں پھر تسلی سے فیصلہ کریں۔" سلمان نے ایک نظر ان کے چہرے کی طرف اور دوسری نظر اس فائل پر ڈالی تھی۔ اس نے فائل اٹھا کر سرسری سے انداز میں اس فائل کو کھولا تھا اور پھر وہ ٹھٹک کر میجر اظہر کا چہرہ دیکھنے لگا۔ انہوں نے کندھے اچکائے جیسے اپنی بے بسی کا اظہار کر رہے ہوں۔

"یہ... یہ کیا ہے...؟" وہ ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹتے ہوئے ہکا بکا ان کا چہرہ بھی دیکھ رہا تھا۔

"آپ کے سامنے ہے جو بھی ہے۔" ان کا انداز سپاٹ تھا۔ وہ یقیناً" اپنے سینے میں بہت سے راز چھپائے ہوئے تھے۔ سلمان ساکت و جامد رہ گیا تھا۔ یہ دوسری اہم بات تھی جس نے اسے آنے والے بہت سے سالوں تک ساکت و جامد ہی رکھا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کیا واقعی آپ جو کہہ رہے ہیں یہی سچ ہے؟" امائمہ نے بوجھل دل مگر چمکتی آنکھوں کے ساتھ سب کچھ سن لینے کے بعد ان سے سوال کیا تھا۔ وہ کس قدر لاچار نظر آئی تھی۔ نور محمد نے کن انکھیوں سے اس کی جانب دیکھا۔ یہ ایک عرصہ بعد ہوا تھا کہ انہوں نے کسی عورت کی جانب آنکھیں اٹھا کر دیکھنے کی جرأت کی تھی اور پھر بے بسی کے عالم میں دوبارہ اپنے ہاتھوں کو دیکھنے لگے تھے۔ ان کے دل میں کوئی گندگی نہیں تھی

بس اتنا تھا کہ انہیں اس کے چہرے میں اپنے محسن کا چہرہ دکھتا تھا' جبکہ وہ جانتے تھے یہ چہرہ محتسب کا تھا۔ وہ آنکھیں مجسم سوال بنی ان کو دیکھ رہی تھیں۔ وہاں بے چینی تھی اور بے یقینی بھی۔

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ اب وہ مزید کچھ چھپانا نہیں چاہتے تھے۔ پہلے ہی بہت تاخیر ہو چکی تھی۔ یہ کوئی گیم شو نہیں تھا کہ آدھا آج کھیل لیا جاتا اور باقی آدھا کل کے لیے چھوڑ دیا جاتا۔ انہیں بالآخر یہ امر تسلیم کرنا ہی پڑا تھا کہ نور محمد کے خاندان کا حق تھا کہ انہیں ہر بات ہر حقیقت ہر نقطہ بتایا جاتا۔

"یہ آپ کے ایمان کی کمزوری ہے نور محمد! جو آپ کو سچ اگلنے نہیں دے رہی۔ اس سے فرار اختیار مت کریں۔ اس سے مقابلہ کریں اور بہادری سے حالات کا سامنا کریں۔ آپ حقیقت جانتے ہیں تو پھر چپ کیوں ہیں۔ آپ کو چاہیے اب "عہد الست" کو منظر عام پر لے آئیں... مزید تاخیر مزید نقصان کا باعث ہوگی۔ یاد رکھیے مزید خاموشی غلطی نہیں "گناہ" ہوگی... میں تو خود کو بھی اس معاملے میں قصوروار سمجھتا ہوں کہ میں کچھ نہیں پایا۔ اللہ کی ناراضی کا احساس بہت خوف زدہ رکھتا ہے... آپ سمجھتے کیوں نہیں ہیں ماں کو اولاد کے لیے تڑپانا اللہ کے غضب کو آواز دینا ہے... جب مٹی تڑپتی ہے تو زلزلے آجایا کرتے ہیں... مٹی سے بنی ماں تڑپتی ہے تو نہ جانے اللہ کس سزا کا حق دار ٹھہرائے گا ہمیں... مت پکڑیں اور دنیا کا سامنا کریں۔ آپ کی نیت نیک ہے تو اللہ آپ کی مدد ضرور کرے گا۔"

یہ صوفی صاحب کے الفاظ تھے جو انہوں نے گزشتہ ملاقات میں کہے تھے۔ اور وہ جب بھی ملتے تھے یہ احساس دلاتے تھے کہ عہد الست مکمل کرو' یہ نور محمد کی بازیابی کے لیے ضروری ہے۔ یہ بات انہیں سلمان حیدر نے بھی سمجھانا چاہی تھی اور صوفی صاحب بھی یہی چاہتے تھے۔ لیکن یہ ایک "بہن" تھی جس کے آنسوؤں نے انہیں احساس دلایا تھا کہ اب انہیں چپ کا روزہ توڑ دینا چاہیے۔ سچ تو یہ ہے وہ خود بھی جیسے اب تھک گئے تھے۔ دل پر بوجھ اتنا بڑھ گیا تھا کہ دل چاہتا تھا وہ سب دنیا کے سامنے لے آئیں جو کب سے ان کے اور ان سے وابستہ چند لوگوں کے درمیان ایک "گناہ" کی طرح چھپا چھپا کر رکھا گیا تھا اور یہی وہ بوجھ تھا جو انہیں سکون سے رہنے نہیں دیتا تھا جو انہیں رات کو سونے نہیں دیتا تھا اور جو خواب میں آ آ کر انہیں ڈرا دیتا تھا۔ انہیں امائمہ سے مل کر اندازہ ہوا تھا کہ وہ واقعی بہت بڑی زیادتی کے مرتکب ہو رہے تھے۔ انہیں کوئی حق نہیں تھا کہ وہ دنیا کو ایک معصوم شخص کے متعلق اندھیرے میں رکھتے۔ یہ اس شخص کے ساتھ بہت بڑی ناانصافی تھی۔ یہ اس کی بہن کی آہوں اور ماں کے نوحوں کا مذاق اڑانے کے مترادف تھا۔ وہ اسی لیے امائمہ سے ملنے کے لیے رضامند ہوئے تھے اور اسے ہر وہ بات بتا دی تھی جو انہیں سو فیصد معلوم تھی جس کے بارے میں وہ گواہی دے سکتے تھے۔

"کیا آپ سچ کہہ رہے ہیں کہ میرا بھائی زندہ ہے؟"

امائمہ نے ایک بار پھر سابقہ بے یقین لہجے میں سوال کیا تھا۔ ان کی ساری باتیں سن لینے کے بعد یہ تیسری مرتبہ تھا کہ اس نے یہ سوال دہرایا تھا۔

"آپ اسے میری خواہش یا امید بھی سمجھ سکتی ہیں... آپ کی طرح میرا بھی دل کہتا ہے کہ نور محمد حیات ہیں' لیکن وہ کہاں ہیں اور کس حال میں ہیں اس کے متعلق مجھے سو فیصد معلومات نہیں ہیں۔"

وہ بتاتے ہوئے بے حد نادم نظر آئے۔ شہروز نے الجھ کر عمر اور امائمہ کا چہرہ دیکھا تھا۔ وہ مزید خاموش نہیں رہ سکتا تھا۔ اس کا ذہن ویسے ہی بہت الجھ گیا تھا۔

"سر! معذرت خواہ ہوں لیکن یہ ایک شخص کی زندگی کا معاملہ ہے۔ ایک ایسا شخص جسے دنیا "دہشت گرد" سمجھتی ہے۔ آپ اسے سوڈوکو (گیم) کی طرح نہیں کھیل سکتے کہ کسی لاجک کے بغیر... ایک سے نو تک کے ہندسے کہیں کہیں کر خانے پر کرتے جائیں۔ یہاں تین لکھ دیں' وہاں آٹھ لکھ دیں۔ عمودی لائن میں آٹھ لکھا ہوا ہے تو پھر یہ لکھنا بہتر رہے گا۔ پہلے

آپ نے کہا نور محمد حیات نہیں ہیں' پھر کہا شہید ہو چکے ہیں اور اب کہہ رہے ہیں کہ حیات ہیں' لیکن آپ کو یہ نہیں پتا کہ وہ کہاں ہیں۔۔۔ کس کے ساتھ ہیں ہم آن ایبل تیجے آپ بہت بہترین ادیب ہیں۔۔۔ لفظ آپ کے اشاروں پر ناچتے ہیں' لیکن اب ہمیں کسی دلیل کے ساتھ اپنا موقف سمجھانے کی کوشش کریں۔"

"مجھے احساس ہے میری باتوں پر ایک دم یقین کرنا مشکل ہے' لیکن میں واقعی نور محمد کے ویر اباؤٹس کے متعلق حتمی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔۔۔ اور میری تذبذب بھری اس طویل خاموشی کی بنیادی وجہ بھی یہی ہے۔" انہوں نے اسی ملول انداز میں بات شروع کی تھی۔

"دراصل دو ہزار سات میں جب پولیس نے ان کی میت ہمارے حوالے کی تو ہم میں سے کوئی نہیں جانتا تھا کہ یہ نور محمد کی میت نہیں ہے۔ ہم نے اس کے فیونرل میں یہی سمجھ کر حصہ لیا تھا کہ یہ نور محمد کا فیونرل ہے۔۔۔ مجھے وہ شخص بے حد پیارا تھا' اسی لیے ان کا اس طرح دنیا سے جانا میرے لیے بہت بڑے ذہنی صدمے کا باعث بنا رہا کیونکہ مجھے اس سارے معاملے میں سب سے زیادہ قصوروار دکھائی دیتا تھا۔ لیکن میرے وہ عزیز جو نور محمد سے حقیقی ہمدردی رکھتے تھے انہوں نے کچھ مہینوں تک جی جان سے کوشش کی تھی اس وقت تک ہم سب کو یقین تھا کہ نور محمد کو واقعی شہید کر دیا گیا ہے۔" وہ لمحہ بھر کے لیے رکے۔

"اکیسویں صدی میں اگر انسان حالات و واقعات کو صرف تقدیر کے ہیر پھیر کا نام دے تو دنیا اسے احمق کہتی ہے' لیکن میرا یقین ہے کہ سو فیصد محنت کے بعد بھی اگر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے تو یہ نہیں تا ہیں مقدر ہی کا کھیل ہوتا ہے۔۔۔ چاہنے کے باوجود بھی ہماری کسی کوشش کو کامیابی نہیں ملی۔ پاکستان کے حالات کو تو آپ لوگ مجھ سے بہتر جانتے ہیں کہ اس ساری مدت میں کس قدر دگرگوں رہے' پھر لندن 7/7 دھماکوں کے بعد لندن کے حالات کافی خراب ہو گئے' لیکن نور محمد کے متعلق خاموش رہنے کی وجہ صرف یہ حالات نہیں تھے۔"

وہ ایک بار پھر چپ ہوئے اور سامنے پڑی تپائی پر پڑا ایک بڑا لفافہ اٹھایا تھا۔ امائمہ سمیت عمر اور شہوز بھی ان کے ہاتھوں کی ایک ایک جنبش پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ نہ جانے لفافے میں سے کیا نکلنے والا تھا۔ نور محمد نے اس میں سے چند کارڈز نکالے تھے۔ یہ عام سے پوسٹ کارڈز تھے۔ امائمہ نے چونک کر وہ کارڈز ان کے ہاتھ سے لیے پھر کچھ دیر ان کو الٹ پلٹ کر دیکھنے کے بعد مایوسی سے بولی۔

"ایسے کارڈز تو ایک بار میری والدہ کے نام بھی موصول ہوئے تھے۔۔۔ ان میں خاص بات کیا ہے؟"

امائمہ اپنے بھائی کے لیے لفظ "دہشت گرد" سن کر کافی بد برداشتہ ہو رہی تھی۔

"بظاہر کوئی خاص بات نہیں ہے' لیکن یہ کارڈز مجھے تب موصول ہوئے تھے جب نور محمد کی میت کو دفنائے تقریباً" چھ مہینے گزر چکے تھے' یہ کارڈز مجھے پاکستان سے بھیجے گئے تھے اور نور محمد کی جانب سے بھیجے گئے تھے۔۔۔ ان کارڈز نے ہم پر یہ انکشاف کیا کہ نور محمد کہیں موجود ہیں اور ہم سے رابطہ کرنے کے باوجود ہم سے ملنا نہیں چاہتے۔۔۔ تب میرے وہ عزیز جو اس معاملے میں میرے ساتھ تھے کو یقین ہو گیا تھا کہ نور محمد کہیں روپوش ہیں اور شاید واقعی "المہاجرون" کے لیے کام کر رہے ہیں۔۔۔ میں نے اتنے سالوں میں نور محمد کو اس "دہشت گرد" کے ٹائٹل سے چھٹکارا دلوانے کے لیے جتنی محنت کی ہے' اتنی شاید ہی کسی اور مقصد کے لیے کی ہو۔۔۔ ان چند سالوں میں سب سے زیادہ دکھ مجھے اسی بات سے پہنچا ہے کہ دنیا کے سامنے مسلمان کو مسلمان ثابت کرنا آسان نہیں ہے' لیکن مسلمان کو "دہشت گرد" ثابت کرنا بے حد آسان ہے۔ اس کی صرف داڑھی اور باجماعت پانچ نمازیں دنیا کو اس کی شناخت کے حوالے سے مشکوک کر دیتی ہیں۔۔۔ یہ ایک المیہ' لیکن حقیقت ہے کہ فی زمانہ مسلمان ہی مسلمان کو "کافر" قرار دینے میں پیش پیش ہے اور

میری خاموشی کی وہ سرف وجہ بھی یہی ہے۔"

وہ اب روانی سے بات کر رہے تھے۔ فقران کے چہرے پر کسی موسم کی طرح بکھری تھی۔ ایک ایسے مسلمان کی طرح جسے مسلم امہ کے حالات دکھ دیتے ہیں۔ پریشان کرتے ہیں وہ بھی پریشان نظر آئے۔

"کچھ عرصہ قبل الجزیرہ انگلش سے ایک ڈاکیومینٹری پیش کی گئی۔ جس میں گوانتاناموبے کے اندرونی حالات اور وہاں موجود کچھ مسلمانوں کے حالات کو ہائی لائٹ کیا گیا تھا۔ اور انہیں دہشت گرد دکھا کر دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی کہ ہاں مسلمان دہشت گرد ہیں۔ اس ڈاکیومینٹری میں نور محمد کا ذکر نہیں تھا، لیکن ایک قطار میں کھڑے کچھ لوگوں کی ایک جھلک دکھائی گئی۔ ان میں نور محمد موجود تھے۔" انہوں نے بالآخر بتا ہی دیا تھا کہ نور محمد کہاں تھے۔

شہوز نے الجزیرہ انگلش کے لفظ پر ایسے پہلو بدلا جیسے کوئی انہونی ہوئی ہو۔ امائمہ کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں جبکہ یہ پہلو عمر کے لیے بھی کافی حیران کن تھا۔

"گوانتاناموبے۔۔۔ واقعی؟" امائمہ کی آواز کسی سرسراہٹ سے مشابہ تھی۔ یہ کسی تاش کے پتوں کے محل کے بار بار گر جانے کے مترادف تھا۔ اس کا خاندان کس قدر بدقسمت تھا۔ ایک کے بعد ایک امید افزا بات پتا چلتی بھی تھی تو وہ بھی آخر میں ناامیدی کے دسترخوان پر بیٹھ کر روزہ افطار کرتی نظر آتی تھی۔ دہشت گرد گوانتاناموبے یہ تو الفاظ ہی خوف زدہ کرنے کو کافی تھے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے عمر۔۔۔ ہمارے ساتھ ہی کیوں ہو رہا ہے؟" وہ روہانسی ہو کر اپنے شریک حیات کی طرف دیکھنے لگی تھی۔

"آپ اس بارے میں اتنے پر یقین کیسے ہیں۔۔۔ کیا پتا وہ کوئی اور ہو۔۔۔ آپ خود ہی کہہ رہے ہیں ڈاکیومنٹری میں نور محمد کی ایک جھلک ہی دکھائی گئی۔۔۔ سننے میں بھی عجیب سا لگتا ہے جیسے کوئی کہانی ہو۔۔۔ نہیں؟" یہ شہوز تھا جس کے لہجے میں طنز کی آمیزش تھی۔

"نور محمد کے معاملے میں ہر بات عجیب ہی رہی ہے اب تک۔۔۔ کیا یہ عجیب نہیں لگتا سننے میں کہ ایک بیٹا ماں باپ کی وجہ سے دربدر ہو کر رہ گیا۔ دنیا اور زندگی ان ہی عجیب و غریب واقعات کا مجموعہ ہے جناب۔۔۔ انسان ازل سے خود بیتی کو واقعہ اور جگ بیتی کو کہانی سمجھتا آیا ہے۔" نور محمد کا لہجہ طنز سے پاک لیکن دو ٹوک تھا۔ شہوز کے لہجے کا طنز انہیں برا لگنے لگا تھا۔

"میں تو کنفیوزڈ ہو گئی ہوں۔۔۔ ایک سرا ہاتھ آتا ہے تو دوسرا الجھ جاتا ہے۔ اب میں اپنے ماں باپ کو کون سی امید کی ڈور تھماؤں گی؟" امائمہ بالکل ڈھ جانے والے انداز میں بولی تھی۔ اس کے اعصاب بالکل جواب دے رہے تھے۔

"میں نے آپ کو سب کچھ بتا دیا ہے۔۔۔ میرے پاس میرا اثاثہ صرف میرے لفظ ہیں اور وہ میں آپ کو دینے کو تیار ہوں۔۔۔ میں "عہد الست" کو بہت جلد پبلک کرنے والا ہوں۔ اس کی اشاعت کے بعد مجھے امید ہے کہ کوئی مثبت پیش رفت ضرور ہو گی کیونکہ اس میں ہر وہ پہلو زیر بحث آیا ہے جو نور محمد کی زندگی کا احاطہ کرے گا اور انہیں معصوم ثابت کرے گا اور۔۔۔ آپ لوگوں کے آنے سے مجھے حوصلہ ملا ہے کہ اب ہم نور محمد کو ڈھونڈ لیں گے۔۔۔ آپ کا ان سے خون کا رشتہ ہے۔۔۔ آپ ہماری مدد کریں۔ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔ نور محمد کو دہشت گرد مت سمجھیں۔ میرے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں۔۔۔ ہر وہ پہلو جو آپ کے لیے الجھن کا باعث بنے گا میں اس پر بات کرنے کو تیار ہوں۔" وہ امائمہ سے براہ راست مخاطب تھے۔

"میں ناامیدی کو گناہ سمجھتا ہوں اور آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ ناامید مت ہوں۔ اسلام قبول کرنے کے بعد میں نے ایک چیز یہ سیکھی ہے کہ مایوسی بھوت کی بیماری ہے۔۔۔ یہ ایک دوسرے کو دیکھنے سے بھی لگ جایا کرتی ہے۔۔۔ آپ مل جل کر میرا ساتھ دیں۔ انشاء اللہ کوئی نا کوئی اچھی خبر مل جائے گی۔"

وہ اسے حوصلہ دینے کی کوشش کر رہے تھے۔ امائمہ نے گہری سانس بھری۔

"میں کیسے اپنی امی کو بتاپاؤں گی کہ ان کا لخت جگر ایک ایسی جگہ ہے' جہاں کا نام لیتے بھی انسان کئی بار سوچتا ہے اور ابو تو پہلے ہی ہمیشہ نیچے نظر رہے ہیں۔ انہیں تو بیٹے سے محبت ہی نہیں تھی کبھی وہ تو اب بالکل ہی مخالفت پر اتر آئیں گے۔"

ایک سوچ آرہی تھی ایک جارہی تھی۔ اس کا جسم جیسے اس کا ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ اس نے مزید کچھ گہری سانسیں بھریں۔ اس کا بی۔ پی بڑھ رہا تھا۔ عمر نے اس کے چہرے کے تکلیف دہ تاثرات کو لمحہ بھر میں نوٹس کیا تھا۔

"امائمہ! تم ٹھیک ہو تا کیا ہو رہا ہے ادھر دیکھو میری طرف۔" امائمہ کی سماعتوں نے اتنا ہی سنا تھا اور پھر وہ جیسے ہیں ہوا میں معلق ہونے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

"بل گرانٹ یا نور محمد۔" شہوز نے الجھے ہوئے انداز میں سوچا تھا اور ساتھ ہی لیپ ٹاپ آن کر کے لیپ ٹاپ کا بٹن دبایا تھا۔ وہ جب سے نوٹن سے واپس آیا تھا اس کے ذہن میں کھلبلی مچی ہوئی تھی۔ بل گرانٹ بمقابلہ نور محمد اور پھر نور محمد بمقابلہ نور محمد۔ ایک معمہ' ایک پہیلی یا پھر ایک انکشاف۔ آج کا دن اس کے لیے بہت سنسنی خیز دن تھا۔ امائمہ کے بھائی کے مسئلے میں الجھتے ہوئے اسے اندازہ ہی نہیں تھا کہ اس کے سامنے ایک نئی داستان شروع ہو جائے گی۔

نوٹن میں بل گرانٹ عرف نور محمد کے انکشافات نے ان تینوں کو چونکایا تھا۔ امائمہ کا بی پی اچانک شوٹ کر گیا تو اسے نوٹن میں ہی ایمرجنسی میں لے جانا پڑا' جہاں وہ تین گھنٹے آبزرویشن میں رہی تھی کیونکہ وہ حاملہ تھی اس لیے اس کا تفصیلی معائنہ اور تمام لیب ٹیسٹ بھی کیے گئے۔ شہوز اور عمر دونوں ہی اس صورت حال سے گھبرا گئے تھے نہ چاہتے ہوئے بھی عمر کو ممی کو فون کر کے بتانا پڑا۔ لنچ کا وقت ہو جانے کے باعث وہ بار بار شہوز کے سیل پر کال کر رہی تھیں۔ امائمہ کے نمبر پر بھی ان کی کال آئی اور پھر جب عمر کا سیل بھی ان کے نام کے حرفوں کے ساتھ چمکا تو بالآخر اسے ان کی کال ریسیو کرنا پڑی اور یہ بھی بتانا پڑا کہ وہ تینوں ایک ساتھ ہیں اور امائمہ کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ممی کی خفگی' پریشانی اور بے چینی عمر کو فون پر ہی محسوس ہو گئی تھی۔ سو وہاں سے واپسی پر ہی وہ تینوں الگ ذہنی خلجان کا شکار رہے تھے۔ امائمہ کو بھائی کے صدمے اور پھر اس پریشانی نے کہ وہ حیات تھا مگر ابھی بھی ان کی رسائی سے دور تھا لاچار کر رکھا تھا' جبکہ عمر کو اپنے والدین کی جواب طلبی کا ڈر ستا رہا تھا اور شہوز کو جس چیز نے سوچ میں الجھا رکھا تھا وہ ایک الگ ہی نقطہ تھا۔ اس کے سامنے تو انکشافات کا ڈھیر لگ گیا تھا۔ نور محمد عرف بل گرانٹ نے انہیں اپنے تعاون کی یقین دہانی کروائی تھی بلکہ رابطے میں رہنے کے لیے بھی کہا تھا۔

ایک ملولسٹ تھا' جس کا نام بل گرانٹ تھا جس کے بارے میں رضوان اکرم نے ایک بار کہا تھا کہ وہ مسلمان ہو چکا ہے۔ تم اس کا انٹرویو لو' انہوں نے بھی نور محمد کا ذکر کیا تھا اور پھر عوف بن سلمان کی کریٹو ٹیم تھی جس نے بہت سا مواد فراہم کیا تھا جس میں کسی نور محمد کا ذکر تھا جو لاہور کا رہائشی تھا۔ اس کے والد کا نام بھی آفاق ہی تھا اور کیسی عجیب بات تھی کہ یہاں امائمہ اپنے کسی بھائی کو تلاش کر رہی تھی جس کا نام نور محمد تھا اور وہ ایک ناول نگار کے قبول اسلام کا موجب بن گیا تھا اور اس کا نام بھی نور محمد تھا لیکن خود اس کے بارے میں اس کو جو بتایا گیا تھا وہ ایک قصہ تھا جبکہ بل گرانٹ عرف نور محمد جو بتا رہے تھے' وہ ایک الگ داستان تھی۔ لیکن یہ سچ تھا کہ شہوز کو فی الحال خود پر حیرت ہو رہی تھی کہ وہ کیسے اس سارے قصے کو سنتے رہنے کے باوجود کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ وہ نور محمد ولد آفاق علی کا نام سننے کے باوجود چونکا کیوں نہیں تھا۔ لیپ ٹاپ کے آن ہوتے ہی خود کو سنبھالتے ہوئے اس نے اپنے پیچھے پڑے سرہانے کو کراؤن کے ساتھ ٹکایا تھا اور پھر انداز نشست کو مزید آرام دہ بنا کر لیپ ٹاپ گود میں رکھ لیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ہلچل

اور دل میں قصید بھی تھی۔ یہ ایک بہت ہی حیران کن بلکہ پریشان کن انکشاف تھا کہ وہ ایک ایسی ڈاکیومنٹری پر کام کر رہا تھا جس کا موضوع "دہشت گردی" تھا۔ اس میں ایک ایسے دہشت گرد کا ذکر تھا جس کے ساتھ اس کی رشتہ داری نکل آئی تھی۔

اب تک اس نے ڈاکیومنٹری پر کام شروع ہی نہیں کیا تھا تو اتنے دن سے سب چیزیں کہیں لاشعور میں دبی بیٹھی تھیں۔ وہ اب مزید وقت ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹے نکتے سے باخبر ہونا بہت ضروری تھا۔ یہ اب صرف اس کی جاب اس کے جنون یا شہرت کا معاملہ نہیں رہا تھا۔ یہ اس کے خاندان کا ذاتی معاملہ بن چکا تھا اور حیرت والی بات یہ تھی کہ یہ سب معلومات بہت مبہم اور منتشر تھیں۔ ایک ہی شخص کے متعلق دو تین طرح کی آرا تھیں اور اس کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے ذرائع بھی تین طرح کے ہی تھے۔ کچھ لوگ کہہ رہے تھے کہ نور محمد دہشت گرد تنظیم کا رکن تھا، کچھ کہہ رہے تھے یہ صرف ایک سازش ہے۔ کچھ لوگ اسے مردہ اور بل گرانٹ کو اس کا قاتل قرار دے رہے تھے جبکہ اس کے پاس جو مواد تھا اس میں یہ واضح لکھا تھا کہ وہ زندہ ہے جبکہ بل گرانٹ خود کو مسلمان ظاہر کر رہا تھا اور اس شخص نے جو انکشافات کیے تھے وہ مزید ہوش اڑا دینے والے تھے۔ اسی لیے شہوز اب اپنے پاس موجود مواد کو بہت اچھے طریقے سے جانچنا پرکھنا چاہتا تھا۔ سو الجھے الجھے انداز میں ایک ایک کر کے تمام چیزیں دیکھنے لگا تھا۔ وہیں کچھ فون نمبر بھی دیے گئے تھے اور ساتھ میں ان کی تصاویر بھی تھیں۔ یہ ان لوگوں کے تھے جن سے وہ لندن میں رابطہ کر سکتا تھا۔

اس نے ایک ایک کر کے ان نمبرز کو اپنے سیل فون میں محفوظ کرنا شروع کیا تھا۔ ایک نمبر پر وہ ٹھٹک گیا تھا۔ یہ دراصل رابطہ نمبر نہیں تھا جس نے اسے چونکایا تھا، بلکہ یہ اس شخص کی تصویر تھی جس نے اسے حیران کر دیا تھا۔

اس کا نام جو لکھا ہوا نظر آ رہا تھا وہ تعمور نصر تھا جبکہ شہوز اسے زین العابدین کے نام سے جانتا تھا۔ یہ وہی شخص تھا جس نے بل گرانٹ عرف نور محمد کے روم میٹ اور دوست کے طور پر ان سے پہلی بار ملاقات کر کے نور محمد کی شہادت کے متعلق بتایا تھا۔

"کیا زین العابدین عرف تعمور نصر کوئی انڈر کور ایجنٹ تھا؟" شہوز کے لیے صورت حال مزید گمبیر ہونے لگی۔ یہ گورکھ دھندا تھا یا بھول بھلیاں۔ معمہ تھا یا پہیلی۔ جو بھی تھا بہت پریشان کن ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم سمجھتے کیا ہو اپنے آپ کو۔"

ابو کی آواز میں خفگی نہیں تھی۔ وہ سرسری سے انداز میں ٹانگ پر ٹانگ رکھے بیٹھے ایسے بات کر رہے تھے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ انہوں نے عمر اور شہوز دونوں کو جواب طلبی کے لیے سٹنگ ہال میں بلوایا تھا۔

"ہیرو ہو کوئی۔ تارزن ہو یا سپرمین۔۔۔؟" ان کی آواز میں طنز کی آمیزش بڑھ گئی تھی۔

عمر نے سر اٹھا کر ممی کی جانب دیکھا کہ شاید وہاں کوئی نرم تاثر دیکھنے کو ملے۔ وہ ابو کے ساتھ ہی کاؤچ پر براجمان تھیں اور ان کے چہرے پر شدید خفگی تھی۔ وہ ابو کی طرح اپنے تاثرات چھپا کر رکھنے کو ناراضی نہیں سمجھتی تھیں۔ وہ عام ماؤں کی طرح اولاد کا ہر وہ معاملہ جس میں ڈانٹ ڈپٹ کا خدشہ ہو، شوہر کے سامنے کھول کر بیان نہیں کرتی تھیں، لیکن جب پانی سر سے اونچا ہوتا دکھائی دیتا تھا تو پھر وہ اولاد کو کوئی رعایت بھی نہیں دیتی تھیں۔

عمر کو ان کے تاثرات سے اندازہ ہو گیا تھا کہ انہوں نے ابو کو ہر بات بتا دی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ اسٹول پر شہوز بیٹھا تھا اور وہ سٹنگ ہال میں بیٹھے ان تینوں افراد میں سب سے زیادہ نروس شخص تھا۔ امائمہ وہاں موجود نہیں تھی۔ اگرچہ وہ اسی گھر میں تھی لیکن عمر نے اسے سونے کے لیے عمیر کے کمرے میں بھیج دیا تھا۔ ممی نے بھی اسی بات پر زور دیا کہ امائمہ کی طبیعت کے پیش نظر ساری بات اس کی غیر موجودگی میں ہونی

چاہیے۔

ابو کی ساری توجہ' سارا ارتکاز عمر پر مرکوز تھا لیکن ان کا انداز سادہ بھی نہیں تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہ بے حد خفا ہیں۔ ان کے لیے سب سے زیادہ حیران کن یہی تھا کہ وہ تینوں آخر ان اوقات میں جب عمر کو ڈیوٹی پر شہروز کو اپنے لیپ ٹاپ پر اور امائمہ کو اپنے گھر میں مصروف ہونا چاہیے تھا۔ وہ تینوں ایک ساتھ وہاں ٹاؤن میں کیا کر رہے تھے۔ انہیں کسی اور معاملے کا علم تو نہیں تھا لیکن وہ ٹاؤن جانے کے معاملے پر ہی سخت خفا تھے۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ان سے بازپرس نہ کی جاتی' بلکہ ٹاؤن والا معاملہ پہلے بھی گھر میں ایک بار زیر بحث آچکا تھا اور ممی اس کے سامنے اپنی سخت ناپسندیدگی کا نہ صرف اظہار کر چکی تھیں بلکہ یہ بھی باور کروا چکی تھیں کہ امائمہ کی یہ روٹین ان کے لیے تشویش کا باعث ہے۔ ممی نے یقیناً" عمر کی فون کال کے بعد ابو کے سامنے سب کچھ اگل دیا تھا۔ اسی لیے وہ دونوں ہی اب کافی ناراض لگ رہے تھے۔

"آئی ایم سوری ابو' دراصل میں آپ کو بتانے والا تھا۔" وہ الفاظ جمع کر کے بولنے کی جستجو میں تھا لیکن امی نے اسے ٹوک کر چپ کروا دیا۔

"کیا بتانے والے تھے؟ یہی کہ تم لوگ گھومنے پھرنے اتنی دور گئے تھے۔ پہلے امائمہ کو روٹ سینس بہتر بنانا تھا۔ اب شہروز کو یہ شوق چڑھا ہوگا۔ تم لوگ اپنے بیوں کو بے وقوف سمجھتے ہو نا۔ ایڈونچرز کا شوق پورا کرنے کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔" ممی انتہائی خفگی بھرے لہجے میں بول رہی تھیں۔

"مجھے بات تو مکمل کرنے دیں۔ ایڈونچر کی بات نہیں ہے۔ ہم کسی اور کام سے گئے تھے۔"

عمر ان بیٹوں میں سے تھا جنہیں ماؤں کی ہمیشہ حمایت حاصل ہوتی ہے اور وہ ہمیشہ ماؤں کی مذہب میں رہتے ہیں۔ ممی ڈیڈی کے سامنے ہمیشہ اس کو ڈانٹ ڈپٹ سے بچاتی آئی تھیں۔ اسی لیے ڈیڈی کے سامنے ان کی یاز پرس پر دل ہی دل میں چڑنے کے باوجود وہ تحمل کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

"کام سے جانے کے لیے تمہیں وہی علاقہ ملا ہے۔۔۔ اور ہر روز ایسے کون سے کام پڑنے لگے ہیں تمہیں وہاں۔۔۔ پہلے تو کبھی نہیں گئے تھے تم لوگ۔" ممی کا انداز اب طنزیہ ہو رہا تھا۔

"اوہو ممی۔۔۔ ایسا بھی حشر نہیں مچا ہوا وہاں۔۔۔ پرسکون علاقہ ہے۔ اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔ کیا ہوگیا اگر ایک آدھ کریمنل مائنڈڈ شخص وہاں سے گرفتار ہوگیا۔۔۔ اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ آپ پورے ٹاؤن کو ہی میدان جنگ سمجھ لیں۔" یہ ون ٹو ون مقابلہ شروع ہوگیا تھا جس کا اختتام ابو کی ایک گھرکی سے ہی ہو سکتا تھا اور یہی ہوا۔

"مجھے بات کرنے دیں۔" انہوں نے ممی سے کہا تھا۔ وہ عمر کو گھورتے ہوئے کچھ کہنے سے باز آگئی تھیں۔

"تم بولو۔۔۔" انہوں نے اسی لاتعلق انداز میں اب عمر سے کہا تھا۔

"ابو۔۔۔ دراصل بات یہ ہے کہ۔۔۔" اس نے بات شروع کی پھر شہروز کی جانب دیکھا جو ایسے بیٹھا تھا جیسے نیوز چینل پر نیوز دیکھ رہا ہو اور رک کر خود ہی جملہ ترتیب دینے لگا تھا۔

"ہم نور محمد کا پتا کرنے گئے تھے۔" وہ اتنا کہہ کر پھر چپ ہو گیا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا بتائے۔

"اچھا تو پھر پتا چلا نور محمد کا؟" ابو کے سوال نے اسے چونکایا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر انہیں دیکھا تھا۔ کیا وہ پہلے سے کچھ جانتے تھے۔

"آپ کو پتا ہے نور محمد کا" آپ جانتے ہیں اس کے بارے میں؟" اسے سوال پوچھنے کے بعد احساس ہوا کہ اسے نہیں پوچھنا چاہیے تھا۔

"مجھے سے پتا ہو سکتا ہے عمر۔۔۔ اور مجھے کچھ پتا کرنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔ تم لوگ اب خود مختار ہو چکے ہو۔۔۔ اپنے معاملات سمجھانے میں ماشاء اللہ کافی ماہر ہو چکے ہو۔ والدین کو کچھ بتانے کی پوچھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔۔۔ میں سمجھ سکتا ہوں تم اگر اپنی

ماں کے ٹوکنے کے باوجود وہاں جاتے رہے ہو تو مسئلہ کچھ بڑا ہی ہو گا۔۔۔ اتنا بڑا کہ تم نے ہمیں بتانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔۔۔ لیکن تم جب دس بارہ سال بعد اپنے باپ کو اس قابل سمجھو کہ اسے کوئی اہم بات بتائی یا کوئی مشورہ لیا جا سکے تو میری قبر پر آکر بتانا۔۔۔ وہی مناسب وقت ہو گا اپنے باپ سے کوئی بات شیئر کرنے کا۔" یہ ان کا بھرپور وار تھا۔ عمر کا سر دوبارہ جھک گیا۔

"ایسی بات نہیں ہے ابو! ہم بتانے والے تھے۔"

عمر نے اتنا ہی کہا تھا کہ ابو نے اسے گھور کر دیکھا۔

"ہاں۔۔۔ دس سال بعد بتا ہی دیتے تم۔۔۔ بہت شکریہ۔" یہ وہی مخصوص طنزیہ انداز تھا جس کی عمر کو عادت تھی۔ صورت حال کی سنگینی کے باوجود عمر کو ہنسی آگئی جسے اس نے ہونٹوں کے کناروں تک آنے سے بھی پہلے روک لیا تھا۔ ایک بڑا مرحلہ ابھی باقی تھا۔

"ابو! ناراض مت ہوں پلیز۔۔۔ میں بتا تو رہا ہوں" اس نے منت بھرے لہجے میں کہا تھا۔ ممی کی ناراضی اسے کبھی نہیں ڈراتی تھی لیکن ابو کی ناراضی سے اسے واقعی ڈر لگتا تھا۔

"بہت احسان مند ہوں میں بیٹا جی!" ابو کہنا نہیں بھولے تھے۔

"نور محمد ائمہ کا بھائی ہے چاچو۔۔۔ ہم لوٹن میں اس سے ملنے گئے تھے۔" شہوز نے خاموشی کے طویل وقفے کو بالآخر توڑا تھا۔

"کس کا بھائی۔۔۔ ائمہ کا؟" ممی نے چونک کر اسے دیکھا۔

"جی ممی! ائمہ کا۔" عمر نے جواب دیا تھا۔

"نور محمد۔۔۔؟" ابو نے اس کی جانب دیکھتے ہوئے دہرایا۔ وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ معاملہ کیا ہو سکتا ہے۔ ان کے گھر میں ائمہ اور عمر کے نکاح کے بعد بس ایک بھائی کا ذکر ہوا تھا اور وہ بھی اس تناظر میں جو باتیں انہیں اپنے بھائی اور بھتیجوں سے پتا چلی تھیں۔ اپنی بہو کے بھائی کا کسی اسائلم میں ہونا ان کا وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔

"یہ ائمہ اور اس کے والدین کا ذاتی معاملہ ہے اور ہم میں سے کوئی بھی اس بارے میں بات نہیں کرے گا۔" یہ تاکید انہوں نے بہت پہلے اپنے گھر میں کر دی تھی۔ وہ اگرچہ اپنے گھر میں بھولی بسری کہانیاں سنانا پسند کرتے تھے نہ ہی انہیں بھولی بسری کہانیاں سننا پسند تھا لیکن اب معاملہ کچھ اور نظر آ رہا تھا۔ سو انہیں بیٹے کی بات سننے میں دلچسپی لینی پڑ رہی تھی۔ دوسری جانب عمر نے دل ہی دل میں ہمت مجتمع کی تھی۔ ان کو بتانے کے لیے اس کے پاس کافی لمبا چوڑا قصہ تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں نے کہا تھا نا آپ سے کہ یہ روز روز لوٹن جانا کوئی اور ہی قصہ ہے۔ اب پتا چل گیا نا آپ کو کہ میرے اندازے کبھی غلط نہیں ہوتے۔۔۔ ہمارے ہونہار سپوت کسی مہم جوئی میں حصہ لیں اور مجھے خبر نہ ہو، یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔"

یہ ممی کا مخصوص جملہ تھا جو عمر کی ہر نئی گراؤنڈ می شرارت پر وہ کہنا نہیں بھولتی تھیں۔ عمر کے خاموش ہوتے ہی وہ ابو کو جتانا نہیں بھولی تھیں۔ یہ معاملہ اگرچہ شرارت سے کچھ آگے کی چیز تھا اور اس میں عمر کا کوئی قصور بھی نہیں تھا لیکن ائمہ کے ناتے اب یہ ان کے گھر کا ہی مسئلہ تھا۔ ابو کے چہرے پر اتنی سنجیدگی تھی، جبکہ دوسری جانب شہوز ابھی کھویا کھویا سا تھا۔ وہاں موجود تینوں مردوں کو اندازہ تھا کہ یہ کس قدر گمبھیر صورت حال ہو سکتی تھی۔

"تم۔۔۔ تمہارا مطلب ہے۔۔۔ ائمہ کا بھائی دہشت گرد ہے اور گوانتاناموبے میں ہے؟" ساری بات سن کر انہوں نے تشویش بھرے انداز میں سوال کیا تھا۔

"جی چاچو۔۔۔ وہ شخص تو یہی کہہ رہا ہے۔" شہوز اب ان کا چہرہ بغور دیکھ رہا تھا۔ آئندہ کا سب لائحہ عمل ان پر منحصر تھا۔

"دہشت گرد نہیں ہے ابو۔۔۔ اس کا امیج ایسا بنا دیا گیا ہے کہ جیسے وہ دہشت گرد ہے۔" عمر نے شہوز کا چہرہ دیکھتے ہوئے تصحیح کی تھی۔ شہوز کا رویہ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وہ ہر نقطے میں کوئی نہ کوئی اعتراض کا پہلو

ڈھونڈ رہا تھا۔

"ایک ہی بات ہے عمر۔۔۔ وہ شت گرد ہونا یا دہشت گرد کا امیج ہونا۔۔۔ دنیا دونوں چیزوں کو ایک ہی تناظر میں دیکھتی ہے۔" شہوز نے دوٹوک لہجے میں کہا تھا۔

"ایک ہی بات کیسے ہو سکتی ہے۔۔۔ دنیا کی کوئی طاقت ملزم کو گناہ ثابت ہونے سے پہلے مجرم نہیں کہتی۔۔۔ تم تو میرے ساتھ سارا قصہ سن کر آئے ہو۔ انہوں نے ایک ایک بات تمہیں بتائی ہے پھر بھی تم ایسے کہہ رہے ہو۔" عمر چڑ کر بولا تھا۔ اسے ابو کے سامنے شہوز کی حمایت کی ضرورت تھی جبکہ وہ پارٹی بدل کر ابو کے ساتھ اس کی مخالفت میں پہلی صف میں جا کھڑا ہوا تھا۔

"تم کچھ بھی کہو۔۔۔ مجھے تو یقین نہیں آیا اس ساری بات پر۔۔۔ عجیب من گھڑت سی کہانی ہے۔۔۔ وہ شخص جھوٹ بھی تو بول سکتا ہے۔" انہوں نے اتنا ہی کہا تھا کہ شہوز نے ان کی بات کاٹ کر انہی کی بات کی تائید کی۔

"مجھے تو خود یقین نہیں آیا اس شخص کی کسی بات پر۔۔۔ عجیب فلمی سی کہانی لگ رہی ہے۔" وہ ابھی بھی اپنے موقف پر قائم تھا اور اب تو اس کا انداز مزید مدلل ہو گیا تھا کیونکہ اب اس نے وہ ڈاکیومنٹری اور اس سے متعلقہ مواد اچھی طرح جانچ لیا تھا۔

"ابو! مجھے لگتا ہے وہ شخص جھوٹ نہیں بول رہا۔۔۔ کچھ حقیقت تو ہے سارے معاملے میں۔" عمر ابھی بھی اپنے موقف پر قائم تھا۔

"یار اسے سمجھاؤ کچھ۔۔۔ ایسا ہوتا ہے بھلا کہیں۔۔۔ تم لوگ اتنے سالوں سے گمشدہ ایک شخص کو ڈھونڈنے نکلو اور وہ تمہیں نہیں ملے بلکہ اس کے ایسے خیر خواہ مل جائیں جو بتائیں کہ وہ حیات نہیں ہے پھر تم منت سماجت کرو تو وہ کہہ دیں کہ ہاں وہ زندہ ہے مگر وہ ان کے ساتھ نہیں ہے۔ وہ اسے جانتے تھے مگر اب وہ کہاں ہے اس بارے میں انہیں نہیں پتا۔۔۔ اور پھر وہ خدشہ ظاہر کریں کہ وہ ایک بدنام زمانہ جگہ پر ہو سکتا ہے۔۔۔ اس بارے میں بھی وہ سو فیصد پر یقین نہیں ہیں کہ وہ گوانتاناموبے میں ہے یا نہیں۔۔۔ میں تو ساری بات سن کر ایک ہی نتیجے پر پہنچا ہوں کہ وہ شخص واقعی اچھا ناولسٹ ہے۔ اسے کہانی لکھنی آتی ہے۔" ابو نے کہا۔ شہوز نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھ لی تھی۔ چاچو عمر کی حمایت نہیں کر رہے تھے۔ یہ ایک خوش آئند بات تھی۔ عمر نے ان کے چہرے کی جانب دیکھا تھا۔

"ابو! آپ سمجھ نہیں رہے۔ وہ بلا جواز یا بنا ثبوت بات نہیں کر رہے۔۔۔ وہ کہہ رہے تھے کہ ان کے پاس ٹھوس شواہد موجود ہیں۔۔۔ وہ ثابت کر سکتے ہیں کہ نور محمد یعنی امائمہ کا بھائی کہاں موجود ہے اور وہ یہ بھی ثابت کر سکتے ہیں کہ وہ معصوم اور بے گناہ ہے۔ ان کے پاس اس ساری سازش کو جھوٹ کا پلندہ ثابت کرنے کے لیے بہت سی شہادتیں ہیں۔۔۔ ابو! اتنی مستند باتیں کوئی خوامخواہ کیوں کرے گا۔" عمر نے بھی اپنا موقف بیان کرنا ضروری سمجھا تھا۔ ابو اب اس کی جانب دیکھ رہے تھے۔

"ٹھوس شواہد موجود ہیں تو اب تک کیوں خاموش تھا وہ۔۔۔ اسے کچھ تو کرنا چاہیے تھا نا۔۔۔ وہ اگر واقعی سچا ہے تو پھر چپ کیوں رہا اتنی دیر۔۔۔" ابو نے اتنا ہی کہا تھا کہ عمر نے ان کی بات کاٹ دی۔

"ابو! وہ کہہ رہے تھے کہ وہ منتظر تھے کہ نور محمد کا کوئی قریبی عزیز ان کا ساتھ دے تو وہ یہ سارا معاملہ پبلک کریں۔ ورنہ وہ کس بنیاد پر یہ سوال کریں گے۔ ان کا کوئی بلڈ ریلیشن تو نہیں ہے نور محمد کے ساتھ۔۔۔ قانونی کارروائی کرنے کے لیے کسی ایسے شخص کا ساتھ ہونا بہت ضروری ہے۔ جس کا نور محمد کے ساتھ بلڈ ریلیشن ہو۔۔۔" وہ پرجوش انداز میں بولا تھا۔ انہوں نے غور کر اسے دیکھا۔ ان کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو رہا تھا۔

"بہرحال جو بھی بات ہو عمر۔۔۔ تم اس سارے معاملے سے دو سو قدم دور رہو۔۔۔ اللہ امائمہ بیٹی کے والدین کو صبر دے۔۔۔ ان کے لیے بیٹے کا زندہ ہونا یا نہ ہونا اب ایک ہی بات ہے۔۔۔ تم اب دوبارہ لوٹ مت جانا۔۔۔ سویڈن میں جو خودکش دھماکہ ہوا ہے نا اس کے

بمبار کا تعلق بھی وطن سے تھا اور تم سے کیا چھپا ہوا ہے۔ اب تو ہر روز وہاں فسادات ہو رہے ہیں گوروں اور بھورے لوگوں کے درمیان۔۔۔ یاد رکھنا یہ میری نصیحت نہیں ہے' میری تاکید ہے۔" ان کا لہجہ دو ٹوک تھا۔ وہ چپ ہوئے تو ممی بھی بول اٹھیں۔

"عمر! ٹینڈر ریلیشن تمہارا ابھی نہیں ہے اور تمہارے ابو کہہ رہے ہیں تاکہ تم اس معاملے سے دور رہو تو بہتر ہے۔۔۔ پہلے ہی مسلمانوں کے لیے بہت مشکلات بڑھ گئی ہیں۔ تمہارے سامنے ہی ہے سب کچھ۔ اس دن مارکیٹ میں کیا ہوا تھا۔۔۔ ذرا سی بات کے لیے مجمع اکٹھا ہو گیا تھا' مسلمانوں بالخصوص پاکستانیوں کے لیے زندگی روز بروز مشکل ہوتی جا رہی ہے۔۔۔ اسکارف سے سر ڈھانپنا ہی مصیبت بنتا جا رہا ہے یہاں۔۔۔ داڑھی والا مسلمان اور ڈھکے سر والی عورت مشکوک سمجھے جاتے ہیں اب۔۔۔ اور پھر پاکستانی چھینک بھی مارے تو یہ گورے سوائن فلو پھیلانے کا الزام لگانے لگتے ہیں۔۔۔ دہشت گردی کا لفظ بھی منہ سے نکالو گے تو یہ منٹوں میں تمہیں دہشت گرد ثابت کر دیں گے۔۔۔ تم لوگوں کو بے شک ڈر نہ لگتا ہو' لیکن میں اس دن کے بعد سے بہت خوف زدہ ہو گئی ہوں۔ تم بس اس معاملے میں نہیں پڑو گے" عمر چند لمحے دونوں کی جانب دیکھتا رہا۔

"نور محمد دہشت گرد نہیں تھا ابو۔۔۔ جب وہ شخص تھا ہی معصوم تو ہم کیوں خوف زدہ ہیں؟ کس لیے ساتھ نہ دیں اس کا۔۔۔ یہ مسلمانوں کے خلاف ایک سازش ہے۔۔۔ مسلم آبادی کو پریشرائز کرنے کی کوشش ہے یہ۔۔۔ اور ممی! آپ خود ہی تو کہا کرتی ہیں کہ برائی کو پھیلتے دیکھو تو اسے ہر ممکن طریقے سے روکنے کی کوشش کرو' میں تو وہی کروں گا جو آپ نے مجھے سکھایا ہے۔۔۔ میں اس شخص کا ساتھ ضرور دوں گا۔"

وہ چڑ چکا ہوا تھا لیکن بات تحمل سے ہی کر رہا تھا۔ وہ اکیلا ہو گیا تھا۔ وہاں کوئی بھی اس کے موقف کی حمایت میں نہیں بول رہا تھا۔ ابو نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا' وہ چاہتے تھے عمر بھی یہی کہے کہ وہ شخص جھوٹ بول رہا ہے۔ بھروا سے سو فیصد جھوٹا قرار دے کر اس سارے معاملے سے مکمل طور پر قطع تعلق ہو جائیں۔ وہ سب بھول جائیں کہ ان کے کسی دور پار کے رشتے دار کا کسی دہشت گردی نیٹ ورک کے ساتھ نام بھی لیا جا رہا تھا' لیکن وہ عمر کو ایک دم یہ سب نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ جب چھوٹا تھا تب بھی ایسے معاملات میں تب تک سکون سے نہیں بیٹھتا تھا' جب تک کہ ان سے بحث کر کے انہیں زچ نہیں کر دیتا تھا۔ اولاد جوان ہو جائے تو باپ کو ٹوکنے کے انداز بدلنے پڑتے ہیں اور وہ تو اب شادی شدہ تھا۔ باپ بننے والا تھا۔

"تم کیا سمجھتے ہو تمہارے صرف اس طرح کہہ دینے سے سب مسئلے سلجھ جائیں گے۔ فرض کرو یہ سازش بھی ہے تب بھی وہ عناصر جو اس کو گھڑنے میں اتنی محنت اور وقت برباد کر چکے ہیں وہ آرام سے بیٹھے ہوں گے۔۔۔ تم کہو گے کہ نور محمد معصوم ہے اور وہ تمہیں یہ کہنے دیں گے۔۔۔ احمقوں کی جنت سے باہر آؤ برخوردار۔۔۔ یہ لندن ہے اور ہم یہاں موم کی طرح پگھل کر مٹی میں جذب بھی ہو جائیں تب بھی پاکستانی ہی رہیں گے اور پاکستانیوں کے لیے ان کے دل میں جگہ کافی تنگ ہو رہی ہے۔۔۔ یہاں رہتے ہوئے ہم بھی اتھنک کی جنگ سے باہر نہیں نکل سکتے۔۔۔ اس لیے بے وقوفی کی باتیں بند کرو۔ تمہاری ذرا سی لاپروائی سے سارا خاندان مشکل میں پڑ جائے گا۔ یہ کھا جائیں گے ہمیں۔۔۔ ہم سب ان کی پلیٹ میں آ جائیں گے۔۔۔ اتنی زندگی گزار کر یہاں جو ساکھ بنائی ہے منٹوں میں ختم ہو جائے گی۔ کاروبار گھر بار سب کچھ۔ پھر مٹی خاک میں مل جائے گا۔" ابو نے سخت لفظوں کو محبت بھرے لہجے میں سمو کر اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ عمر چند لمحے ان کی شکل دیکھتا رہا جیسے زچ ہو رہا ہو پھر سرد لہجے میں بولا۔

"ابو! جب ہم اتھنک کی جنگ سے نکل نہیں سکتے تو پھر ہم یہاں رہ کیوں رہے ہیں' یہ اچھا خدشہ پال لیا ہے آپ لوگوں نے۔۔۔ ہم لندن میں رہ رہے ہیں اس لیے ہم سچ نہیں بولیں گے۔ ہم حق کی مخالفت

کریں گے اور ہم برائی کو دیکھیں گے اسے دل میں برا جانیں گے اور پھر آنکھیں نیچی کر کے وہاں سے گزر جائیں گے۔ مگر اس کے خلاف بولیں گے کچھ نہیں کیونکہ ایتھنک بنیادوں پر ہمارا استحصال ہو گا۔ بہ الفاظ دیگر اگر کسی جگہ کا ذکر کرنا مقصود ہو گا تو ہم دل کھول کر صرف پاکستان کی بات کریں گے۔ پاکستان کو برا ہی کہ ہم وہاں محفوظ نہیں ہیں۔ وہاں مسالک کی بنیاد پر استحصال ہے۔ وہاں مساوی حقوق نہیں ہیں۔ یہاں لندن میں ہمارا جان مال محفوظ ہے۔ ہمارا ایمان محفوظ ہے۔ حد ہو گئی ابو۔ مجھ سے نہیں ہو گا یہ سب۔ ایمان کا اس قدر کمزور درجہ مجھے قبول نہیں۔ میں غلط کو غلط نہ کہوں تو مجھے سکتے بن نیند نہیں آتی۔ میں کیا کروں۔ مجھ سے یہ بات ہضم نہیں ہوتی کہ ایک شخص جو اتفاق سے میرا رشتے دار بھی ہے اور گناہ گار بھی نہیں ہے اسے اگر میری مدد کی ضرورت ہے تو میں کیوں اس کی مدد نہ کروں۔ میں تو ضرور کروں گا۔ لندن ہو یا لاہور میں حق کو حق ہی کہوں گا۔ اللہ کو منہ بھی دکھانا ہے میں نے۔"

شہوز نے بھی اب کی بار اسے ناپسندیدگی سے دیکھا۔ یہ تھا وہ عمر جس کی جذباتیت کے آگے وہ سب خود کو بے بس محسوس کیا کرتے تھے۔

"اللہ کو درمیان میں کیوں لا رہے ہو۔ اللہ نے تو کہا ہے کہ ماں باپ کے حکم کی تعمیل کرو۔ میں تمہیں روک رہی ہوں۔ تمہارے ابو تمہیں روک رہے ہیں تو پھر سمجھ کیوں نہیں جاتے تم۔ اتنے نافرمان کیوں ہو جاتے ہو تم۔ یہ تو نہیں سکھایا تھا میں نے تمہیں۔"

ممی اب بے حد برا مان چکی تھیں اور ان کا لہجہ سخت ناراضی ظاہر کر رہا تھا۔ عمر نے بے چین ہو کر ان کی طرف دیکھا۔

"ممی! اللہ درمیان سے نکلتا ہی کب ہے۔ اسی لیے تو میں چاہتا ہوں کہ ہم حق کا ساتھ دیں۔ ہم سب تا کہ اللہ کے سامنے سرخرو ہو سکیں۔ آپ ہی نے تو سکھایا تھا کہ حق کا ساتھ ہمیشہ دل کھول کر بے خوف ہو کر دو۔ یہ سبق پڑھا کر بھی ہمیشہ آپ ہمیں ڈراتی ہی رہی ہیں۔ یہ غلط ہے ممی۔ آپ ہی کہتی تھیں نا کہ کسی کا کھانا شیئر مت کرنا۔ کہیں کوئی حرام لقمہ نہ بدن میں چلا جائے۔ حرام لقمہ بدن میں جائے گا تو سچ بولنے کی طاقت ختم ہو جائے گی۔ ساری زندگی حرام کے خوف سے بہت سی حلال چیزوں سے بھی اتنی احتیاط سے کی ہیں۔ صرف اس لیے کہ حق اور باطل کا فرق نہ بھول جائے۔ اس لیے جب کوئی یہ کہتا ہے نا کہ حق کا ساتھ نہ دو تو پھر اچھا نہیں لگتا۔ طبیعت بے چین ہونے لگتی ہے۔ سانس اکھڑنے لگتی ہے۔ یہ اگر میری جذباتیت ہے تو آئی ایم سوری ممی! یہ مجھے بہت عزیز ہے۔" وہ چپ ہو گیا تھا اور باقی سب لوگ بھی۔

"میں مانتا ہوں تم حق کے ساتھ ہو۔ میں یہ بھی مان لیتا ہوں کہ نور محمد معصوم اور گنہگار ہے۔ اس کے باوجود اس بات کو دبا دینا بہتر ہے میرے بچے۔ ہم بہت چھوٹے بہت ادنیٰ لوگ ہیں اور یہ سازش بہت بڑی معلوم ہو رہی ہے۔ ہم ان عناصر کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ہماری اگلی پچھلی نسلیں مصیبت میں آجائیں گی۔ ہمارا موقف بھی سمجھنے کی کوشش کرو۔"

ابو اس کے انداز سے پیچ کر بولے تھے۔ وہ واقعی غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔ بچپن سے اسے ایک ہی بات تو سکھائی تھی انہوں نے کہ حق کتنا بھی خوفناک کیوں نہ لگے۔ وہ حق ہوتا ہے اور حق ہی انسانی فطرت ہے اور حق ہی اللہ کو مرغوب ہے اور بالآخر حق ہی فاتح اعظم ٹھہرتا ہے۔

"عمر! مجھے ہولاؤ مت۔ ختم کرو بس اب۔ تم ٹھیک کہہ رہے ہو، لیکن میں اپنی اولاد کو کسی مشکل میں نہیں دیکھ سکتی۔ پتا نہیں کس سے مل کر آ گئے ہو۔ کون لوگ ہیں ہمیں نہیں پڑنا کسی ایسے ویسے مسئلے میں۔ ہم میں سے کوئی تمہیں اس حماقت کی اجازت نہیں دے سکتا۔ بھول جاؤ نور محمد کو۔" ممی نے عاجز ہو کر کہا تھا۔

"میں نہیں بھول سکتا ممی۔ مجھ سے بھولا نہیں جائے گا۔" عمر بھی ان لوگوں کے انداز سے خائف ہو

رہا تھا۔

"ممی ٹھیک کہہ رہی ہیں عمر۔ بھول جاؤ نور محمد کو۔" یہ امائمہ کی آواز تھی۔ وہ ان لوگوں کی بلند آوازیں سن کر زیادہ دیر کمرے میں لیٹی نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے اٹھ کر چلی آئی تھی۔ دل تو بوجھل سا تھا اور فی الوقت کوئی دوسری سوچ بھی ذہن میں نہیں تھی بلکہ اس نے ساس سسر کی ساری باتیں سنی تھیں اور کہیں نا کہیں اسے بھی ان باتوں سے اتفاق تھا۔

"امائمہ! تم تو ایسے مت کہو" عمر کو اس کی مداخلت ذرا نہیں بھائی۔

"تم سمجھنے کی کوشش کرو عمر! معاملہ واقعی اتنا الجھا ہوا ہے کہ ہم سب کا اس سے دور رہنا ہی بہتر ہے۔ یہ ایک خاندان کا نہیں ہے۔ نسلوں کا معاملہ ہے۔ ہم کس کس کو سمجھائیں گے کہ نور محمد دہشت گرد نہیں تھا۔"

وہ ایک ایک قدم اٹھاتی اس کے ساتھ کاؤچ پر آ بیٹھی تھی۔ عمر نے ہونٹ بھینچ کر اسے دیکھا۔ ممی اسے فاتحانہ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ "انہیں اچھا لگا تھا کہ امائمہ بھی ان کا ساتھ دے رہی تھی۔

"چلو۔ تمہاری کمی رہ گئی تھی۔ باخدا پہلے تم سب لوگ خود کو تو سمجھا لو کہ وہ دہشت گرد نہیں تھا۔ مجھے تو ایسے لگ رہا ہے کہ جیسے تم سب لوگ خود کو ہی یقین نہیں دلا پا رہے۔" امائمہ کے الفاظ نے اسے مزید تاؤ دلا دیا تھا۔

"عمر! پلیز ہوش کے ناخن لو۔ ہر معاملہ جذباتیت سے حل نہیں ہوتا۔ ایک نور محمد کی خاطر سارے خاندان کو مصیبت میں نہیں ڈالا جا سکتا۔ مجھے یقین ہے وہ دہشت گرد نہیں ہے بلکہ وہ جس جگہ پر ہے وہاں دہشت گرد ہی رکھے جاتے ہیں۔ وہ لیبلڈ ہو چکا ہے۔ اس کے نام کے ساتھ اب یہ لفظ لگ چکا ہے جسے چاہ کر بھی مٹایا نہیں جا سکتا۔ نہ ہی کبھی مٹایا جا سکے گا۔ میرا خاندان بھی یہ سب نہیں برداشت کر پائے گا۔ ہماری آنے والی نسلیں یہ سب سہہ نہیں پائیں گی۔ اس بات کو یہیں دفن کر دو بس۔ میں پاکستان میں یہی کہہ دوں گی کہ بھائی کا کچھ پتا نہیں چلا۔ میرے ماں باپ پہلے ہی بہت کچھ سہہ رہے ہیں لیکن مزید یہ سب نہیں سہہ سکتے عمر۔ اولاد کا دکھ انہیں کھا جائے گا۔"

وہ نقاہت کا شکار تھی مگر پھر بھی پوری کوشش کر رہی تھی کہ اپنے شوہر کو وہ بات سمجھا سکے جو اس کے ماں باپ سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

"بہت خوب۔ بہت ہی خوب۔ یہی امید تھی تم سے مجھے۔ اتنے دن سے تم بھائی بھائی کر رہی تھیں۔ اور اب جب کچھ پتا چل گیا ہے تو تمہیں وہی بھائی لیبلڈ لگنے لگا ہے۔ پہلے بھی تم یہی کہتی آئی ہو کہ میرے ماں باپ بہت لاچار ہیں۔ اولاد کا دکھ انہیں کھائے جا رہا ہے اور اب جب کہ اسی اولاد کے بارے میں پتا چل گیا ہے تب بھی تم یہی کہہ رہی ہو کہ اولاد کا دکھ تمہارے ماں باپ کو کھا جائے گا۔ مجھے آپ سب لوگوں پر حیرت ہو رہی ہے۔ آپ لوگ تقریریں اتنی بڑی بڑی کرتے ہو اور اب جب عمل کا وقت آیا ہے تو سب نصیحتیں کرنے لگے ہیں۔ دراصل یہی ہمارا قومی رویہ ہے۔ انسان ہوں، رشتے یا آپ کا اپنا ملک۔ اسے صرف تب اون کرنا ہے جب وہ کامیاب ہے طاقتور ہے۔ مستحکم ہے۔ اگر وہ ناکام، کمزور یا غیر مستحکم ہے تو اسے لک آؤٹ کر دو۔ ڈس اون کر دو۔ زندگی سے نکال دو۔ اور اسے "ذلت" کی طرح پہلو میں چھپا کر رکھ لو۔ معاف کیجئے گا آپ سب لوگ۔ میں ایسا نہیں ہوں اور میں کبھی ایسا ہو بھی نہیں سکتا۔ آپ میں سے کوئی بھی نور محمد کا ساتھ نہ دے بلکہ لیکن اب میں اس کا ساتھ ضرور دوں گا۔ یہ اب میرے لیے حق اور باطل کی لڑائی ہے اور میں حق کو پہچانتا ہوں۔ یہ بحث و مباحثہ میری طرف سے یہاں ختم ہوتا ہے۔"

اس نے اتنا کہا تھا پھر ان میں سے کسی کی جانب دیکھے بنا وہاں سے اٹھ کر چل دیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"کھانا تیار ہے ملکہ عالیہ؟" یہ سوال تھا جو اس نے

امی کے عقب میں ان کے کندھے کو انگلی سے بجاتے ہوئے پوچھا تھا۔

"ہاں تمہارا پسندیدہ مٹر پلاؤ اور شامی کباب۔" وہ مسکرائی تھیں۔

"کتنی دیر ہے؟" اسے زیادہ ہی بھوک لگ رہی تھی۔

"پانچ منٹ بس... چاول دم دیے ہیں اور کباب تلنے لگی ہوں۔ تم ذرا زارا کو تو فون کرو... اگر فارغ ہو گئی ہے تو ہمارے ساتھ کھانا کھالے... بے چاری چھٹی والے دن بھی یہاں خوار ہوتی رہتی ہے۔ میں نے ایس ایم ایس کیا تھا اس کا جواب نہیں آیا۔"

انہوں نے فرائنگ پین دوسرے چولہے پر رکھتے ہوئے بنا اس کی جانب دیکھے کہا تھا۔ اس نے شیلف پر پڑی سلاد کی پلیٹ اٹھاتے ہوئے ان کی جانب ناپسندیدگی سے دیکھا۔

"آپ اپنے خلوص کا اس قدر بے دریغ استعمال بھی مت کیا کریں کہ لوگ عاجز ہی آجائیں... کوئی ضرورت نہیں ہے کسی کو فون کرنے کی۔" اس نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے ناک چڑھا کر کہا تھا۔ وہ آج کل دوپہر کے وقت ہی اٹھتا تھا تو ناشتے کے بجائے کھانا ہی کھا لیتا تھا۔

"لو ہو... ایک تو تم اپنی ماں کی ماں بنے رہا کرو... نہیں آتے لوگ عاجز تم کل تو کرو۔" وہ چڑ کر بولی تھیں۔ ان کے ہاتھ تیزی سے انڈا پھینٹ رہے تھے اس عمر میں بھی ان کی پھرتی قابل داد تھی۔

"ہمارا کام تھا ڈاکٹر زارا کی مدد کرنا... وہ ہم کر چکے... اب اس کو خود اپنے مسئلے مسائل حل کرنے دیں... یہ نہ ہو کہ وہ آپ کی روز روز کی دعوتوں سے تنگ آجائے۔"

"ارے کھانے کا وقت ہے... مہمان کی موجودگی باعث رحمت ہوتی ہے۔ میں کون سا سر دبوانے کے لیے بلوا رہی ہوں اسے۔"

"نہ کریں امی... نہ کریں۔ لوگ آپ کو وہ کہنے لگیں گے۔" وہ گاجر کتر رہا تھا۔

"کیا کہنے لگیں گے؟" انہوں نے مڑ کر اسے دیکھا تھا، پھر چونکہ کباب فرائنگ پین میں ڈال چکی تھیں اس لیے فوراً ہی توجہ اس طرف مبذول کرلی ورنہ اس کے چہرے کی شرارتی مسکراہٹ ضرور دیکھ لیتیں۔

"وہی جو گول گول سا ہوتا ہے باہر سے سبز سبز اندر سے سفید سفید۔" وہ مسکراہٹ چھپانے کی کوشش بھی نہیں کر رہا تھا۔

"کیا بک رہے ہو... سفید سفید، سبز سبز پاکستان کا پرچم؟" انہوں نے شاید جملے کا آخری حصہ ہی سنا تھا۔ سلمان نے قہقہہ لگایا۔

"نہیں وہ جو چپ چپا سا ہوتا ہے۔ لیس دار... جس کا اچار ڈالتے ہیں۔" اس نے جملہ مکمل کر کے منہ میں کھیرا رکھ لیا تھا۔ امی کا سارا دھیان کبابوں کو سنہری رنگت میں رنگنے کی جانب مبذول تھا اس لیے ایک ساعت تو وہ واقعی نہیں سمجھی تھیں پھر جب سمجھ گئیں تو بڑا برا سا منہ بنایا۔

"شرم تو نہیں آتی ماں کو لسوڑا کہتے ہوئے۔" سلمان نے پھر قہقہہ لگایا۔

"میں کب لسوڑا کہہ رہا ہوں آپ کو... میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ اگر آپ اپنا خلوص آٹے کے بھاؤ لٹاتی رہیں گی تو لوگ خدانخواستہ میرے منہ میں خاک... آپ کو کہہ سکتے ہیں۔ لسوڑا۔" سارا زور آخری لفظ پر دیتے ہوئے اس نے جملہ مکمل کیا تھا۔

"برخوردار! خلوص کا بھاؤ تو آنہ بھی نہیں ہوتا... یہ تو ہے ہی لٹانے کی چیز... جتنا لٹاؤ گی اتنا ہی واپس پاؤ گی، ہاتھ والا نلکا دیکھا ہے نا، یہ خلوص بالکل ہاتھ والے نلکے کی طرح ہوتا ہے۔ جتنی طاقت سے چلاؤ گے۔ اتنا پانی آئے گا۔" انہوں نے کباب پلیٹ میں منتقل کیے تھے۔

"امی! کھلا دیں گی یا لیکچر سے پیٹ بھرنا پڑے گا؟" وہ مڑ کر بولا تھا۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کے پاس امی کی بات کا جواب نہیں ہے سوالا جواب ہو کر وہ ہمیشہ یہی انداز اپناتا تھا۔

"کھانا تیار سمجھو۔ تم فون تو کرو۔" انہوں نے وہی بات دہرائی جو سلمان سننا نہیں چاہ رہا تھا۔

"امی! میں فون وون نہیں کر رہا۔ اتنی بھوک لگی ہوئی ہے اور آپ کو خلوص کا دورہ پڑ گیا ہے۔ آئیں کھانا کھاتے ہیں آپ پلیٹ بنا دیں میں کھانا کھا کر دے آؤں گا ڈاکٹر صاحبہ کو۔"

وہ مزید چڑ گیا تھا۔ امی نے کباب اور رائتہ میز پر رکھتے ہوئے اس کی جانب ناپسندیدگی سے دیکھا لیکن کہا کچھ نہیں۔ وہ جانتی تھیں کہ بھوک فی الحال اس کے حواسوں پر سوار ہے۔ تمام لوازمات میز پر سجا کر وہ خود بھی بیٹھ گئی تھیں۔ ان کے بیٹھتے ہی وہ پلیٹ میں چاول نکالنے لگا۔ امی نے بھی گلاس میں پانی بھرا پھر اس کا رغبت بھرا انداز دیکھ کر شفقت سے مسکرائیں لیکن کہا کچھ نہیں بلکہ خاموشی سے پہلے اس کی پلیٹ میں رائتہ ڈالا پھر کباب بھی رکھ دیا۔ اسے شوق سے کھاتا دیکھ کر مطمئن ہو گئی تھیں۔ اسی لیے اپنے لیے چاول نکالتے ہوئے بھی اسے کسی بات پر مخاطب کیا نہ ٹوکا۔

کچھ دیر خاموشی سے دونوں ماں بیٹا کھانے میں مگن رہے پھر جب اس نے پہلا کباب ختم کر کے دوسرا کباب بھی خود اٹھا کر پلیٹ میں رکھ لیا تو امی نے کھنکھار کر گلا صاف کیا پھر ٹھٹک کر رک گئیں اور کچن کی کھڑکی سے باہر دیکھا۔ انہیں ایسا محسوس ہوا تھا جیسے باہر والا گیٹ کسی نے کھولا ہو۔ پڑوس والوں کی بیا چتا بھی آئی ہوئی تھی تو اس کے بچے اکثر کھیلنے کے لیے دوپہر کو آجایا کرتے تھے لیکن جب کھڑکی سے کوئی نظر نہیں آیا تو پھر سر جھٹک کر اس کی جانب دیکھا۔

"تم زارا سے کب بات کرو گے؟"

"کون سی بات۔۔۔؟" اس نے نا سمجھی کے عالم میں ان کا چہرہ دیکھا تھا۔ اسے آج کل اپنے پروجیکٹ کے علاوہ کسی چیز میں دلچسپی محسوس نہیں ہوتی تھی۔

"آمنہ کی بات۔" امی جتا کر بولیں۔

"آمنہ کی بات زارا سے کیوں کروں گا امی؟" اسے امی کی باتوں سے زیادہ فی الوقت چاولوں میں دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔

"زارا سے کرنا بند کرو۔ میں شادی کی بات کر رہی ہوں۔" امی نے اس کی پلیٹ میں بلا ضرورت مزید چاول نکالے کہ کہیں وہ اٹھ کر چلا نہ جائے۔

"میں زارا کی شادی کی بات آمنہ سے کروں۔۔۔ یا آمنہ کی شادی کی بات زارا سے کروں۔ کس کی شادی ہو رہی ہے۔ زارا کی شادی ہو رہی ہے؟ اس نے بتایا آپ کو؟" وہ آخری بات پر چونکا تھا۔ امی نے اپنے تئیں اس کی چوری پکڑی پھر مسکرائیں۔

"تم سب کو چھوڑو صرف اپنی شادی کی بات کرو۔"

"ماشاء اللہ یعنی اب آپ کی بورنگ باتیں بھی برداشت کرنا پڑیں گی۔۔۔ اچھا کھانا کھلانے کی یہی سزا دیتی ہیں آپ ہمیشہ۔" وہ گہری سانس بھر کر بولا تھا۔

"میں سنجیدہ ہوں۔" امی نے اسے گھورا تھا۔

"میں سلمان حیدر ہوں۔۔۔ سنجیدہ بیگم آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔۔۔ کھانا کھائیے نا!" وہ ان کی سنجیدہ بات کو واقعی غیر سنجیدہ انداز میں اڑا رہا تھا۔ امی چند ساعتوں تک تو خاموشی سے اس کی بات کو سمجھنے کی کوشش کرتی رہیں پھر سمجھ گئیں تو اس کے کندھے پر چپت رسید کر کے بولیں۔

"تم مان کیوں نہیں جاتے کہ تم زارا کو پسند کرتے ہو؟"

"میں نے کب انکار کیا ہے کہ میں اسے پسند کرتا ہوں۔۔۔ اچھی لڑکی ہے تب ہی تو ہمارے شناساؤں میں شامل ہے۔۔۔ اچھی ہے تب ہی تو آپ سے ملوایا ہے۔ اچھی ہے تب ہی تو آپ کو کھانے کے وقت پر یاد آجاتی ہے۔" وہ مٹر کا ایک ایک دانہ منہ میں رکھتے ہوئے وضاحت کر رہا تھا۔ امی کو ایسا محسوس ہوا جیسے وہ انہیں ہمیشہ کی طرح ٹال رہا ہے۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ میں خود ہی زارا سے بات کر لوں گی۔" انہوں نے گویا دھمکی دی تھی۔

"یہ ہمارے گھر کی ہر بات میں زارا کا ذکر کیوں آجاتا ہے؟" اس نے چمچ پلیٹ میں رکھ دیا تھا۔ پلیٹ میں ابھی بھی چاول موجود تھے۔

"یہ سماجی اصول ہے بیٹا۔۔۔ پہلے لڑکی کا ذکر گھر میں آتا ہے پوری لڑکی اس کے بعد ہی گھر آتی ہے۔"

سلمان نے ان کی بات پر اب کی بار بغور ان کی جانب دیکھا پھر کچھ دیر دیکھتا ہی رہا۔

"امی۔۔۔ آپ بہت ذہین و فطین ہیں۔۔۔ لیکن رمضان کا چاند رجب میں دیکھنے کی کوشش نہ کریں۔۔۔ میں آپ کو آخری بار کہہ رہا ہوں۔۔۔ آپ غلط سوچ رہی ہیں۔"

وہ مصنوعی انداز میں مسکراتے ہوئے کرسی سے اٹھ گیا تھا۔ اس کا انداز دو ٹوک تھا' سوائی چند لمحے کے لیے چپ ہی ہو گئیں اور کچھ لمحے تذبذب کے عالم میں اسے سنک کے پاس کھڑے ہاتھ دھوتا دیکھتی رہیں۔ وہ جو کہہ رہا تھا ان کی سمجھ میں تو آ گیا تھا لیکن وہ اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ بیٹے کی یہ حرکتیں انہیں تاؤ دلاتی تھیں۔ وہ کچھ لمحے اس کی پشت کی جانب دیکھتی رہیں پھر کہنے کے لیے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو چڑ کر اپنی پلیٹ کی جانب متوجہ ہوئی تھیں۔

"میں اگر غلط سوچ رہی ہوں نا تو تم غلط کر رہے ہو میپو۔۔۔ ایک ماں کے دل کے ساتھ کھیل رہے ہو۔۔۔ اللہ پوچھے گا تمہیں۔"

"مدھوبالانہ بنیں۔۔۔ کھانا کھائیں۔۔۔ پھر چائے پلاتا ہوں آپ کو اپنے ہاتھ کی۔" وہ مسکراتا ہوا سا اس چین اٹھانے لگا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ اب تم سے اس سے متعلق کوئی بات نہیں ہو گی۔ میں خود ہی زارا سے بات کروں گی اور اسے بتادوں گی کہ وہی "آمنہ" ہے۔" ان کا انداز دو ٹوک تھا۔ سلمان کچھ نہیں بولا تھا اور ان دونوں کو پتا نہیں چلا تھا کہ کوئی گیٹ تک آ کر دوبارہ واپس چلا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اتنی بے مروتی بھی اچھی نہیں ہوتی ڈاکٹر صاحب۔"

سلمان نے دروازے سے اندر آتے ہوئے اسے دیکھ کر کہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں المونیم فوائل سے ڈھکا ہوا پارسل تھا۔ زارا نے اسے دیکھا اور پھر دیکھتی رہی۔

اس کا دماغ بالکل کام نہیں کر رہا تھا۔ وہ جو باتیں ان دونوں ماں بیٹے کو کرتا سن کر آئی تھی ان سب نے اسے بے حد الجھا دیا تھا۔ آنٹی نے اسے ٹیکسٹ کیا تھا کہ وہ کھانا ان کے ساتھ کھائے۔

یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ جب سے وہ یہاں آنا شروع ہوئی تھی اتوار کو کھانا ان کے ساتھ ہی کھاتی تھی۔ ایک بار وہ اپنے گھر کے خانساماں سے بھی فرائیڈ رائس بنوا کر لے گئی تھی' لیکن رافعہ آنٹی نے اس بات کا سخت بُرا مانا تھا۔ اس کے بعد سے وہ کچھ بھی نہیں لے کر گئی تھی۔ اس کے لیے آنٹی رافعہ اب ایک سہیلی کی طرح تھیں۔ ان کے درمیان کافی بے تکلفی پیدا ہو چکی تھی۔ اسی لیے جب ان کے گھر کا گیٹ کھلا ملا تو اس نے اطلاعی گھنٹی بجانے کا تکلف نہیں کیا تھا' بلکہ گیٹ کھول کر اندر چلی گئی تھی اور تب ہی برآمدے میں کھلنے والی کچن کی کھڑکی سے ان دونوں کی باتوں' آوازوں نے اسے لاشعوری طور پر باہر ہی رک جانے پر مجبور کیا تھا۔ وہ اسی کا ذکر کر رہے تھے۔

"تم زارا سے کب بات کرو گے؟" وہ نجانے کس بات کے متعلق کہہ رہی تھیں لیکن اس کا ذکر ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے وہیں کھڑی رہی اور پھر اسے سمجھنے میں چند لمحے ہی لگے تھے کہ آنٹی رافعہ دراصل اپنے بیٹے سے کیا بات کر رہی تھیں۔ وہ ان دونوں ماں بیٹے کی انتہائی ذاتی گفتگو تھی' لیکن اس کے لیے یہ دھچکا بہت بڑا تھا کہ آنٹی کو اسے پہلی بار دیکھ کر جو غلط فہمی ہوئی تھی کہ وہ "آمنہ" ہے وہ دراصل غلط فہمی نہیں تھی۔

کیا میپو اسے ہی "آمنہ" کہتا تھا۔ اس سوال نے اسے جھنجوڑ کر رکھ دیا تھا۔ وہ اچھا انسان تھا۔ وہ دل سے اس کی قدر کرتی تھی' اس کی عزت کرتی تھی' لیکن محبت والا معاملہ دور دور تک نہیں تھا۔ اس نے اسے شہوز کے متعلق ایک ایک بات بتا رکھی تھی۔ وہ اس کی اور شہوز کی وابستگی اور رشتے سے متعلق مکمل واقفیت رکھتا تھا تو پھر اسے یہ حق نہیں تھا کہ وہ اس کے متعلق

اپنی امی کو کسی قسم کی کوئی آس دلاتا یا کسی غلط فہمی کا شکار ہوتا یا پھر اپنے دل میں ایسی کوئی امید پالتا کہ ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی ایسی وابستگی پیدا ہو سکتی ہے۔

زارا کو اس ساری صورت حال سے انتہائی الجھن ہونے لگی تھی۔ نینو کے دل میں اگر اس کے لیے ایسی کوئی پسندیدگی تھی تو یہ بہت عجیب اور الجھا دینے والی بات تھی اور نجانے یہ پسندیدگی پیدا کب ہوئی تھی۔ وہ تو شہروز کے متعلق ہر بات اتنے کھلے الفاظ میں اسے بتاتی آئی تھی، حتیٰ کہ اس نے اسے یہ بھی بتا دیا تھا کہ کبھی کبھی وہ یہ سوچ کر پریشان ہو جاتی ہے کہ شہروز کو امائمہ جیسی لڑکیاں اچھی لگتی ہیں اور وہ دل ہی دل میں اس بات پر جیلس بھی ہوتی ہے۔

"میری پیاری امی نے آپ کے لیے کھانا بھیجا ہے۔ اور میری امی بہت اچھا کھانا بناتی ہیں۔" اس نے پارسل اس کے سامنے میز پر رکھ دیا تھا اور تب ہی شاید اس نے زارا کے چہرے کو بغور دیکھا تھا، جہاں دنیا بھر کا اضطراب پھیلا ہوا تھا۔ تین بجے وہ کلینک بند کر دیا کرتے تھے اس لیے اس کے ساتھ آنے والی دونوں نرسز بھی جا چکی تھیں۔

"کیا ہوا تمہارے چہرے پر زوال کا وقت کیوں ٹھہرا ہوا ہے؟" اس نے اپنے مخصوص غیر سنجیدہ انداز میں سوال کیا تھا۔ زارا کچھ نہیں بولی۔ اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ بولے بھی تو کیا۔ وہ واقعی بہت الجھی ہوئی تھی۔

"رکو۔۔۔ مجھے اس وقت کو بدلنے کا طریقہ آتا ہے۔ ایک مسکراہٹ ہر مشکل وقت کو ٹال دیتی ہے۔ مسکرا دو پلیز زارا!" وہ ایسا ہی تھا، اسی طرح کی بے سروپا باتیں کرتا تھا لیکن آج سے پہلے اس کی باتیں زارا کو بری نہیں لگی تھیں۔ وہ مسکرانا تو دور کی بات، اس کی جانب دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔ سلمان کرسی گھسیٹ کر اس کے مقابل بیٹھ گیا تھا۔

"تمہاری مسکراہٹ کا پاس ورڈ آتا ہے مجھے۔۔۔ رکو۔" اس نے اتنا کہا پھر میز پر پڑے ایک چھوٹے سے اسٹینڈ سے چٹ اٹھا کر اس پر S.H.A.H.R.O.Z لکھنا شروع کیا تھا۔

وہ شہروز کے نام کے اسپیلنگ لکھ رہا تھا۔ اسپیلنگ لکھنے کے بعد اس نے لمحہ بھر کا توقف کیا تھا پھر با آواز بلند بولا تھا۔

"انٹر" زارا نے اسے یہ سب حرف لکھتے اور با آواز بلند پڑھتے دیکھا اور سنا تھا۔ وہ پھر بھی مسکرا نہیں پائی تھی۔

"اوہو۔۔۔ پاس ورڈ چینج کر لیا گیا۔۔۔ اور بتایا بھی نہیں۔" اس کا ساکت و جامد چہرہ دیکھ کر وہ مزید چڑا رہا تھا۔

"ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔" وہ یکدم بولی تھی۔ اس کا لہجہ خاصا جارحانہ جبکہ سلمان کا انداز کافی پُرخلوص تھا۔

"اللہ نہ کرے کہ کبھی ایسا ہو۔" وہ اسی انداز میں بولا تھا۔ زارا اس کی جانب مڑی پھر بے دھڑکے پن سے پوچھنے لگی۔

"آپ مجھ سے محبت کرتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ بے حد۔" اس نے بھی ترنت جواب دیا تھا۔ زارا کا حلق تک کڑوا ہو گیا تھا۔

(باقی آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں)

ہاجرہ ریحان

اعتماد

"مجھے تم سے کچھ نہیں سننا' صرف یہ پوچھنا ہے کہ وہ کون تھا؟"

مجھے ان کے اس سوال پر حد سے زیادہ حیرت تھی۔ میں نے حسنین بھائی کی طرف دیکھا جو ہماری میز سے کچھ دور کھڑے کسی شناسا سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔ کیا انہوں نے ثروت باجی کو ابھی تک کچھ نہیں بتایا؟ اور اگر نہیں بتایا تو ثروت باجی کو کیسے پتا چلا... میں ابھی یہی سب سوچ رہی تھی کہ ثروت باجی اب کی بار سخت لہجے میں گویا ہوئیں۔

"گونگی کیوں بن گئی ہو؟ جواب کیوں نہیں دیتیں؟ بتاتی کیوں نہیں؟"

حسنین بھائی کو ثروت باجی کے ساتھ دیکھ کر مجھے خوشی ہوئی تھی' وہی اب میری خاموشی کی وجہ بھی بن گئے تھے۔۔۔ اگر یہ ساتھ نہ ہوتے۔ اگر میں نے ان دونوں کو یوں ساتھ نہ دیکھا ہوتا تو میں ابھی صاف صاف ثروت باجی کو بتا دیتی کہ وہ حسنین بھائی ہی تھے۔ مگر اب۔۔۔ اب جبکہ وہ دونوں مطمئن نظر آ رہے تھے.... ثروت باجی کے چہرے پر تازگی سی تھی۔۔۔ ان کے نوعمر لڑکے۔۔۔ خوب لمبے چوڑے' صحت مند۔۔۔ ایک خوش حال گھرانے کی تصویر بنے وہ سب کے سب اس محفل میں مجھ سے ٹکرا گئے تھے... میرے تو وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں کبھی ثروت باجی کو دوبارہ دیکھ پاؤں گی اور وہ بھی اس طرح۔۔۔ جو سانحہ میرے یا حسنین بھائی کی وجہ سے ان پر گزرا تھا اس کی جھلک اب اگر تھی بھی تو ان کے اوپر چھپ گئی تھی اور ایک گداز سی شخصیت کا خاکہ ابھارتی تھی... ثروت باجی اب بہ رحم دل۔۔۔ بہت ہی حساس دل رکھنے والی خاتون۔۔۔ نظر آتی تھیں۔۔۔ یہ بات تو تھی کہ جو حس مزاح ان کے اندر پہلے تھا' اب اس کا شائبہ تک نظر نہیں آتا تھا مگر وہ زندہ تھیں اور کئی لوگوں سے بہتر تھیں بھی۔۔۔ ان کے ساتھ دراز قد و کاٹھ والے حسنین بھائی بھی تو تھے۔۔۔ میں نے گلا کھنکار کر اپنے کو آپ ٹٹولا... مگر الفاظ نہ نکل سکے۔۔۔ ثروت باجی تھوڑی دیر مجھے گھورتی رہیں اور پھر لرزتی ہوئی آواز میں انہوں نے کہا۔

"کاش کہ تم بھی میری بہت سی دوستوں کی طرح میرے اس سوال پر حیرانی کا اظہار کر دیتیں تو میں سمجھ جاتی کہ یہ تم نہیں ہو۔۔۔ مگر تمہاری خاموشی اس بات کا اشارہ ہے کہ وہ تم ہی تھیں۔۔۔ کیا سمجھا تھا میں نے تم کو... کتنا چاہا تھا۔۔۔ چھوٹی بہن نہیں تھی میری' تو تم کو اپنی چھوٹی سی گڑیا سی دوست بنا کر تم سے ساری عمر کا ناتا رکھنے کا سوچا تھا مگر تم نے۔۔۔ کہاں لا کر میرا دل توڑا ہے۔۔۔" ان کی آنکھیں ابھی تک اتنی ہی گہری تھیں کہ ان میں دو تین لمحے سکے لیے آنسو تیرے اور پھر وہ بھی ڈوب گئے۔۔۔ میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا' ایسا کہ کانوں میں دھمک کے علاوہ کچھ محسوس نہیں ہو رہا تھا۔۔۔ وہ مجھے چند لمحے دیکھتی رہیں' پھر ناراض سی اٹھ کر اسٹیج پر سجی بیٹھی دلہن کو دیکھنے چلی گئیں۔

✡ ✡ ✡

مطلوبہ کالج میں داخلہ حاصل کرنے کے لیے دسویں جماعت میں مجھے کافی محنت کرنا تھی۔۔۔ ویسے تو ٹیوشن ہمارے گھر میں کبھی بھی کسی کو بھی نہیں پڑھائی گئی تھی' مگر نویں جماعت میں عین امتحان کے دنوں



میں میں بیمار پڑ گئی تھی یوں پاس تو ہو گئی تھی مگر گریڈ حد سے زیادہ گر گیا تھا۔ ایسے میں امی بھی سمجھ رہی تھیں کہ مجھے کسی کی مدد کی ضرورت ہے' لہٰذا امی نے مجھے ثروت باجی کے ہاں پڑھنے کے لیے بھیجنا شروع کر دیا۔ وہ کوئی باقاعدہ ٹیوشن نہیں پڑھاتی تھیں۔ میں ہی جاتی تھی ان سے پڑھنے کے لیے وہ بھی اس لیے کہ میری امی سے ان کی امی کی دوستی تھی اور ثروت باجی امی کو بڑی پسند تھیں۔ ثروت باجی اس وقت بی فارمیسی کر رہی تھیں۔ ان کی ذہانت کی تو میں قائل تھی ہی' ویسے بھی وہ بڑی ہنس مکھ تھیں۔ پڑھائی کے دوران بھی چٹکلے چھوڑتی رہتی تھیں وہ کچھ اس طرح مجھ سے باتیں کرتی تھیں کہ میں ان سے بڑے مزے سے اپنی تمام باتیں کر لیتی تھی یا پھر وہ اگلوانے میں ماہر تھیں۔ ان کی باتوں میں جہاں دنیا بھر کی معلومات تھیں۔ وہیں ان کی یونیورسٹی کے قصوں سے بھی میں بڑی متاثر رہتی تھی۔ وہ اپنے والد کی بہت لاڈلی تھیں۔ صرف دو بھائی بہن ہونے کی وجہ سے گھر میں ان کے دم سے ہی رونق لگی رہتی تھی۔ خیر۔ میں نے وہ چھ مہینے بڑے اچھے گزارے۔

ثروت باجی کا گھر پہلی منزل پر تھا اور نیچے جو گھر تھا اس کے صحن سے ہو کر سیڑھیاں اوپر جاتی تھیں' جس کی وجہ سے مجھے نیچے والے گھر میں بھی جانا پڑتا تھا۔ مگر کیونکہ مین گیٹ ہر وقت کھلا ہی رہتا تھا تو اوپر جانے والوں کو کوئی روک ٹوک نہیں تھی۔ کچھ دن تو مزے میں گزرے' مگر پھر ایک صاحب سیڑھیوں کے پاس ٹہلتے ہوئے ملنے لگے۔ پہلے تو مجھے اندازہ نہیں ہو سکا۔ مگر پھر کچھ گھبراہٹ سی طاری ہوئی۔ وہ دراز سے قد کے تھے' ایسے کہ جھکے ہوئے سے لگتے۔ اکثر کوئی نہ کوئی کتاب ہاتھ میں لیے ہوئے' کسی سوچ میں ڈوبے' وہ ایک بے ضرر سے انسان لگتے تھے۔ خاص طور سے جمعہ کے روز وہ سفید کرتا اور شلوار میں نظر آتے' میں اوپر جاتے جاتے ایک بار مڑ کر ان کو ضرور دیکھ لیتی تھی۔ ایک دن انہوں نے مجھے ٹوک دیا۔

"بڑوں کو دیکھ کر سلام کرنا نہیں سکھایا کسی نے؟" انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے پوچھا۔ میں نے معصومیت سے جواب دیا۔

"جی سکھایا ہے امی نے۔"

"تو پھر کرتی کیوں نہیں ہو سلام؟" انہوں نے زیر لب مسکراتے ہوئے پوچھا۔

میں نے پھر اسی معصومیت سے جواب دیا "کوئی بڑا نظر آئے تو کر بھی لوں۔"

"ارے تو میں کیا ہوں؟ چلو کرو مجھے سلام؟"

میں نے جان چھڑانے کے لیے جلدی سے سلام کیا اور اوپر پہنچ گئی۔

☆ ☆ ☆

یوں سلام دعا ہونے لگی۔ ایک دن انہوں نے مجھ سے معلومات لیں کہ میں اوپر پڑھنے جاتی ہوں تو کون

کون پڑھاتا ہے۔۔۔ میں نے فخر کرتا کہ میں تو صرف ثروت باجی سے پڑھتی ہوں۔۔ انہوں نے نخوت سے کہا۔

"وہ نک چڑی؟" میرے دل پر لگ گئی۔

"نک چڑی تو نہیں ہیں۔۔۔ اتنا تو ہنستی ہیں۔"

انہوں نے سر کے اشارے سے مجھے رفو چکر ہو جانے کی اجازت دے دی اور میں اوپر آگئی۔۔۔ ایک دو دن کے بعد ایک عدد خط پکڑا دیا گیا۔

"یہ ذرا اپنی نک چڑی باجی کو دے دینا۔۔۔" میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔۔ ثروت باجی کے ہاں امی اکثر آتی تھیں۔۔ اوپر سے کچھ ایسی بات تھی ثروت باجی میں۔۔۔ کہ میں جانتی تھی ان کو یہ بات بالکل بھی پسند نہیں آئے گی' ہو سکتا ہے وہ مجھے پڑھانے سے انکار کر دیں۔۔ شکایت تو وہ شاید ہی لگائیں۔۔ مگر کوئی بہانہ بنا کر مجھ سے پیچھا چھڑا لیں گی۔۔ اور میں ان سے جدا نہیں ہونا چاہتی تھی۔۔۔ میں نے پہلا دن تو یہی سوچنے میں لگا دیا اور خط باجی کو نہیں دیا بلکہ اپنے ساتھ گھر لے آئی۔۔ حسنین بھائی روز مجھ سے پوچھتے۔۔ کہ کوئی جواب دیا۔۔ کیا کوئی اثر نظر آیا۔۔۔ کچھ کہا۔۔۔ میں ہر دفعہ جھوٹ بول دیتی کہ "مجھے نہیں پتا۔۔۔ میں نے خط دے دیا ہے۔" حسنین بھائی اب دیوداس سے نظر آنے لگے۔۔ اور مجھے ان کی حالت پر بھی دکھ ہونے لگا۔۔۔ جھک کر تو پہلے ہی چلتے تھے' اب تو لگنے لگا تھا جیسے ان میں دم ہی نہ رہا ہو۔ ایک احساس ہوا کہ جہاں ثروت باجی مجھے عزیز ہو گئی تھیں' اسی طرح کچھ حسنین بھائی سے بھی انسیت سی ہو گئی تھی' اور پھر میں نے دنیا کا بدترین کام کر دکھایا جو ہم جیسے بیوقوف لوگوں کا وطیرہ ہے۔۔۔ میں نے ان کو اپنی طرف سے ایک خط لکھ ڈالا۔۔ مگر حتی الامکان کوشش کی کوئی ایسی ویسی فضول بات نہ لکھوں۔۔۔ حسنین بھائی بڑے خوش ہوئے۔۔۔ اور کئی دن تک بڑی ترنگ میں سیڑھیوں پر "ٹہلتے" رہے' میں بھی مطمئن ہو گئی' چلو ان کا بھی کچھ بھلا ہو گیا اور ثروت باجی بھی ناراض نہیں ہوئیں۔۔۔ مگر پھر ایک اور خط داغا گیا' جس کے جواب میں' میں نے' ایک خط ایک مہینے کی لمٹ لگا دی جو انہوں نے بخوشی قبول کر لی یوں چھ سے سات خط لکھے گئے ہوں گے۔۔۔ امتحان کے دنوں میں ثروت باجی نے میرا وقت بھی بڑھا دیا تھا اور خوب محنت سے پڑھانا شروع کر دیا تھا' جس کی وجہ سے آدھے سے زیادہ دن میں ان کے گھر پر ہی گزارتی تھی اور اکثر کھانا پینا بھی کر لیتی تھی۔۔۔ اور تب ہی مجھے پتا چل گیا کہ ثروت باجی کا کہیں نکاح کیا جا رہا ہے۔۔۔ مگر میری بیوقوفی یہ تھی کہ مجھے ایک مرتبہ بھی حسنین بھائی کا خیال نہیں آیا کہ یہ سب سن کر ان پر کیا گزرے گی۔۔۔ خیر میں امتحانوں میں مصروف ہو گئی۔۔۔ اور مجھے کچھ خبر نہ ہو سکی۔۔۔

☼ ☼ ☼

امتحانوں کے بعد ہمارے ہاں ایک رشتہ دار رہنے کے لیے آ گئے اور یوں مجھے ثروت باجی کے ہاں جانے کا خیال بھی نہیں آیا اور میں گھر میں مگن ہو گئی۔ یہاں تک کہ امتحانوں کا نتیجہ آ گیا' میرے نمبر اچھے آئے تھے اور آخر کار میں سرخرو ہو گئی۔۔۔ رزلٹ کے بعد میں نے ثروت باجی کے ہاں مٹھائی لے جانے کی ٹھانی اور ان کے لیے ایک اچھا سا گفٹ بھی لینے کا سوچا۔۔ مگر امی نے مجھے منع کر دیا۔۔۔ کہا بس جا کر بتا دو کہ یہ رزلٹ آیا ہے۔۔ میں بڑی مایوس ہوئی۔۔۔ میں نے غصے سے کہا میں جاتی ہی نہیں ہوں۔۔۔ مگر پھر ثروت باجی کی یاد ستانے لگی' اچانک دل چاہنے لگا کہ اڑ کر چلی جاؤں اور ثروت باجی کے گلے لگ جاؤں۔۔۔ تھوڑی ہی دیر بعد میں واپس امی کے اردگرد منڈلانے لگی تھی۔ جو امی نے بھی محسوس کر لیا کہ اب میں جائے بغیر نہیں رہ سکوں گی۔ انہوں نے مجھے چلتے پھرتے بتایا کہ ثروت باہر پڑھنے جا رہی ہیں۔۔۔ میں اس پر بھی حیران ہو گئی کہ یہ تو خوشی کی بات ہے بھلا اس میں مٹھائی سے پرہیز کیوں۔۔۔ میرے پوچھنے پر امی نے مجھے بتایا کہ امید کم ہی ہے کہ وہ پلٹ کر آئیں۔۔۔ پھر امی کچھ سوچ کر ایک جگہ بیٹھ گئیں میں سمجھ گئی کہ امی مجھے اور بھی کچھ بتانا چاہتی ہیں خاموشی سے ان کے قریب بیٹھ کر انتظار

کرنے لگی... تھوڑی دیر کے بعد امی نے مجھے بتایا کہ ثروت باجی کا جس دن نکاح تھا اس دن ڈاک سے ان کے والد کو کچھ خطوط ملے جو کہ اس بات کی گواہی تھے کہ ثروت نے کسی کو چاہا تھا۔ ان کے والد اور والدہ نے کافی پوچھا، مگر ثروت نے بتانے سے انکار کردیا... اور یوں اس کے والد نے نکاح منسوخ کروادیا کہ وہ اپنی بیٹی کی مرضی کے خلاف چلنا نہیں چاہتے تھے، جبکہ ثروت اسی بات پر بضد رہی کہ اس کو ان سب خطوط کے بارے میں کچھ خبر نہیں... نکاح والے دن نکاح سے انکار ان کے پورے خاندان میں ثروت کی بدنامی بن گیا اور وہ پچھلے دنوں کافی بیمار بھی رہی ہے... میرا منہ دنگ گیا۔ "ثروت نے سختی سے تم کو کچھ بھی بتانے سے منع کردیا تھا کہ تمہارے امتحان تھے۔" امی نے مجھے دلاسہ دیتے ہوئے کہا۔ میرے منہ سے اچانک نکل گیا۔

"تو خطوط دیکھ کر... لکھائی سے تو اندازہ لگایا جاسکتا تھا کہ وہ ثروت باجی نے لکھے بھی ہیں کہ نہیں۔"

امی نے مجھے حیران نظروں سے دیکھا اور اس بات کو میری دور اندیشی گردانا... اور افسوس سے بتایا کہ خط تو ان کے والد نے غصے میں جلادیے۔

دکھ تو تھا ہی مگر ڈر حد سے زیادہ تھا۔ میری اس غلطی سے کسی معصوم لڑکی پر بہت بڑا بہتان لگ چکا تھا، اور کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا کہ میں اس الجھے ہوئے معاملے کو کیسے سلجھاؤں... میں چپ کرکے بیٹھ گئی اور ثروت باجی کا سامنا کرنے کے خیال سے ہی ڈرنے لگی، دوسری طرف مجھے حسنین بھائی پر شدید غصہ آنے لگا۔ انہوں نے ایسی گھٹیا حرکت کی، مگر اب اگر میں جا کر سب کچھ بتا بھی دوں تو بھی جو بدنامی ثروت باجی کی ہوگئی ہے، اس کو تو کسی طرح سے ٹھیک نہیں کرسکتی تھی... میں اب خود میں ہمت ہی نہیں پارہی تھی کہ اس گلی کا رخ کروں۔ مجھے ایک دو مرتبہ امی نے کہا بھی کہ وہ جارہی ہیں میں ان کے ساتھ ہی چلی چلوں، مگر میں نے صاف انکار کردیا۔

☆ ☆ ☆

دن گزرتے ہی جاتے ہیں... ثروت باجی پڑھنے کے لیے باہر چلی گئیں اور میں نے پھر کبھی امی سے ثروت باجی کے بارے میں نہیں پوچھا... آج میں ان کو حسنین بھائی کے ساتھ دیکھ کر بہت حیران ہوگئی تھی۔

اندازہ تو ہوچکا تھا کہ دونوں کی آپس میں شادی ہو چکی ہے مگر یہ کب ہوا اور کیسے... مجھے کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا، میں تھوڑی دیر ہمت جمع کرتی رہی اور میری نظریں ثروت باجی کا پیچھا کرتی رہیں... وہ جس وقار کے ساتھ جلوہ گر تھیں، جس تمکنت سے وہ لوگوں سے باتیں کررہی تھیں، مجھے ان پر پیار آنے لگا دل چاہا کہ بس ان کے گلے لگ جاؤں... معافی مانگ لوں... ان کے پیر پڑ جاؤں... وہ اسٹیج کے پاس کھڑی اپنے چھوٹے لڑکے سے کچھ کہہ رہی تھیں، جبکہ حسنین بھائی دور دور تک نہیں تھے۔ میں نے موقع غنیمت جانا اور ان کے برابر میں خاموشی سے جاکر کھڑی ہوگئی... انہوں نے مجھے دیکھا، ہلکا سا مسکرائیں۔

"تم کتنی بڑی ہوگئی ہو... اور بہت بردبار بھی لگ رہی ہو۔ اس کے بعد انہوں نے مجھ سے وہ سوال کیا جس کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اب کس کس کو خط ارسال کرتی ہو؟" انہوں نے طنزیہ کہا اور پھر فوراً ہی سنبھل گئیں جیسے ان کو اب بھی مجھے دکھ دینے سے تکلیف ہورہی ہو... میں نے سر جھکالیا... وہ پھر سے گویا ہوئیں۔

"تمہیں اندازہ بھی نہیں ہے کہ مجھے کیا کچھ نہیں سہنا پڑا... شروع میں تو جب مجھے اندازہ ہی نہیں ہو سکا تھا کہ وہ خط آخر آئے کہاں سے، تو مجھے بہت ہی تکلیف تھی... ایک روگ سا لگا تھا دل کو... میں کھلنڈری تھی، یہ بات سچ ہے، مگر اس طرح کبھی میں نے کسی کو بھی دکھ نہیں دیا تھا کہ جس کی ایسی سزا ملتی مجھے... اور پھر... جب میں کینیڈا کی لمبی لمبی سرد راتوں میں تنہا ہوئی تو بس پھر میرا ایک ہی کام تھا، میں اکثر اپنی کسی دوست کو فون کرتی، اور اس سے یہی سوال کرتی اور ہر کسی نے بڑھ کر مجھ سے یہی پوچھا کہ میں کس کے بارے میں دریافت کررہی ہوں... اور تم... تم پہ

تو مجھے ایسا اندھا اعتماد تھا۔ تمہاری والدہ سے میں نے کئی دفعہ تمہارا پوچھا تھا اور ان کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ شاید میرے ساتھ جو بھی کچھ ہوا تم سن کر اتنی دکھی ہو گئی ہو کہ اب ملنے سے کترانے لگی ہو اور مجھے تم پر اور بھی پیار آگیا تھا۔ مگر آج۔ تم نے بڑا مایوس کر دیا مجھے۔ اب تو میں خود کو ہی کوس رہی ہوں کہ کاش تم سے میں نے یہ سوال کیا ہی نہ ہوتا۔ کیا ضرورت تھی تم کو ایسا کرنے کی؟ کیا فائدہ ہوا تمہیں مجھے یوں بدنام کر کے۔ جانتی ہو ہمارے چھوٹے سے گھرانے پر کیسا عذاب جیسا تھا وہ دور؟"

وہ کہتی جا رہی تھیں اور میں سن رہی تھی، کبھی کبھی وہ مجھے سخت الفاظ میں سنانے لگ جاتیں، جو ہمت میں اس وقت اپنے اندر پیدا نہیں کر سکی تھی۔ آج ان کو دیکھ کر آ گئی تھی میں ان کو پورا پورا موقع دینا چاہتی تھی کہ وہ اپنی بھڑاس نکال لیں۔ یہ مجھ پر ان کا قرض تھا جو میں آج پورا اتار دینا چاہتی تھی۔ وہ اب کچھ حسنین بھائی کے بارے میں کہنے لگی تھیں اور میں پھر سے ہمہ تن گوش ہو گئی۔

"اور پھر جب میں چلتے چلتے تھکنے لگی تو اللہ تعالیٰ نے مجھ پر رحم کر دیا اور حسنین کو میری مدد کے لیے بھیج دیا۔ میں تین سال میں پہلی بار چھٹیوں پر پاکستان پہنچی ہی تھی کہ ان کا پیام میرے لیے آگیا۔ مجھے بہت حیرت ہوئی، مطلب یہ کہ وہ تو ہمارے نیچے والے پورشن میں ہی رہتے تھے ان کو تو سب معلوم تھا۔ میرے نکاح ٹوٹنے کی وجہ۔ میرے پاکستان سے غائب ہو جانے کی وجہ۔ مگر انہوں نے پھر بھی سب جان کر بھی۔ مجھے اپنانے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں ایک دن ان سے سیڑھیوں پر ملی۔ میں نے ان سے پوچھا۔ اور اپنے بارے میں صاف صاف بتا دیا' وہ خاموشی سے' توجہ سے سنتے گئے اور مجھے یقین دلایا کہ ان کو مجھ پر یقین ہے اگر میں کہہ رہی ہوں کہ وہ خط میں نے نہیں لکھے تو واقعی وہ میں نے نہیں لکھے۔ بس ان کا یہ کہنا تھا کہ میں بھی مان گئی۔ مجھے لگا کہ جیسے خدا نے میری سن لی' مجھے اپنا اعتماد بحال ہوتا محسوس ہوا۔ حسنین نے بھی مجھے اپنے ماضی کی اس بات کو چھیڑنے نہیں دیا۔ اکثر میں کبھی کچھ یاد کر کے دکھی ہوتی تو وہ ناراض ہو جاتے تھے وہ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔"

ثروت باجی نے حسنین بھائی کی تعریف میں کافی کچھ کہا مگر میں اندر ہی اندر غصہ سے پاگل ہو رہی تھی۔

کتنے چالاک ہیں یہ حسنین بھائی۔ ان کو بھی کچھ دنوں بعد اندازہ ہو گیا تھا کہ خط ثروت باجی کی طرف سے نہیں تھے، مگر انہوں نے معافی مانگنے کے بجائے جچی ہوئی۔ بکھری ہوئی ثروت باجی کو اسی طرح حاصل کر لینے کا سوچا۔ ان کا مقصد صرف ثروت باجی کا حصول تھا۔ جس میں ہر طرح سے کامیاب رہے تھے۔ میں نے دیکھا کہ حسنین بھائی خراماں خراماں ہماری طرف چلے آ رہے ہیں۔ ثروت باجی نے میرا ہاتھ ہلکے سے دباتے ہوئے کہا۔

"اب ان کے سامنے کوئی بات نہ کرنا۔ میں نہیں چاہتی کہ ان کو پتا چلے کہ وہ خط تم نے لکھے تھے۔ پتا نہیں وہ کیسے ری ایکٹ کریں۔ بس اس بات کو یہیں ختم کر دو۔"

میرا دل تو ہوا کہ وہیں بچوں کی طرح ضد کرنا شروع کر دوں کہ نہیں نہیں حسنین بھائی کو ضرور پتا چلنا چاہیے کہ وہ خطوط کس نے کس کو لکھے تھے۔ ایک دل ہوا کہ ثروت باجی سے کہوں کہ یہ سوال جو آپ نے مجھ سے کیا' وہ حسنین بھائی سے بھی کر لیں مگر میں پھر اپنی ہمت کھو بیٹھی' میں ایک دفعہ پھر سے ثروت باجی کو بکھیرنا نہیں چاہتی تھی کیا ہوا اگر ان کو میرا پتا چل گیا میں تو ویسے بھی ان سے دور ہو ہی چکی تھی اور اب سچ جان لینے کے بعد تو ثروت باجی شاید ہی مجھے خود سے قریب کریں۔ اچھا ہے وہ مجھ سے دور ہی رہیں کیا پتا کب میں جذبات میں بہہ کر حسنین بھائی کا پول کھول دوں پھر کیا ہو گا۔ ثروت باجی ایک دفعہ پھر بکھر جائیں گی۔ ٹوٹ جائیں گی۔ اپنا اعتبار' اپنا اعتماد پھر سے کھو دیں گی اور کیا میرے اندر جان بوجھ کر یہ کرنے کی ہمت ہو گی۔ شاید کبھی بھی نہیں۔ یوں میں ان لوگوں سے دور ہو گئی۔

☼

نمرہ احمد

نمل

فارس غازی انٹیلی جنس کے اعلا عہدے پر فائز ہے۔ وہ اپنے سوتیلے بھائی وارث غازی اور اپنی بیوی کے قتل کے الزام میں چار سال سے جیل میں قید ہے۔ سعدی یوسف اس کا بھانجا ہے جو اس سے جیل میں ہر ہفتے ملنے آتا ہے۔

سعدی یوسف تین بہن بھائی ہیں۔ ان کے والد کا انتقال ہو چکا ہے۔ حنین اور اسامہ سعدی سے چھوٹے ہیں۔ ان کی والدہ ایک چھوٹا سا ریسٹورنٹ چلاتی ہیں۔ زمر سعدی کی پھپھو ہے۔ وہ چار سال قبل فائرنگ کے ایک واقعہ میں زخمی ہو جاتی ہے۔ فائرنگ کا الزام فارس غازی پر ہے۔ فارس غازی کو شک تھا کہ اس کی بیوی اس کے بھائی کے ساتھ انوالو ہے۔ اس نے جب فائرنگ کی تو زمر اس کی بیوی کے ساتھ تھی۔ فائرنگ کے نتیجے میں بیوی مر جاتی ہے اور زمر شدید زخمی ہو جاتی ہے۔ ایک انگریز عورت اپنا گردہ دے کر اس کی جان بچاتی ہے۔ یقین ہے کہ اس کا ماموں بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا گیا ہے۔ اس لیے وہ اسے بچانے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی بنا پر زمر اپنے بھتیجے سعدی یوسف سے بدظن ہو جاتی ہے۔ بدظن ہونے کی ایک اور بڑی وجہ یہ ہے کہ زمر جب موت و زندگی کی کشمکش میں ہوتی ہے تو سعدی اس کے پاس نہیں ہوتا۔ وہ اپنی پڑھائی اور امتحان میں مصروف ہوتا ہے۔

جواہرات کے دو بیٹے ہیں۔ ہاشم کاردار اور نوشیرواں۔

ہاشم کاردار بہت بڑا وکیل ہے۔ ہاشم اور اس کی بیوی شہرین کے درمیان علیحدگی ہو چکی ہے۔ ہاشم کی ایک بیٹی سونیا ہے۔ جس سے وہ بہت محبت کرتا ہے۔

فارس غازی ہاشم کی پھپھو کا بیٹا ہے۔ جیل جانے سے پہلے وہ ہاشم کے گھر میں جس میں اس کا بھی حصہ ہے رہائش پذیر تھا۔ سعدی کی کوششوں سے فارس رہا ہو جاتا ہے۔



مکمل ناول



والدین کے کہنے پر زمر سعدی کی سالگرہ پر اس کے لیے پھول اور ہاشم کی بیٹی سونیا کی سالگرہ کارڈ لے کر جاتی ہے۔ سعدی ہاشم کی بیوی سے ہاشم کے لیپ ٹاپ کا پاس ورڈ مانگتا ہے۔ شہرین اپنے دیور نوشیرواں سے جو اپنی بھابھی میں دلچسپی رکھتا ہے بہانے سے پاس ورڈ حاصل کر کے سعدی کو سونیا کی سالگرہ پر دے دیتی ہے۔

پاس ورڈ ملنے کے بعد سعدی ہاشم کے کمرے میں جا کر اس کے لیپ ٹاپ پہ فلیش ڈرائیو لگا کر ڈیٹا کاپی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

چیف سیکریٹری ہفیسر خاور ہاشم کو اس کے کمرے کی فوٹیج دکھاتا ہے جس میں سعدی کمرے میں جاتے ہوئے نظر آتا ہے ہاشم خاور کے ساتھ بھاگتا ہوا کمرے میں پہنچتا ہے لیکن سعدی اس سے پہلے ہی وہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمرے میں لیپ ٹاپ سے ڈیٹا کاپی کرنے آیا تھا اور شہرین نے نوشیرواں کو استعمال کر کے پاس ورڈ سعدی کو دیا تھا۔ دوسری جانب بڑے ابا زمر کو یہ بتا دیتے ہیں کہ زمر کو کسی یورپین خاتون نے نہیں بلکہ سعدی نے گردہ دیا تھا۔ یہ سن کر زمر کو بے حد دکھ ہوتا ہے۔

نوشیرواں ایک بار پھر ڈرگز لینے لگتا ہے اس بات پر جواہرات فکر مند ہے۔

بعد میں سعدی لیپ ٹاپ پہ فائلز کھولنے کی کوشش کرتا ہے لیکن فائلز ڈیمیج ہو جاتی ہیں۔

سعدی حنین کو بتاتا ہے کہ وہ ٹیم کے ہائی اسکورز کی فہرست میں پہلے نمبر پر نہیں ہے حنین حیران ہو کر اپنی ٹیم والی سائٹ کھول کر دیکھتی ہے تو پہلے نمبر "آمس ایور آفٹر" لکھا ہوتا ہے۔ وہ علیشا ہے ورجینیا سے۔ حنین کی علیشا سے دوستی ہو جاتی ہے۔

اب کہانی ماضی میں آگے بڑھ رہی ہے۔ فارس زمر سے لاء کی کچھ کلاسز لیتا ہے۔ ندرت اس سے شادی کا پوچھتی ہیں۔ وہ لاپروائی سے زمر کا نام لے لیتا ہے۔ ندرت خوش ہو کر ابا سے بات کرتی ہیں۔ ان کی ساس فارس کو اجڈ اور بدتمیز سمجھتی ہیں اور اس کے مقابلے میں فند سے زمر کی بات طے کر دیتی ہیں۔ وارث غازی ہاشم کے خلاف منی لانڈرنگ کیس پر کام کر رہا ہے۔ اس کے پاس مکمل ثبوت ہیں۔ اس کا باس فاطمی ہاشم کو خبردار کر دیتا ہے۔ ہاشم خاور کی ڈیوٹی لگاتا ہے کہ وہ وارث کے پاس موجود تمام شواہد ضائع کرے۔ وارث کے ہاسٹل کے کمرے میں خاور اپنا کام کر رہا ہے۔ جب وارث ریڈ سنٹرز ملنے پر اپنے کمرے میں جاتا ہے۔ پھر کوئی راستہ نہ ہونے کی صورت میں بہت مجبور ہو کر ہاشم خاور کو وارث کو مار دینے کی اجازت دے دیتا ہے۔ دوسری صورت میں وارث فارس کو وہ سارے شواہد میل کر دیتا۔ وارث کے قتل کا الزام ہاشم فارس پہ ڈلواتا ہے۔

زرتاشہ کو قتل اور زمر کو زخمی کرنا بھی فارس کو وارث کے قتل کے الزام میں پھنسانے کی ہاشم اور خاور کی منصوبہ بندی ہوتی ہے۔ وہ دونوں کامیاب ٹھہرتے ہیں۔ زرتاشہ مر جاتی ہے۔ زمر زخمی حالت میں فارس کے خلاف بیان دیتی ہے۔ فارس جیل چلا جاتا ہے۔ سعدی زمر کو سمجھاتا ہے کہ فارس ایسا نہیں کر سکتا۔ اسے غلط فہمی ہوئی ہے۔ زمر کہتی ہے کہ وہ جھوٹ نہیں بولتی اور اپنے بیان پر قائم رہتی ہے۔ نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ناراض ہو جاتے ہیں۔ زمر کی ناراضی کی ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ وارث کے قتل کے وقت بھی اس کی شادی لیٹ ہو جاتی ہے اور وہ اپنی شادی روک کر فارس کے لیے مقدمہ لڑتی ہے۔ اب وہی شخص اپنے اس قتل کو چھپانے کے لیے اسے مارنا چاہتا ہے۔ وہ بظاہر اتفاقاً بچ جاتی ہے مگر اس کے دونوں گردے ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور اس حادثے کی صورت اس کی شادی ٹوٹ جاتی ہے۔

حنین کی نیٹ فرینڈ علیشا دراصل اورنگ زیب کی بیٹی ہے جسے وہ اور ہاشم تسلیم نہیں کرتے۔ وہ باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے حنین سے دوستی کرتی ہے اور پڑھائی کے لیے کاردار سے پیسے کے لیے غیر قانونی پاکستان آتی ہے۔ مگر ہاشم اس سے بہت برے طریقے سے پیش آتا ہے اور کوئی مدد نہیں کرتا۔ زرتاشہ اور زمر کے قتل کے وقت فارس اور حنین وارث کیس کی ایل بائی کے سلسلے میں علیشا کے پاس ہی ہوتے ہیں مگر علیشا ہاشم کی وجہ سے کھل کر ان کی مدد کرنے سے قاصر ہے۔

زمر فیصلہ کر چکی تھی کہ وہ فارس کے خلاف بیان دے گی۔ گھر میں اس فیصلے سے کوئی بھی خوش نہیں جس کی بنا پر زمر کو

دکھ ہوتا ہے۔

جواہرات زمر سے ملنے آتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ فارس کے خلاف بیان دے۔ وہ زمر کے ساتھ ہے اسی وقت زمر کا منگیتر اس کو لینے آتا ہے۔ اس کی ہونے والی ساس یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہے۔ جواہرات اس کے منگیتر کو اپنی گاڑی میں بٹھا لیتی ہے اور اسے آسٹریلیا بھجوانے کی آفر کرتی ہے۔

سعدی فارس سے ملنے جاتا ہے تو وہ کہتا ہے ہاشم اس قسم کا آدمی ہے جو قتل بھی کر سکتا ہے اور وہ فارس سے مخلص نہیں ہے۔

سعدی کو پتا چلتا ہے کہ اسے اسکالر شپ نہیں ملا تھا۔ زمر نے اپنا پلاٹ بیچ کر اس کو باہر پڑھنے کے لیے رقم دی تھی۔ اسے بہت دکھ ہوتا ہے۔

زمر کو کوئی گردہ دینے والا نہیں ملتا تو سعدی اسے اپنا گردہ دے دیتا ہے۔ وہ یہ بات زمر کو نہیں بتاتا۔ زمر بدگمان ہو جاتی ہے کہ سعدی اس کو اس حال میں چھوڑ کر اپنا امتحان دینے ملک سے باہر چلا گیا۔

سعدی علیشا کو راضی کر لیتا ہے کہ وہ یہ کہے گی کہ وہ اپنا گردہ زمر کو دے رہی ہے کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر زمر کو پتا چل گیا کہ گردہ سعدی نے دیا ہے تو وہ کبھی سعدی سے گردہ لینے پر رضامند نہیں ہوگی۔

ہاشم حنین کو بتا دیتا ہے کہ علیشا نے اور نگ زیب کاردار تک پہنچنے کے لیے حنین کو ذریعہ بنایا ہے۔ حنین اس بات پر علیشا سے ناراض ہو جاتی ہے۔

ہاشم علیشا کو دھمکی دیتا ہے کہ وہ اس کی ماں کا ایکسیڈنٹ کروا چکا ہے اور وہ اسپتال میں ہے۔ وہ عنیشہ کو بھی مروا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی بتاتا ہے کہ وہ اور اس کی ماں بھی امریکن شہری ہیں۔

جواہرات زمر کو بتاتی ہے کہ زمر کا منگیتر حماد شادی کر رہا ہے۔

فارس بتاتا ہے کہ وہ ایک بار زمر سے مل کر اس کو بتانا چاہتا ہے کہ وہ بے گناہ ہے۔ اسے پھنسایا جا رہا ہے۔ وہ ہاشم پر بھی شبہ ظاہر کرتا ہے لیکن زمر اس سے نہیں ملتی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی اس کے کمپیوٹر سے ڈیٹا چرا کر لے جا چکا ہے۔ وہ جواہرات سے کہتا ہے کہ زمر کی شادی فارس سے کرانے میں خطرہ ہے، کہیں وہ جان نہ جائے کہ فارس بے گناہ ہے لیکن وہ مطمئن ہے۔ جواہرات زمر کو بتاتی ہے کہ فارس نے اس کے لیے رشتہ بھجوایا تھا، جسے انکار کر دیا گیا تھا۔ زمر کو یقین ہو جاتا ہے کہ فارس نے اسی بات کا بدلہ لیا ہے۔ زمر جواہرات کے اکسانے پر صرف فارس سے بدلہ لینے کے لیے اس سے شادی پر رضامند ہو جاتی ہے۔

ڈیڑھ ماہ قبل ایک واقعہ ہوا تھا جس سے سعدی کو پتا چلا کہ ہاشم مجرم ہے۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ نوشیرواں نے ایک ڈرامہ کیا تھا کہ وہ کوریا میں ہے اور اغوا ہو چکا ہے۔ تاوان نہ دیا گیا تو وہ لوگ اس کو مار دیں گے۔

ہاشم، حنین اور سعدی کو آدھی رات کو گھر بلاتا ہے اور ساری پچویشن بتا کر اس سے پوچھتا ہے کیا اس میں عنیشا کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

وہ حنین سے کہتا ہے کہ تم اس کے بارے میں پتا کرو۔ حنین کمپیوٹر سنبھال لیتی ہے۔ سعدی اس کے ساتھ بیٹھا ہوتا ہے۔ تب ہی ہاشم آ کر اپنا سیف کھولتا ہے تو سعدی کی نظر پڑتی ہے۔ اس کو جو کچھ نظر آتا ہے۔ اس سے اس کے ہوش اڑ جاتے ہیں۔

اس میں وارث کی بیٹیوں کی تصویر ہوتی ہے۔ جو وارث ہمیشہ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ وہ ہاشم کے سیف کے لوڈ آئینے میں دیکھ لیتا ہے اور گھر سے اس کے جانے کے بعد سیف کھولتا ہے۔ اس سے ایک لفافہ ملتا ہے جس میں اس ریسٹورنٹ میں فائرنگ کے فوراً بعد کی تصویر ہوتی ہے، جس میں زمر خون میں لت پت نظر آتی ہے اور ایک فلیش ڈرائیو بھی ملتی ہے۔

تب اسے پتا چلتا ہے کہ ہاشم مخلص نہیں تھا۔ یہ قتل اسی نے کرایا تھا۔

حنین نوشیرواں کی پول کھول دیتی ہے' وہ کہتی ہے کہ نوشیرواں پاکستان میں ہی ہے اور اس نے پیسے اینٹھنے کے لیے اغوا کا ڈراما رچایا۔

سعدی وہ فلیش سنتا ہے تو سن رہ جاتا ہے۔ وہ فارس کی آواز کی ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ جس میں وہ زمر کو دھمکی دیتا ہے۔

سعدی بار بار سنتا ہے تو اسے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ جعلی ہے۔ وہ فارس کے وکیل کو فارغ کر دیتا ہے۔ جو ہاشم کا آدمی تھا۔

سعدی زمر کے پاس ایک بار پھر جاتا ہے اور اسے قائل کرنے کی کوشش کرتا ہے کہ فارس بے گناہ ہے۔ وہ کہتا ہے اس میں کوئی تیسرا آدمی بھی ملوث ہو سکتا ہے۔

"مثلاً کون؟" زمر نے پوچھا۔

"مثلاً..... مثلاً "ہاشم کاردار....." سعدی نے ہمت کر کے کہہ ڈالا۔ زمر سن سی ہو گئی۔

زمر کو ہاشم کاردار کے ملوث ہونے پر یقین نہیں آتا سعدی زمر سے کسی اچھے وکیل کے بارے میں پوچھتا ہے تو وہ ریحان خلجی کا نام لیتی ہے۔ سعدی فارس کا وکیل بدل دیتا ہے۔

حنین علیشا کو فون کرتی ہے تو پتا چلتا ہے کہ وہ جیل میں ہے کیونکہ اس نے چوری کی کوشش کی تھی۔

ہاشم کو پتا چل جاتا ہے کہ سعدی نے وہ آڈیو حاصل کر لی ہے جس میں فارس کا جعلی فون ٹیپ ہے لیکن وہ مطمئن ہے کہ بچ تو اب کا ہے۔

ہاشم کی بیوی شہرین ایک کلب میں جوا کھیلتی ہے' اس کی سی سی ٹی وی فوٹیج ان کے کیمروں میں ہے۔ اسے غائب کرانے کے لیے سعدی کی مدد لیتی ہے۔

ریحان خلجی عدالت میں زمر کو لاجواب کر دیتا ہے۔ یہ بات فارس کو اچھی نہیں لگتی۔

فارس جیل سے نکلنا چاہتا ہے لیکن اس کا ساتھی غلطی سے زمر کو اس میں استعمال کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ زمر کا غصہ فارس کے خلاف مزید بڑھ جاتا ہے۔

زمر فارس سے ملتی ہے تو فارس کہتا ہے کہ ایک بار وہ اس کے کیس کو خود دیکھے۔ فارس کہتا کہ وہ زمر سے معافی نہیں مانگے گا۔

جیل سے علیشا حنین کو خط لکھتی ہے وہ حنین سے کہتی ہے تم میں اور مجھ میں ذہانت کے علاوہ ایک اور چیز مشترک ہے ہے ہماری برائی کی طرف مائل ہونے والی فطرت۔ اس لیے کسی کی کمزوری کو شکار مت کرنا۔ گناہ مت کرنا ورنہ کفارے دیتے عمر بیت جائے گی۔

حنین کو اپنا ماضی یاد آجاتا ہے جب اس نے کسی کی کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا اور وہ شخص صدمے سے دنیا سے رخصت ہو گیا تھا۔ وہ کفارے کے لیے آگے بڑھنے سے انکار کر دیتی ہے۔ وہ سعدی کو یہ ساری بات بتاتی ہے تو سعدی کو شدید صدمہ ہوتا ہے۔

اورنگ زیب نوشیرواں کو عاق کرنا چاہتے ہیں۔ یہ جان کر جواہرات غصے سے پاگل ہو جاتی ہے۔ وہ اورنگ زیب کو قتل کر دیتی ہے اور ڈاکٹر سے مل کر اسے بلیک میل کر کے ———— پوسٹ مارٹم رپورٹ بھی اپنی مرضی کی حاصل کر لیتی ہے۔

گیارہویں قسط

کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھوالا؟
اور ہابیل تھا بھیڑوں کا رکھوالا۔

جبکہ قابیل تھا کھیت کا کسان
اور گزرتے وقت کے ساتھ ایسا ہوا کہ

قائیل لایا اپنے باغ کا پھل (قدرے کم تر پھل)
قربانی کے طور پہ اپنے رب کے لیے
اور ہابیل لایا اپنے ریوڑ کی اول زلو صحت مند بھیڑ
اور خدا نے عزت دی ہابیل اور اس کی قربانی کو
مگر قائیل اور اس کی قربانی کو عزت نہ بخشی
پس قائیل بہت غضب ناک ہوا
اور اس کا چہرہ بجھ گیا تو پکارا خدا نے قائیل کو
کہ کیوں ہو تم غصے میں؟ کیوں بجھ گیا ہے تمہارا چہرہ؟
اگر تم (خالص) نیکی کرو گے، تو کیا وہ قبول نہ کی جائے گی؟
اور اگر تم نہیں کرو گے (خالص) نیکی
تو گناہ تمہاری چوکھٹ گھات لگائے بیٹھا ہے
اور تم اس کی خواہش کے تابع ہو گے
اور قائیل بات کرنے لگا اپنے بھائی ہابیل سے
اور ایسا ہوا کہ جب تھے وہ دونوں کھیت میں
تو قائیل اٹھ کھڑا ہوا اپنے بھائی ہابیل کے مد مقابل
اور قتل کر ڈالا اسے
پس پوچھا خدا نے قائیل سے
"کہاں ہے تمہارا بھائی ہابیل؟"
تو کہنے لگا
"مجھے نہیں معلوم، کیا میں ہوں اپنے بھائی کا رکھوالا؟
اور اس پہ خدا تعالیٰ نے فرمایا
یہ تم نے کیا کر ڈالا؟
تمہارے بھائی کے لہو کی آواز
مجھے زمین کے اندر سے پکار رہی ہے
اور اب تم ملعون ہو اس زمین میں
جس نے اپنے لب کھول کر
تمہارے بھائی کا خون
تمہارے ہاتھ سے جذب کر لیا ہے
اب جب تم کھیتی باڑی کرو گے
تو یہ زمین تمہیں نفع نہیں دے گی
ایک مفرور اور آوارہ گرد کی طرح
بھٹکتے پھرو گے تم اس زمین پہ
پس کہا قائیل نے خدا سے
"میری سزا میری برداشت سے بہت زیادہ ہے۔"
(تورات)

عقد نکاح ہو چکا تھا۔ زمر کو اندر سے لایا گیا تو ایک طرف سیم اور دوسری طرف سعدی تھا۔ اس نے سعدی کی کہنی تھام رکھی تھی اور اسی طرح قدم قدم چلتی، نرم مسکراہٹ کے ساتھ آگے آرہی تھی۔ وہاں موجود تمام لوگ اٹھ کھڑے ہوئے۔ فارس بھی۔ وہ زمر کے چہرے کو نہیں دیکھ رہا تھا۔ نگاہیں سعدی کی کہنی تک تھیں۔ زندگی پیچیدہ ہو گئی تھی۔

زمر کو اس کے ساتھ بٹھا دیا تو وہ بھی اسی سنجیدگی سے بیٹھ گیا۔ بظاہر وہ ندرت کی طرف متوجہ تھا جو اس سے کچھ کہہ رہی تھیں، مگر کن انکھیوں سے اس کا نیم رخ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ دوپٹا اور پھر گھٹنوں سے نیچے میکسی کا فلیئر درست کرتی، مسکرا کر کسی رشتے کی وار کی مبارک باد کا جواب دے رہی تھی۔ اس نے ہلکا میک اپ کر رکھا تھا اور عام حالات میں (اپنی پُرکشش شخصیت سے ہٹ کر دیکھو تو) وہ جو محض متناسب شکل و صورت کی مالک تھی۔ آج واقعی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔

تب ہی ندرت جھک کر زمر سے کچھ کہنے لگیں۔ آنکھیں نم تھیں جن کو وہ بار بار پونچھتیں۔ وہ جواب میں نرم مسکراہٹ سے سر اثبات میں ہلاتی رہی۔

مبارک، سلامت، مٹھائی، اس مختصر سی تقریب کا آخری جز مکمل ہو چکا تو صداقت دوسرے ملازموں کے ساتھ کھانا لگانے لگا۔ سیم نے صوفے پہ بیٹھے بیٹھے گردن اونچی کر کے آتے جاتے ملازموں کی ٹرے دیکھنی چاہی تو حنین نے ہاتھ دبا کر اسے ٹھنڈا کیا۔
"یہ چاول اور چکن ہے۔ اتنی محنت نہ کرو۔ باربی کیو آخر میں ہے۔ میں پہلے ہی دیکھ چکی ہوں۔"

اطمینان سے اطلاع دی۔ وہ فارس اور زمر کے صوفے کے قریب بیٹھی تھی۔ درمیان میں صرف بڑے ابا کی

وہیل چیئر تھی۔

دفعتاً" ابا حسین کی طرف رخ کرکے کہنے لگے۔

"لڑکی! کیا تم وہ نوز رنگ پہنوگی بھی یا ایسے ہی لے لی میری بیٹی سے؟"

"اگر آپ کو لگتا ہے کہ آپ کی اس بات پہ غیرت میں آکر میں وہ تحفہ واپس کروں گی تو ایسا نہیں ہونے والا۔ میں نارمل نہیں ہوں' میں حسین ہوں۔ پھپھو پہ یہ ہی لونگ سوٹ کرتی ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ وہ اسے اتاریں۔"

وہ بڑے ابا کی جانب چہرہ جھکا کر' آنکھیں گھما کر بولی اور فارس نے بے اختیار اس کو دیکھا۔ مگر حسین نے بھرپور کوشش کی کہ وہ فارس کی طرف نہ دیکھے یا شاید اسے ہنسی آجائے۔ شاید ڈھیر سارا رونا۔

ندرت نے بھی سن لیا تھا۔ کافی ملال سے (اور حنہ کو گھورتے ہوئے) اس کی اس "وحشانی" کو تفصیل سے بیان کرتے افسوس کرنے لگیں۔ فارس نے اپنے پیر کے انگوٹھے کو دیکھتے پوری بات سنی۔ مگر چپ رہا۔

زمر نرمی سے اتنا ہی بولی۔ "حنہ ٹھیک کہہ رہی ہے بھابھی! مجھے یہ لونگ بہت پسند ہے' میں اسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتی۔"

"کہاں سے بنوائی تھی؟" فرزانہ باجی زمر کے دوسری طرف بیٹھے ہوئے پوچھنے لگیں۔

"یہ میری ایک اسٹوڈنٹ نے مجھے دی تھی۔ آپ کو پتا ہے نا' بچیاں اپنی ٹیچرز کو ایسے گفٹس دینے کے لیے کریزی ہوتی ہیں' میں ہمیشہ واپس کردیتی ہوں' مگر یہ رکھ لی۔" وہ جو دفعتاً "اس لونگ کے حسب نسب سے نا واقف تھی' سادگی سے ان کی طرف چہرہ کیے بتانے لگی۔

کھانا لگ چکا تھا۔ اشتہا انگیز خوشبو ہر سو پھیلی تھی۔ باتوں' مسکراہٹوں کے شور میں فارس بالکل خاموش بیٹھا تھا۔ نگاہیں سامنے میز پہ جمی تھیں۔ پہلو میں بیٹھی زمر اپنا کام دار دوپٹا درست کررہی تھی۔ سیم نے کھانے کے لیے جاتے' اس کے گھٹنوں پہ پھول لاکر رکھے تھے' ایک کلی سے اس کے دوپٹے کا کام اٹک گیا تھا۔ وہ الجھے تاروں سے اس کو نکالنے کی کوشش کررہی تھی۔ بار بار ٹہنی کو کھینچتی مگر وہ الگ نہ ہوپاتی۔

وہ بے اختیار گردن جھکا کر دیکھنے لگا۔ وہ غلط سمت سے کھینچ رہی تھی اور مسلسل حرکت پہ فارس کو اکتاہٹ ہورہی تھی۔ اس نے ہاتھ بڑھایا اور ٹہنی کھینچ لی۔ زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ نگاہیں ملیں' اس کی رسمی مسکراہٹ مدھم ہوئی چہرے پہ برہمی آئی۔

"مجھے آپ کی کسی مدد کی ضرورت نہیں ہے۔" دبی دبی سی آواز میں بولی اور سختی سے اپنا دوپٹا چھڑالیا۔

"جب تک زندہ ہیں یاد رکھیے گا۔" اور قدرے دوسری طرف سرک گئی۔ چونکہ کھانا ڈال کر اکا دکا لوگ ادھر ہی آرہے تھے تو وہ اگلے ہی لمحے چہرے پہ پھر سے مسکراہٹ لے آئی۔

فارس نے کچھ نہیں کہا' محض لب بھینچے سامنے دیکھنے لگا' جہاں میز کے گرد کھڑے لوگ جھک کر کھانا نکال رہے تھے۔ منظر تبدیل ہونے لگا۔ فضائیں بدلیں۔ وقت چند سال پیچھے گیا۔ یونی ورسٹی کی لائبریری میں اس شام کا منظر نمایاں ہوا۔ اس منظر پہ ایسی زردی چھائی ہوئی تھی جیسے پرانی کتابوں میں ملنے والے سوکھے پھولوں پہ چھائی ہوتی ہے۔

لائبریری کی کھڑکی سے باہر اترتی شام گہری ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔ کونے والی میز پہ گھنگریالے بالوں والی لڑکی بیٹھی' سر جھکائے کاغذ پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ بائیں ہاتھ پہ پہلی کرسی پہ وہ پیچھے ہوکر بیٹھا زمر کے کاغذات کو دیکھ رہا تھا۔ جھکے سر کے باعث ایک گھنگریالی لٹ کاغذ کو چھو رہی تھی۔

دفعتاً "ساتھ رکھا چھوٹا' پرانا نوکیا ذرا سا بج کر خاموش ہوگیا۔ زمر نے قدرے کوفت سے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

"ایک تو لوگ صرف مسڈ کال کیوں دیتے ہیں؟" وہ بڑبڑائی۔ موڈ آف تھا اور تھکن زدہ لگتی تھی۔ موبائل اٹھا کر کال ملائی اور اسے کان پہ لگایا۔ قلم

انگلیوں میں گھماتی، منتظر خاموش سنے گئی۔ پھر کمپیوٹرائزڈ آواز آئی تو اس کی آنکھوں میں ڈھیروں بے زاری اتری۔ (بیلنس ختم) جھنجلا کر فون کان سے ہٹایا اور پرس میں ہاتھ ڈالا۔

"انسان کا فون خراب نہ ہو بس!"

"یہ کس کا فون ہے؟" وہ مسکراہٹ دبائے اسے دیکھ رہا تھا۔

"میرا ہی کا، پری پیڈ ہے۔" پرس سے ایک کارڈ نکالا۔ "میں پوسٹ پیڈ استعمال کرتی ہوں، وہ خراب تھا تو عارضی طور پہ یہی سہی۔" وہ اتنی لمبی غیر ضروری بات اس سے کیسیں کیا کرتی تھی، اب بھی بس برے موڈ میں بول گئی۔ کارڈ نکالا اور سر جھکائے اس کی سلور کوٹنگ، ناخن سے رگڑنے لگی۔ فارس کے ابرو بھینچے، قدرے غیر آرام دہ سا ہو آگے ہوا۔

"یہ۔" وہ متذبذب سا رکا۔ زمر نے رگڑتا ناخن روک کر نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"جی؟"

"یہ ناخن سے نہیں اسکریچ کرتے کو ھرلا یئے۔"

جیب سے چابی نکالتے ہوئے دوسرا ہاتھ بڑھایا۔ زمر نے ایک نظر اس کے ہاتھ پہ ڈالی۔ دوسری کارڈ پہ اور پھر کارڈ اس کے ہاتھ پہ رکھا۔ فارس چابی نکال کر اٹھا اور کارڈ اسکریچ کرتے چند قدم آگے چلا گیا۔ لائبریرین کی ٹیبل تک رکا، باکس سے دو ٹشو نکالے اور واپس آیا۔ کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ ٹشو اس کی طرف بڑھائے۔

"ناخن صاف کرلیں۔ یہ کوٹنگ صحت کے لیے خطرناک ہوتی ہے۔" زمر نے ٹشو پکڑ لیے اور پھر ناخن صاف کرتی اس کو دیکھے گئی۔ وہ اب اس کا موبائل اٹھائے کارڈ سے نمبر دیکھ کر ٹائپ کر رہا تھا۔ ری چارج کرکے موبائل اس کے سامنے رکھا۔ پھر اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ متذبذب سی اسے دیکھ رہی تھی۔ جب وہ بولی نہیں تو فارس کو کہنا پڑا۔

"اب بلا لیجیے شکل!"

زمر نے کچھ کہے بنا پرس میں ہاتھ ڈالا اور کچھ نکال کر سامنے رکھا۔ فارس نے چونک کر دیکھا۔ وہ پلاسٹک میں لپٹے نو کارڈ کی اسٹرپ تھی۔ ان میں سے دسواں کارڈ وہ تھا جو اس نے ابھی ابھی فیڈ کیا تھا۔ کارڈ اٹھاتے ہوئے چابی دوبارہ جیب سے نکالتے وہ مسکرا دیا اور زمر۔ وہ سر جھٹکتے ہوئے ہنس دی۔

"تھینک یو۔ مجھے یہ۔" انگوٹھے کا ناخن اٹھا کر بتایا۔ "ناخن سے نہیں کرنا۔ جب تک زندہ ہوں، یاد رکھوں گی۔"

زرد زمانوں کی شام وقت کی دھول میں مدھم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ نئے اور رنگین مناظر اطراف میں ابھرنے لگے۔

باتیں، قہقہے، برتنوں کی آواز، کھانے کی خوشبو، وہ سر جھٹک کر واپس حال میں آیا۔ تقریب جاری و ساری تھی۔

✿ ✿ ✿

کاش کوئی ہم سے بھی پوچھے
رات گئے تک کیوں جاگے ہو؟

قصر کاردار کے اونچے ستون رات میں بھی روشن نظر آتے تھے۔ ایسے میں فینونا للاؤنج کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی اور نوشیرواں کے کمرے کا دروازہ بجا کر کھولا۔ نوشیرواں اندر نہیں تھا، غالباً باتھ روم میں تھا۔ مدھم بتی جل رہی تھی۔ وہ پانی کا جھرنا لیے بالکونی کی سمت باہر نکل آئی۔ باری باری پودوں کو پانی دیا۔ گملے بگاہے نگاہ اٹھا کر انیکسی کی سمت بھی دیکھ لیتی جہاں سفید پاؤں کو چھوتے لباس والی دلہن کو ایک خاتون ہاتھ سے پکڑ کر گاڑی سے باہر لا رہی تھیں۔ فینونا نے اشتیاق سے گردن اونچی کرکے دیکھنا چاہا مگر دلہن کی پشت تھی۔ وہ مایوس ہو کر اندر آگئی۔

واپس جاتے جاتے اسٹڈی ٹیبل تک ٹھہری۔ وہاں کاغذ کی کھلی پڑیا رکھی تھی۔ اس پہ سفید دانے دار شے رکھی تھی۔ اس نے ٹھٹک کر اس پڑیا کو دیکھا۔ بے اختیار استعجابیہ ابرو اٹھائی۔ تب ہی باتھ روم کا دروازہ کھلا۔ فینونا چونک کر اس طرف دیکھنے لگی جہاں سے

وہ آرہا تھا۔ ملگجے لباس اور سرخ آنکھوں کے ساتھ وہ بہت ست سا لگ رہا تھا۔ فینو نا نہیں ہلی' وہیں کھڑی رہی۔ نوشیرواں اسے دیکھ کر چونکا' فوراً" اسے اور پڑیا کو دیکھا۔ پھر ابرو تن گئے ۔۔۔ بے زاری سے سر جھٹکا۔

"جاؤ' جا کر بتادو ہاشم بھائی کو کہ میں ڈرگز لے رہا ہوں۔"

فینو نا نے تھوک نگلا' بظاہر مسکرائی۔

"اگر میں گھر کے ایک فرد کی بات دوسرے کو بتانے والی ہوتی تو مسز کاردار مجھے پہلے دن ہی نکال دیتیں سر! میں آپ کی ملازمہ ہوں' آپ کے حکم کی پابند ہوں۔" وہ تابعداری سے سر جھکا کر بولی تو شیرو مشکوک نظروں سے اسے گھورتا رہا' پھر اسٹڈی ٹیبل کی کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ چابی کے لوہے سے ٹکڑوں کو چورچور کرنے لگا۔

"سر۔ کیا میں آپ کی کوئی مدد کر سکتی ہوں؟" قدرے ہمدردی سے اس نے ڈرگ پیستے شیرو کے ہاتھوں کو دیکھا۔

"مجھے کسی کی مدد کی کیا ضرورت؟" بے پروائی سے شانے اچکائے' مگر آواز میں اداسیاں گھل رہی تھیں۔ "میں نوشیرواں کاردار ہوں' بھائی کہتا ہے' تم ایک بڑے خاندان میں پیدا ہونے والے بڑے انسان ہو۔ میں کیوں مدد مانگوں کا کسی سے؟" وہ جیسے خود پہ طنز کر رہا تھا۔ فینو نا جھرنا پکڑے فکرمندی سے سنویں سکیڑے دو قدم آگے آئی۔

"آپ کو ایسے نہیں سوچنا چاہیے۔ آپ واقعی ایک بڑے انسان ہیں۔" فینو نا نے رٹ کر مزید خوبیوں والے سابقے لاحقے جوڑنے کی کوشش کی' مگر شیرو کی کوئی خوبی یاد نہیں آرہی تھی۔

"ہونہہ۔۔۔" سر جھکائے' چابی سے پاؤڈر پیستے اس نے استہزا سے سر جھٹکا۔ "پتا نہیں کون بڑا ہے کون چھوٹا۔ ممی نے میرا نام نوشیرواں رکھا۔ جانتی ہو اس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟" فینو نا نے نفی میں گردن ہلائی۔

"بادشاہ۔ سپر ہیرو' ہونہہ۔۔۔" پھر سر جھٹکا۔ بے اختیار ایک منظر یاد آیا۔

کوریا جا کر اغوا کا ڈرامہ کرنے سے چند دن قبل حنین کو دیے جانے والے ڈنر میں جب سب لاؤنج میں بیٹھے تھے تو جواہرات نے ندرت کی کسی بات کے جواب میں کہا تھا۔

"مجھے نہیں لگتا' مجھے اپنے چھوٹے بیٹے کے نام سے زیادہ کوئی نام پسند ہے' نوشیرواں' ایک بڑا بادشاہ' ایک بڑا ہیرو' سپر ہیرو۔" فخر سے گردن تان کر نوشیرواں کو دیکھتے ہوئے اس کی ماں مسکرا کر بولی تھی' وہ بھی ذرا سا مسکرایا۔

اور وہ تیز طرار لڑکی۔ وہ شدید جھنجلاہٹ میں مبتلا کرنے والی حنین' وہ فوراً" سعدی کے قریب جھکی اور کان میں سرگوشی کی۔

"بھائی' اگر یہ لوزر سپر ہیرو ہے' تو میں تو پھر ہیلن آف ٹرائے ہوں۔" اور سعدی نے بہت دقت سے اپنی مسکراہٹ روک کر اس کو چپ رہنے کو کہا' کیونکہ نوشیرواں قریب ہی بیٹھا تھا اور اس نے سن لیا تھا۔

"میرے نام سے لے کر میری شخصیت تک' میری ہر چیز کا مذاق بناتے ہیں وہ دونوں۔" چابی زور' زور سے پاؤڈر پہ دبا' وہ کہہ رہا تھا۔ "یونیورسٹی سے لے کر اب تک وہ سعدی وہ ہمیشہ میرا کمپٹیٹر بنا رہتا ہے۔ ممی کی نظر میں' ہاشم بھائی کی نظر میں' وہ بہت اعلا چیز ہے اور میں کیا ہوں؟ ایک لوزر؟" اس کی آواز سے اکتاہٹ مفقود ہو کر دکھ میں بدلتی جا رہی تھی۔ فینو نا تاسف سے اسے دیکھتی سنتی گئی۔

"اس نے میرا ہر رشتہ خراب کیا ہے۔ ممی کو میری شکایت لگاتا تھا' تب سے اب تک' ممی میری طرف سے ان سیکیور رہتی ہیں۔ ہاشم بھائی کو وہ اغوا والی بات بتائی' وہ آج تک مجھ پہ بھروسا نہیں کرتے' کبھی میرا فون لے لیتے ہیں' کبھی مجھے جھڑک کر کہتے ہیں کہ شیرو' تم کچھ نہیں کرو گے' جیسے میں تو اب قابل اعتبار رہا ہی نہیں۔ پتا نہیں کیا کر بیٹھوں۔" چابی پرے ڈالی اور گہری سانس لے کر ٹیک لگائی۔ جواب بالکونی کے دروازے کی طرف تھا اور وہاں سے آتی روشنی میں اس کی آنکھوں میں کچھ بھیگنا دکھائی دے رہا تھا۔

"اور میرے ڈیڈ۔ اس نے ڈیڈ اور میرے درمیان اتنا فاصلہ پیدا کر دیا کہ میں ان کی منتیں کرتا رہا' وہ مجھے معاف کر دیں' مگر وہ مجھ سے بات ہی نہیں کرتے تھے۔" اس نے آنکھیں بند کیں' زخم پھر سے تازہ ہوئے۔ "اس رات تو میں نے سوچ لیا تھا' آج سونے سے پہلے میں ان کے پاس جاؤں گا' ان کے گلے لگ جاؤں گا اور۔۔۔ اور اس دفعہ وہ مجھے معاف کر دیں گے اور اسی رات فینونا! میرے ڈیڈ مر گئے۔"

فینونا کو احساس ہوا کہ بے خودی کے عالم میں بند آنکھوں سے بولتا شیرو غالباً" منشیات کے زیر اثر ہے۔ اسٹڈی ٹیبل کے قریب ڈسٹ بن میں خالی پڑیاں تازہ تازہ گرائی نظر آ رہی تھیں۔

"اور وہ اس حال میں مرے کہ وہ مجھ سے ناراض تھے۔ مجھے لگا' سعدی اس سے بڑا نقصان مجھے نہیں پہنچا سکتا مگر۔۔۔" کرب بڑھا۔ "اس نے پیچھا لیا۔ وہ لڑکی جسے میں پسند کرتا ہوں' اس نے اسی کو بلیک میل کیا اور پھر میرے اور اس کے رشتے کو اتنا پیچیدہ کر دیا کہ ہاشم بھائی اور ممی۔۔۔" آنکھیں کھولیں' نفی میں سر ہلایا۔

"اب وہ کبھی مجھے اس لڑکی کے ساتھ تعلق رکھنے کی اجازت نہیں دیں گے۔ سعدی نے میرے ہر رشتے کو خراب کیا ہے۔ میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گا۔" وہ سست ڈھیلے انداز میں نفی میں سر ہلاتے کھڑکی کو دیکھتے کیے جا رہا تھا۔

"ایک دن میں اس سے انتقام لوں گا۔ ہر چیز کا انتقام۔" ذرا دیر کو ٹھہرا۔ "اب تم جاؤ فینونا اور دوبارہ شکل مت دکھانا مجھے۔"

فینونا قدرے گڑبڑا کر "جی اچھا" کہتی باہر نکل گئی۔ نوشیرواں کرسی پہ بیٹھا اسی طرح باہر کی روشنی کو دیکھتا رہا جو کمرے کا اندھیرا دور کرنے کے لیے اب بھی ناکافی تھی۔

☼ ☼ ☼

خود کو بکھرتے دیکھتے ہیں' کچھ کر نہیں پاتے
پھر بھی لوگ خداؤں جیسی باتیں کرتے ہیں

وہ کتنی ہی دیر ادھر بیٹھا رہا۔ پھر مدھم سی دستک ہوئی تو اٹھا۔ انداز پہچانا تھا' سو سائیڈ ٹیبل سے ماؤتھ فریشنر اٹھا کر منہ میں اسپرے کیا اور چہرے پہ بشاشت لاتے دروازہ کھولا۔ ہاشم کافی کا مگ پکڑے سامنے کھڑا تھا۔

"سعدی نے میری سیکرٹری کو فون کیا ہے۔ وہ صبح آئے گا ہم سے ملنے۔ ہم تینوں کو وہاں ہونا چاہیے۔ ایک خاندان کی طرح' ہوں؟" مگ سے گھونٹ بھر کر اسے نیچے کرتے ہوئے سنجیدگی سے تاکید کی۔ وہ مطمئن اور پُراعتماد لگ رہا تھا۔ نوشیرواں نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلایا۔

"میں تیار رہوں گا۔"

"گڈ!" اس کی نگاہوں اور الفاظ کے "عجیب" سے انداز کو وہ محسوس کرتا' مگر جیب میں رکھا موبائل بجا۔ وہ پیغام چیک کرتا اپنے کمرے تک آیا۔ مگ اور فون اسٹڈی ٹیبل پہ رکھا اور بالکونی کے دروازے میں کھڑی سونی کو پیچھے سے آ کر بازوؤں میں اٹھا لیا۔ اس کا گال چوما اور چہرہ اپنی طرف کیا۔ وہ گردن پیچھے پھینک کر ہنسنے لگی۔

"بابا۔ ادھر کون آیا ہے؟" چہرہ سیدھا کر کے اس نے چمک دار شرارتی آنکھوں سے پوچھا۔ ہاشم نے بالکونی کے پار دیکھا جہاں رات اتر چکی تھی اور نیچے انیکسی کی بتیاں جل رہی تھیں۔ ایک گاڑی واپس جا رہی تھی۔ سعدی کی کار اور برآمدے میں سفید کرتے میں کھڑا فارس گاڑی کو جاتے دیکھ رہا تھا' ہاشم مسکرایا۔

"تمہاری فیملی میں ایک ناخوش گوار اضافہ' صبح ملاقات کریں گے ان سے بھی۔" وہ بھی محظوظ سا ہو کر خود سے بولا اور سونیا کو اٹھائے اسٹڈی ٹیبل کی طرف آیا' جہاں لیپ ٹاپ کھلا تھا اور چند فائلز اس کی منتظر تھیں۔

"بابا! اب کام کریں گے اور سونی اب سونے جائے گی' ٹھیک۔" وہ کرسی دھکیل کر بیٹھتے ہوئے اسے کہہ رہا تھا جب موبائل بج اٹھا۔ نمبر دیکھ کر ہاشم نے بے چینی سے اسے اٹھایا۔

"آپ درست تھے۔ سعدی فرشتہ نہیں ہے، مجھے کچھ ملا ہے۔" دوسری طرف خاور بولتا جا رہا تھا اور ہاشم مسکرا کر سنتا گیا۔ پورے جسم و جاں میں گویا سکون سا پھیل گیا۔

"زبردست خاور! تم نے ایک دفعہ پھر ثابت کر دیا کہ تم میرے لیے کتنے اہم ہو۔ کل ہم ایک ساتھ اس لڑکے کو کنفرنٹ (مقابلہ) کریں گے۔" مسکرا کر اس نے موبائل رکھ دیا۔

دیوار کے پار نوشیرواں اپنے کمرے میں ڈریسنگ روم کے سامنے کھڑا تھا۔ وارڈ روب کھلا تھا۔ ٹائی ریکس، کف لنکس، کوٹ، شرٹس، اس نے آہستہ آہستہ ہر ریک سے ایک ایک چیز چننی شروع کی۔ ٹام فورڈ کا سوٹ، ہیری روزن کی شرٹ، Zegna کی ٹائی۔ لباس کا چناؤ کر کے اسے سامنے لٹکایا۔ پھر اسی خاموشی سے ایک الماری کا پٹ کھولا۔ اندر سیف نصب تھا۔ اس نے کوڈ دبایا تو ننھا دروازہ باہر کو کھلا۔ شیرو نے ہاتھ اندر ڈال کر نکالا تو اس میں ایک Glock کی سیاہ چمکتی پستول (گن) تھی۔ G-41 برانڈ نیو ماڈل۔ اس نے گولیاں نکالیں اور انہیں میگزین میں بھرنے لگا۔

"ایک... دو..." (تم نے وہ کچرے کے ڈبے دیکھے ہیں جن پہ یوزی لکھا ہوتا ہے؟)

"پانچ... چھ..." (ہاں نوشیرواں میرے بہن بھائی نے تمہارے جیسی چیزیں کبھی دیکھی ہیں۔)

"دس... گیارہ..." (تمیز سے بات کرو میری بہن سے 'چھوٹے ممنوں' سال ہے۔)

بارہ اور یہ ہوئے مکمل تیرہ۔ بھرا ہوا پستول اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس بھاری لوہے کے ہاتھ میں آجانے ہی جسم میں گویا کرنٹ سا دوڑنے لگا۔ گردن مزید اکڑ گئی۔ لبوں پہ تنفر بھری مسکراہٹ آگئی۔

"نہیں ہاشم بھائی... آپ سعدی یوسف کو نہیں سنبھال سکتے۔" پستول پہ نظریں جمائے وہ بڑبڑایا۔ "یہ وہ مسئلہ ہے جسے میں خود سنبھال لوں گا۔ کل کا دن اس کا اس دنیا میں آخری دن ہو گا۔ بس بہت ہو گیا۔"

ایک مضبوط عزم کے ساتھ اس نے کل کے لباس کے اندر پستول رکھا اور پھر بستر کی طرف چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

قرب کیا ہے کہ تو سامنے ہے اور ہمیں
شمار ابھی سے جدائی کی ساعتیں کرنی

جس وقت ہاشم اور نوشیرواں اپنے اپنے ارادوں پہ نظر ثانی میں مصروف تھے، انیکسی کے باہر سے سعدی کی کار گیٹ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ فارس برآمدے میں کھڑا الوداعی انداز میں ان کو جاتے دیکھتا رہا۔ اندر گھر میں سناٹا تھا۔ اس کا گھر، زمر کا سامان، ہر شے ترتیب دے کر، سارے کام ختم کر کے، ندرت جو رخصتی کے ساتھ ہی ادھر آگئی تھیں۔ اب اس گاڑی میں بیٹھی واپس جا چکی تھیں اور پیچھے گھر بالکل خاموش اور ویران سا ہو گیا تھا۔ لاؤنج میں کھڑے فارس نے گردن اٹھا کر اوپر جاتے لکڑی کے گول زینے کو دیکھا جس کے اختتام پہ دو بیڈ روم تھے۔ ایک وہ جو کبھی فارس اور زرتاشہ کا ہوا کرتا تھا اور دوسرا وہ جس میں اس وقت وہ بیٹھی تھی۔

وہ گہری سانس لے کر قدم قدم زینے چڑھنے لگا۔ لکڑی پیر کے نیچے ہلکی سی چچی۔ خاموشی میں ارتعاش پیدا ہوا۔ وہ اوپر آیا۔ "اس" کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا۔ اندر زرد روشنیاں جل رہی تھیں۔ سنگھار میز اور دوسری دو میزوں پہ پھولوں کے تین بوکے رکھے تھے۔ وہ بھی سعدی نے رکھے تھے۔ اس کے علاوہ کوئی شے ایسی نہ تھی جو سجاوٹ کہلائی جا سکتی تھی۔

چوکھٹ میں کھڑے ہو کر اس نے دیکھا۔ بیڈ خالی تھا۔ نگاہیں آگے پھسلیں۔ وہ ڈریسنگ ٹیبل کے اسٹول پہ بیٹھی تھی۔ فارس کی طرف پشت تھی۔ مگر آئینے میں اس کا عکس دکھائی دیتا تھا اور چوکھٹ میں کھڑا فارس بھی نظر آتا تھا۔ وہ مصروف سی بندے اتار رہی تھی۔ کامدار دوپٹا سر پہ تھا اور آنکھوں کا کاجل اب بھی تازہ تھا۔

"سب جا چکے ہیں۔" وہ وہیں کھڑے کھڑے، ہلکے

مگر سپاٹ انداز میں بولا۔ "آپ کا سامان میں نے ادھر رکھوا دیا تھا۔ کچن نیچے ہے اور اس میں تقریباً" سب کچھ موجود ہے۔ آپ کی ڈریسنگ ٹیبل پہ اس گھر کی ڈپلی کیٹ چابیاں پڑی ہیں آپ کے لیے سوائے۔" وہ رکا "نیچے بیسمنٹ کے۔ اس کے لاک کی چابی میرے پاس ہوگی۔ اس میں میری بیوی کی بہت سی چیزیں ہیں اور میں نہیں چاہتا کہ ان کو کسی بھی طرح کا کوئی نقصان پہنچے۔ باقی پورا گھر آپ کا ہے' جو چاہے کریں۔"

وہ آئینے میں خود کو دیکھتے دوسرا بندہ اتار رہی تھی۔ جب وہ خاموش ہوا تو اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

"میں نے کچھ بھی نہیں پوچھا۔ آپ اپنے الفاظ ضائع نہ کریں۔" بندہ اتار کر چہرہ جھکائے اسے جیولری باکس میں رکھا۔

فارس چند لمحے لب بھینچے خاموش کھڑا رہا' پھر جانے کو مڑا اور جیسے نہ چاہتے ہوئے پوچھا۔ "کیا آپ کو کوئی چیز چاہیے؟"

زمر نے چہرہ سیدھا کیا اور ٹیکا اتارنے لگی۔

"صرف یہ ہی کہ میرے سامنے کم سے کم آیا کریں۔ مجھے بہت کچھ یاد آنے لگتا ہے۔"

فارس کی آنکھوں میں ناگواری ابھری جو اس نے بمشکل ضبط کی۔ "ایسے بات مت کیجیے جیسا آپ مجھے جانتی ہیں۔"

نتھ اتارتے اس کے ہاتھ رکے' وہ اسٹول سے اٹھی' اس کی جانب گھومی' آنکھوں میں چبھن لیے اسے دیکھا۔ "میں جتنا آپ کو جانتی ہوں' اس سے زیادہ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔"

"اور پھر بھی آپ نے مجھ سے شادی کرلی؟"

"آپ کو پتا ہے' میں نے آپ سے کیوں شادی کی ہے۔" وہ بھی اتنی ہی بے زاری سے کہہ کر گھوم گئی اور آئینے میں دیکھتی نتھ اتارنے لگی۔

"مجھے نہیں معلوم تھا' آپ اتنی ظالم ہیں۔" چوکھٹ میں کھڑے' سینے پہ بازو لپیٹے' وہ اسے دیکھتے ہوئے آہستہ سے بولا تھا تو زمر نے پن نکالتے ہوئے اس کے عکس کو تیز نظروں سے گھورا۔

"آپ اس سب کے حق دار ہیں۔ یہ مت سمجھیے کہ جیل سے نکلنے کے بعد آپ کی سزا ختم ہوگئی ہے۔"

"اوہ اچھا!" اس نے ابرو اٹھا کر اسے دیکھا۔ "ویسے کیا کریں گی آپ میرے ساتھ' مجھے بھی تو بتایئے۔" دیوار سے ٹیک لگائے وہ اس کو مسلسل دیکھ رہا تھا۔

"میرا اور اپنا وقت ضائع مت کیجیے اور جایئے یہاں سے۔ اگر آپ کچھ دیر مزید یہاں ٹھہرے تو خدا کی قسم میں..." دبے دبے غصے سے اس نے ایک نظر فارس پہ ڈالی اور دوسری پھلوں کی ٹوکری میں رکھی چھری پہ۔ "کچھ کر بیٹھوں گی۔"

فارس نے چونک کر اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھا اور پھر اس کے اندر کچھ ٹوٹا تھا' آنکھوں میں افسوس در آیا۔

"گڈ نائٹ!" کہہ کر وہ ایک قدم پیچھے ہٹا' نظریں ابھی تک اس پہ تھیں۔ وہ ان الفاظ پہ تیزی سے چوکھٹ تک آئی۔ دروازے کا ہینڈل پکڑا اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے "گڈ نائٹ فارس" کہہ کر دروازہ زور سے بند کیا۔ لاک کے دو کلک ہوئے اور اندر سے مقفل ہوگیا۔ فارس نے گہری سرد سانس خارج کی' ہلکے سے سر جھٹکا اور مڑ گیا۔

اپنے کمرے میں آیا تو وہاں مرکزی دیوار پہ آج بھی زرتاشہ اور اس کی تصویر آویزاں تھی۔ وہ سیاہ ساڑھی میں ملبوس تھی اور مسکرا رہی تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے تمام مناظر لہرائے جب وہ زرتاشہ سے اکھڑے لہجے میں یا غصے سے بات کر جاتا تھا اور ایک یہ عورت تھی۔ اس نے دیوار کو دیکھا جس کے پار وہ پھولوں سے مہکتا کمرہ تھا جس کو کچہری میں لوگ روز منوں کے حساب سے گالیاں دیتے تھے' مگر ایک یہ ہی عورت تھی جس پہ اسے غصہ نہیں آتا تھا۔

"آپ اس دن کیا کریں گی میڈم پراسیکیوٹر' جس دن آپ کو یہ معلوم ہوگا کہ فارس غازی سچا تھا؟" تصویر کو دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا تھا۔

باہر رات اسی طرح بھیگ رہی تھی۔ دوسرے کمرے میں موجود زمر اب لباس تبدیل کرکے اس اجنبی بیڈ پہ آبیٹھی تھی۔ زمر کا فرنیچر' زمر کا نیا بیڈ کور' مگر پھر بھی ہر شے پرائی لگ رہی تھی۔ کچھ دیر پہلے فارس کے سامنے کا بے تاثر جواب تکلیف کے احساس میں لپٹا تھا۔ وہ اداسی سے بیڈ کور پہ ہاتھ پھیر رہی تھی۔

"کیا بگاڑا تھا میں نے فارس کا جو اس نے میرے ساتھ یہ کیا؟" نہ چاہتے ہوئے بھی لبوں سے پھسلا۔ مگر اداسی الفاظ تک ہی محدود رہی۔ نہ دل بھر آیا' نہ آنکھ بھیگی۔ وہ زمر تھی' وہ رلا سکتی تھی' مگر وہ روتی نہیں تھی۔

رات مزید گہری ہوتی چلی گئی اور اب چند گھنٹے بعد اس نے ایک ایسے دن کو جنم دینا تھا جو ان دو خاندانوں میں سے کسی کو بھی بھولنے والا نہیں تھا۔

☆ ☆ ☆

یہ لوگ کیسے' مگر دشمنی نبھاتے ہیں
ہمیں تو راس نہ آئیں محبتیں کرنی

صبح پورے اسلام آباد پہ طلوع ہوئی تو اس میں باسی گلاب کی پتیوں اور کافور کی خوشبو پھیلی تھی۔ دور جنگلوں میں جانوریوں نوحہ بلند کر رہے تھے جیسے رات کی تاریکی میں کوئی غارت گر کسی ننھے بھیڑ کے بچے کو چیر پھاڑ کر چلا گیا ہو۔

قصر کاردار کے سبزہ زار پہ واقع انیکسی کے اندر بھی صبح کی روشنی پھیلی تھی۔ فارس اوپن کچن کی گول میز کے گرد بیٹھا مگ سے چائے کے گھونٹ بھر رہا تھا' جب لکڑی کے زینے پہ باریک ہیل کی آواز نیچے آتی سنائی دی۔ وہ نہ رکا' نہ مڑا' سامنے فریج کے چمکتے دروازے میں عکس دکھائی دے گیا تھا۔

وہ سیاہ منی کوٹ پہنے' بیگ اور فائلز اٹھائے زینہ اتر رہی تھی۔ گھنگریالے بال سمیٹ کر چہرے کے بائیں طرف ڈال رکھے تھے اور موبائل پہ کوئی پیغام ٹائپ کرتے ہوئے نگاہیں جھکی تھیں۔ اسی طرح چلتی آئی اور فریج کے پاس رکی۔ ڈور کھولا' ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔

"تو آپ آفس جا رہی ہیں؟" نگاہیں اس پہ جمائے' چائے کا گھونٹ بھرتا' وہ آہستہ سے بولا۔ وہ اسٹول پہ بیٹھی اس کی طرف پشت کیے پانی پینے لگی' جواب نہیں دیا۔

"ویسے پراسیکیوٹر صاحبہ!" آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھتے' کوئی غیر محسوس سی مسکراہٹ دبائے' وہ ہلکے انداز میں گویا ہوا۔ "آپ کو یہ خیال نہیں آیا کہ اگر میں آپ کے والد کو جا کر اس شادی کی حقیقت بتا دوں تو کیا ہوگا؟"

زمر پانی پی کر کھڑی ہوئی' نل سے گلاس دھویا' واپس رکھا اور اس کی جانب گھومی' سنجیدہ' چبھتی ہوئی نگاہوں سے اس کا چہرہ دیکھا۔

"آپ کبھی بھی یہ نہیں کریں گے۔"

"اچھا؟" فارس نے ابرو اٹھایا۔ "آپ کو کیوں لگتا ہے کہ میں یوسف صاحب کے سامنے جا کر یہ بات ان سے نہیں کہوں گا؟"

زمر کے لبوں پہ ہلکی سی تلخ مسکراہٹ آئی۔ "کیونکہ سامنے سے کچھ کرنے کے لیے جو گٹس چاہیے ہوتے ہیں' وہ آپ میں نہیں ہیں۔ آپ صرف پیچھے سے وار کرنے والوں میں سے ہیں۔" وہ ٹھنڈے انداز میں اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی تھی۔

فارس کی دبی ہوئی مسکراہٹ بھی غائب ہوئی' ابرو اکٹھے ہوئے' آنکھوں میں سختی در آئی مگ کے ہینڈل کو زور سے مٹھی میں بھینچا گویا ضبط کیا ہو۔

"کیوں؟ غصہ آرہا ہے؟ مجھے بھی آیا تھا' مگر اب نہیں آتا۔" ایک کاٹ دار نظر اس پہ ڈال کر وہ اپنی فائلیں سمیٹتی دروازے کی جانب بڑھ گئی۔ پھر رکی اور مڑ کر اسے دیکھا۔

"مجھ سے مخاطب ہونے کی کم سے کم کوشش کیا کیجیے اور ہاں آئندہ اس کانٹریکٹ کو شادی مت کہیے گا آپ۔" سلگتی نظروں سے اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ "آپ میرے شوہر نہیں ہیں۔ صرف میرے باپ کے

مقروض ہیں اور اپنا قرضہ اتار رہے ہیں۔"

فارس نے چہرہ موڑ لیا اور مگ سے گھونٹ بھرنے لگا۔ وہ راہداری عبور کر کے دروازہ تک آئی ہی تھی کہ وہ بجا۔ زمر نے اسے کھولا۔ وہ بھی بے اختیار اس طرف دیکھنے لگا۔ وہ سامنے سے ہٹی تو باہر کھڑا شخص نظر آیا اور اسے دیکھتے ہی فارس نے بے زاری سے منہ پھیر لیا۔

"گڈ مارننگ مسز غازی!" پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے 'ہاشم نے مسکرا کر کہا تو زمر گہری سانس بھر کر رہ گئی۔ وہ آفس کے لیے تیار لگ رہا تھا۔ وجیہہ اور ہشاش بشاش' چوکھٹ پہ کھڑا تھا اور پرفیوم کی خوشبو انیکسی کے اندر تک پھیل گئی تھی۔

"مارننگ' کاردار صاحب۔" وہ جبراً" مسکرائی۔

"بہت خوشی ہوئی آپ کو یہاں۔" ہاشم نے نگاہیں آگے پیچھے دوڑائیں۔ "گھر میں دیکھ کر۔ آرام سے ہیں آپ؟"

"مجھے بھی بہت خوشی ہوئی آپ کو اپنے ہمسائے میں دیکھ کر۔ امید ہے ملاقات ہوتی رہے گی۔ اب اگر آپ مجھے اجازت دیں تو۔" کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھی۔ "میری آج پیشی ہے اور مجھے دیر ہو رہی ہے۔"

"پہلے میری بات سن لیجیے۔" وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ "آج رات آپ لوگ ڈنر ہمارے ساتھ کریں گے۔ تم نے سن لیا' فارس؟" ساتھ ہی بلند آواز میں پکارا۔

میز پہ موجود فارس نے اکتا کر سر جھٹکا۔ "میں معروف ہوں۔"

مگر ہاشم نے توجہ نہیں دی۔ "مجھے منفی جواب کی عادت نہیں ہے۔ ہم ڈنر پہ آپ کا انتظار کریں گے۔ ٹھیک آٹھ بجے۔" اپنی کلائی کی گھڑی کے ڈائل پہ انگلی سے دستک دے کر دکھایا۔ زمر نے گہری سانس لے کر سر کو خم دیا۔ "شیور۔ ہم آئیں گے۔" وہ اسی مسکراہٹ کے ساتھ پلٹ گیا۔ اس کے نکلنے کے چند لمحے بعد زمر پیچھے دیکھے بنا باہر نکلی۔ ہاشم کی کارروائی جاری تھی۔

وہ انیکسی کے برآمدے کے زینے اترتی سبزہ زار پہ آئی۔ وہاں فارس اور اس کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ اپنی گاڑی کا لاک کھولتے' زمر نے گردن اٹھا کر ادھر ادھر سرسری سا دیکھا۔ سامنے قصر کاردار کی عقبی بالکونیاں دکھائی دیتی تھیں۔ ایک بالکونی ہاشم کے کمرے کی تھی' اسے اندازہ تھا۔ چابی گھماتے ہوئے اس کی نگاہیں دوسری بالکونی تک گئیں' جس کے شیشے کے دروازے کے پیچھے کمرے میں کوئی کھڑا نظر آرہا تھا۔ زمر نے آنکھیں سکیڑ کر دیکھا۔ وہ نوشیرواں تھا۔ اس کے ہاتھ میں سگریٹ تھا جو لبوں سے لگائے ہوئے تھا۔ اس نے بھی زمر کو دیکھ لیا تھا' فوراً" اسے سگریٹ والا ہاتھ پیچھے کرتا مڑ گیا۔ زمر سر جھٹک کر کار میں بیٹھ گئی۔

☆ ☆ ☆

قبروں میں نہیں ہم کو کتابوں میں اتارو
ہم لوگ محبت کی کہانی میں مرے ہیں!

وہ صبح کافور کی مہک لیے' چھوٹے باغیچے والے گھر پہ بھی وہی پرملال سی طلوع ہوئی تھی۔ ندرت کچن میں گھر میں ناشتہ بنا رہی تھیں۔ سعدی کے کمرے کا دروازہ بند تھا۔ "عالبا" وہ تیار ہو رہا تھا۔ راہداری میں آگے جاؤ تو حنین اپنے کمرے کے بیڈ پہ ٹیک لگائے بیٹھی نظر آرہی تھی۔ ہاتھ میں سفید جلد والی کتاب تھی جو کل رات زمر کے سامان میں دیکھ کر وہ اس سے پوچھ کر لے آئی تھی۔ زمر نے نہ وہ پڑھی تھی نہ پڑھنی تھی۔ اب اس کے صفحوں کے کنارے ناخن سے رگڑتی وہ سوچے جا رہی تھی۔

"شکر ہے کل نکاح پہ ہاشم بھائی نہیں تھے ان کو دیکھتے ہی امتحانی مرکز والا واقعہ یاد آجاتا اور بھائی کے سامنے اپنا آپ مجرم لگنے لگتا۔" وہ مدھم آواز میں بڑبڑائی تھی۔ پھر ابرو سکیڑ کر بھینچے۔ "مگر بھائی کو بتاؤں یا نہیں؟" پوچھتے ہوئے اس نے سر جھٹکا۔ پھر نگاہیں کتاب تک گئیں تو تمام خیالوں کو ذہن سے ہٹاتے

اسے کھول لیا۔

دروازہ سامنے تھا جو اسے صدیوں پہلے کے زرد زمانوں میں لے جایا کرتا تھا۔

اس نے اسے دھکیلا۔ اونچے پٹ وا ہو گئے۔ دوسری جانب چاند کی ٹھنڈی میٹھی روشنی میں ڈوبی رات تھی۔ ایک کھلا میدان اور سامنے۔

حنین نے گردن اٹھا کر دیکھا۔ ایک بلند مضبوط قلعہ جس کے آگے پہرے دار چکر کاٹ رہے تھے۔

اس سارے سیاہ سفید منظر نامے میں وہ ماتھے پہ کٹے بالوں اور پونی ٹیل والی لڑکی گلابی قمیص اور سفید ٹراؤزر میں ملبوس 'فریش سی نظر آتی تھی۔ مگر صدیوں پہلے کے لوگ اس کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ وہ آہنی گیٹ عبور کر کے کھلے صحن میں آ گئی۔ اسے پار کیا تو آگے برآمدہ تھا۔ وہ اندر چلتی گئی۔ اندھیرا بڑھ گیا۔ مگر جیسے جیسے وہ قدم آگے بڑھاتی گئی' راہداری کی دیوار پہ قطار میں نصب مشعل دان جلتے گئے۔ جیسے کوئی قدیم زمانوں کا جادو۔

اندھیرا قدرے کم ہوا تو وہ ایک کوٹھڑی کے سامنے جا رکی۔ اس کے دروازے پہ زنجیروں میں لپٹے تالے مشعل دان کے پھڑپھڑاتے زرد شعلوں میں دکھائی دیتے تھے۔ دیوار پہ ایک ابھری ہوئی چوکی تھی۔ حنین دیوار کو پکڑے' اس چوکی پہ کھڑی ہوئی تو چہرہ ایک سلاخ دار کھڑکی کے برابر آیا۔ بے چین نگاہوں سے' سلاخیں پکڑے اس نے اندر جھانکا اور پھر گہری سانس بھری۔

اس کے شیخ (استاد) سفید' خستہ حال لباس میں الجھے بال اور داڑھی کے ساتھ چہرے اور ہاتھوں پہ زخموں کے نشان لیے' دیوار سے لگے کھڑے تھے۔ کھڑکی سے چند ہاتھ دائیں طرف۔

"اے شیخ! میں اتنے برسوں بعد آئی ہوں' اور آپ کو اس قید خانے میں بند دیکھتی ہوں۔ ایسا کیا کر دیا آپ نے؟ آپ کا خلیفہ تو مسلمان ہے نا؟" افسوس سے سہلاتے اس نے سوال کیا۔

اندر دیوار سے لگے کھڑے شیخ معلم نے تھکان مگر سکون سے چہرہ موڑ کر اسے دیکھا۔

"شد الرحیل إلى قبر الخليل" (سواری کا باندھنا محبوب کی قبر تک جانے کے لیے)

"انہوں نے یہ کہا تو آپ نے کیا؟" اس نے تعجب سے پوچھا۔

"بدعت' بدعت!"

"اُف!" حنین نے گہرے تاسف سے انہیں دیکھا۔ "ہم سب کو معلوم ہے کہ ٹھیک ہے' بالکل ٹھیک ہے۔ مگر شد الرحیل إلى قبر الخليل کا انکار آپ کو زنداں میں لے آیا' اے شیخ۔" ملامتی نظروں سے وہ انہیں دیکھ رہی تھی۔ "مطلب کیا ضرورت تھی اتنا کھلم کھلا اسٹینڈ لینے کی۔ اور ہاں' فائدہ کیا ہوا اس اسٹینڈ کا؟ اب تو قبر کی نیت اور مسجد کی نیت کا آسان جتنا فرق کسی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ مجھے بھی بھائی نے ایک زمانے میں بتایا تھا' اب تو بھول بھال گئی۔"

شیخ خاموشی سے کھڑے اپنے ہاتھوں کو دیکھے گئے۔ وہ سیاہ ہو رہے تھے۔ حنین نے چہرہ مزید آگے کر کے اندر جھانکا۔

"آپ کی کتابیں' قلم۔ کیا سب چھین لیے انہوں نے؟ اُف۔" کراہ کر اس نے آنکھیں میچیں۔ "ٹھیک ہے' بندہ حق بات کہتا ہے ظالم حکمران کے سامنے مگر اب اتنا بھی کیا کہ اس بات کے پیچھے ساری زندگی برباد کروا لو اپنی۔ کتاب تو آپ کی ادھوری رہ گئی۔ اب لکھیں گے کیسے؟" آنکھیں کھول کر مزید بے بسی سے ان کو دیکھا۔ وہ اپنے سیاہ ہاتھوں کو دیکھ رہے تھے۔ حنین ایک دم چونکی۔ فرش پہ چند کوئلے رکھے تھے اور اس کی نظریں اوپر اٹھتی چلی گئیں۔ دیواروں پہ جا بجا کوئلے سے عبارتیں لکھی تھیں۔ آیات' احادیث' قرآن کی نشانیوں میں غور و فکر کرنے کے بعد کے نکات۔ دیواریں بھری پڑی تھیں۔

"جب تک اللہ نہ چھینے' کوئی نہیں چھین سکتا۔" اس کو بالکل ساکت' متعجب پا کر وہ بولے تھے۔ حنین چپ سی ہو گئی۔ تنے اعصاب قدرے ڈھیلے پڑے۔ چہرے پہ نرمی آ گئی۔

"اور جب زندگی سب کچھ چھیننے پہ آ جائے تو کیا کرنا

چاہیے؟" شاید پہلی دفعہ اس نے کوئی سوال پوچھا تھا۔

"دعا۔" وہ دھیما سا بولے۔

"دعا کیا کرتی ہے؟" سلاخوں سے سر لگا کر وہ ان کو دیکھتے کہیں اور گم تھی۔

"آنے والی مصیبت کو روکتی ہے اور جو مصیبت اُتر چکی' اس کو ہلکا کرتی ہے۔ یہ مومن کا ہتھیار ہے' دین کا ستون ہے' آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔"

ان کی آواز قید خانے کی اونچی دیواروں سے ٹکرا کر ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔

حنین گم صم کھڑی رہی۔ ہاتھ سلاخوں پہ جمے رہے۔ پھر ماتھے پہ بل آئے' اکیسویں صدی کے دماغ نے بحث کے لیے نکتے ڈھونڈے۔

"آپ کی مصیبتیں ٹلتی ہوں گی دعاؤں سے۔ ہماری تو نہیں دور ہوتیں۔"

"دعا مصیبت سے کمزور ہے تو مصیبت حاوی ہو جائے گی۔ دعا مضبوط ہے تو دعا حاوی ہو گی۔"

"اور اگر دونوں ہی ایک جتنی مضبوط ہوں تب؟" وہ تُرنت بولی۔

"تو دعا قیامت تک اس مصیبت سے لڑتی رہے گی۔"

"یعنی۔" وہ چونکی۔ "اگر دعا چھوڑ دی' یا شدت کم کر دی تو مصیبت حاوی آجائے گی؟"

شیخ معظم نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حنین کے لب گول ہو کر سکڑے۔ ابرو اکٹھے کر کے سوچنے والے انداز میں وہ ان کو دیکھے گئی۔

"اور کیا کرتی ہے دعا؟"

"دعا قضا و قدر کو رد کر سکتی ہے' ویسے ہی جیسے نیکی عمر بڑھاتی ہے اور گناہ رزق سے محروم کرتے ہیں۔"

"مگر۔" اس کی آنکھوں میں پھر آرام دہ سی الجھن اُبھری۔ ایڑیاں اٹھا کر وہ مزید لونچی ہوئی۔ "میری تو دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔"

قدیم قید خانے کی کوٹھے سے بچی دیوار سے ٹیک لگائے بزرگ نے سر جھکائے مسکرا کر نفی میں گردن ہلائی۔

"ہر شخص کی دعا قبول ہوتی ہے' اگر وہ جلد بازی نہ کرے تو۔"

"جلد بازی مطلب؟"

"مطلب یہ ہے کہ تم کہنے لگو کہ میں نے دعا کی اور بہت دعا کی' مگر میری دعا قبول ہوتی نہیں نظر آ رہی۔ یہ کہنے کے بعد تم لوگ مایوس ہو کر دعا کرنا چھوڑ دیتے ہو۔"

وہ ایک ہاتھ کے ناخن دانتوں سے کترتی' سنتی جا رہی تھی۔ آخر میں بے اختیار انگلیاں لبوں سے نکالیں۔ "یعنی کہ جب یہ کہا تو دعا قبول نہیں ہو گی' لیکن اگر یہ نہ کہوں تب ہو جائے گی؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پیچھے ہوا کے جھونکے سے مشعل دان کا شعلہ پھڑپھڑایا۔ رات کی پُراسراریت میں اضافہ ہوا۔

"اچھا مگر۔" اس کو پھر سے بے چینی ہوئی۔ "کچھ لوگوں کی دعا بہت جلدی قبول ہو جاتی ہے۔ کیا اس لیے کہ وہ بہت نیک ہوتے ہیں؟"

"یہ بھی ہوتا ہے' مگر۔" وہ لحظہ بھر کو رکے۔ حنہ نے ان کی آواز سننے کو کان سلاخوں کے مزید قریب کیا۔ "مگر قبولیت دعا کا اصل راز دعا مانگنے والے کا طریقہ ہوتا ہے۔ وہ کیسے مانگتا ہے' اور کتنی شدت سے مانگتا ہے۔"

"اور اس کے بعد دعائیں قبول ہو جاتی ہیں؟"

"ہاں' سب کی سب دعائیں قبول ہو جاتی ہیں۔"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ حنین نے گہری سانس کھینچ کر پیشانی سلاخوں پہ ٹکا دی۔ آنکھیں موند لیں۔

"میں دعا مانگتی ہوں کہ بھائی مجھے' وہ اخلاقی مرکز والا قصہ سننے کے بعد' معاف کر دے' اور مجھ سے ناراض نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ سب کچھ ایک دم سے بالکل ٹھیک ہو جائے؟" اس نے کتاب سے سر اٹھایا تو صفحے کھلے پڑے تھے۔ قدیم زمانوں کی مشعلیں وقت کے بانیوں نے بجھا دی تھیں اور وہ اپنے کمرے میں بیڈ پہ بیٹھی تھی۔ کتاب بند کر کے اس نے دوپٹہ چہرے کے گرد لپیٹا اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا لیے۔

باہر راہداری میں سعدی کے کمرے کا دروازہ کھلا۔ وہ باہر نکلا تو سیاہ سوٹ میں ملبوس تھا۔ گرے شرٹ پہ سفید سیاہ ترچھی دھاریوں کی ٹائی بندھی تھی۔ بال اس نے فجر کے بعد جا کر کٹوا لیے تھے۔ اب سامنے سے جیل لگا کر پیچھے کیے تو سیدھے لگتے۔ اگر مڑتا تو پیچھے سے گھنگریالے نظر آتے۔

ندرت چائے لے راہداری میں آئیں تو وہ گول میز کے سرے پہ کرسی کھینچ رہا تھا۔

"آفس کے لیے دیر نہیں ہو رہی تمہیں؟" حیرت سے پوچھتے انہوں نے مگ اسے تھمایا۔

"نہیں، آفس نہیں جا رہا۔ کسی اور کام سے جا رہا ہوں۔" وہ بنا عجلت کے آرام سے چائے کے گھونٹ بھرنے لگا۔ ندرت نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے سوٹ کو دیکھا۔

"یہ اپنا سب سے اچھا سوٹ تو تم آفس بھی نہیں پہن کر جاتے۔ آج کیا خاص ہے؟"

سعدی نے کپ ہٹا کر سنجیدگی سے انہیں دیکھا۔

"میں نابھاگ کر شادی کرنے جا رہا ہوں۔"

انہوں نے دھپ سے اس کے کندھے پہ تھپڑ لگایا، اور مصنوعی خفگی سے بڑبڑاتی پلٹ گئیں۔

وہ ناشتہ کر کے اٹھا اور ابھی راہداری کے سرے تک آیا ہی تھا کہ حنین کمرے سے باہر نکلی، وہ چہرے کے گرد دوپٹہ لپیٹے مضطرب اور بے چین لگ رہی تھی۔

"تمہاری فجر کی اذان اس وقت ہوتی ہے؟"

"نہیں وہ۔" اس نے غور نہیں کیا۔ "کیا ہم تھوڑی دیر بات کر سکتے ہیں؟"

سعدی نے غور سے اسے دیکھا جو انگوٹھے سے درمیانی انگلی کا ناخن کھرچتے ہوئے بول رہی تھی۔

"تم کافی دن سے کہہ رہی ہو کہ تمہیں بات کرنی ہے پھر رک جاتی ہو۔"

حنین کا گلا خشک ہونے لگا۔ کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر بند کر لیے۔

"نہیں، آپ جائیں، اتنی خاص بات نہیں ہے۔ پھر کبھی سہی۔" ارادہ بدل دیا۔

"شیور؟" سعدی نے بغور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ حنین نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

وہ مسکرا دیا اور خدا حافظ کہتا پلٹ گیا۔ دروازہ بند ہوا تو وہ وہیں بے چین سی کھڑی سوچتی رہ گئی۔

☼ ☼ ☼

جہنم کہ جنت، جو بھی ہو گا، فیصلہ ہو گا
یہ کیا کم ہے کہ ہمارا اور اس کا سامنا ہو گا!

وہ عمارت سڑک کنارے پوری آب و تاب سے کھڑی تھی۔ بالائی منزل کے کارز آفس میں خنکی پھیلی تھی۔ چوڑی میز کے پیچھے چاور سیٹ پہ ہاشم ٹیک لگائے بیٹھا مسکراتے ہوئے کاغذات پلٹتا جا رہا تھا۔ پھر سر اٹھا کر سامنے کھڑے خاور کو دیکھا۔

"یہ بہت زبردست کام ہے خاور!" ستائش سے فولڈر میز پہ ڈالتے اس نے پیچھے کو ٹیک لگائی۔ کھڑکی کے پاس سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی جواہرات نے ناپسندیدگی سے اسے دیکھا۔

"اس کے خلاف ذرا سا کچھ ملا ہے کیا؟ وہ معلوم نہیں ہمارے خلاف کتنی فائلز اور ثبوت لے کر آئے گا۔"

"میم! یقیناً" اس نے بھی اب تک بہت کچھ نکال لیا ہو گا مگر ہم اس کے ہر وار کا توڑ کرنا جانتے ہیں۔"

وہ ناک چڑھا کر واپس کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ سیاہ لمبے گاؤن اور موتیوں کے آویزوں میں ملبوس، بھورے بال کندھے پہ آگے ڈالے، وہ ناخوش اور مضطرب لگ رہی تھی۔

"آپ کیوں فکر کرتی ہیں ممی؟ ہاشم سنبھال لے گا۔" وہ مطمئن اور پرسکون تھا۔

اور ہاشم کی میز کے عین سامنے، دیوار سے لگے صوفوں میں سے ایک پہ براجمان نوشیرواں بالکل خاموش تھا۔ اس کی آنکھیں ہلکی گلابی ہو رہی تھیں، اور وہ مسلسل کچھ سوچے جا رہا تھا۔

اس عمارت کی بیسمنٹ میں عین اسی وقت سعدی اپنی کار پارک کر رہا تھا۔ بیسمنٹ دوپہر کے

باوجود اندھیری پڑی تھی۔ کار روک کر وہ کچھ دیر خاموشی سے اسٹیئرنگ وہیل پہ ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ اسے وہ فلیش ڈرائیو یاد آئی جس میں موجود فائلز وہ کھول نہیں سکا تھا۔ اس کے پاس ہاشم کے خلاف کچھ نہ تھا سوائے ایک آخری پتے کے۔ اگر یہ وہ ٹھیک سے کھیل گیا تو۔ تو سب ٹھیک ہو سکتا تھا۔

چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پھر اس نے ڈیش بورڈ کھولا اور اپنا قرآن پین نکالا۔ چند بٹن دبائے اور وہیں سے تلاوت لگائی جس سے اس روز چھوڑی تھی۔

سعد الغامدی کی پُرسوز آواز گاڑی کے اندر گونجنے لگی۔ "میں اللہ کی پناہ چاہتا ہوں دھتکارے ہوئے شیطان سے!" وہ خاموشی سے سننے لگا۔

"اور آپ سکھائے جاتے ہیں قرآن بڑے حکمت والے بہت علم والے کی جانب سے۔"

سعدی کے لبوں پہ اداس مسکراہٹ پھیل گئی۔

"میں ابھی یہی سوچ رہا تھا اللہ تعالیٰ کہ میں قرآن میں کیا تلاش کر رہا ہوں اس وقت جب کہ مجھے اوپر ہاشم بھائی کے آفس میں ہونا چاہیے؟ اور دیکھیں، مجھے جواب مل گیا۔ جب میں قرآن پہ غور کرتا ہوں تو گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ یہ قرآن مجھے اللہ کی طرف سے دیا جا رہا ہے۔ اللہ جو نور ہے اور ساری روشنی اللہ آپ سے ہی ملتی ہے۔ مجھے اب سمجھ میں آیا کہ جو انرجی چاہیے جو کسی بھی موسیٰ کو فرعون کے دربار میں جانے کے لیے چاہیے ہوتی ہے، وہ مجھے صرف قرآن دے سکتا ہے۔"

ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ وہ زیرِ لب کہہ رہا تھا۔ قاری غامدی اگلی آیت اسی مدھم، خوب صورت آواز میں پڑھ رہے تھے۔ "جب موسیٰ نے اپنے گھر والوں سے کہا کہ۔"

وہ ایک دم چونکا اِدھر اُدھر دیکھا۔ (اوکے اللہ، سیلی مجھے بھول گیا تھا کہ آگے موسیٰ علیہ السلام کا ذکر ہے۔ ویسے اللہ تعالیٰ، آپ کو بھی موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرنا کتنا پسند ہے۔ ہر چند آیتوں کے بعد پھر سے فرعون و موسیٰ اور موسیٰ و فرعون۔ مطلب کبھی کبھی میں حیران ہو جاتا ہوں۔ قرآن میں اتنا ذکر کسی کا نہیں جتنا موسیٰ کا! کیوں؟) اس نے بولا نہیں۔ صرف سوچا تھا۔ آیت سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

"اور جب موسیٰ نے کہا اپنے گھر والوں سے کہ میں نے دیکھی ہے ایک آگ۔ میں ابھی وہاں سے آپ کے لیے کوئی خبر لاتا ہوں

یا لے کر آتا ہوں کوئی سلگتا ہوا انگارہ،

تاکہ آپ اسے سینکیں۔"

ذرا دیر کو وقفہ آیا تو سعدی نے گہرا سانس لیا۔

"آہ موسیٰ علیہ السلام۔" اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں بند کر لیں۔ ہلکی آواز میں ساتھ ساتھ بڑبڑاتا رہا۔ "تو اللہ تعالیٰ، آپ نے سورۃ نمل کی تمہیدی آیات کے بعد، پہلے قصے کا آغاز ہی موسیٰ علیہ السلام کی "فیملی" سے کیا۔ مجھے اسی لیے یہ سورۃ بہت اچھی لگتی ہے، کیونکہ یہ فیملی ویلیوز کی سورۃ ہے۔ دیکھیں نا، موسیٰ علیہ السلام نے جو بات کہی، اس میں "آپ" کا صیغہ استعمال کیا۔ حالانکہ اس وقت ان کے ساتھ صرف ان کی اہلیہ تھیں، بے شک وہ امید سے تھیں، مگر سامنے تو صرف وہی تھیں نا، ان کے۔ پھر بھی موسیٰ علیہ السلام نے ان کو آپ کہہ کر پکارا۔ جمع تعظیم کا صیغہ۔ ہمارے انبیاء جو ہمارے رہنما تھے، کتنے مہذب تھے ان میں، کتنے نرم، اور خوب صورت لوگ تھے وہ۔ کوئی حیرت نہیں مجھے کہ آپ اللہ تعالیٰ قرآن میں ہر چند صفحات بعد موسیٰ علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں۔ کتنی پرواہ، کتنا خیال تھا ان کے انداز میں اپنے خاندان کے لیے۔ پھر ہم اپنے گھر والوں کے لیے اتنے نرم کیوں نہیں بن سکتے؟"

گاڑی میں خاموشی چھا گئی۔ پھر وہی پُرسوز آواز ابھرنے لگی۔

"پھر جب موسیٰ وہاں (اس آگ کے قریب) آئے

تو ان کو آواز آئی کہ

بابرکت ہے وہ جو آگ میں ہے

اور جو اس کے آس پاس ہے
اور پاک ہے اللہ
جو دونوں جہانوں کا رب ہے۔"

سعدی نے پوز کے بٹن کو دبا کر، بند آنکھوں کے ساتھ چند لمحے لیے ان الفاظ کو اندر جذب کرنے کے لیے۔

"اللہ مجھے نہیں پتا کہ آپ کی آواز سننا کیسا ہوگا' مگر مجھے اتنا پتا ہے کہ جب میں قرآن سنتا ہوں' تو میرے لیے وہی آپ کی آواز ہوتی ہے' اور یہ الفاظ بعض دفعہ میری استطاعت سے زیادہ وزنی بن کر میرے دل پہ اترتے ہیں۔ میرے لیے یہ قرآن اور اس سے جڑی ہر شے بابرکت ہے کیونکہ یہ قرآن مجھے بتاتا ہے کہ اللہ کون ہے۔" وہ ٹھہرا۔ بند آنکھوں سے ٹکان بھرے الفاظ ادا کرتے آواز ہلکی ہو گئی۔

"اللہ میرا رب ہے' اور میرے ابو نے مجھے بتایا تھا کہ رب کسے کہتے ہیں۔ وہ جس نے ہمیں بنایا ہے' وہ جس کا ہمارے اوپر سب سے زیادہ حق ہے' اور وہ جو ہمارے لیے سارے فیصلے کرتا ہے' خالق' مالک' مدبر!"

انگوٹھے کو اسی بٹن پہ رکھ کر دبایا تو آیات کا سلسلہ جڑا۔

"اے موسیٰ'
بے شک وہ میں ہوں اللہ۔
غالب' حکمت والا۔
اور پھینک دو اپنی لاٹھی کو۔
تو جب اس (موسیٰ) نے دیکھا کہ وہ (لاٹھی) حرکت کرتی ہے
گویا کہ ہو کوئی سانپ
تو پیٹھ پھیر کر بھاگا
اور پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔
(تو فرمایا اللہ نے) اے موسیٰ' ڈرو نہیں۔
بے شک میرے پاس پیغمبر ڈرا نہیں کرتے۔"

سعدی آنکھیں بند کیے' سیٹ سے سر ٹکائے بیٹھا رہا۔ لبوں کی مسکراہٹ میں اداسیاں گھلتی گئیں۔

"پیغمبر کون ہوتا ہے اللہ؟ وہ جو اچھائی کا حکم دے اور برائی سے روکے۔ آپ سارے پیامبروں کے ساتھ ایسے ہی کرتے ہیں نا۔ ان کو اندھیرے میں روشنی کی جھلک دکھاتے ہیں' اور جب اس نور کا پیچھا کرتے وہ اس تک آ پہنچتے ہیں' تو آپ ان کو بتاتے ہیں اللہ کون ہے۔ پھر آپ ان کو کہتے ہیں کہ اپنا عصا سامنے ڈال دو۔ یہاں تو آپ نے عصا کا لفظ استعمال کیا مگر اپنے اسی قرآن میں ایک اور جگہ آپ نے موسیٰ سے یہ فرمایا کہ ڈال دو وہ جو تمہارے دائیں ہاتھ میں ہے۔ تو بات یہ ہے اللہ' کہ سب کے دائیں ہاتھ میں عصا نہیں ہوتا۔ دائیں ہاتھ میں انسان کا ٹیلنٹ ہوتا ہے' کوئی ہنر یا کوئی قیمتی چیز۔ تو اللہ جب آپ کا پیامبر اپنا عصا پھینک دیتا ہے تو اس کا نتیجہ ایک دم سے اتنا خوفناک' اتنا ڈراونا اور پرہیبت ہوتا ہے کہ انسان مڑ کر بھاگے نہ تو کیا کرے؟ فرعون کے ساحر جو بھی گھڑ لائیں' میرے دائیں ہاتھ کی چیز اس کو نگل لے گی' میں جانتا ہوں' اور یہ بھی جانتا ہوں کہ اللہ کے پاس اس کے پیامبر ڈرا نہیں کرتے' نہ اپنے ماضی سے نہ اپنے مستقبل سے' مگر مجھے فرعونوں کے پاس "ڈرنے" سے ڈر لگتا ہے۔" اس کا دل بوجھل ہو گیا تھا گویا پھر سے ہلکا ہونے کے لیے۔ بٹن قرآن آف کر کے ڈیش بورڈ میں رکھا۔ گاڑی بند کی۔ چابی' موبائل' والٹ سنبھالتا باہر نکل آیا۔

مطلوبہ فلور پہ جب لفٹ کے دروازے وا ہوئے تو سامنے واک تھرو گیٹ تھا۔ وہ اس سے گزرنے کے بجائے ایک طرف سے نکل کر آگے چلا آیا۔ کسی نے نہیں روکا۔ جب ہاشم کے آفس کے سامنے آیا تو کلم کرتی حلیمہ کے اس طرف سیاہ کوٹ میں ملبوس خاور مستعد کھڑا تھا۔

"کاردار صاحب آپ کے منتظر ہیں۔" سعدی اس بات پہ آگے بڑھنے لگا تو خاور نے ہاتھ راہ میں حائل کر کے اسے روکا۔ سعدی نے گہری سانس لی۔

"میرے پاس کوئی اسلحہ نہیں ہے۔ چاہیں تو تلاشی لے لیں۔" مسکرا کر وہ بولا۔ خاور نے سپاٹ چہرے کے ساتھ اس کے لباس کو تھپتھپایا۔ سیل فون نکال کر

حلیمہ کی میز کی ٹوکری میں ڈالا۔ اور پھر مطمئن ہو کر پیچھے ہٹا۔ سعدی نے کوٹ کا بٹن بند کیا۔ اوپری جیب میں لگا سلور پین درست کیا اور آگے بڑھ گیا۔

☼ ☼ ☼

"میں چاہتا تھا کہ کاسہ خرید لے میرا! میں اس کے تاج کی قیمت لگا کے لوٹ آیا"

اندر آفس میں ایک طرف صوفے پہ نوشیرواں بیٹھا تھا۔ اسے دیکھتے ہی ماتھے پہ بل پڑ گئے۔ سامنے مرکزی میز کے پیچھے ہاشم ٹیک لگائے براجمان تھا۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔ جواہرات جواب ہاشم کی کرسی کی پشت پہ کہنی ٹکائے کھڑی تھی' وہ بھی مسکرا رہی تھی۔

"آؤ سعدی!" ہاشم نرمی سے کہتے جگہ سے اٹھا اور ہاتھ بڑھایا۔ سعدی آگے آیا' ہاتھ ملالیا اور پھر سامنے کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ وہ سنجیدہ نظر آرہا تھا۔

"کیا لو گے؟ چائے؟ سافٹ ڈرنک؟" انٹر کام اٹھاتے ہوئے اس نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

"کافی!" وہ بس اتنا بولا۔ ہاشم نے اثبات میں سرہلایا' اور ریسیور کان سے لگا کر کہا۔ "حلیمہ' دو چائے اندر بھیجو۔" پھر ریسیور رکھ کر ہلکے پھلکے انداز میں اسے ٹوکا۔ "اتنی گرمی میں کافی نہیں پینی چاہیے تمہیں۔"

سعدی گہری سانس بھر کر رہ گیا۔ (اسے ہاشم سے اور کس بات کی توقع تھی؟) اور پھر جیب سے پلاسٹک زپ لاک بیگ میں مقید نیکلس نکال کر میز پہ رکھا۔

"آپ کی امانت' جو غلطی سے آپ کی ملازمہ نے میری جیب میں ڈال دی تھی۔"

نیکلس میز پہ پڑا رہا۔ کسی نے آنکھ اٹھا کر بھی اسے نہ دیکھا۔ وہ سعدی کو دیکھ رہے تھے۔

"تم کیا کہنا چاہتے تھے سعدی؟" ہاشم نے اسی مسکراہٹ سے اسے دیکھتے بات کا آغاز کیا۔ سعدی نے گردن موڑ کر پیچھے ہاتھ باندھے کھڑے خاور کو دیکھا اور پھر ہاشم کے ساتھ کھڑی جواہرات کو۔

"خاور ہمارا اپنا بندہ ہے' اس کی موجودگی میں بات کرو۔" وہ مسکرا کر بولی۔

"آئی سی!" سعدی نے سر اثبات میں ہلایا البتہ اندر سے کچھ ٹوٹا تھا۔ (تو کیا جواہرات بھی۔؟) بہت کچھ سمجھ میں آیا۔ پھر ذرا سا کھنکارا اور ہاشم کی آنکھوں پہ آنکھ ڈال کر بولا۔

"ہم جس دین کے ماننے والے ہیں ہاشم بھائی! اس میں مختلف مسئلوں کے لیے مختلف اسکولز آف تھاٹ ہوتے ہیں۔ قتل کے مسئلے پر بھی دو آرا ہیں۔ (ہاشم اسی طرح مسکرا کر اسے دیکھتا رہا) پہلے مسلک کا کہنا ہے کہ سچے دل سے توبہ کی جائے' یا دیت دی جائے تو قتل معاف ہو جایا کرتا ہے' وہ حدیث میں مروی اس واقعے کو دلیل بناتے ہیں جس میں بنی اسرائیل کے ایک عالم کے پاس ایک ایسا شخص آیا جس نے ننانوے قتل کیے تھے۔ اس نے قتل کی معافی کا پوچھا اور منفی جواب ملنے پہ اس عالم کو بھی قتل کر دیا۔ ایک اور عالم کے پاس گیا تو معافی کی امید مل گئی۔ بہرحال واقعہ آپ کو معلوم ہو گا۔" وہ سانس لینے کو رکا۔

جواہرات اور ہاشم کی مسکراہٹوں میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ پیچھے بیٹھا نوشیرواں جو یہاں سے سعدی کی پشت دیکھ سکتا تھا' بے حد کڑوا سا منہ بنائے بیٹھا تھا۔ حلیمہ اندر آئی اور چائے رکھ کر باہر چلی گئی تو وہ پھر سے کہنے لگا۔

"دوسرا مسلک کہتا ہے کہ نہیں' قتل کی کوئی معافی نہیں۔ اگر آپ کو قتل کی سزا یعنی سزائے موت دنیا میں نہیں دی گئی تو پھر دیت یا توبہ سے امید تو کی جا سکتی ہے کہ یہ آپ کو معاف کروا دیں گی مگر اصل فیصلہ قیامت کے دن ہو گا جب اللہ' مقتول کے ہاتھ میں قاتل کا سر دے کر کہے گا کہ اپنا بدلہ لے۔ یہ دوسرا مسلک کہتا ہے کہ قرآن میں جب اللہ کسی گناہ کا ذکر کرتا ہے' اور اس کے عذاب کا' تو آخر میں یہ فرماتا ہے کہ وہ لوگ عذاب میں رہیں گے' سوائے ان کے جنہوں نے توبہ کی اور اچھے عمل کیے وغیرہ وغیرہ۔ مگر قتل کی آیات کے آخر میں' سخت عذاب کی وعید سنانے کے بعد اللہ نے نہیں کہا' سوائے اس کے اور اس کے نہیں۔ اللہ نے قاتلوں کے لیے وہ ہمیشہ

عذاب میں رہیں گے، کمہ کربات ختم کردی۔ اب بہت سے مسلمان ایک عقیدہ رکھتے ہیں اور بہت سے دوسرا۔ میں بھی ایک دوسرے مسلک سے تعلق رکھتا ہوں جو کہتا ہے کہ قتل کی کوئی معافی نہیں۔ جان لی ہے تو جان دینی پڑے گی۔ کیونکہ ہر انسان اپنے بھائی کی جان کا رکھوالا ہوتا ہے۔ ایک قتل اس سے جڑے تمام انسانوں کا قتل ہوتا ہے۔ ایک قتل۔ صرف ایک بے گناہ مسلمان کا قتل ہاشم بھائی کعبہ کو ڈھا دینے سے بڑا گناہ ہے۔ اور آپ نے تو میرے خاندان کے دو لوگ مار دیے۔" اس کی آواز بلند ہوئی اور قدرے کپکپائی۔ آنکھوں میں دکھ اور صدمہ اترنے لگا۔

اتنے سال بعد پہلی دفعہ ہاشم کے منہ سے وہ بول دیا جو ابھی تک دل میں چھپا کر رکھا تھا۔ چند لمحے آفس میں خاموشی چھائی رہی۔ اے سی کی ٹھنڈک جہنم کی تپش میں بدلنے لگی۔ پھر ہاشم نے اسی نرمی سے اسے دیکھتے پوچھا۔

"اور کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ یہ سب میں نے کیا ہے؟"

"صرف میرے دل کی گواہی۔ اور کچھ نہیں۔"

ہاشم اور خاور نے چونک کر اسے دیکھا۔ (اب وہ کھڑکی کے ساتھ جا کھڑا ہوا تھا جہاں سے وہ سعدی کو سامنے سے دیکھ سکتا تھا)۔ جواہرات ہاشم کرسی پہ ٹکائی کہنی ہٹا کر سیدھی کھڑی ہوئی۔ آنکھوں میں اچنبھا آیا۔

"تمہارے پاس کوئی ثبوت نہیں؟" ہاشم کو حیرت ہوئی۔

"نہیں۔ میں نے آپ کی فائلز چرائی تھیں اس رات پارٹی میں۔ مگر میں انہیں کھول نہیں پایا۔ وہ کرپٹ ہو گئیں۔ وہ میری قابلیت سے اوپر کی چیز تھی۔"

(خاور کی گردن قدرے فخر سے مزید تنی) "میں نے ڈیڑھ سال کوشش کی کہ کوئی ثبوت ڈھونڈ لوں، مگر مجھے اعتراف کرنا پڑ رہا ہے کہ آپ لوگوں نے بہت پکا کام کیا ہے۔" قدرے تکان اور ستائش سے اس نے خاور کو دیکھا۔

"ڈیڑھ سال؟" ہاشم نے سوالیہ ابرو اٹھائی۔

"آپ نے زرتاشہ اور وارث غازی کو قتل کروایا، میں ڈیڑھ سال سے جانتا ہوں۔ آپ کے بھائی کی مہربانی سے۔" عقب میں بیٹھے شیرو کی طرف اشارہ کیا۔ "میں نے ایک رات آپ کے گھر گزاری۔ آپ کا سیف جو آپ کی تاریخ پیدائش سے کھلتا ہے، اس میں وارث ماموں کی بچیوں کی تصویر تھی۔ میں نے اسے ایک نظر دیکھا اور میں جان گیا کہ یہ سب آپ نے کروایا ہے۔"

شیرو کا چہرہ یوں ہو گیا گویا کسی ٹرک نے کچل دیا ہو۔ ہاشم کی مسکراہٹ جاتی رہی۔ اس نے بس ایک سخت ملامتی نظر نوشیرواں پہ ڈالی اور پھر سعدی کی جانب متوجہ ہوا۔

"اور اپنی اس تھیوری کے بارے میں تم نے اور کس کس کو بتایا ہے؟"

"کسی کو بھی نہیں، کیونکہ آپ تو ایک وائٹ کالر کرمنل ہیں، کوئی کیسے یقین کرے گا کہ آپ یہ سب کرا سکتے ہیں۔"

ہاشم ٹیک چھوڑ کر آگے کو ہو بیٹھا۔ سوچتے، الجھتے انداز میں اسے دیکھا۔ "اور تمہارے پاس یہ ثابت کرنے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے؟"

"نہیں، مگر مجھے کسی ثبوت کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں یہاں آپ کو پولیس کے حوالے کرنے نہیں آیا۔ میں آپ کو اپنے خاندان کے حوالے کرنے آیا ہوں۔"

"مطلب؟" جواہرات نے اچنبھے سے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔

"میں یہاں آپ سے یہ کہنے آیا ہوں ہاشم بھائی کہ آپ سچائی کا خود اعتراف کر لیں۔ میرے خاندان کے سامنے جا کر اعتراف جرم کر لیں۔ یوں فارس ماموں بری ہو جائیں گے، ہر الزام سے۔ آپ سارہ خالہ سے معافی مانگیں۔ اور ان کے باپ کی دیت کی رقم ان کی بچیوں کو ادا کر دیں۔ ہم آپ کے خلاف پولیس میں

نہیں جائیں گے۔ ہم آپ کو معاف کردیں گے۔"

اور ہاشم کو پہلی دفعہ لگا' وہ سونیا کی پارٹی سے لے کر اب تک جو "سعدی' سعدی" ڈرامے سے پریشان ہوا' وہ سب بے کار تھا۔ یہ تو ایک بے وقوف گھامڑ اور معصوم سا بچہ تھا۔ بلکہ یہ تو پورے کا پورا گدھا تھا۔ اور یہ سوچ کر وہ زور سے ہنس دیا۔ جواہرات بھی قدرے سکون سے مسکرائی۔ ہنستے ہنستے ہاشم نے چائے کا کپ ہونٹوں سے لگایا' گھونٹ بھرا اور پھر اسے ہٹایا۔

"مجھے یہ کہنے دو سعدی! کہ آج تم نے مجھے واقعی مایوس کیا ہے۔ میں ایک سوٹ ایک ہی دفعہ پہنا کرتا ہوں' تم نے میرے اس سوٹ کا فرسٹ ویئر ضائع کردیا۔"

"جی؟" وہ الجھن بھرے انداز میں ہاشم کو دیکھنے لگا۔ "کیا آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ آپ نے یہ قتل نہیں کیے؟ اوہ۔ کم آن ہاشم بھائی' ہم دونوں جانتے ہیں کہ یہ آپ نے کیا ہے۔"

"میں نے انکار نہیں کیا۔" ہاشم نے تازہ دم مسکراتے ہوئے اثبات میں سرہلایا۔ "یہ میں نے کیا ہے' وارث میرے راستے میں آرہا تھا۔ میں نے اسے مروادیا۔ خاور نے اسے خودکشی کا رنگ دیا۔ مگر یہ کافی نہیں تھا۔ اس کا قتل کور اپ کرنے کے لیے ہمیں زرتاشہ کی قربانی بھی دینی پڑی۔ زمر کو بھی زخمی کرنا پڑا' جس کے لیے مجھے بہت افسوس ہے۔ ہاں ٹھیک ہے سعدی' یہ سب ہم نے ہی کیا ہے۔ ممی' خاور اور میں نے۔"

سعدی کی دکھ بھری نگاہیں ہاشم کی کرسی کے ساتھ کھڑی جواہرات تک گئیں۔ پھر وہاں سے کھڑکی کے آگے کھڑے خاور تک جا پھسلیں۔ تو یہ سب ساتھ تھے؟ شروع دن سے؟

"مگر تم سعدی' تم نے تو آج مجھے سخت مایوس کیا ہے۔ میرا خیال تھا' تم ثبوت کا کوئی انبار لے کر آؤ گے میرے پاس۔ مگر تم۔ تم تو وہی معصوم سے بچے ہو' جس سے میں سات سال پہلے ملا تھا۔ تم کس دنیا میں رہتے ہو؟" اب کے ہاشم کو افسوس ہونے لگا۔ آگے ہو کر' ہتھیلیاں باہم ملائے' وہ برہمی سے کہنے لگا۔ "تمہیں کیا لگا تھا' یہ تم قتل کی لمبی سی تقریر یاد کرکے میرے سامنے دہراؤ گے اور میں فوراً" جاکر تمہارے خاندان کے پیروں میں گرجاؤں گا اور ان کی منتیں کروں گا کہ وہ مجھے معاف کردیں؟ مطلب' تم نے یہ سوچا بھی کیسے؟" غصے اور افسوس سے زیادہ حیرت شدید تھی۔

"تو کیا آپ اب بھی معافی نہیں مانگیں گے؟ کیا آپ اتنے گلٹ کے ساتھ رہ لیں گے؟" سعدی نے تعجب سے اسے دیکھا۔

"تم اپنا دماغ کہاں چھوڑ کر آئے ہو سعدی؟ تمہیں واقعی لگا تھا کہ ہاشم تمہارے کہنے پہ یہ کرے گا؟ اف!" جواہرات کو اس کی ہر بات ناگوار گزر رہی تھی۔

"اور آپ سارہ خالہ کو دیت بھی ادا نہیں کریں گے؟"

"تو بات آخر میں پیسے پہ آگئی ہے؟" ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہاشم نے ٹیک لگائی۔ "نہیں ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں دوں گا' کیا کرلو گے تم؟"

"میں۔" وہ شدید دکھ کے عالم میں باری باری ان سب کے چہرے دیکھنے لگا۔ "میں زمر اور فارس ماموں کو بتادوں گا' مجھ پہ کریں گے سب یقین!" مگر خاور کچھ غیر آرام دہ سا سعدی کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے اس غصے میں کچھ بناوٹ لگتی تھی یا شاید اس کا وہم تھا۔

"کم از کم زمر تو تمہارا یقین نہیں کرے گی۔" جواہرات نے ناک سکوڑ کر کہا۔ "اس کے دل میں فارس کی نفرت اتنی پختہ ہے کہ وہ اپنی زندگی فارس سے انتقام کے لیے داؤ پر لگا چکی ہے' تو وہ کیسے مانے گی تمہاری بات؟"

"انہوں نے کسی انتقام کے لیے یہ شادی نہیں کی۔" وہ ایک دم کھڑا ہوا۔ کان سرخ ہوئے' آنکھوں میں غصہ اترا۔ "وہ فارس ماموں کو کبھی کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گی۔ جس مقصد کے لیے آپ ان کی شادی پہ اتنا زور دے رہی تھیں' وہ کبھی پورا نہیں ہوگا۔"

"تمہیں اپنے خاندان کے بارے میں اپنی

معلومات اپ ڈیٹ کرنے کی ضرورت ہے سعدی!"

"میں زمر کو ساری حقیقت بتادوں گا۔"

"تم ایسا نہیں کرو گے۔" ہاشم کا انداز ٹھنڈا تھا۔

"کیوں؟ کیا مجھے بھی ماردیں گے آپ؟" اس نے دکھ سے ہاشم کو دیکھا۔

"اونہوں۔" ہاشم نے گردن دائیں سے بائیں ہلائی۔ "میں بس یہ فائل دے دوں گا۔ اعلا پولیس حکام کو پراسیکیوشن آفس کو۔ میڈیا کو۔" ایک فائل اس کے سامنے ڈالی۔ سعدی نے مشکوک نظروں سے اس کو دیکھا۔

"یہ کیا ہے؟"

"تمہارا اعمال نامہ۔ جو مجھے ڈھونڈنے میں دو دن لگے۔ تمہارے خیال میں مزید چیزیں ڈھونڈنے میں پولیس کو کتنا وقت لگے گا؟"

"میں نے ایسا کچھ نہیں کیا جو میں ڈر جاؤں۔"

"کیا تم نے جج کو بلیک میل نہیں کیا؟ اس فائل میں تمہارے اور جسٹس سکندر کے درمیان تبادلہ کی گئی ای میلز اور ٹیکسٹ میسجز کا ریکارڈ ہے۔ جو ہمیں خود جسٹس صاحب نے مہیا کیا ہے۔ بے شک تمہارا نمبر پرائیویٹ ہے' اور ای میل ان جانا' لیکن جسٹس صاحب کا نمبر تو اصلی ہے۔ جیسے ہی میں نے یہ فائل پراسیکیوشن آفس بھجوائی' فارس غازی پھر سے گرفتار ہو جائے گا۔ اور اس دفعہ تم بھی ساتھ ہی جیل جاؤ گے۔ تمہارا خاندان تمہیں کھو دے گا سعدی۔"

سعدی نے گہری سانس لی۔ کرسی کھینچی۔ واپس ٹانگ پہ ٹانگ رکھ کر بیٹھا۔ سنجیدگی سے ہاشم کو دیکھا۔

"اور اگر میں کسی کو کچھ نہ بتاؤں تو۔۔؟"

اب کے ہاشم کھل کر مسکرایا۔ جواہرات نے بھی مطمئن سی سانس خارج کی۔ نوشیرواں ہنوز خاموش تھا' اور خلور۔ وہ اب بھی غیر آرام دہ سا کھڑا تھا۔ کچھ تھا جو اسے ڈسٹرب کر رہا تھا۔ کچھ غلط تھا۔

"میرا خیال ہے ہم ایک معاہدے کو پہنچ سکتے ہیں۔"

ہاشم نے کڑوی چائے کا کپ اٹھایا' گھونٹ بھرا اور پھر اسے ہاتھ میں پکڑے کہنے لگا۔

"پاکستان میں ایک انسان کی دیت کتنی ہے؟ یہی کوئی تیس' انتیس لاکھ روپے۔ میں تمہیں کروڑ دوں گا۔ دیکھو' یہ رشوت نہیں ہے' دیت ہے۔ تمہارا حق ہے کہ تم اپنے ماموں کی دیت لو۔ میں تمہیں خرید نہیں رہا۔ کفارہ ادا کر رہا ہوں۔ مجھے افسوس ہے' جو بھی میں نے کیا۔ وہ غلط تھا۔ آئی ایم سوری فار دیٹ۔" افسوس سے سہلاتے ہوئے اس نے بات جاری رکھی۔ "لیکن میں بھی تو خوش نہیں ہوں۔ اس کے بعد دیکھو' میرا باپ بھی مر ہی گیا' بے شک قدرتی موت تھی' مگر میں نے کسی کو کھونے کا غم اٹھایا۔ (جواہرات کی گردن میں گلٹی سی ڈوب کر ابھری) میری شادی ٹوٹ گئی۔ میری بچی ڈسٹرب ہو کر رہ گئی۔ مجھے دوبارہ گھر بنانے کی تمنا ہی نہیں رہی۔ اب صرف کام پہ دھیان دیتا ہوں۔ میں نے بھی بہت دکھ اٹھائے ہیں۔ میں اپنی سزا کاٹ رہا ہوں۔ اب تم مجھے مزید کیا سزا دینا چاہتے ہو؟ دیکھو' بچے' اگر تم آنکھ کے بدلے آنکھ مانگو گے تو ساری دنیا اندھی ہو جائے گی۔ تم معاف کرنا سیکھو' درگزر کرو اور آگے بڑھ جاؤ۔ بیس کروڑ لو' اپنی فیملی کو باہر سیٹل کرو' میں تمہیں امریکہ میں کسی بہترین کمپنی میں جاب دلوا دوں گا' میرا وعدہ ہے! یا چاہو تو ہم مل کر نوشیرواں کی کمپنی چلا سکتے ہیں۔ تم پچاس فیصد کے پارٹنر ہو گے۔ جو تم تھرڈ کوں میں کر رہے ہو' وہی پرائیویٹ سیکٹر میں کرو۔ تم سائنس دان لوگ سرکاری اداروں میں صرف ضائع ہو جاتے ہو۔ میرے پاس آؤ' میرے ساتھ کام کرو۔" بہت سکون' نرمی اور امید سے ہاشم نے کہا۔ سعدی ہلکی مسکراہٹ سے اسے دیکھے گیا۔

"تیس کروڑ دیں گے آپ مجھے؟ میرے خاندان کے ایک مرد کے بدلے میں؟"

"ہوں۔" ہاشم نے سر اثبات میں ہلایا۔ سعدی آگے کو جھکا اور اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ "میں آپ کو ساٹھ کروڑ دوں گا' مجھے اجازت دیجئے کہ آپ کے اس ادھیڑ عمر بھائی کا گلا گھونٹ کر اسے پنکھے سے

لٹکا دوں اور کہوں کہ یہ خودکشی ہے۔ منظور ہے؟"

کمرے کا درجہ حرارت بدل گیا۔ نوشیرواں کے بدن میں شرارے دوڑے' وہ بھڑک کر کھڑا ہوا۔

"آدھا مرد؟" کہ ہاشم نے ہاتھ اٹھا کر اسے تھم جانے کا اشارہ کیا۔ اور خود سعدی کی طرف دیکھا تو چہرے پہ بے پناہ سختی تھی۔

"میرے بھائی سے تمہارا خاندان مقابلہ نہیں کرسکتا' اس لیے کوشش بھی مت کرو۔" بڑی ہی سے چبا چبا کر وہ بولا۔

ساتھ کھڑی جواہرات بھی آنکھوں میں تپش لیے سعدی کو گھور رہی تھی۔ "تم اپنی بات کرو۔ کیا لو گے اپنا منہ بند رکھنے کے لیے۔"

"منہ بند نہیں رکھوں گا آج ہی جا کر سب کو سچائی بتا دوں گا۔ جرم کیا ہے تو بھگتنا پڑے گا ہاشم بھائی!" وہ بھی اتنی ہی سختی سے بولا تھا۔ ہاشم تاسف سے اسے دیکھے گیا۔

"کیا تم وہی نہیں ہو جس کو ہمیشہ میں نے فیملی کی طرح ٹریٹ کیا؟ کیا تم وہی نہیں ہو جو خود بھی ایک جج کو بلیک میل کرنے کا جرم کر چکے ہو؟"

سعدی ایک دم ہنس دیا۔ ہاشم بھی تلخی سے مسکرایا۔

"اس میں مزاحیہ کیا بات تھی؟"

"کچھ نہیں۔" اس نے مسکراہٹ دباتے سر جھٹکا۔ "ایک کتاب میں فجر میں روز پڑھتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں اس میں پرانی کہانیوں کے علاوہ کچھ نہیں ہے' مگر میں آپ کو بتاؤں اس کی پرانی کہانیوں میں بہت کچھ ہے۔ اسی میں ایک کہانی ایک چرواہے کی بھی ہے' کسی زمانے میں اس چرواہے کو ایک بادشاہ نے اڈاپٹ کیا تھا' پھر جب برسوں بعد خدا نے اس کو اسی محل کے دربار میں کلمہ حق کہنے بھیجا تو بادشاہ وقت نے کہا۔ آپ وہی نہیں ہیں موسیٰ' جو ایک قتل کر کے یہاں سے بھاگ گئے تھے؟ تو مجھے اس حسن اتفاق پہ ہنسی آگئی۔"

"یہ بہت دلچسپ لیجنڈ ہے مگر میرے پاس وقت کم ہے۔" اس نے کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے بات کاٹی۔ "تمہیں میرے پیسے رکھ لینے چاہیے تھے' مگر تم نے نہیں رکھے۔ تمہاری مرضی۔ اب سنو۔ آگے۔" سعدی کی آنکھوں میں دیکھتے اس کی آنکھوں میں زمانے بھر کی سنگینی در آئی۔ "اگر تمہارے منہ سے ایک لفظ بھی نکلا' تو میں تمہاری فائل آگے کردوں گا۔ پوری دنیا جان جائے گی کہ تم اور فارس فراڈ ہو' اور یہ کہ تمہاری بہن نے کس طرح بورڈ ایگزام میں چیٹنگ کی ہے۔ تم تینوں رات تک تھانے میں بند ہو گے۔"

اور سعدی یوسف کو لگا' ساری کائنات تھم گئی ہے۔ یہ ناممکن ہے۔ ناممکن تھا کہ ہاشم یہ بات جانتا ہو۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑا ہوا۔

"میری بہن کے بارے میں بکواس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ اپنی محنت سے بورڈ ٹاپ کرتی رہی ہے۔" غصے سے وہ غرایا تھا۔

"ہمیشہ کا تو نہیں پتا' مگر دو ہفتے پہلے اپنے آخری پیپر میں جب وہ چیٹنگ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی اور اس نے مجھے وہاں بلایا تھا تو۔" ہاشم سرسری انداز میں کہتے اس کے تاثرات دیکھ کر رکا' چہرے پہ ایک دم حیرانی لے آیا۔ "اوہ۔ اس نے تمہیں نہیں بتایا؟"

سعدی کی آنکھیں غصے اور اچنبھے سے سکڑیں۔

"کیا کہانیاں سنا رہے ہیں آپ مجھے؟"

"سعدی!" جواہرات نے مسکراتے ہوئے اسے پکارا۔ "تمہاری بہن دو ہفتے قبل' سنی کی پارٹی کی صبح اپنے پیپر کے دوران چیٹنگ کرتے ہوئے پکڑی گئی تھی اور اس نے ہاشم کو مدد کے لیے بلایا تھا۔ تمہیں تو ہاشم کا احسان مند ہونا چاہیے کہ اس نے معاملہ رفع دفع کر دیا۔"

سعدی کا غصہ' بے یقینی میں بدلتا گیا۔ اس نے باری باری ان سب کے چہرے دیکھے۔ "مجھے آپ کی کسی بات پہ یقین نہیں ہے۔"

ہاشم نے جواب دینے کے بجائے ایک نمبر ملا کر اسپیکر آن کیا اور موبائل کو ہاتھ میں تھماتے' سعدی کو مسکرا کر دیکھتے دوسری جانب جاتی گھنٹی سننے لگا۔

"جی السلام علیکم کاروار صاحب۔" فون جلد ہی اٹھا لیا گیا۔

"وعلیکم السلام خواجہ صاحب۔ کیسے مزاج ہیں۔" وہ کہہ فون پہ رہا تھا اور دیکھ سعدی کو رہا تھا۔ سعدی خاموش تھا' چبھتی' مشتبہ نگاہیں ہاشم پہ جمی تھیں۔

"اللہ کا کرم ہے۔ آپ سنایئے؟"

"میں نے اس بچی کے سلسلے میں فون کیا تھا۔ یاد ہے آپ کو' آپ کے کالج میں بی اے کے ایگزام میں جو بچی چیٹنگ کرتی پکڑی گئی اور اس نے مجھے بلوایا تھا۔"

"جی جی سپرنٹنڈنٹ صاحب نے مجھے بعد میں تمام صورت حال بتادی تھی۔ حنین یوسف نام تھا اس کا اور رول نمبر تھا' 13051 ۔ آپ نہ ہوتے تو جناب اس کے پیپر پہ سرخ کاٹا لگنا ہی تھا۔"

سعدی کی رنگت زرد پڑنے لگی۔ اس کے قدموں سے آہستہ آہستہ جان نکل رہی تھی۔ قطرہ بہ قطرہ۔

"یہ تو آپ کی کرم نوازی ہے جی۔" ہاشم نے اس کا چہرہ دیکھتے تشکر سے سر کو خم دیا۔ "ویسے اب بھی اگر آپ اس کی رپورٹ کردیں تو سپرنٹنڈنٹ کی گواہی کافی ہوگی اس کا رزلٹ کینسل کروانے کے لیے؟"

"جی بالکل سر۔ جب اسے اس طرح بچا سکتے ہیں تو رپورٹ بھی کرسکتے ہیں۔ کیا رپورٹ کرنی ہے اس کی؟" وہ رازداری سے بولے۔ ہاشم مسکرایا اور وہ مسکراتے ہوئے بہت چند سم لگتا تھا۔

"نہیں' ابھی نہیں۔ اگر ضرورت پڑی تو بتاؤں گا۔"

"لوکے' جی۔ اچھا کاروار صاحب' ایف نمبن میں میرا جو پلاٹ۔۔۔"

"کل ڈنر پہ آیئے گا' وہیں بات کریں گے۔" سلسلہ منقطع کرکے اس نے موبائل میز پہ ڈالا۔

"بیٹھ جاؤ سعدی۔ اور ٹھنڈا پانی پیو۔" مسکرا کر نرمی سے کرسی کی طرف اشارہ کیا' مگر وہ کھڑا رہا۔ اس کی رنگت سفید پڑ رہی تھی اور آنکھوں میں سرخی ابھر رہی تھی۔

"کیا اب یقین آیا کہ تمہاری بہن تم سے زیادہ مجھ پہ بھروسا کرتی ہے؟"

سعدی کی کنپٹی کی رگیں ابھرنے لگیں۔ سفید رنگت سرخ پڑنے لگی۔ ہاشم کی آنکھوں میں دیکھتے وہ غرایا۔

"اس جعلی کال سے مجھے رتی برابر فرق نہیں پڑتا۔ میری بہن ایسا کچھ نہیں کرسکتی۔ آپ صرف مجھ پہ دباؤ ڈالنے کے لیے ایسا کررہے ہیں' یہ آپ کی بھول ہے کہ اس طرح آپ ہمارے خاندان کو توڑ سکتے ہیں۔"

اس نے اندر جو طوفان برپا تھا اس کو جن دقتوں سے چھپا کر اس نے بظاہر گردن اکڑا کر رکھا' صرف اس کا دل جانتا تھا۔ قدموں میں لرزش تھی' دل ڈوب رہا تھا' مگر وہ سعدی تھا' اسے ابھی نہیں ٹوٹنا تھا۔ بس چند منٹ اور۔۔۔

"تو جاؤ اپنی بہن سے پوچھ لو۔" ہاشم نے بس افسوس سے اتنا کہا ہو کہ وہ خود بھی اس کے اتنے یقین پہ تلملا رہا تھا۔ سعدی غصے سے اسے دیکھتا میز پہ دونوں ہاتھ رکھے آگے جھکا۔

"میرے۔ خاندان۔ سے۔ دور رہیں' ہاشم بھائی!" خون رنگ ہوتی آنکھوں سے وہ بلند آواز میں غرایا تھا۔ "ورنہ میں وہ کروں گا آپ کے ساتھ کہ آپ کی نسلیں یاد رکھیں گی' اگر آپ کی نسلیں بچ پائیں تو!"

پیچھے کاؤچ پہ بیٹھے نوشیرواں کے کان سرخ پڑے۔ صوفے کی گدی کو مٹھی میں زور سے بھینچ کر گویا ضبط کیا۔ دوسرا ہاتھ بار بار جیب کی طرف جاتا۔ خاور کی نگاہ بھی بار بار اس کے جیب کی طرف جاتے ہاتھ تک اٹھ جاتی۔

ہاشم ابھی تک ٹیک لگائے پرسکون بیٹھا تھا' اس دھمکی پہ زخمی سا مسکرایا۔ "اتنا بغض ہے تمہارے دل میں میرے لیے تو ابھی تک مجھے ہاشم بھائی کیوں کہتے ہو؟" سعدی نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے مگر الفاظ ختم ہوگئے اس سوال کا جواب خود اس کے پاس بھی نہیں تھا۔

"آپ کا لحاظ کر جاتا ہوں' آج کے بعد نہیں کروں گا۔ دوبارہ میری بہن کا نام مت لینا۔ ہاشم کاردار!" انگلی اٹھا کر' سختی سے اسے دیکھتے تنبیہہ کی اور اس سارے میں پہلی دفعہ ہاشم کے چہرے پہ شدید تکلیف ابھری۔ نہیں' کچھ چھن سے ٹوٹ گیا تھا۔ کبھی نہ جڑنے کے لیے۔

جواہرات نے وہ تکلیف دیکھ لی تھی' فوراً تپ کر اسے مخاطب کیا۔

"تو پھر جاؤ' اور اپنے خاندان کی فکر کرو' ہماری نہیں۔"

سعدی نے تنفر سے سر جھٹکا۔

"موتو بغیظکم۔" قرآن کے وہ الفاظ بلند آواز میں پڑھے۔ (مر جاؤ اپنے غصے میں تم لوگ!) کرسی کو پیر سے ٹھوکر ماری اور سرخ آنکھوں سے ان دونوں کو گھورتے مڑ گیا۔ ہاشم نے اسی تاسف سے اسے باہر جاتے دیکھا۔

دروازہ بند ہوا تو وہ تعجب اور افسوس سے بولا۔ "یہ اتنا بے وقوف ہو گا میں نے نہیں سوچا تھا۔" "نوشیرواں سعدی کے پیچھے گیا تھا' خاور بھی احتیاطاً" جانے لگا مگر ہاشم کی بات نے اسے روک دیا۔

"میرا نہیں خیال سر! کہ وہ بے وقوف ہے۔ جب اسے آؤ بوٹی میں نے کہا تھا' یہ لڑکا گڑبڑ ہے مگر آپ نے تب بھی اسے انڈر ایسٹیمیٹ کیا تھا اب پھر آپ وہی کر رہے ہیں۔"

"بس کرو یار۔" ہاشم نے بے زاری سے لیپ ٹاپ کھول کر سامنے کیا۔ "وہ ایک معصوم بچہ ہے' مجھ سے جھوٹ تو بول نہیں سکتا۔ دیکھا نہیں کیسے ایک ہی سانس میں سب بتا دیا۔" ناک سے مکھی اڑاتے وہ اسکرین کی طرف متوجہ ہوا۔ خاور نے بے چینی سے پہلو بدلا' مگر وہ خود بھی سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ اسے کیا چیز تنگ کر رہی ہے۔

"مجھے نہیں لگتا' وہ سچ بول رہا تھا سر۔ مجھے لگتا ہے' وہ اداکاری کر رہا تھا۔ وہ کسی اور چکر میں تھا۔" وہ خود بھی متذبذب تھا۔ جواہرات نے اکتا کر اس کو دیکھتے ناک سے مکھی اڑائی۔

"بہت ہو گیا سعدی نامہ اب بس کرو۔" اور وہ ہاشم کے سامنے کرسی پہ آکر بیٹھی۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائی۔ گردن کی مالا کے موتیوں پہ انگلی پھیرتے سوچتے ہوئے ہاشم کو مخاطب کیا۔ "کیا وہ کسی کو بتائے گا؟"

"بتاتا ہو تا تو اب تک بتا چکا ہوتا۔ اسے پتا ہے کوئی اس کا یقین نہیں کرے گا۔ ابھی غصے میں کیا ہے۔ ٹھنڈا ہو گا تو میں بات کروں گا اس سے۔ میں اسے سنبھال لوں گا۔ خاور' یہ رپورٹ میں نے تمہیں کہا تھا کب۔"

ہاشم نے اسکرین پہ کچھ دیکھتے خاور کو اشارہ کیا تو وہ جو گاہے بگاہے بند دروازے کو بے چینی سے دیکھ رہا تھا' بادل نخواستہ اس کے قریب آگیا۔ جواہرات موبائل نکال کر میلز چیک کرنے لگی۔ وہ تینوں اس تماشے سے ساؤنڈ پروف دروازوں کے باعث بے خبر رہے جو باہر ہو رہا تھا اور جس کا خاور کو ڈر تھا۔

☼ ☼ ☼

تم کو اپنی شکست دکھتی ہے؟
یا مرے حوصلے سے خائف ہو؟

سعدی جب آفس سے نکلا تو اس کا چہرہ زرد تھا اور آنکھیں گلابی۔ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے اس نے ہاشم کے آفس کے باہر ہال پار کیا جس میں صرف حلیمہ سیکریٹری کا ڈیسک تھا۔ آگے لمبی راہداری تھی جس کے آگے لفٹ تھی۔ جگہ ایسی تھی کہ ہاشم کے آفس میں کون آ رہا ہے کون جا رہا ہے اس کا علم حلیمہ یا چند گارڈز کے علاوہ اس فلور پہ کسی اور کو نہیں ہوتا تھا۔

اور ابھی ہاشم کے آفس سے نکلنے والے لڑکے کا چہرہ ایسا بے رنگ ہو رہا تھا کہ وہ بھی سر اٹھا کر دیکھنے لگی۔ اور پھر نگاہوں کا زاویہ بدلا۔ سعدی کے عقب میں نوشیرواں لمبے لمبے ڈگ بھرتے آتا دکھائی دیا۔ چہرے پہ دبا دبا غصہ لیے اس کا انداز جارحانہ تھا۔ سعدی کے ساتھ سے گزر کر وہ سامنے آکھڑا ہوا۔ سعدی رکا' گلابی آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔

"یہ میرے بارے میں کیا بکواس کر رہے تھے تم؟" نوشیرواں نتھنے پھلائے غصے سے پھنکارا۔ "اس وقت تو میں خاموش رہا کیوں کہ۔۔۔"

"کیوں کہ نوشیرواں جب دو مرد آپس میں بات کر رہے ہوں تو تمہیں چاہیے کہ تم خاموش ہی رہو۔" سعدی سرخ پڑتی آنکھوں سے بلند آواز میں ایسے چبا چبا کر بولا کہ نوشیرواں کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔ منہ یوں ہو گیا جیسے طمانچہ مار گیا ہو۔ اور اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہہ پاتا، کن انکھیوں سے اسے نظر آیا۔ ہاشم کی سیکریٹری نے ہنسی چھپانے کو چہرہ جھکایا تھا۔ نوشیرواں نے لال بھبھوکا چہرہ اس طرف پھیرا۔ (کیا یہ ہنسی روک رہی ہے؟ کیا یہ مجھ پہ ہنسی ہے؟ کیا یہ مجھ پہ ہنسی ہے؟) وہ ایک دم جارحانہ انداز میں اس ڈیسک تک آیا۔

"بہت فنی لگ رہا ہے تمہیں؟ ہاں؟" زور سے زمین پہ رکھے سسٹم یونٹ کو ٹھوکر ماری۔ بھاری یونٹ ایک طرف کو لڑھکا۔ حلیمہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ ہکا بکا سی وہ اٹھی۔

"سر۔۔۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟"

"جو بکواس کرتی ہو میرے آگے۔" نوشیرواں نے بر ہمی سے ہاتھ مار کر میز کی چیزیں گرا دیں۔

"میرا غصہ ایک کمزور لڑکی پہ نکال رہے ہو؟ مرد بنو نوشیرواں۔ مرد بنو!" اور بس ایک قہر آلود نظر اس پہ ڈال کر اپنا فون اٹھا کر آگے بڑھ گیا۔ نوشیرواں تلملا کر واپس گھوما تو دیکھا۔ حلیمہ اسی طرح پریشان کھڑی تھی۔ چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ سعدی پہ دبا سارا غصہ اور عود کر آیا۔

"کھڑی شکل کیا دیکھ رہی ہو میری؟" وہ آگے بڑھا۔ زور سے اس کی کمپیوٹر اسکرین کو دھکا دیا۔ وہ الٹ کر دوسرے طرف جا گری۔ حلیمہ ڈر کر دو قدم پیچھے ہٹی۔ ہراساں نگاہوں سے شیرو کو دیکھا۔ جس کے نقش غصے سے بگڑ رہے تھے۔ اسے لگا وہ ابھی کے ابھی اسے نوکری سے نکل جانے کا کہے گا مگر نوشیرواں کے ذہن پہ اس وقت دوسری چیزیں سوار تھیں۔ سعدی کی لفٹ جا چکی تھی۔ شیرو دوسری لفٹ کی طرف لپکا۔

☆ ☆ ☆

جرم کی نوعیت میں کچھ تفاوت ہو تو ہو در حقیقت پارس تو بھی نہیں، میں بھی نہیں

کچہری کی راہداری میں انسانوں کا جم غفیر تھا۔ کوئی آ رہا تھا، کوئی جا رہا تھا۔ ایسے میں احمر رستہ بناتا آگے بڑھ رہا تھا۔ اپنے لاپروا حلیے کے برعکس آج وہ سیاہ پینٹ کے ساتھ سفید ڈریس شرٹ میں ملبوس تھا۔ کف بھی بند تھے اور بال بھی پیچھے سیٹ کر رکھے تھے۔

وہ رکا۔ ایک ادھ کھلے دروازے کے اندر وہ بیٹھی دکھائی دی۔ میز کے اس پار کرسی پہ براجمان، سر جھکائے فائل پہ روانی سے قلم چلاتی۔ گھنگریالے بال کیچر میں آدھے بندھے تھے، اور ایک لٹ جھک کر فائل کو چھو رہی تھی۔

احمر فوراً" سے دیوار کی اوٹ میں ہو گیا۔ چند لمحے کے لیے سوچتا رہا۔

(یہ میری طرف سے غازی کی شادی کا تحفہ ہے۔ مگر۔۔۔) وہ رکا۔ (جب میں چڑیل کی غلط فہمی دور کروں گا اور اسے حقیقت بتاؤں گا کہ وہ میری غلطی تھی، ورنہ غازی نے اسے استعمال کرنے کی کوشش نہیں کی۔ تو وہ کیا کرے گی؟ ہوں۔۔۔ سوچنے دو۔"

دیوار سے ٹیک لگائے اس نے آنکھیں بند کیں اور تصور کرنا چاہا۔

دروازہ کھٹکھٹاتا ہے، زمر چہرہ اٹھا کر اسے دیکھتی ہے۔ چونکتی ہے۔ "احمر شفیع؟" ابرو اٹھاتی ہے۔ پھر اندر آنے کے لیے سر کو خم دیتی ہے۔ وہ جھجکتا ہوا اندر داخل ہوتا ہے۔ تذبذب سے سلام کر کے کہتا ہے۔

"آپ کو شادی مبارک ہو۔ میں پہلے اس لیے نہیں آیا کہ آپ کا غازی سے کوئی رشتہ نہیں تھا مگر اب رشتہ ہے، سو مجھے آپ کی یہ غلط فہمی دور۔۔۔"

اور وہ بات کاٹ کر کہتی ہے۔ "تمہید چھوڑیں اور کام کی بات پہ آئیں۔" وہ گہری سانس بھر کر رہ جاتا ہے۔ پھر جلدی جلدی بتانے لگتا ہے۔

"اس دن غازی نے مجھے بصیرت صاحب کے پاس بھیجا تھا۔ جعلی مخبری کرنے۔ وہ آپ کو استعمال نہیں کر رہا تھا' یہ میری غلطی تھی۔"

وہ ایک دم حیرت زدہ رہ جاتی ہے مضطرب سی کھڑی ہوتی ہے۔

"کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"جی میم۔" اور وہ مزید تفصیل بتانے لگتا ہے۔ وہ جیسے جیسے سنتی جاتی ہے اس کا رنگ زرد پڑتا جاتا ہے یہاں تک کہ آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔

"یعنی کہ اس نے کچھ نہیں کیا' اور میں ایسے ہی اتنے سال اس کو موردِ الزام ٹھہراتی رہی۔ او میرے اللہ!" وہ سر دونوں ہاتھوں میں گرائے بیٹھ جاتی ہے۔

"کیا وہ مجھے معاف کر دے گا؟ میں نے اس کو اتنا غلط سمجھا۔"

"اونہوں!" احمر نے برا سا منہ بنا کر آنکھیں کھولیں۔ تصور غائب ہوا۔ راہداری میں لوگوں کا شور سماعتوں میں گونجنے لگا۔ اس نے اپنے سر پہ چپت رسید کی۔ "یہ چڑیل اتنی ایموشنل نہیں ہو سکتی۔ اونہوں۔ یہ کچھ اور کرے گی۔"

اس نے پھر سے آنکھیں بند کر کے سوچنا چاہا۔ تصور کا پردہ روشن ہوا۔

وہ زمر کے سامنے کھڑا ہے اور اسے بتا رہا ہے۔

"وہ میری غلطی تھی۔ غازی نے مجھے بصیرت صاحب کے پاس بھیجا تھا۔"

اور ایک دم غصے سے کھڑی ہوتی ہے۔ "تمہیں کیا لگتا ہے میں تمہاری بکواس پہ یقین کر لوں گی؟ یہ کہانی کسی اور کو جا کر سناؤ۔ میں جانتی ہوں کہ اس روز اسی نے تمہیں میرے پاس مخبری کرنے کے لیے بھیجا تھا۔" بے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے وہ کہتی ہے۔

"اف!" احمر نے تلملا کر آنکھیں کھولیں۔ بے بسی سے چوکھٹ تک گردن نکال کر جھانکا۔ جہاں وہ پُرسکون سی' سر جھکائے فائل پہ لکھتی جا رہی تھی۔ اب جو ہوگا دیکھا جائے گا۔ وہ جی کڑا کر کے اوٹ سے نکلا اور دروازے کو انگلیوں سے بجایا۔

لکھتے لکھتے زمر نے سر اٹھایا' اسے دیکھ کر وہ چونکی۔

"احمر شفیع؟" ابرو اٹھا کر قدرے تعجب سے اسے دیکھا۔ پھر قلم بند کر کے کرسی پہ پیچھے کو ٹیک لگائی۔ سر کے خم سے اسے اندر آنے کا اشارہ کیا۔

وہ متذبذب سا اندر داخل ہوا اور سلام کیا۔ تھوک نگل کر خشک گلا تر کیا۔ اس کے عین سامنے آکھڑا ہوا۔

"میں آپ کو شادی کی مبارک باد دینے آیا تھا' اور ساتھ میں ایک پرانی غلط فہمی بھی دور کرنا تھی۔"

وہ خاموشی مگر نرمی سے اس کو دیکھتی رہی۔

"وہ جعلی مخبری جو میں نے کی تھی' وہ مجھے آپ کے پاس جا کر نہیں کرنی تھی۔ غازی نے مجھے بصیرت صاحب کے پاس بھیجا تھا' وہ نہیں تھے تو میں نے آپ کو بتا دیا' یہ میری غلطی تھی۔ اس کو تو پتا بھی نہیں تھا کہ میں اس طرح کر دوں گا۔" (سانس روک کے) احمر نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔

وہ چپ چاپ اسے دیکھتی رہی' پھر اسی پُرسکون اور نرم انداز میں بولی۔ "مجھے پتا ہے۔"

احمر کے سارے تصورات بھک سے اُڑ گئے "جی!" وہ بے یقینی سے اسے دیکھنے لگا۔

"آپ کو کیسے پتا؟"

"مجھ سے ہی تو آپ نے پوچھا تھا بصیرت صاحب کا۔ وہ نہیں تھے' تو آپ نے مجھے بتا دیا' میں سمجھ گئی تھی۔"

احمر تیزی سے دو قدم آگے آیا۔ "مطلب کہ آپ جانتی ہیں سب۔ تو پھر آپ غازی سے خفا کیوں ہیں؟"

"کیوں کہ اس نے مجھے استعمال کر کے جیل توڑنی چاہی۔" ہلکے سے کندھے اچکا کر وہ اسی سکون سے بولی۔ احمر الجھن سے رک کر اسے دیکھنے لگا۔

"مگر ابھی آپ نے کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ وہ میری غلطی تھی۔ تو۔۔؟"

زمر چند ثانیے اسے دیکھتی رہی پھر گہری سانس لے کر کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ "بیٹھیے احمر۔"

(اتنی عزت؟) کوئی اور وقت ہوتا تو وہ سوچتا مگر ابھی وہ فوراً" سے کرسی سنبھال کر بیٹھا۔ آگے کو ہوتے بے چینی سے اسے دیکھا۔

"آپ کے انداز سے لگتا ہے کہ آپ ہماری شادی کے بارے میں "بہت کچھ" جانتے ہیں۔ میں اپنے ذاتی معاملات یوں ڈسکس نہیں کرتی' مگر چونکہ موضوع آپ نے چھیڑا ہے اور اس سے آپ کا تعلق بھی ہے' اس لیے۔ مجھے بتایئے۔ اس روز کیا تاریخ تھی جب آپ میرے پاس جعلی مخبری لے کر آئے تھے؟"

"آ...پتا نہیں۔" وہ گڑبڑایا۔

"اس روز سولہ تاریخ تھی۔ کیا آپ کو یاد ہے کہ اس کے بعد فارس سے ملنے میں کس دن جیل آئی تھی؟"

"یقین کیجیے' جیل میں مجھے کیلنڈر نہیں دیا گیا تھا گو کہ یہ میرے پریزن رائٹس کے خلاف تھا مگر۔"

"اکیس۔ میں اکیس تاریخ کو دوبارہ جیل آئی تھی۔ اور میں نے فارس کو بہت سنائی تھیں یعنی چار دن بعد۔ ٹھیک؟"

"جی۔ ٹھیک!" وہ توجہ سے سن رہا تھا۔

"آپ نے کس دن فارس کو بتایا کہ یہ مخبری آپ نے میرے سامنے کی ہے؟"

"اسی دن سولہ تاریخ کو۔ جاتے ساتھ ہی بتا دیا۔ بہت غصہ ہوا مجھ پہ۔ اس نے کہا کہ وہ آپ کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اور...." جوش سے بولتے بولتے وہ رکا۔

زمر ادا سی مسکرائی۔ "اور پھر فارس نے کیا کیا' احمر؟"

اور احمر کو لگا اس کے منہ پہ چابک دے مارا گیا ہو۔ وہ ہونقوں کی طرح زمر کی شکل دیکھنے لگا۔ "پھر؟" اس نے غائب دماغی سے دہرایا۔

"آپ مجھے یہ بتانے آئے ہیں کہ وہ بے قصور ہے کیوں کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔ میں آپ کو بتاتی ہوں کہ وہ قصوروار ہے کیوں کہ اس نے کچھ نہیں کیا۔"

احمر بس شل سا اسے دیکھے گیا۔ کیا وہ فارس کی حمایت میں اتنا اندھا ہو گیا تھا کہ اسے سامنے کی بات نظر نہیں آئی؟

"سولہ تاریخ کو آپ نے اسے بتایا کہ آپ نے مجھے استعمال کیا ہے' مجھے اندازہ تھا' یہ بات آپ اسے جاتے ساتھ ہی بتائیں گے۔ پھر آگے میں آپ کو بتاتی ہوں کہ کیا ہوا۔" وہ تحمل سے کہہ رہی تھی۔

"وہ آپ پہ خفا ہوا' غصہ ہوا۔ اور پھر۔ وہ چپ ہو گیا۔ اس نے آگے کچھ نہیں کیا۔ میں نے اسے چار دن دیے۔" انگوٹھا بند کر کے چار انگلیاں دکھائیں۔ "چار دن تاکہ وہ اپنی غلطی کو درست کر لے۔ مجھے یقین تھا' یہ صرف ایک غلطی ہے۔ اٹھارہ تاریخ کو اسے جوڈیشل ریمانڈ کی توسیع کے لیے عدالت لایا گیا۔ کاریڈور میں' میں نے اسے گزرتے ہوئے دیکھا۔ ابھی چند روز پہلے ہی تو اس نے مجھے وہاں روک کر کہا تھا کہ وہ بے گناہ ہے۔ مگر اٹھارہ تاریخ کو وہ مجھے دیکھ کر خاموشی سے گزر گیا۔ میں انتظار کرتی رہی۔ ایک دفعہ وہ کہہ دے' یہ احمر کی غلطی تھی' ہم آپ کو استعمال نہیں کر سکتے' مگر اس نے پلان جاری رکھا۔ اس... نے... پلان... جاری... رکھا... احمر!"

احمر بالکل لاجواب سا ہوا اسے دیکھ رہا تھا۔

"یہ وہ وقت تھا جب میں نے ڈھائی سال تک اس کی بات نہیں سنی' کیوں کہ مجھے ڈر تھا' میں اسے معاف کر دوں گی اور جب وہ میرے سامنے آیا تو میں نے شاید اسے معاف کر بھی دیا تھا' میں اس کے کیس کی خود تحقیق کرنے جا رہی تھی' میں سب کچھ اپنے ہاتھ میں لینا چاہتی تھی' میرا دماغ کہتا تھا' وہ اتنے گواہ جنہوں نے اسے گن لے کر ہوٹل کے کمرے میں جاتے دیکھا ہے' جنہوں نے اسے اپنے بھائی کے ہوسٹل کے کمرے سے رات کو نکلتے دیکھا ہے' وہ سب جھوٹ کہہ رہے ہیں؟ مگر دل کہتا تھا' میں اسے ایک چانس اور دوں۔ اور میں نے دیا۔ احمر صاحب' میں نے اس کو چار دن دیے کہ وہ اپنی غلطی درست کر لے۔ ٹھیک ہے' اسے نہیں پتا تھا مگر جب پتا چل گیا تب کیا؟ کیا اس

نے؟ کیا مجھے بتایا کہ ہم riots نہیں جیل توڑنے جارہے ہیں؟ کیا سوچا کہ فرار کے بعد میرا کیا بنے گا؟ میں ایک عورت ہوں۔ ایک عورت کے ساتھ یہ پوری کچہری کیا کرے گی؟ اس کو معلوم تھا سب مگر اس نے کچھ نہیں کیا۔ اس دن میں نے ہمیشہ کے لیے فارس پہ اعتبار کرنا چھوڑ دیا تھا۔ اب مجھے اس پہ اعتبار ہی نہیں رہا۔ پھر بھی جب میں اس کے پاس گئی تو اس سے کہا کہ تم نے اپنے سائیڈ کک (احمر کے ابو بھیجے) کو میرے پاس بھیجا تو سجتے ہوئے بھی میری خواہش تھی کہ وہ کہہ دے۔ مجھے تو نہیں پتا میں نے تو کچھ اور کہا تھا مگر اس نے پلک تک نہیں جھپکی۔ یعنی وہ جانتا تھا کہ آپ مجھے کہہ گئے ہیں اور اس نے کچھ نہیں کیا۔ معافی بھی نہیں مانگی۔ احمر کیا اسے معافی مانگنی نہیں چاہیے تھی؟"

احمر کا سر خود بخود اثبات میں ہلا۔ "اس نے شاید اس لیے..." وہ ٹھہر گیا۔ ساری دلیلیں ختم ہو گئیں۔ بے بسی سے اس نے زمر کو دیکھا۔ "یہاں اس کا قصور ہے مگر اس نے وہ قتل نہیں کیے۔" وہ نگاہیں زمر کے چہرے سے ہٹا نہیں پا رہا تھا۔ جو پرسکون سی بیٹھی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اداسی تھی مگر اطمینان بھی تھا۔

"جب آپ کا ایک دھوکا سامنے آجائے تو آپ کے سارے سچ مشکوک ہو جاتے ہیں اور یہ مت کہیے کہ اس نے وہ قتل نہیں کیے۔ آپ کے چہرے پہ لکھا ہے کہ آپ کو خود بھی یقین نہیں کہ وہ بے گناہ تھا۔"

احمر نے آہستہ سے سر ہلا دیا۔ "مجھے نہیں پتا وہ بے گناہ ہے یا نہیں، اس کے خلاف اتنے ثبوت ہیں کہ اگر سوچوں تو وہ قاتل لگتا ہے، مگر وہ میرا دوست ہے، مجھے اس کی ہر بات ٹھیک لگتی ہے۔ آئی ایم سوری۔ ہم نے بہت غلط کیا۔" خفت سے گردن قدرے جھکا کر وہ بولا۔

"مجھے آپ کی معذرت سے فرق نہیں پڑتا۔ آپ میرے کچھ نہیں لگتے۔" نرمی سے کندھے اچکا کر وہ بولی تو وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ پھر اٹھ گیا۔

"اگر آپ کو کبھی یہ معلوم ہوا کہ وہ بے گناہ ہے اور اسے پھنسایا گیا ہے تو آپ کیا کریں گی؟"

"وہ بے گناہ نہیں ہے، کم از کم مجھے اس پہ اب یقین نہیں آتا۔"

"میں دوبارہ آپ سے معذرت کرتا ہوں۔" اس کا آفس چھوڑنے سے پہلے احمر نے پھر سے کہا تھا۔ زمر نے سر کو بس خم دیا۔ مگر وہ جانتا تھا کہ اس نے معذرت قبول نہیں کی تھی۔

☼ ☼ ☼

لغزشوں سے ماورا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں
دونوں انسان ہیں، خدا تو بھی نہیں، میں بھی نہیں

احمر اپنے کچن کے اونچے اسٹول پہ، سوچ میں گم بیٹھا تھا جب دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ پھر بھاری قدم قریب آتے سنائی دیے۔

"کیوں بلایا ہے؟" فارس بے نیازی سے پوچھتا ساتھ والے اسٹول پہ بیٹھا۔ کہنیاں کاؤنٹر پہ رکھ دیں اور گردن موڑ کر اسے دیکھنے لگا جو آنکھیں چھوٹی کرکے سامنے کسی غیر مرئی نقطے کو دیکھ رہا تھا۔

"ہیلو!" فارس نے اس کے چہرے کے آگے چٹکی بجائی۔ وہ چونکا نہیں بس آہستہ سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

"آج کچہری گیا تھا کسی کام سے۔ میڈم زمر سے ملاقات ہوئی۔"

"پھر؟" فارس نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سامنے دیکھ رہا تھا۔

"یار! ہم نے ایک لڑکی کو استعمال کرکے جیل توڑنی چاہی۔ لعنت ہے ہمارے اوپر۔"

وہ پہلے قدرے حیران ہوا پھر ناگواری سے لب بھینچ لیے۔ چہرہ موڑ کر سامنے دیکھنے لگا۔

"یہ قصہ کیوں دہرا رہے ہو؟"

"ہم نے ایک لڑکی کو استعمال کیا یار!" وہ سخت پرملال تھا۔

"ایک منٹ، میں نے تمہیں دوسرے وکیل کے لیے پیغام دیا تھا، یہ تمہاری غلطی تھی۔" خفگی سے اس

سے بات کاٹی۔

"اور پھر تم نے کیا کیا؟" وہ بھی اتنی ہی درشتی سے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولا۔ "تم نے میری غلطی کو ٹھیک کیا؟ مجھے ایک دفعہ بھی کہا کہ جا کر اس کو سب بتا دیتے ہیں۔ تمہیں پتا تھا کہ ایسی مخبری پہ کارروائی کے بعد اگر ہم فرار ہو گئے تو اس کے ساتھ کیا ہو گا مگر تم نے سب کچھ چلنے دیا۔"

"ایسے ظاہر مت کرو جیسے تم نے کچھ نہیں کیا۔" وہ برہم ہوا۔

"مگر میں اس کا کچھ نہیں لگتا تھا' غازی! تمہیں کم از کم تمہیں پلان جاری نہیں رکھنا چاہیے تھا۔ اور پھر بعد میں تمہیں اس سے معافی بھی مانگنی چاہیے تھی۔ وہ قتل تم نے نہیں کیے ہوں گے' تم بے قصور ہو گے' مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم زندگی میں ہر معاملے میں بے قصور ہو۔ تم نے واقعی اس کو استعمال کرنے کی کوشش کی۔" سنجیدگی سے وہ کہہ رہا تھا۔ فارس تنے ابرو کے ساتھ چہرہ موڑے سامنے دیکھتا رہا۔ چند پل ایک شدید تناؤ کی کیفیت میں خاموش گزرے۔ پھر وہ اسی خفگی سے بولا۔

"میں کیوں معافی مانگتا؟ میں نے اس پہ گولی نہیں چلائی تھی۔"

احمر نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔ "بالکل۔ تم نے اس پہ گولی نہیں چلائی۔ تم نے اس کا دل توڑا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو یہ زیادہ بڑا گناہ ہے۔" ملامتی انداز میں کہہ کر وہ اٹھ گیا اور گھوم کر لاؤنج کی سمت آیا اور میز پہ رکھا موبائل اٹھا کر بٹن دبانے لگا۔ چند لمحے اس اظہار لاتعلقی کی نذر ہو گئے۔

فارس ابھی تک اونچے اسٹول پہ بیٹھا' خفگی سے سامنے دیکھ رہا تھا۔ احمر اس کی پشت پہ تھا۔ جب وہ مزید کچھ نہ بولا تو فارس نے گہری سانس لی۔

"مجھے پتا ہے' میں نے اسے استعمال کرنے کی کوشش کی۔ میں خود غرض ہو گیا تھا۔" پھر وہ گویا اکتا کر پیچھے گھوما۔ "میں ڈھائی سال سے جیل میں بند تھا' میرے پاس کوئی دوسرا راستہ۔"

"اوہ پلیز' کوئی وضاحت مت دینا۔ کسی کا دل توڑنے کی کوئی وضاحت نہیں ہوتی۔" موبائل جیب میں رکھتے احمر نے چابیوں کا گچھا اٹھایا اور راہداری کی سمت بڑھ گیا۔

"اگر تمہیں خود جانا تھا تو کیوں بلایا مجھے؟" اس نے بےزاری سے پکارا۔

"یہ بتانے کے لیے کہ میں آج کے بعد اس کو چڑیل نہیں کہوں گا۔ دراصل آج مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اتنی بری نہیں ہے' جتنی کورٹ میں مجھے لگا کرتی تھی۔ اور ہاں!" دروازہ کھولتے کھولتے وہ رکا۔ مڑ کر سنجیدگی سے دور بیٹھے فارس کو دیکھا۔ "میرا خیال ہے وہ جو تمہارے ساتھ کر رہی ہے' تم وہ ڈیزرو کرتے ہو۔" پھر الوداعی انداز میں ہاتھ ہلایا اور باہر نکل کر دروازہ بند کر دیا۔

"بدتمیز۔" پہلے سے خراب موڈ اسٹیپنی نے مزید خراب کر دیا تھا۔ وہ اسٹول دھکیلتا خود بھی جانے کے لیے اٹھا اور یہ تب ہی تھا' جب ندرت کا فون آیا۔

"میں نے زمر کو کال کی تھی' اس نے بتایا وہ آفس میں ہے۔ تم دونوں یوں کرو' دوپہر میں ہماری طرف آجاؤ' سعدی صبح کہہ کر گیا تھا کہ شام کو ریسٹورنٹ کو کسٹمرز کے لیے بند کر کے باربی کیو کریں گے۔"

"رات کو ہاشم نے کھانے پہ بلایا ہے۔"

"میں نے زمر سے بات کر لی ہے' وہ کہہ رہی ہے' ہاشم سے معذرت کر لے گی۔ تم بھی آجاؤ۔" اور ندرت عجلت میں فون کاٹ گئیں۔ فارس نے بےزاری سے موبائل کو تکا۔

"اگر ہاشم سے معذرت کرنی ہی تھی تو میرے سامنے ہاں کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" بےحد برے موڈ میں وہ وہاں سے نکلا تھا۔

☼ ☼ ☼

سانس روکے کھڑا تھا ملک الموت
سامنا دیپ کو ہوا کا تھا

چھوٹے باغیچے والے گھر کے لاؤنج کو کولر نے ٹھنڈ بخش رکھی تھی۔ کھانے کے برتن اٹھائے جا چکے تھے'

ندرت خوشی خوشی زمر کو کچھ بتا رہی تھی جو صوفے پہ بیٹھی' زمی سے مسکرائی ان کو دیکھ رہی تھی۔ حنہ قریب میں پیر اوپر کر کے بیٹھی' ڈائجسٹ پڑھتے ہوئے ناخن چبا رہی تھی۔

"فارس کو دیکھو' آیا ہی نہیں' کب سے فون کیا تھا اسے۔" ندرت نے گھڑی دیکھتے ہوئے قدرے خفگی سے کہا۔ زمر بدقت مسکرائی۔

"سعدی کب آئے گا؟" موضوع تبدیل کیا۔

"پتا نہیں' آج کسی کام سے گیا تھا' شاید دیر ہو جائے۔"

اور عین اسی وقت بیرونی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ان تینوں نے بے اختیار اس طرف دیکھا۔ وہ شاید تیزی سے اندر آیا تھا' اس لیے اگلے ہی لمحے راہداری عبور کر کے چوکھٹ پہ آن رکا۔ کوٹ پہنا ہوا تھا' مگر ٹائی ڈھیلی تھی' بال قدرے بکھر چکے تھے' اور دھوپ کی تمازت سے چہرہ تمتمایا ہوا لگ رہا تھا۔ ساتھ میں پسینہ بھی تھا۔ مگر یہ اس کا حلیہ نہیں' کچھ اور تھا جس کے باعث وہ سب اس کو دیکھنے لگے۔

جارحانہ انداز اور آنکھوں میں دبا غصہ۔ زمر کو دیکھ کر وہ چوکھٹ پہ تھما' سرخ غصیلی آنکھوں سے حنہ کو دیکھا۔ گردن ترچھی کر کے اشارہ کیا۔ "بات سنو میری!"

نہ سلام' نہ کچھ۔ حنین کے رسالہ پکڑے ہاتھ نم ہونے لگے۔ چہرہ بے رنگ ہوا۔ بھائی کو پتا چل گیا۔ حنہ ڈیڑھ برس کی محنت کے بعد بھی اپنا اعتبار کھونے سے نہیں بچا سکی۔ سب اکارت گیا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

زمر کی نظروں نے سعدی سے حنین کے چہرے تک کا سفر کیا اور ایک دم پریشان نظر آنے لگی۔ سعدی کہہ کر رکا نہیں' مڑ گیا۔ حنہ مرے مرے قدموں سے اٹھی اور اس کے پیچھے گئی۔

"سعدی۔" ندرت نے فکرمندی سے پکارا' مگر اس نے نہیں سنا۔ وہ کمرے میں آیا' کوٹ اتار کر کرسی پہ ڈالا' اور پلٹا تو حنہ انگلیاں موڑتی اس کے سامنے کھڑی ہوئی۔ سعدی نے دروازہ پاؤں سے دھکیل کر بند کیا اور اس کی جانب گھوما۔ (دروازہ چوکھٹ سے ابھی چار انچ دور تھا جب باہر سے زمر نے ہینڈل تھام لیا۔ ذرا سی درز باقی رہ گئی۔)

"تمہارے آخری پیپر میں' جولاء اسکول میں کیا ہوا تھا؟ ہاں' کیا ہوا تھا؟" وہ طیش سے اسے گھورتے دو قدم مزید قریب آیا۔ حنہ نے ڈرتے ڈرتے پلکیں اٹھائیں۔

"آپ کو کس نے بتایا؟"

"حنین! میں نے تمہیں رکھ کر تھپڑ مارنا ہے اگر تم نے مجھے سیدھی طرح پوری بات نہ بتائی تو۔ تم چیٹنگ کرتے پکڑی گئی تھیں اور تم نے ہاشم کو بلایا تھا' ہاں؟"

حنین کی سعدی کا چہرہ تکتی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ذرا سا اثبات میں سر ہلایا۔ سعدی کے قدموں تلے زمین سرکنے لگی۔ ہاشم سچ کہہ رہا تھا۔ اس کے کان سرخ ہوئے۔

"تمہارا بھائی مر گیا تھا جو اس گھٹیا آدمی کو بلایا تم نے؟" وہ بے حد غم و غصے سے دھاڑا تھا۔

"تمہیں کیا پرابلم ہے اس بات سے؟" زمر ٹھنڈے انداز میں گھستی اندر داخل ہوئی۔ حنہ نے نم آنکھوں سے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ حنین کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ سعدی کے مقابل۔

"زمر! میں اپنی بہن سے بات کر رہا ہوں' آپ درمیان میں مت آئیں۔" اس نے غصے کو ضبط کرتے بمشکل لحاظ کیا۔ وہ سینے پہ بازو لپیٹے وہیں کھڑی رہی۔ ہلی بھی نہیں۔

"مگر میں تم سے بات کر رہی ہوں۔ ہاشم کو بلانے کے لیے میں نے کہا تھا اسے۔ اس نے پہلا فون مجھے کیا تھا۔" سعدی کی آنکھوں میں دیکھ کر اسی سکون سے بولی۔ حنین کا دل دھک سے رہ گیا۔

"مجھے پتا ہے' آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ آپ کو اس بات کا علم بھی نہیں تھا۔" وہ اتنے ہی غصے سے بولا۔

"شاید تم بھول گئے ہو کہ میں تم سے آٹھ سال بڑی ہوں۔ اس لیے پہلی بات' مجھ سے ذرا تمیز سے بات کرو۔ دوسرا یہ کہ مجھے تم سے جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرا فون ریکارڈ چیک کرلو بے شک۔"

سعدی کے تنے کندھے قدرے ڈھیلے پڑے' مگر غصہ بھری آنکھوں میں شکوک و شبہات لیے وہ زمر کو دیکھتا رہا۔

"اچھا اگر آپ کو یہ بات پتا تھی تو کیا نام ہے اس وکیل کا جو اس لاء کالج کا منتظم ہے اور جس سے ہاشم نے بات کرکے اس کو..." غصیلی نظر حنین پہ ڈالی۔ "اس مسئلے سے نکلوایا تھا؟"

"راجہ عبدالباسط' ممبر ہائی کورٹ بار۔ کیا گھر کا ایڈریس بھی دوں ان کا؟" وہ اتنی برہمی سے بولی کہ سعدی کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ باری باری ان دونوں کے چہرے دیکھے۔

"اگر حنین نے آپ کو کال کیا تھا تو آپ خود کیوں نہیں گئیں؟ ہاشم کو کیوں انوالو کیا میرے گھر کے معاملے میں؟" وہ اب بھی مشکوک تھا اور غصہ پھر سے چڑھنے لگا۔

"کیوں کہ میں دن میں پچیس کام کرکے دیتی ہوں اس کے' دو چار وہ کردے گا تو احسان نہیں کرے گا۔" وہ خفگی سے کہہ رہی تھی۔ "اس وکیل سے میرے تعلقات اچھے نہیں ہیں' اس کے گروپ کو ووٹ نہیں دیا تھا میں نے' دوسرے بھی کئی مسئلے ہیں میرے ساتھ۔ میں جاتی تو مسئلہ مزید بگڑتا' اس لیے میں نے حنہ سے کہا کہ ہاشم کو کال کرتی ہوں۔ میرے کرنے سے پہلے حنہ نے کردی کال اور وہ پہنچ بھی گیا۔ تمہیں کیا پرابلم ہے اس سب سے؟"

"تم نے..." سعدی کے چہرے پہ اشتعال ابھرا' انگلی اٹھا کر سنگین انداز میں پوچھا۔ "تم نے چیٹنگ کی تھی یا نہیں؟"

اور یہ وہ سوال تھا جس کا جواب زمر کو بھی معلوم نہیں تھا' سو وہ اسی اطمینان سے حنین کی طرف مڑی۔

"ہو تو بھی حنین' اپنی پوزیشن کلیئر کرو' کھا نہیں جائے گا وہ تمہیں۔"

اور حنین جو اس وقت مختلف کیفیات کا شکار ہو رہی تھی' اس کا دل بھر آیا۔ آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ "میں نے چیٹنگ نہیں کی تھی' پچھلی لڑکی نے ٹشو میں نقل لکھ کر مجھے دی کہ اگلی کو دوں۔ وہ ٹشو میرا نہیں تھا' نہ میں نے کچھ پڑھا اس میں۔ میں نے تو صرف ٹشو پاس کیا تھا۔ انویجیلیٹر نے مجھے دیکھا دوسروں کو نہیں' بس مجھے اٹھا دیا اور پھر..." وہ سارا واقعہ ٹھیک ٹھیک بتانے لگی۔

"تمہیں نہیں پتا تھا اس ٹشو میں کیا لکھا ہے؟" وہ سختی سے پوچھ رہا تھا اور ایک ہی نکتہ تھا جہاں پہنچ کر پچھلے دو ہفتے سے حنین کا دل ڈوبتا تھا۔

"مجھے پتا تھا مگر..."

اور سعدی نے بے زاری سے سر جھٹکا۔ "تمہیں پتا تھا اور پھر بھی تم نے ٹشو آگے پاس کیا' تم نے ان کی اعانت کی۔ تم ان کی چیٹنگ میں شریک بنیں۔" نفی میں سر ہلاتے اس نے غصے اور صدمے سے حنہ کو دیکھا جس کے آنسو مزید تیزی سے گرنے لگے تھے۔ "تم نے مجھ سے وعدہ کیا تھا حنین۔"

"اچھا اگر تم اس کی جگہ ہوتے تو کیا کرتے؟" زمر نے اس کی توجہ حنین سے ہٹائی۔

"میں اسی وقت کھڑا ہو کر وہ ٹشو انویجیلیٹر کے حوالے کر دیتا۔ اعانت جرم' جرم کرنے کے برابر ہوتی ہے۔"

"تم ایسا کر بھی سکتے ہو کیوں کہ تمہارے ساتھ کمرا امتحان میں لڑکے ہوتے' جو تھانے چلے جائیں' پرچہ کٹ جائے اور تین سال امتحان نہ دے سکیں تو کوئی قیامت نہیں آتی' مگر حنہ کے ساتھ لڑکیاں تھیں اور ان کی عزت اگر خاک میں ملے تو پورا خاندان تباہ ہوتا ہے سعدی۔ کیا یہ ان دو لڑکیوں کو ایک غلطی کی اتنی بڑی سزا دیتی؟" وہ تیز لہجے میں اس سے مخاطب تھی۔ ساتھ ہی آنکھوں میں بے پناہ برہمی تھی۔

سعدی کے ماتھے کی تیوریاں قدرے ڈھیلی پڑیں' مگر پوری طرح نہیں۔

"اور اب کیا ہوگا؟ وہ وکیل اس چیز کو اب بھی استعمال کر سکتا ہے۔"

"تمہیں لگتا ہے' میں اسے یہ کرنے دوں گی؟"

اس نے الٹا حیرت سے سعدی سے پوچھا۔ کوئی بوجھ سا تھا جو سعدی کے دل سے سرکنے لگا۔ وہ رخ موڑ کر گہرے سانس لیتا خود کو کمپوز کرنے لگا۔ حنہ فکرمندی سے باری باری دونوں کا چہرہ دیکھتی۔ اس کا سانس ابھی تک اٹکا تھا۔

"مجھے کیوں نہیں بتایا' ہاں؟" اس نے ملامتی نظروں کا رخ زمر کی طرف کیا۔

"تمہیں بتاتی تاکہ تم وہ کرو جو ابھی کر رہے ہو۔ آخر میں ہو تو فارس کے ہی بھانجے نا۔ (فی الحال وہ دونوں بھانجی بھانجے اس ریفرنس پہ احتجاج کرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے۔ وہ اسی تیز برہم انداز میں بولتی گئی۔) اور تم کیا کر لیتے وہاں آکر سوائے مسئلہ بڑھانے کے؟ میں نے وہی کیا جو مجھے ٹھیک لگا۔ حنہ نے بھی وہی کیا جو اسے ٹھیک لگا۔ زیادہ اسمارٹ بننے کی ضرورت نہیں ہے' جب تم انگلینڈ میں مزے کر رہے تھے۔ (سعدی نے اس لفظ پہ بے اختیار ابرو اٹھائی۔) تو یہاں زمر اور حنین اپنے مسئلے خود حل کر رہی تھیں۔ کیا ہم نے تمہیں بتایا حنہ کی اس کلاس فیلو کے بارے میں جو اسے ہراساں کر رہی تھی' یا اس وائس پرنسپل کے بارے میں جو غلط طریقے سے اس کی محنت چرانا چاہ رہی تھی' یا ان لوگوں کے بارے میں جن کو میں اور حنہ کمپیر جا کر ان کی غیر قانونی جائیداد کے خلاف کارروائی کی دھمکی دے کر آئے تھے۔ ہم نے تو بہت سارے مسئلے اکٹھے سلجھائے ہیں' کس کس کا بتاؤں میں تمہیں؟"

ایک واقعہ کو تین سے ضرب دے کر اس نے کہا تو سعدی کا غصہ جاتا رہا۔ وہ واقعی فکر فکر دونوں کی شکل دیکھنے لگا۔

"میری بات کان کھول کے سنو سعدی! آئندہ اس لہجے میں اپنی بہن سے بات مت کرنا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔" انگلی اٹھا کر سختی سے اس کو وارننگ دی۔ "اب باہر نکلو تو تم دونوں کا موڈ ٹھیک ہونا چاہیے۔ بھابھی کو بھنک بھی نہیں پڑنی چاہیے۔" ایک آخری ناراض نظر ان پہ ڈال کر وہ باہر نکل گئی۔

پیچھے سعدی اور حنین کے درمیان خاموشی حائل ہو گئی۔ وہ جھکی بھیگی پلکوں کے ساتھ کھڑی تھی اور وہ گو کہ ابھی تک خفگی سے اسے دیکھ رہا تھا' مگر صاف ظاہر تھا' وہ ٹھنڈا ہو چکا ہے۔

"آئی ایم سوری۔ میں نے صرف اس لیے نہیں بتایا کہ مجھے لگا' آپ مجھے غلط سمجھیں گے' مگر میں آپ کو بتانے والی تھی۔"

"اگر تم غلط نہیں تھیں تو میں تمہیں کیوں غلط سمجھتا؟ زمر جو بھی کہیں' تم لوگوں کو مجھ سے کچھ چھپانا نہیں چاہیے۔ ہم ایک فیملی ہیں' ہم ایک دوسرے سے باتیں نہیں چھپا سکتے۔"

"آپ نے کہا تھا کہ اگر آپ نے دوبارہ چیٹنگ کا سنا تو ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔"

"اُفوہ!" سعدی نے جھلا کر سر جھٹکا۔ "امی دن میں پچاس دفعہ کہتی ہیں کہ تمہاری ٹانگیں توڑ دیں گی' کبھی آج تک توڑیں؟"

حنین نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا' پھر نفی میں سر ہلا دیا۔

"انسان تنبیہہ کرتے ہوئے بہت سی باتیں کہہ دیتا ہے' ایسا کرنا تھوڑا ہی ہوتا ہے؟ ہم ایک خاندان ہیں' تم لاکھ دفعہ غلطی کرو' میں تمہیں نہیں چھوڑوں گا' میں تمہارا بھائی ہوں۔ موت کے علاوہ کوئی چیز ہمارے درمیان نہیں آسکتی۔"

اور موت کا لفظ اتنا اداس کر دینے والا تھا کہ حنین کا دل لرز گیا' مگر وہ کہہ رہا تھا۔ "میری بات سنو' اب تم کبھی بھی آئندہ ہاشم کو نہیں بلاؤ گی۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ تم مجھے بلاؤ گی' میں نہیں ہوں تو تم زمر کو بلاؤ گی' مگر کبھی بھی ہاشم پہ بھروسا نہیں کرنا۔"

"وہ ویسے نہیں ہیں جیسے آپ ان کو سمجھتے ہیں۔ وہ ہمارے لیے اتنا کرتے ہیں اور ہم۔۔۔"

"بالکل بالکل Saint Hashim (ولی ہاشم)

کی برائی تو میرا خاندان سن ہی نہیں سکتا۔" افسوس سے اس نے حنہ کو دیکھا۔ "بہرحال ہم اس بارے میں بعد میں بات کریں گے۔ ابھی میں فریش ہولوں۔" حنین نے بھی سکھ کا سانس لیا۔ باہر نکلی تو سعدی کچھ یاد آنے پہ ساتھ ہی باہر آیا۔ زمر ندرت کے ساتھ لاؤنج میں بیٹھی تھی۔

"مجھے کچھ کام کرنا ہے، پھر میں چاہتا ہوں کہ آپ سب ریسٹورنٹ میں جمع ہو جائیں رات کے کھانے کے لیے۔ مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔" اس نے اب ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اطلاع دی۔ زمر مسکرا دی، سر کو خم دیا۔ وہ پلٹ گیا۔ اس کے جاتے ہی زمر نے حنین کو اشارہ کیا اور وہ ندرت سے معذرت کر کے حنین کے کمرے میں چلی آئیں۔ زمر نے دروازہ بند کیا اور جب اس کی طرف گھومی تو چہرے پہ ڈھیروں غصہ تھا۔

"تم نے ہاشم کو کال کیا؟ ہاشم کاردار کو؟" غصے اور صدمے سے دبی آواز میں پوچھی۔ اس نے حنین کو کہنی سے پکڑ کر جھٹکا دیا۔

"وہ میرے مقروض تھے، مجھے میری سمجھ میں نہیں آیا اور کیا کروں۔ میں۔" اس نے تفصیل سے ایک ایک بات بتا دی۔

"سعدی کو کس نے بتایا؟" اس نے غصے سے گھورتے بات کاٹی۔

"پتا نہیں، انہوں نے نہیں بتایا۔"

"ظاہر ہے ہاشم نے بتایا ہو گا۔"

"کبھی بھی نہیں۔ وہ نہیں بتا سکتے۔ کسی اور نے بتایا ہو گا۔" حنین نے جتنے وثوق سے کہا، زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ آنکھوں میں تعجب گہرا ہوا۔

"ہاشم اچھا آدمی نہیں ہے حنہ! کبھی دوبارہ اس کو اپنے مسئلوں کے لیے نہیں بلانا۔ اچھا؟"

"اچھا۔" وہ خفیف سی ہو کر رہ گئی۔ پھر یاد آیا۔

"آپ کو کیسے پتا ان وکیل صاحب کا نام؟"

"تم نے خود بتایا تھا کہ تم کہاں ایگزام دے رہی ہو۔ وہاں ایک ہی سینئر لائیر ہیں۔ میں جانتی ہوں ان کو۔"

"اوہ۔ تو باقی سب سچ تھا۔"

"اب قیامت تک سعدی کو پتا نہ چلے کہ تم نے مجھے کال نہیں کی تھی، اوکے؟" موبائل پہ نمبر ملاتی وہ باہر کی طرف بڑھی، پرس بھی جس انداز سے کندھے پہ ڈالا، حنین نے حیرانی سے اسے دیکھا۔

"آپ کہاں۔؟"

"مجھے ایک رپورٹ اٹھانے جانا ہے لیب، شام تک آجاؤں گی، مگر سنو۔" جاتے جاتے دوبارہ سختی سے تنبیہہ کی۔ "آئندہ کوئی بھی مسئلہ ہو، تم اسے نہیں، مجھے بلاؤ گی۔ چاہے تمہیں مجھ سے کتنی ہی نفرت کیوں نہ ہو۔؟"

آخری الفاظ پہ حنین کا دل ایک دم خالی ہو گیا۔ وہ وہیں شل سی کھڑی رہ گئی۔ زمر اس کو دیکھے بغیر موبائل پہ بٹن دباتی آگے بڑھ گئی۔ کھڑے کھڑے ندرت کو کام کا بتایا، اور پھر اسی طرح موبائل پہ دیکھتی راہداری پار کی اور دروازہ کھولا تو۔ وہ سامنے کھڑا تھا۔ ہینڈل پہ ہاتھ رکھنے لگا تھا، اسے دیکھ کر رک گیا۔ زمر نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا، پھر واپس موبائل پہ نظریں جھکائے ایک طرف ہو گئی۔ وہ خاموشی سے اندر آیا اور وہ باہر نکل گئی۔ فارس گردن موڑ کر اسے جاتے دیکھتا رہا۔ دل میں چھپا کرب اور آنکھوں کا حزن مزید بڑھ گیا۔

"تم نے اس کا دل توڑا ہے۔ مجھ سے پوچھو تو یہ زیادہ بڑا گناہ ہے۔"

جس وقت وہ ندرت سے مل رہا تھا، اور حنین کھڑکی سے باہر زمر کو جاتے دیکھ رہی تھی، اندر سعدی اپنے باتھ روم سے تازہ دم ہو کر نکل رہا تھا۔ گیلے بال تولیے سے رگڑتے، سفید آدھی آستین کی ٹی شرٹ اور نیلی جینز پہنے وہ پہلے سے بہت ہلکا پھلکا لگ رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ لاک کیا۔ اور وہ کوٹ، جو آج پہن کر گیا تھا، اسے اٹھا کر کمپیوٹر چیئر پہ آبیٹھا۔ لیپ ٹاپ آن کیا۔

"سو ہاشم بھائی۔ سعدی یوسف ایک معصوم، بے وقوف بچہ ہے نا۔" کوٹ کی اوپری جیب سے پین نکالا،

اور کوٹ کو پیچھے بیڈ پہ اچھال دیا۔

"اور یہ معصوم بچہ اتنا ھاضر ہے کہ آپ کو جا کر کہتا ہے کہ اعتراف جرم کر کے معافی مانگ لیں' اور دیت ادا کریں۔ آپ کے خیال میں سعدی آج آپ کے پاس اس لیے آیا تھا؟" وہ تھکن سے مسکرایا۔ لیپ ٹاپ اسکرین روشن ہو چکی تھی۔

"نہیں ہاشم بھائی' میں آپ کے پاس "اس" لیے آیا تھا۔" اپنے پین کو دیکھتے ہوئے وہ بڑبڑایا' اور پھر پین کا ڈھکن کھولا۔ اندر نب نہیں تھی۔ اس کی جگہ یو ایس بی پلگ تھا۔ سعدی نے اسی مسکراہٹ کے ساتھ پلگ لیپ ٹاپ میں داخل کیا۔

"مجھے صرف آپ کا اعتراف جرم چاہیے تھا ہاشم بھائی۔ اور وہ مجھے مل گیا۔" پین لیپ ٹاپ میں لگ چکا تھا' اور اب وہ اسکرین پہ وہ دکھا رہا تھا جو اس میں لگے ننھے کیمرے نے ریکارڈ کیا تھا۔ سعدی کی اوپری جیب میں لگا قلم' ہاشم کے آفس میں داخل ہونے سے لے کر وہاں سے نکلنے تک' تمام مناظر بہترین کوالٹی میں عکس بند کرتا آیا تھا۔ چونکہ زیادہ وقت اس کے سامنے ہاشم اور جواہرات رہے تھے اس لیے وہ اسکرین پہ بالکل سامنے نظر آئے تھے۔ پرائم ٹائم پہ جیسے انٹرویو ریکارڈ کروا رہے ہوں۔

"میری بات پہ کوئی یقین نہیں کرے گا مگر کیا آپ کی اپنی بات پہ بھی کوئی یقین نہیں کرے گا؟" اس نے گہری سانس بھرتے اس نے کرسی پہ ٹیک لگائی۔

"آپ لوگوں نے فارس غازی کو پھنسایا ٹیکنالوجی استعمال کر کے۔ اب آپ دیکھیے کہ میں یہی ٹیکنالوجی آپ کو کیسے لوٹاتا ہوں۔ میں ایک بے وقوف بچہ نہیں ہوں۔ آپ بھول گئے کہ میں ایک سائنس دان ہوں۔"

ویڈیو بہترین کوالٹی اور کلیئر آواز کے ساتھ اس کے سامنے چل رہی تھی' اور وہ بازوؤں کا تکیہ بنا کر سر رکھے ٹیک لگائے اطمینان سے اسے دیکھ رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

جان محسن تو بھی تھا ضدی اتنا مجھ میں بھی تھی

دونوں خود سر تھے جھکا تو بھی نہیں میں بھی نہیں

دوپہر باسی ہو کر شام میں ڈھل گئی اور سارے شہر پہ نیلا سا اندھیرا پھیلنے لگا۔ ایسے میں چھوٹے سے غیچے والے گھر کے لاؤنج میں رونق لگی تھی۔ بڑے ابا نرمی سے مدھم آواز میں فارس سے کچھ کہہ رہے تھے' جسے وہ سنجیدگی سے سن رہا تھا' البتہ گاہے بگاہے ابا ایک پُر تشویش نگاہ زمر پہ بھی ڈالتے جو فارس کے ساتھ بیٹھنے کے بجائے سامنے بیٹھی تھی۔ وہ تو بیاہتا لڑکیوں کی طرح ہی لگ رہی تھی' شیفون کے ہلکے کام والے لمبے نیوی بلیو گاؤن اور سلک پاجامے میں ملبوس' جھکے چہرے پہ میک اپ بھی نظر آ رہا تھا' اور کانوں میں آویزے بھی' مگر وہ جس طرح سامنے جا کر بیٹھی تھی' اور ابھی تک فارس سے مخاطب نہیں ہوئی تھی' یہ یوسف صاحب کو کھٹک رہا تھا۔

ندرت بھی نیا جوڑا پہنے اندر کمرے میں تیار ہو رہی تھیں۔ میک اپ کے لیے حنین کی محتاج تھیں' بیڈ پہ بیٹھی اسے سخت سست سناتے ہوئے جلدی کرنے کا کہہ رہی تھیں' جس کی اپنی تیاری ختم ہونے میں نہیں آ رہی تھی۔ یہ ڈنر ریسٹورنٹ میں سعدی کی طرف سے تھا اور اس کا پلان تھا کہ سب مل کر باربی کیو کریں گے۔ ویٹر فارغ۔ ای کو بھی ریسٹ ملے گا۔ البتہ وہ خود تھوڑی دیر پہلے باہر نکلا تھا۔ کہاں' اس نے نہیں بتایا۔

"حنین! میری اچھی بچی' جلدی کرو' میرے لپ اسٹک لگا دو۔" ندرت بیڈ پہ بیٹھیں' اسے مسلسل پکار رہی تھیں۔ (میک اپ کے لیے بیٹیوں کی محتاج مائیں۔) وہ جلدی سے واپس پہنچی ان تک آئی۔

"نہیں نہیں' صبح کون کہہ رہا تھا مجھے نکمی' پھوہڑ حنین۔" ان کے سامنے کھڑے' جھک کر ان کو لپ اسٹک لگاتے وہ ترنت بولی تھی۔ بھائی سے صلح ہو گئی' ایک بوجھ دل سے ہٹ گیا' وہ بھی موڈ میں آ گئی تھی۔ اب ندرت نہ بول سکتی تھیں' نہ جوتا اتار نے ہاتھ پاؤں تک نیچے لے جا سکتی تھیں۔ (ذرا یہ لپ اسٹک مکمل کر لے نا!)

"تمہاری جاب کا کیا بنا؟" باہر لاؤنج میں فارس نے

بظاہر توجہ سے ابا کا سوال سنا، مگر ان کی بار بار زمر کی طرف اٹھتی فکر مند نگاہیں اسے نظر آرہی تھیں۔

"اپنی ایجنسی میں تو کوئی چانس نہیں رہا، ایک دو پرائیویٹ سیکیورٹی ایجنسیز میں اپلائی کیا تھا، پاشت کرلیا ہے، ہیم سے جوائن کرنا ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔" ابا نے پھر زمر کو دیکھا' جو لاتعلقی سے سامنے بیٹھی موبائل پہ ٹائپ کیے جارہی تھی۔

"زمر!" فارس نے عام سے انداز میں اسے پکارا تو زمر نے چونک کر اسے دیکھا۔ پھر ابا کو جو اسے ہی دیکھ رہے تھے۔

"آپ ادھر کیوں بیٹھی ہیں؟ ادھر آجائیں نا۔" اس نے بڑے صوفے پہ اپنے ساتھ خالی نشست کی طرف اشارہ کیا۔ بڑے ابا خاموشی سے زمر کو دیکھے گئے۔

اس نے جیسے ڈھیروں غصہ ضبط کیا' بدقت مسکرائی۔ البتہ آنکھوں میں فارس کے لیے شدید تپش تھی۔

"سوری۔ آپ لوگوں کو وقت نہیں دے پارہی۔ کچھ ای میلز کرنا تھیں۔" بظاہر مسکرا کر کہتی وہ اٹھی اور جب اس کے ساتھ بیٹھی تو درمیان میں نامحسوس سا فاصلہ رکھا۔ بڑے ابا غور سے اس کے چہرے کے اتار چڑھاؤ دیکھ رہے تھے۔

"سعدی کیا کہہ رہا تھا؟ کب آئے گا وہ۔" فارس نے چہرہ موڑ کر اسے مخاطب کیا۔ ساتھ ہی آنکھوں سے اشارہ کیا۔ (بڑے ابا دوسری سمت بیٹھے تھے' اس لیے اس کے چہرے کے تاثرات نہیں دیکھ سکتے تھے۔) وہ اسے ابا کے سامنے مخاطب کر رہا تھا' اسے جواب دینا تھا۔

"وہ ابھی آجائے گا تو تھوڑی دیر تک۔" اندر اٹھتے ابال کو دبا کر وہ مسکرا کر بولی۔ ابا کے چہرے پہ اطمینان سا چھانے لگا۔ اندر سے آتی ندرت چلنے کا کہنے لگیں تو وہ اس طرف دیکھنے لگے۔ زمر نے اسے تیز نظروں سے گھورا، مگر وہ اسی سنجیدگی سے واپس ابا کی طرف متوجہ ہوگیا۔ وہ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے' پھر سے موبائل دیکھنے لگی۔ البتہ اندر کوئی ابال سا اٹھنے لگا تھا۔ (یہ سب اتنا آسان نہیں تھا جتنا شروع میں لگا تھا۔)

"چلیں' ہم ریسٹورنٹ چلتے ہیں' سعدی وہیں آجائے گا۔" ندرت نے جلدی مچائی اور سیم نے ابا کی چیئر تھامی۔ حنین گھر کے دروازے لاک کرنے لگی۔ زمر اور فارس ساتھ ساتھ اٹھے۔ بڑے ابا نے سیم سے آہستہ سے کچھ کہا' وہ مڑ کر ان دونوں کو دیکھنے لگا۔ پھر جلدی سے حنین سے کیمرہ لے آیا۔

"آپ دونوں کی ایک پکچر لے لوں؟ امی آپ بھی آجائیں نا۔"

"نہیں میری تصویریں اچھی نہیں آتیں۔" ندرت دوسرے کاموں میں مصروف تھیں' منع کر گئیں۔ زمر نے بھی انکار کرنے کے لیے لب کھولے' پھر ان آنکھوں سے دیکھا' ابا اسی جانب دیکھ رہے تھے۔ وہ جبراً" مسکرائی۔ ساتھ کھڑے فارس پہ سرسری سی نظر ڈالی۔ وہ سیاہ پینٹ پہ پورے آستین اور گول گلے کی سفید شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ (اس کی ساری شرٹس ایک جیسی ہوتی ہیں!)

سیم کیمرہ لے کر سامنے آکھڑا ہوا۔ فارس مسکرایا نہیں' بس اسی سنجیدگی سے زمر کے ساتھ کھڑا رہا۔ البتہ وہ جبراً" مسکرائی رہی۔ کلک۔ اور دکھاوا ختم۔ وہ اس سے پہلے ہی باہر نکل آئی۔ اب مزید اس کے قریب رہنا برداشت سے باہر تھا۔

اور باہر پھیلتے اندھیرے کو دیکھ کر پہلی دفعہ تھا جب زمر کو ایک دم سے فکر ہونے لگی۔

"سعدی کو اب تک آجانا چاہیے تھا۔ کدھر رہ گیا؟" وہ خود سے بڑبڑائی۔

"بس وہ آتا ہی ہوگا۔" ندرت عجلت سے' خوشی سے گھر لاک کر رہی تھیں۔ زمر کی آنکھوں میں تفکر ہلکورے لینے لگا۔ کچھ ٹھیک نہیں محسوس ہو رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

سلوک یار سے دل ڈوبنے لگا ہے فراز

مگر یہ محفل اعدا ہے، کیا کیا جائے!

قصر کاردار اندھیرے میں ڈوبنے لگا تو ملازموں نے ساری بتیاں جلادیں اور لونچا محل چمکنے لگا۔ لاؤنج میں ایک ملازم گملے پہ جھکا پتے تراش رہا تھا اور فینونا اس کے سر پہ کھڑی ہدایات دے رہی تھی، جب ہاشم اندر داخل ہوا۔ فینونا فوراً اس تک آئی۔ پیچھے آتے ملازم سے ہاشم کا بریف کیس لے لیا اور اسے جانے کا کہا۔ وہ کوٹ اتارتے ہوئے سیڑھیوں کی طرف چلا گیا۔ فینونا پیچھے لپکی۔

"کیا بات ہے ڈنر کی تیاری نہیں ہو رہی کیا؟"

"مسز مرنے مسز کاردار کو فون کر کے معذرت کرلی تھی۔ مسز کاردار نے کل کے ڈنر کا کہہ دیا ہے۔"

"کیوں؟" سیڑھیاں چڑھتے ہاشم نے تعجب سے مڑ کر اسے دیکھا۔

"تفصیل نہیں معلوم۔ غالباً" ان کے بھتیجے نے پہلے دعوت دے دی تھی۔"

"سعدی۔" ہاشم نے زخمی سا مسکرا کر سر جھٹکا اور زینے چڑھتا گیا۔ فینونا بے چین سی پیچھے آئی۔ وہ کمرے میں داخل ہوا تو فینونا نے اس کا کوٹ لے لیا۔ بریف کیس بھی احتیاط سے رکھا۔

"کچھ کہنا ہے؟" وہ ٹائی ڈھیلی کر کے اتارتے ہوئے دوسرے ہاتھ میں موبائل نکال کر دیکھنے لگا۔

"جی۔ مگر آپ کسی کو نہیں بتائیں گے کہ آپ کو مجھ سے معلوم ہوا ہے۔" وہ مضطرب سی اس کے سامنے کھڑی سر جھکائے کہہ رہی تھی۔

"ہوں۔"

"مجھے معلوم ہے مجھے گھر کے ایک فرد کی بات دوسرے کو نہیں بتانی چاہیے، مگر آپ کے خاندان سے وفاداری کے باعث میں۔"

"اپنی تقریر مختصر کر کے کام کی بات پہ آؤ۔ مجھے تمہاری اخلاقیات سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ موبائل کی اسکرین کو انگوٹھے سے اوپر کرتا جا رہا تھا۔

"جی۔" وہ شرمندہ سی ہو کر جلدی جلدی کہنے لگی۔ "وہ نوشیرواں صاحب کے متعلق بات کرنا چاہتی ہوں۔"

اسکرین پہ انگوٹھا پھیرتے ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔ "کیوں؟ کہاں ہے وہ؟"

"وہ تو صبح آفس کے لیے نکلے تھے اس کے بعد گھر نہیں آئے۔"

"کیا واقعی؟" اسے اچنبھا ہوا۔

"گھر میں پچھلی رات کا ذکر کرنا چاہتی ہوں۔ جب۔" وہ بے چینی سے جلدی جلدی بتانے لگی۔ ہاشم ابرو بھینچے سنتا گیا۔

⁂ ⁂ ⁂

میرے چارہ گر کو نوید ہو صف دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر وہ قرض آج چکا دیا

اندھیرا آہستہ آہستہ چھوٹے باغیچے والے گھر اور اس کالونی کو نگل چکا تھا۔ نوشیرواں کاردار اپنی گاڑی نہیں دور کھڑی کر کے اس کالونی کے ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا تھا۔ بجلی گئی ہوئی تھی۔ ساری گلی سنسان اندھیرے میں ڈوبی تھی۔ کہیں اکا دکا یو پی ایس کے انرجی سیور جل رہے تھے۔ باقی گھپ اندھیرا تھا۔ جس کے باعث کیپ پہنے کھڑے نوشیرواں کا چہرہ دور سے صاف دکھائی نہ دیتا تھا۔ ہاں قریب سے دیکھو تو وہ کینہ توز نظروں سے اس گھر کو گھور تا دکھائی دے رہا تھا۔ جس کے باہر سعدی کھڑا موبائل پر نمبر ملا رہا تھا۔ نوشیرواں کی آنکھیں سرخ لگتی تھیں اور پپوٹے سوجے سے۔ جیبوں میں ڈالے ہاتھوں میں لرزش تھی۔ وہ اسی صبح والے ویسٹ، ٹائی اور پینٹ میں ملبوس تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب سعدی گھر سے نکلا تھا اور ابھی اندر زمر اور فارس بڑے ابا کے ساتھ بیٹھے تھے۔ موبائل جیب میں ڈالے، ہینڈز فری کانوں میں لگائے وہ آگے بڑھنے لگا تو نوشیرواں درخت کی اوٹ سے نکلا اور اس کے پیچھے قدم بڑھا دیے۔

سعدی جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، لبوں میں کوئی مدھم سی سیٹی گنگناتا مگن سا چلتا جا رہا تھا۔ دفعتاً"

وہ رکا۔ مڑ کر پیچھے دیکھا۔ احتیاط سے اس کا تعاقب کرتا نوشیرواں قریبی درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ (وہاں ہر گھر کے آگے پودے یا درخت تھے۔) سعدی نے آنکھیں سکیڑ کر اندھیری سڑک کو دیکھا' اور ادھر ادھر گردن گھمائی' پھر سر جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔ نوشیرواں درخت کے عقب سے نکلا اور احتیاط سے فاصلہ رکھے' پھر اس کا تعاقب کرنے لگا۔

سعدی یوسف چلتا گیا۔ موڑ مڑ کر پچھلی گلی میں آگیا۔ یہ بھی تاریکی میں ڈوبی تھی۔ نوشیرواں یہاں بھی اس کے پیچھے چلتا رہا۔ اس کے دل میں ہر اٹھتے قدم کے ساتھ جوش اور ابال بڑھتا جا رہا تھا۔ ایک لاوا تھا جو پھٹنے کو بے تاب سا تھا۔

تیسری گلی میں مڑنے سے قبل سعدی نے پھر رک کر پیچھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں اچنبھا سا تھا۔ گلی ویران اور خالی تھی۔ دور شاید کسی موٹر سائیکل کے چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سر جھٹک کر پھر سے آگے بڑھ گیا۔

ایک گلی سے نکل کر وہ اگلی میں مڑ جاتا۔ چند منٹ بعد نوشیرواں نے چونک کر ادھر اُدھر دیکھا۔ یہ وہی گلی تھی' جہاں سے وہ ابھی پانچ منٹ پہلے نکلے تھے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ انہی تین چار گلیوں میں ہی پھر رہے تھے۔ کیا اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے؟

نوشیرواں کی آنکھوں میں برہمی در آئی۔ اندر ہی اندر شدید تلملاہٹ ہوئی۔ اس نے اپنا اور سعدی کا درمیانی فاصلہ بڑھا دیا۔ دفعتاً" سعدی ایک گلی کا موڑ مڑ کر دوسری میں چلا گیا تو وہ دبے قدموں اس موڑ تک آیا۔ اگلی گلی سنسنان تھی۔ خالی' ویران۔ سعدی کہیں نہیں تھا۔

"ڈیم اٹ!" غصے سے اس کا چہرہ سرخ پڑنے لگا۔ وہ ادھر اُدھر گھوما۔ آگے پیچھے پھرا۔ مکمل اندھیرا۔

اس گلی میں کوئی بتی نہ تھی۔ سوائے دو تین گھروں کے' سڑک کے اطراف کے باقی تمام پلاٹس پہ زیر تعمیر مکان تھے' یا محض سریے کھڑے تھے۔ دن میں یہاں مزدور ہوتے اور رات میں محض جنات۔ نوشیرواں اس گلی کی چوڑی سڑک کے وسط میں کھڑا شدید جھنجلاہٹ سے آگے پیچھے ایک ایک گھر میں جھانک رہا تھا۔ وہ کہاں گیا؟

اس نے پوری گلی عبور کی۔ اندھیرے کے باوجود اطراف میں وہ اتنا دیکھ سکتا تھا کہ سعدی ادھر نہیں تھا۔ دور کہیں راہگیر بولتے ہوئے گزر رہے تھے۔ دو چار گلیاں چھوڑ کر سڑک سے ٹریفک کی آوازیں بھی آ رہی تھیں۔ ایسے میں اس نے رک کر سعدی کی کوئی چاپ سننی چاہی' مگر پس منظر کی آوازوں کے باعث یہ ناممکن تھا۔

وہ پھر سے پچھلی گلی میں آیا۔ شدید تلملاہٹ اور اندر ابلتے غصے سے آگے پیچھے جھانکا۔ مگر نہیں۔ سعدی جس گلی میں گم ہوا تھا' وہ وہیں ہو گا۔ چند منٹ ضائع کر کے نوشیرواں واپس اس زیر تعمیر مکانوں والی ویران اور اندھیری گلی میں آیا۔

سڑک کے وسط میں کھڑے ہوئے اس نے ادھر ادھر دیکھ کر اندازہ کرنا چاہا کہ وہ کہاں غائب ہوا تھا۔ تب ہی دور کہیں موبائل کی گھنٹی بجی۔ اگلے ہی لمحے وہ بند کر دی گئی' مگر نوشیرواں کے لبوں پہ بے اختیار مسکراہٹ اُمڈ آئی۔

وہ آواز دائیں طرف کے ایک زیر تعمیر مکان سے آئی تھی۔ سعدی اپنا فون سائلنٹ کرنا بھول گیا تھا۔ نوشیرواں نے جیب سے پستول نکالا' اور اسے ایک ہاتھ میں پکڑے' آہستگی سے قدم اٹھاتا اس گھر تک آیا۔ گھر کا گیٹ لگ چکا تھا' مگر اندر برہنہ اینٹوں کی عمارت کے دروازے' کھڑکیاں ابھی ندارد تھے۔ گیٹ کے قریب آ کر اس نے گردن اونچی کر کے جھانکا۔ بجری اور سیمنٹ کے ڈھیر کے ساتھ' پورچ میں سعدی کھڑا تھا۔ منہ دوسری طرف تھا۔

"کیا تم مجھ سے چھپ رہے تھے؟" طنزیہ انداز میں اسے پکارتے وہ گیٹ کو دھکیل کر اندر داخل ہوا' پاؤں سے گیٹ واپس دھکا دے کر بند کیا۔

سعدی جو پشت کیے کھڑا تھا' مڑا۔ اس کی نگاہیں

پہلے نوشیرواں کے ہاتھ میں پکڑے پستول تک گئیں اور پھر اس کی آنکھوں تک۔

"تم کیا کر رہے ہو یہاں شیرو؟" بظاہر اطمینان سے کہا۔

"میں تمہیں تمہارا کارنامہ (اعمال نامہ) دینے آیا ہوں۔" پستول کی نال بازو لمبا کر کے اس کی طرف بلند کی۔

سفید ٹی شرٹ میں ملبوس چھوٹے کٹے گھنگریالے بالوں والا لڑکا دلاسی سے مسکرایا۔

"میں نے کبھی کسی کی جان نہیں لی۔ میرا کارنامہ مجھے گولی کے ذریعے دینے آئے ہو؟"

"تم اسی قابل ہو۔" اس پہ پستول تانے نوشیرواں کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے تھے۔ "بہت دفعہ میں نے تمہیں برداشت کیا' سوچا ہاشم بھائی سنبھال لیں گے تمہیں مگر نہیں۔ سعدی۔ تمہارا ایک ہی حل ہے۔ اس کے علاوہ تم کسی اور طریقے سے ہماری زندگیوں سے نہیں نکلو گے۔"

"تم واقعی مجھے مارنے آئے ہو؟" ابرو اٹھا کر ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے تعجب کا اظہار کیا۔ اسے معلوم تھا شیرو کبھی اس پہ گولی نہیں چلا سکتا۔ شیرو اس کا دوست رہا تھا۔

"ہاں' تاکہ تم مجھے مزید نقصان نہ پہنچا سکو۔"

"میں نے تمہیں کبھی نقصان نہیں پہنچایا۔ نوشیرواں۔" نرمی سے کہتے ہوئے سعدی کا ہاتھ اپنی جیب کی طرف رینگ رہا تھا۔

"زیادہ اسمارٹ بننے کی کوشش مت کرو۔ اپنا موبائل نکال کر زمین پہ پھینک دو۔" پستول کو مزید تانے شیرو نے برہمی سے کہا۔ سعدی نے گہری سانس لی۔ موبائل نکالا اور جھک کر زمین پہ رکھ دیا۔ زمر کی کال آرہی تھی۔ مگر۔ وہ سیدھا ہو گیا۔ اس نے سوچا کاش اس کا پین کیمرہ اس کی فرنٹ پاکٹ میں ہوتا' مگر وہ بھی اس کے پاس ابھی نہیں تھا۔ نہتا سعدی یوسف اب نوشیرواں کی تنی پستول کے سامنے کھڑا تھا۔

"میرا قصور کیا ہے؟" اندھیرے میں بھی اس کے چہرے کا اطمینان نظر آتا تھا۔

"اتنا کچھ کرنے کے بعد' تم میں اتنی بھی شرم نہیں کہ اپنا قصور پوچھ رہے ہو؟" صدمے اور غصے سے سامنے کھڑے نوشیرواں کی آواز کپکپائی۔ "تم نے میری زندگی کی ہر خوشی (spoil) کی۔ تم نے مجھ سے میرا بھائی چھینا' میری ماں کا اعتبار چھینا' میرا باپ اس حالت میں مرا کہ وہ مجھ سے نفرت کرتا تھا' تمہاری صرف تمہاری وجہ سے۔" بپھرے ہوئے انداز میں کہتے اس کی آواز بلند ہوئی۔ آنکھوں کی سرخی اور طیش بڑھ رہا تھا۔

"میں نے ہمیشہ تمہارے ساتھ اچھائی کی ہے شیرو۔"

"بکواس نہیں کرو۔" وہ غرایا۔ "آج تم اپنا منہ بند رکھو گے' آج تم مجھے سنو گے۔"

"اوکے شیرو!" سعدی نے سر کو تسلیما "خم دیا" البتہ پہلی دفعہ اس کے چہرے پہ چھایا اطمینان' قدرے پریشانی میں بدلتا نظر آیا تھا۔

"میرا نام نوشیرواں ہے!" وہ غصے سے پھیلی آنکھوں کے ساتھ چلایا۔ پستول ہنوز تان رکھی تھی۔ "مجھے اس نام سے مت پکارو' جس سے میرے دوست پکارتے ہیں۔ تم میرے دوست نہیں ہو۔ تم ایک احسان فراموش آدمی ہو۔ تم۔ تم نے میرا ہر رشتہ خراب کیا ہے۔ تم نے میرا اور شیری کا تعلق بھی خراب کیا ہے۔"

"میں نے شیریں سے۔"

"اپنی بکواس بند رکھو سعدی!" غضب ناک ہو کر اس نے کلک کے ساتھ پستول لوڈ کیا۔ سعدی کو سرخ بتی جلتی بجھتی محسوس ہونے لگی۔

"تم نے شیری کو بلیک میل کیا' تم نے میرے اور اس کے ہر ممکنہ تعلق کو خراب کیا۔ تم ہمیشہ میرے ساتھ یہی کرتے ہو۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں زندہ چھوڑا جائے۔"

"مجھے تمہارے اور شیری کے بارے میں کچھ نہیں پتا' مگر میں نے اسے بلیک میل نہیں کیا۔ میں مزید کوئی

صفائی نہیں دوں گا' مگر تم مجھ سے میری زندگی نہیں چھین سکتے۔" وہ سنجیدہ نظریں نوشیرواں پہ جمائے' ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔ "یہ زندگی اللہ نے مجھے دی ہے' کسی انسان کو حق نہیں ہے کہ وہ مجھ سے میری زندگی چھینے۔"

اندھیرے پورچ میں' پینٹ کے ڈبوں' بجری اور سیمنٹ کے ڈھیر کے ساتھ آمنے سامنے کھڑے ان دونوں لڑکوں کے چہرے اندھیرے میں مدھم سے دکھائی دیتے تھے۔ دونوں کے درمیان چند فٹ کا فاصلہ تھا اور نظریں ایک دوسرے پہ جمی تھیں۔

"تم مجھے روک نہیں سکتے۔ میں نے قسم کھائی تھی' تمہیں اپنے ہاتھ سے گولی ماروں گا۔" نفرت' حقارت سے اسے دیکھتے شیرو نے دوسرے ہاتھ کی پشت سے منہ رگڑا۔ سعدی کی آنکھیں سکڑیں۔ نظریں اس کے پستول پکڑے ہاتھ تک گئیں۔ جو ہلکا سا کپکپا رہا تھا۔

"تم پہلے سے ڈرے لگتے ہو نا۔ ایسا مت کرو اپنے ساتھ شیرو۔" اس کی آنکھوں میں فکرمندی ابھری۔

"اپنی جوش اپنے پاس رکھو۔ تمہاری باتیں مجھ پہ اثر نہیں کر سکتیں۔ تم نے اپنے ہر عمل پہ مہر لگادی ہے۔" نفرت سے اسے دیکھتا وہ غرایا تھا۔ "تم نے میرے خاندان کو دھمکایا ہے' میرے بھائی کو دھمکایا ہے' میں تمہیں عبرت کی مثال بناؤں گا۔" اس کے چہرے پہ پسینہ آرہا تھا۔

"تم ایک اچھے انسان ہو شیرو۔ تم اپنے بھائی جیسے نہیں ہو۔ تمہارے بھائی نے میرے خاندان کے دو لوگ قتل کروائے ہیں' زمر کی زندگی برباد کی ہے' فارس کو تباہ کیا ہے' میرا ان سے جو بھی مسئلہ ہے' تم سے کبھی بھی شکایت نہیں رہی۔ تم اندر سے اچھے ہو۔ تم اپنے والد کی طرح ہو۔ غصے کے تیز ہو' مگر تمہارا دل اچھا ہے۔"

"نام بھی مت لینا میرے باپ کا۔" اس کی آنکھیں مزید سرخ ہوئیں۔ آستین سے منہ رگڑا۔

"دیکھو' جو صبح میں نے تمہیں کہا' غصے میں کہہ دیا۔ آئی ایم سوری نوشیرواں! مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔" وہ محتاط نظروں سے اس کے پستول کو دیکھتا اسے ٹھنڈا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ رات کا اندھیرا ان دونوں کے گرد مزید مہیب ہوتا جا رہا تھا۔

"تمہاری معذرت کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔" نفرت سے اسے گھورتے شیرو نے دائیں طرف تھوکا۔

"دیکھو' تم میرے مسلمان بھائی ہو۔ مجھے مارنا چاہتے ہو' مار دو۔ تم اگر مجھ پہ ہاتھ اٹھاؤ گے' میں تب بھی تم پہ ہاتھ نہیں اٹھاؤں گا۔ تم پوائنٹ بلینک پہ مجھے شوٹ کر کے چلے جاؤ۔ کوئی یہاں نہیں ہے' مگر شیرو' اللہ دیکھ رہا ہے۔ اللہ تمہیں کبھی یہ منظر بھولنے نہیں دے گا۔ قتل بہت بڑا گلٹ ہے' اتنا بوجھ تم پوری زندگی کیسے اٹھاؤ گے؟ دیکھو شیرو' تم۔" رسان سے چوکنے انداز میں وہ سمجھاتے ہوئے کہے جا رہا تھا' مگر نوشیرواں نے ٹریگر دبا دیا۔

سائلنسر نے آواز دبائی۔ کلک ہوا۔ ایک گولی شعلے کی لپٹیں لیے نکلی اور سعدی کے پیٹ میں پیوست ہو گئی۔ خون کا فوارہ پھوٹا۔ وہ بے اختیار آگے کو جھکا۔ پیٹ پہ ہاتھ رکھے' بے یقینی' صدمے سے پھیلی آنکھوں سے نوشیرواں کو دیکھا۔

(میں نے تمہیں بچانے کے لیے کچھ نہیں کیا۔ تمہارے ڈیڈ فکرمند تھے نوشیرواں! تمہیں نیچے جا کر انہیں ان کے بیٹے کی شادی کی مبارک باد دینی چاہیے۔)

شعلہ بار نظروں سے اسے گھورتے نوشیرواں نے تنے بازو کے ساتھ دوبارہ ٹریگر دبایا۔ دوسری گولی اس کے کندھے میں جا لگی۔ وہ دوہرا ہو کر گھٹنوں کے بل زمین پہ جا گرا۔ درد اتنا شدید تھا' اس کے لبوں سے کراہیں نکلنے لگیں۔

(میں تمہیں ایک کہانی سناتا ہوں نوشیرواں۔ میں ایک ایسے لڑکے کو جانتا ہوں' جس کا باپ اسکول ٹیچر تھا۔)

"آہ۔ آہ۔ آہ۔" تکلیف سے چہرہ سفید پڑتا جا رہا تھا۔ اور سفید شرٹ بھی سرخ ہوتی جا رہی تھی۔

نوشیرواں قدم بہ قدم چلتا قریب آیا۔

"میں نے کہا' مجھے شیرو مت کہو۔ میرا نام۔" اس نے جوتے سے سعدی کے منہ پہ ٹھوکر ماری۔ وہ کمر کے بل زمین پہ گرا۔ "نوشیرواں ہے۔" حقارت سے کہتے' اس کے ساتھ کھڑے' گردن جھکائے اس نے سعدی کو دیکھا۔ وہ تیزی سے بہتے خون کے ساتھ زمین پہ گرا ہوا تھا۔ جوتا جہاں پہ لگا تھا' وہاں منہ سے خون رسنے لگا تھا۔ درد بے حد شدید تھا۔ اس کا جسم جل رہا تھا۔ وہ کراہنا چاہ رہا تھا مگر آواز نہیں نکل رہی تھی۔ سفید پڑتے چہرے اور بند ہوتی آنکھوں کے ساتھ اس نے اپنے سر پہ کھڑے نوشیرواں کو دیکھا۔ وہ ہاتھ جھکائے ابھی تک اس پہ پستول تانے ہوئے تھا۔

(اس کے بعد وہ مجھے کیا سمجھتے ہوں گے؟

صرف اپنا بیٹا!)

"یہ میرے باپ کے لیے تھا۔ اور یہ۔" اس نے دوسرے بازو سے منہ رگڑتے اس کی طرف پستول تانے ٹریگر دبایا۔ گولی کہاں لگی' نوشیرواں کی آنکھوں نے آنے والی دہشت کے باعث بار بار چھاتے غبار نے ٹھیک سے دیکھنے نہ ہونے دیا۔ سعدی کی ٹانگ خون میں بھیگتی دکھائی دے رہی تھی۔ "اور یہ شیری کے لیے تھا۔" اس نے زہر آلی آواز میں چلا کر کہا۔

نیچے گرے سعدی کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ درد اس کے دل تک کو کاٹ رہا تھا۔ "اللہ۔" اس سے شدید تکلیف کے باعث بولا نہیں جا رہا تھا۔ "اللہ تم سے حساب لے گا۔ آہ۔" اس کی پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا رہا تھا۔ سر پہ کھڑا نوشیرواں دھندلا رہا تھا۔

"مجھے اس کی پروا بھی نہیں ہے۔" شدید نفرت سے اسے دیکھتے شیرو نے جوتے سے اس کے سر کو ٹھوکر ماری۔ سعدی کا زخمی چہرہ پرے لڑھک گیا۔ "تم اسی قابل ہو۔" اس نے جوتے سے اس کے وجود کو چند اور ٹھوکریں ماریں۔ کتنی اور کدھر' حساب کتاب کھو گیا تھا۔ تھک کر وہ رکا اور ادھر ادھر دیکھا۔

وہ اندھیرے پورچ میں کھڑا تھا' اس کے قدموں میں خون میں لت پت سعدی گرا ہوا تھا۔ آگاہی اس کے دماغ کو جیسے کوئین برن کرنے لگی تھی۔ وہ تیزی سے جھکا' سعدی کا موبائل اٹھایا' جس پہ خون کے محض چند قطرے لگے تھے' اور اسے جیب میں ڈالے مڑ گیا۔ اب اسے جلد سے جلد یہاں سے نکلنا تھا۔

تب ہی۔

☼ ☼ ☼

دل تجھ سے بچھڑ کر بھی
کہاں جائے گا اے دوست!

فوڈلی ایور آفٹر کی ساری بتیاں جلی تھیں' باہر "کلوزڈ" کا بورڈ لگا تھا۔ اندر تمام میزیں خالی تھیں' سوائے درمیان میں ایک لمبی میز کے جس کے گرد وہ سب منتظر سے بیٹھے تھے۔ فارس خاموشی سے بار بار کلائی کی گھڑی دیکھتا' پھر دور آئی دروازے پہ نگاہ زمر پہ ڈالتا جو سینے پہ بازو لپیٹے' سامنے ٹہل رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ اضطراب تھا' اور نظریں بار بار دروازے کی طرف اٹھتی تھیں۔

"آ جائے گا۔ تم بیٹھ جاؤ۔" بڑے ابا نے نرمی سے پکارا۔ ان کی وہیل چیئر لمبی میز کی سربراہی نشست کی جگہ پہ رکھی تھی۔ فارس ان کے دائیں ہاتھ پہلی کرسی پہ تھا۔ ایک کرسی (زمر کے لیے) چھوڑ کر حنین بیٹھی تھی۔ وہ بھی گاہے بگاہے وال کلاک کو دیکھتی' پھر چہرے پہ اداسی آ جاتی۔

ندرت' جنید اور سیم کے ساتھ کچن میں تھیں۔ باقی سب کی چھٹی تھی۔ سیم غالباً "مدد کروانے کے بجائے کام بڑھا رہا تھا۔

"اتنی دیر ہو گئی' وہ اپنی گاڑی بھی نہیں لے کر گیا' یہیں قریب میں ہی گیا ہے' تو واپس کیوں نہیں آ رہا؟" وہ بظاہر خود کو پرسکون رکھتے' ٹہلتے ہوئے بولی تو آواز میں فکر مندی چھلکتی تھی۔

تب ہی ریسٹورنٹ کاؤنٹر پہ رکھا فون بجا۔ چیختی ہوئی آواز۔ شستی زمر رکی' چونک کر فون کی سمت دیکھا۔ کچن سے جنید بھاگتا ہوا آیا' اور مستعدی سے ریسیور

اٹھ کر بولا۔ "فوڈلی اپور آفٹر۔" دوسرے طرف کے جانے والے الفاظ پہ اس کے تاثرات بدلتے گئے۔

"جی۔ جی۔ اچھا۔ کدھر؟" نگاہیں اٹھا کر زمر کو دیکھنا۔ سو وہیں سامنے کھڑی اسے دیکھے گئی۔

"اوکے۔" فون رکھ کر وہ چند لمحے تذبذب سے وہیں کھڑا رہا۔ سب اس کو دیکھنے لگ گئے تھے۔

"کیا ہوا؟" فارس نے اس کی مسلسل زمر پہ جمی پریشان نگاہیں غور سے دیکھیں۔

"وہ۔ میرا بھائی تھا۔ میڈم! میں نے جو کام آپ کو کہا تھا۔" اس نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اشارہ کیا۔ زمر نے اثبات میں سر ہلایا تو وہ جلدی سے بیرونی دروازے کی طرف بڑھا۔ "آپ میری بات سن لیں گی دو منٹ؟" وہ قدم قدم چلتی اس کے پیچھے آئی۔ بڑے ابا، حسین اور فارس سب ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔

باہر نکلتے ہی جنید نے ریسٹورنٹ کا شیشے کا دروازہ بند کیا اور بے حد پریشانی سے اس کی طرف گھوما۔ "وہ۔ اندر سعدی بھائی کے دادا۔ ان کے سامنے بتانا نہیں چاہیے اور۔"

"سنو! جو بھی نام ہے، کس کا فون تھا؟" اس نے بات کاٹی، بے قرار نگاہیں جنید کی آنکھوں پہ جمی تھیں۔

"وہ۔ سعدی بھائی۔ اسپتال سے فون تھا۔ سعدی بھائی کو گولیاں لگی ہیں، اور۔" شاید وہ اور بھی کچھ کہہ رہا تھا، مگر زمر گلے پہ ہاتھ رکھتی دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس کو سانس نہیں آ رہا تھا۔ چہرہ زرد پڑنے لگا تھا۔

"میری۔ میری کار کی چابیاں۔ اندر سے لاؤ۔" اس نے پوری بات سنی بھی نہیں۔ وہ گاڑی کی طرف بڑھ گئی۔ قدم اٹھ نہیں رہے تھے، وہ بڑھ نہیں رہے تھے۔ آنکھوں کے سامنے بہت سے مناظر گڈمڈ ہونے لگے۔ اطراف کی ساری آوازیں بند ہو گئیں۔ ہر شے سلو موشن میں ہو رہی تھی۔

وہ کار کے دروازے کے ساتھ کھڑی تھی۔ جنید نے چابی اس کے ہاتھ میں تھمائی۔ اس نے کی ہول میں چابی ڈالنی چاہی۔ ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ سوراخ کے اندر نہیں جا پا رہا تھا۔ دروازے کے سائیڈ مرر میں اسے فارس باہر آتا دکھائی دے رہا تھا۔ پریشان سی حنہ اس کے پیچھے زینے پھلانگتی آ رہی تھی۔ وہ جنید سے کچھ کہہ رہا تھا، تیز لہجے میں کچھ پوچھ رہا تھا۔ آوازیں زمر تک نہیں آ رہی تھیں۔ وہ لرزتے ہاتھوں کے ساتھ چابی دروازے میں لگا رہی تھی۔ ریموٹ کے بٹن کو دبانا یاد نہیں رہا تھا۔

"مجھے دیجیے۔ آپ فرنٹ سیٹ پہ بیٹھیے۔" وہ عجلت میں کہتے اس کے عقب سے آیا اور چابی اس کے ہاتھ سے لینی چاہی۔ مگر اس نے چابی مٹھی میں دبوچ لی، اپنا ہاتھ پیچھے کر لیا۔ پھر سفید چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا تو آنکھیں ویران تھیں مگر ان میں سامنے کھڑے شخص کے لیے واضح تنفر نظر آتا تھا۔

"آپ اکیلی نہیں جا رہیں، ہم ساتھ جائیں گے، ادھر دیجیے۔" بہت ضبط سے کہتے فارس نے جھٹکے سے اس کے ہاتھ سے چابی لی، اس کا اپنا چہرہ بھی بے رنگ ہو رہا تھا، مگر پریشانی کے تاثرات پہ عجلت کا عنصر نمایاں تھا۔ زمر نے نگاہیں جھکائیں تو دیکھا، چابی سوراخ میں گھساتے اس کے ہاتھوں میں بھی ہلکی سی لرزش تھی۔

"وہ ٹھیک ہو جائے گا، اسے کچھ نہیں ہو گا، آپ اندر بیٹھیے۔" ڈرائیونگ سیٹ پہ بیٹھتے اس نے زمر سے زیادہ خود کو تسلی دی۔ وہ چند لمحے وہیں، بے دم سی کھڑی رہی۔ حسین، جو جنید اور فارس کی بات سننے کے بعد اندر چلی گئی تھی بھاگتی ہوئی واپس آئی تھی۔

"میں بھی آپ کے ساتھ جاؤں گی۔" فارس کی کھڑکی کے ساتھ کھڑے، وہ رو دینے کو تھی۔ زمر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی فرنٹ سیٹ تک جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے آگے بار بار اندھیرا چھا رہا تھا۔ پس منظر میں آوازیں آ رہی تھیں۔

"میں تمہیں کال کروں گا، تم اپنی امی اور دادا کے پاس رکو۔"

"میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ بھائی نے کہا ہے انہیں دیر ہو جائے گی، اور ہم مارکیٹ تک جا رہے

ہیں۔ خدا کی قسم ماموں اگر آپ مجھے نہ لے کر گئے تو میں اتنا چیخوں گی' اتنا چیخوں گی کہ امی اور بڑے ابا کو سب پتا چل جائے گا۔" اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اور فقرے کے آخر میں اس نے ہچکی لی تھی۔

"بیٹھو!" یہ آخری آواز تھی جو زمر نے سنی اور پھر وہ بے دم فرنٹ سیٹ پہ بیٹھ گئی۔ کار تیزی سے سڑک پہ دوڑنے لگی تھی' مگر اس کی آنکھوں کے آگے سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ وہ ادھر نہیں تھی۔ وہ اسپتال میں تھی اور اس کے بھائی نے ایک کمبل میں لپٹا بچہ اس کے بازوؤں میں دیا تھا۔ وہ حال اور ماضی کے درمیان کہیں تیر رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

کبھی فراز نئے موسموں میں رو دیا
کبھی تلاش پرانی رفاقتیں کرنی!

قصر کاردار کے لاؤنج میں لگے بڑی شیلف پہ فونا کتابیں ترتیب سے رکھ رہی تھی جب اس نے نوشیرواں کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ فوراً" ---- سر جھکائے جلدی جلدی کام کرنے لگی۔ نوشیرواں سیدھا سیڑھیوں پہ چڑھتا گیا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لڑکھڑاہٹ تھی اور جھکی آنکھوں کو دیکھ کر لگتا تھا کہ وہ دور کسی خیال میں گم ہے۔ کسی اطمینان انگیز' سرشار سے خیال میں۔

اپنے کمرے کا دروازہ کھولا تو اندر ساری بتیاں جل رہی تھیں۔ اتنی تیز روشنی سے اس کی آنکھیں چندھیا گئیں۔ ناگواری سے ادھر ادھر دیکھا اور پھر ساکت رہ گیا۔

سامنے کاؤچ پہ ہاشم بیٹھا تھا۔ صبح والی شرٹ اور پینٹ میں ملبوس تھا۔ ٹائی اور کوٹ اتارنے کے بعد اس نے لباس بھی نہیں بدلا تھا۔ اور اب' ٹانگ پہ ٹانگ جمائے بیٹھا وہ چبھتی نظروں سے چوکھٹ میں کھڑے شیرو کو دیکھ رہا تھا۔

"رک کیوں گئے۔ اندر آؤ۔" طنزیہ سا بولا تو نوشیرواں نے (بظاہر) سرسری سا سر جھٹکا۔ ہاتھ میں پکڑا کوٹ بیڈ پہ ڈالا۔

"آپ ادھر ----؟"

"تمہیں کیا لگتا ہے' مجھے تمہاری حرکتوں کے بارے میں معلوم نہیں ہو گا؟" سلگتی نظروں سے اسے دیکھتا وہ غصے سے ایک دم پھٹا تھا۔ "کیا سوچ کر تم نے یہ کیا' ہاں؟"

نوشیرواں کا سانس رک گیا۔ پلکیں جھپکنا بھول گیا۔ بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

(ہاشم بھائی کو اتنی جلدی کیسے پتا چل سکتا ہے؟ ابھی تو وہ وہیں خون میں گرا پڑا ہو گا)

"وہ ---- آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں سمجھا نہیں۔" اٹک اٹک کر' سفید پڑتے چہرے کے ساتھ اس نے کہنا چاہا۔ جواب میں ہاشم نے ہاتھ بڑھا کر میز پہ رکھے پیکٹ اٹھائے اور زور سے اس کے گھٹنوں پہ دے مارے۔ سارے پیکٹ شیرو کے قدموں میں جا بکھرے۔

"اوہ ---- یہ ----" ایک ریلیف کا احساس تھا جس نے شیرو کا سانس بحال کیا۔ اس کے چہرے کی رنگت واپس آنے لگی۔ ذرا سے شانے اچکا کر وہ الماری کی جانب بڑھا۔ ہاشم ایک دم تپ کر اٹھا۔

"تمہیں اندازہ ہے یہ کیا ہے؟ یہ تمہاری بربادی ہے۔ تم ----"

"کس نے بتایا آپ کو؟" وہ بے پروائی سے الماری کھولے اس کی طرف پشت کیے کھڑا تھا۔

"کس نے بتایا مجھے؟ یعنی کہ اور لوگوں کو بھی معلوم ہے؟ کیا صرف میں بے خبر تھا؟" وہ اتنا اتنے غصے سے بولا کہ نوشیرواں کو اس کی سچائی پہ ذرا بھی شک نہ گزرا۔ ویسے بھی یہ مسئلہ اب کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔

"شیرو' اگر آئندہ میں نے تمہیں دیکھا کہ تم ----"

"نہیں ہوں گا ڈرگز' بس ٹھیک ہے' سن لیا ہے۔" وہ بے زاری سے بولا تھا۔ ہاشم ایک دم رک کر اسے دیکھنے لگا۔ اس کے انداز میں کچھ بدلا ہوا تھا۔

"کہاں سے آ رہے ہو تم؟" کھوجتی نگاہوں سے

اس کی پشت کو دیکھتے اس نے جس انداز میں پوچھا‘ نوشیرواں نے چونک کر چہرہ گھمایا‘ پھر فوراً ”نظریں چرا کر واپس ہونے لگا کہ۔

”ادھر میری آنکھوں میں دیکھ کر بتاؤ‘ کہاں سے آرہے ہو تم؟“ نوشیرواں نہ چاہتے ہوئے اس کی جانب مڑا۔

☼ ☼ ☼

”میں باہر تھا۔ یونہی آگے پیچھے۔“

”جھوٹ مت بولو۔ کدھر تھے تم؟“ اس کی آنکھوں سے لمحے بھر کو بھی نظریں ہٹائے بغیر ہاشم اسے دیکھے جا رہا تھا۔ شیرو نے اکتا کر ادھر ادھر دیکھا۔

”یا میں بچہ ہوں تو ہر بات کی رپورٹ دیا کروں؟“

”تم۔“ ہاشم کچھ سوچتے سوچتے چونکا۔ ”تم سعدی کے پاس تو نہیں گئے؟“

”میں کیوں جاؤں گا اس کے پاس؟“ وہ ایک دم بھڑک اٹھا۔

”مجھے معلوم ہے تم اسی کے پاس گئے ہو گے۔ پتا نہیں کیا کیا کہہ دیا ہو گا تم نے اسے۔ میں کتنی دفعہ تمہیں کہوں گا کہ اسے تنہا چھوڑ دو‘ میں اسے سنبھال لوں گا۔ کہاں ہے وہ اس وقت؟“ جیب سے موبائل نکالتے ہاشم نے پوچھا تھا۔

”مجھے کیا پتا وہ کہاں ہے۔ کیا میں اس کا گارڈ ہوں؟“ وہ بگڑ کر بولا تھا۔ اس کے انداز پہ جھنجلاتے ہاشم نے صرف اسے گھورنے پہ اکتفا کیا‘ پھر موبائل کان سے لگایا۔ نوشیرواں خفگی سے منہ میں بڑبڑانے لگا۔

”کیا کیا ہے تم نے اسے؟ تم مجھے بتا دو‘ ورنہ وہ مجھے بتا دے گا اور۔“ موبائل کان سے لگائے وہ درشتی سے کہہ رہا تھا جب بیڈ پہ گرے شیرو کے کوٹ میں کچھ تھرتھرانے لگا۔ ان دونوں نے اس طرف دیکھا۔ شیرو کا رنگ پھیکا پڑا اور ہاشم۔ وہ چونک کر قدرے تعجب سے آگے بڑھا اور کوٹ میں ہاتھ ڈال کر نکالا تو سعدی کا وائبریشن پہ لگا فون ہاتھ میں تھا۔ اس نے بے یقینی سے شیرو کو دیکھا جو بالکل چپ کھڑا تھا۔

”یہ اس کا فون تمہارے پاس کیا کر رہا ہے؟“ دونوں فون اس نے بیڈ پہ ڈالے اور اب جب وہ شیرو کے سامنے آیا تو غصیلی نگاہوں میں بے پناہ سختی تھی۔

”بولو۔“

نوشیرواں نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”میں نے اسے شوٹ کر دیا ہے اور اس کا فون اٹھا لایا ہوں۔“

”بکواس مت کرو۔“ ہاشم نے اکتا کر اسے دیکھا۔

”مجھے سیدھی طرح بتاؤ‘ کیا کہہ کر تم نے اس کا فون چھینا ہے؟ تم ایسا۔“

”کیا آپ نے سنا نہیں؟“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر چبا چبا کر بولا۔ ”میں نے سعدی کو شوٹ کر دیا ہے۔“ پھر تیزی سے آگے بڑھا اور کوٹ اٹھا کر اندر سے پستول نکال کر اس کے سامنے میز پہ ڈالی۔ ”پوری تین گولیاں ماری ہیں۔ اب نہیں بچے گا۔“ اعتراف نے کوئی سرشاری سی سارے وجود پہ انڈیل دی۔ گردن اکڑا کر اس کے سامنے کھڑے وہ بولا تو ہاشم بالکل ساکت سے دیکھنے لگا۔ سانس رو کے شل سا۔

”میں نے آپ سے کہا تھا نا‘ یہ وہ مسئلہ ہے جسے آپ نہیں سنبھال سکتے۔ سو آج میں نے مسئلہ ختم کر دیا۔“

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ ہاشم کے ذہن کو اس کے الفاظ سمجھنے میں چند لمحے لگے تھے اور جب سمجھ میں آیا تو۔ اس کی آنکھیں بے یقینی سے پھیلیں‘ چہرے پہ سرخی اتری۔ وہ آگے بڑھا اور نوشیرواں کے چہرے پہ چٹاخ چٹاخ دو تھپڑ لگائے۔ وہ اس حملے کے لیے تیار نہیں تھا۔ بوکھلا کر دوسری طرف لڑکھڑایا‘ دیوار کا سہارا لے کر سنبھلا اور منہ پہ ہاتھ رکھے‘ بے یقینی سے ہاشم کو دیکھا‘ جو تیز تیز سانس لیتا اتنے ہی صدمے سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم نے۔ تم نے اسے گولی مار دی؟ او میرے خدا! تم۔ تم گھٹیا انسان۔“ اس کا گریبان پکڑ کر غصے سے اس کو جھنکا دیتے وہ چلایا تھا۔ ”تم نے کیسے اسے گولی مار دی؟ کدھر ہے وہ؟ کدھر پھینک آئے ہو

اسے؟"

بالکل گنگ ہوئے شیرو کا گریبان چھوڑا اور ماتھے پہ ہاتھ رکھے ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا۔ اس کا دماغ گویا بھک سے اڑ چکا تھا۔

"وہ مر تو نہیں گیا؟ کیا وہ زندہ تھا جب تم وہاں سے آئے ہو؟" غصے کی جگہ پریشانی نے لے لی، وہ دوبارہ اس کی طرف لپکا۔ شیرو کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔

"او میرے خدا۔ نوشیرواں یہ تم نے کیا کیا؟ تم کیسے اس کی جان لے سکتے ہو۔" ملامت بھری نظروں سے اسے دیکھا تو وہ متعجب ہوا۔

"آپ کو کیوں اس کی اتنی فکر ہے؟ کیوں اتنی محبت ہے آپ کو اس سے؟"

"نوشیرواں!" ہاشم نے آگے بڑھ کر اس کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔

"اس نے تمہاری... جان بچائی تھی۔ کیا تم بھول گئے ہو؟ کیا تم نے اس شخص پہ گولی چلائی جس نے تمہاری جان بچائی تھی؟"

اور ایک لمحے کو نوشیرواں کا ذہن بالکل خالی ہو گیا۔ وہ ٹکر ٹکر ہاشم کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ اسے چھوڑ کر پھر سے ادھر ادھر چکر کاٹنے لگا تھا۔

"یہ... یہ فون اور گن، اسے تم ہاتھ بھی نہیں لگاؤ گے اب۔" دونوں چیزیں اٹھاتے ہوئے اس نے سختی سے اسے تنبیہہ کی۔ پھر اپنا موبائل اٹھا کر نمبر ملانے لگا۔ "اگر تم اس کمرے سے نکلے تو میں تمہاری جان لے لوں گا۔ سمجھے؟۔ پتا نہیں وہ بچا یا نہیں۔" فون کان سے لگاتے، وہ تیز سانسوں کے درمیان اور بے رنگ ہوتے چہرے کے ساتھ کہہ رہا تھا۔

"ہاں خاور، فوراً گھر آؤ۔ جلدی... ہمارے پاس وقت نہیں ہے۔" عجلت سے کہتا گن اور فون لیے وہ کمرے سے باہر نکل گیا، تو پیچھے ہر طرف ویرانی اور خاموشی چھا گئی۔ نوشیرواں دونوں ہاتھ پہلو میں گرائے، ہنوز ہکا بکا سا کھڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

میرے صبر پہ کوئی اجر کیا؟ مری دوپہر پہ یہ ابر کیوں؟
مجھے اوڑھنے دے اذیتیں، مری عادتیں نہ خراب کر!

اسپتال میں دوائیوں کی بو کے ساتھ کوئی نحوست تھی جو ہر سو پھیلی تھی۔ یہ وہ عمارت تھی جہاں انسان کو اس کے دکھ لے کر آتے تھے۔ آپریشن تھیٹر کے باہر جگہ جگہ پولیس اہلکار دکھائی دیتے تھے۔ راہداری میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ فارس بے چینی سے ادھر ادھر چکر کاٹ رہا تھا۔ بار بار مڑ کر بند دروازوں کو دیکھتا اور پھر زمر کو جو دیوار سے لگی، سفید چہرہ لیے، بالکل خاموش، گم صم کھڑی تھی۔ اس کی نظریں دروازے پہ جمی تھیں، اور ان میں زمانے بھر کی ویرانی تھی۔ وہ روئی نہیں تھی، سو اس کا ہلکا میک اپ، آویزے، خوب صورت لباس ویسے ہی دمک رہے تھے مگر چہرے کی بے رونقی نے سب ویران کر دیا تھا۔ واحد آواز حنین کے رونے کی تھی۔ وہ زمر کے قریب کھڑی، سر جھکائے، گھٹا گھٹا سا روئے جا رہی تھی۔ پھر اس نے آنسوؤں سے بھیگا چہرہ اٹھایا۔ گیلی آنکھوں سے فارس کو دیکھا۔

"ماموں... اتنی دیر ہو گئی۔ یہ لوگ باہر کیوں نہیں آتے؟ کوئی کچھ بتاتا کیوں نہیں ہے؟"

فارس نے تاسف سے اسے دیکھا۔ "سرجری ہو رہی ہے، وقت لگے گا۔ اگر دوبارہ امی کا فون آئے تو وہی کہنا جو پہلے کہا ہے کہ ہم سعدی کے کسی دوست کے لیے ادھر ہیں۔"

"مگر بھائی کو کون گولی مار سکتا ہے؟"

"ابھی یہ سوچنے کا وقت نہیں ہے۔ تم بس دعا کرو۔" وہ سر جھٹکتے دوبارہ ٹہلنے لگا۔ حنہ چونکی۔

"دعا۔" اسے کچھ یاد آیا۔

"میں... میں اب نہیں روؤں گی۔" اس نے ہتھیلی کی پشت سے گیلی آنکھیں رگڑیں اور دوپٹا سر پہ رکھ کر چہرے کے گرد لپیٹنے لگی۔ "میں دعا کروں گی۔ دعا کے علاوہ کوئی چیز مقدر نہیں بدلا کرتی۔" آنسو بار بار ابل کر آ رہے تھے، وہ پوروں سے ان کو صاف کرنے لگی۔ "مصیبت اوپر سے آتی ہے اور دعا نیچے سے جاتی

ہے۔ جو زیادہ شدید ہوگی وہ جیت جائے گی۔ مجھے یقین ہے۔ اب دیکھیے گا آپ، میں دعا کروں گی اور کیسے بھائی ٹھیک ہو جائے گا۔ ہے نا؟" آخر میں ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ وہ چلتے چلتے اس کے پاس ٹھہرا، اداسی سے اس کا چہرہ دیکھا، پھر اس کا چہرہ تھپتھپا کر اپنے کندھے سے لگایا، حنین کے گرم گرم آنسو پھر سے گرنے لگے۔

"دعا کرو۔" اس کا سر تھپک کر وہ اس سے علیحدہ ہوا تو حنہ اثبات میں گردن ہلاتی، ہاتھوں کا پیالہ بنائے، زیرِ لب کچھ پڑھنے لگی۔

فارس نے دوبارہ قدم اٹھاتے ہوئے زمر کو دیکھا جو ہنوز سر دیوار سے ٹکائے بند دروازے کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھیں بالکل ویران تھیں۔ وہ آہستہ سے آگے بڑھا اور کاریڈور کا موڑ مڑ گیا۔ چند لمحے بعد جب واپس آیا تو ہاتھ میں شاپر میں لپٹی ٹھنڈے پانی کی بوتل تھی۔

حنہ کے قریب آکر اس نے ہلکا سا اس کے کندھے کو چھوا۔ حنہ نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ "اپنی پھپھو کو پانی پی لیں۔" بوتل شاپر سے نکال کر اسے تھماتے سرگوشی کی۔ حنہ نے چونک کر زمر کو دیکھا جو تھیٹر کے دروازے کو تک رہی تھی۔ پھر فوراً" بوتل لے کر اس تک آئی۔

"پھپھو۔ پانی پی لیں۔" اس نے زمر کی کہنی چھو کر کہا تو وہ چونکی۔ چہرہ پھیر کر اسے دیکھا۔ پھر بے اختیار نگاہیں اٹھیں اور فاصلے پہ کھڑے فارس کے ہاتھوں تک جا ٹھہریں۔ خالی شاپر۔ اس نے دوبارہ بوتل کو دیکھا۔

"مجھے پیاس نہیں ہے۔" وہ بنا تاثر کے کہہ کر رخ پھیر گئی۔

"تھوڑا سا ہی پی لیں۔" مگر زمر نے نفی میں سر ہلا دیا۔ حنین نے بے بسی سے فارس کو دیکھا، وہ گہری سانس لے کر وہاں سے ہٹا اور راہداری میں چکر کاٹنے لگا۔

انتظار بہت تکلیف دہ تھا۔

☼ ☼ ☼

اب کے ہم بچھڑے تو شاید کبھی خوابوں میں ملیں
جس طرح سوکھے ہوئے پھول کتابوں میں ملیں

آپریشن تھیٹر کے اندر، میز پہ سعدی اپنے اوپر جھکے لوگوں، خود سے جڑی نالیوں اور اپنے گوشت کو کاٹتے اوزاروں سے بے خبر، بند آنکھوں سے لیٹا تھا۔ اس کی پلکوں کے پیچھے ایک اور دنیا تھی۔ وہاں نہ خون تھا، نہ ہتھیار تھے۔

نہ کونیاں۔۔۔ نہ تکلیف۔۔۔ نہ آنسو۔

وہ ایک تازہ سی صبح تھی جس میں چڑیوں کی چہچہاہٹ گونجتی تھی۔ ایک چشمہ تھا، جس کے کنارے پتھروں پہ ایک گھنگھریالے بالوں والا لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنے گورے سفید پیر ٹھنڈے پانی میں ڈبو رکھے تھے۔ ساتھ والے پتھر پہ ایک لڑکی بیٹھی تھی، جس کے لمبے گھنگھریالے بال کمر تک آتے تھے اور وہ جھک کر پانی میں بانس کی لمبی چھڑی سے لکیریں کھینچ رہی تھی۔ اس کی ناک میں سونے کی بالی جیسی نتھ تھی اور کم عمر چہرے پہ سوچ کا عنصر تھا۔ اس نے بھی پاجامہ ذرا اوپر فولڈ کر کے پیر پانی میں ڈبو رکھے تھے۔

"دشمن۔" لڑکے نے قدرے فکرمندی سے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔ "موسیٰ علیہ اسلام تو پیغمبر تھے نا، اتنے بہادر اور اچھے۔ پھر وہ فرعون کے پاس اکیلے کیوں نہیں گئے؟ انہوں نے کیوں کہا کہ انہوں نے ہارون کو ساتھ لے کر جانا ہے؟ کیا ان کی زبان میں واقعی لکنت تھی؟"

"ارے نہیں۔" لڑکی نے دائیں بائیں گردن ہلائی۔ "انبیاء جو ہوتے ہیں نا سعدی! وہ معصوم اور عیوب سے پاک ہوتے ہیں۔ یہ عقیدہ اگر تمہارا درست نہیں تو تم مسلمان نہیں ہو سکتے۔ ان کی زبان میں کوئی لکنت نہیں تھی۔ یہ صرف اسرائیلیات کی وہ روایتیں ہیں جن کو مسلمان مفسرین بغیر کسی ثبوت یا دلیل بیان (quote) کرتے رہتے ہیں۔ موسیٰ کی زبان میں لکنت نہیں تھی، وہ صرف بہت فصیح نہیں

تھے اور ان کے بھائی ہارون زیادہ اچھا بول سکتے تھے۔"

"تو کیا صرف اس لیے وہ لے کر گئے اپنے بھائی کو اپنے ساتھ؟" لڑکے نے کنکر پانی میں اچھالتے پوچھا تھا۔

"ہاں اور اس لیے بھی کہ جو سپورٹ انہیں چاہیے تھی' وہ ان کو اپنے بھائی سے ہی مل سکتی تھی' کیوں کہ ہر انسان اپنے بھائی کا رکھوالا ہوتا ہے۔"

دوسرا کنکر پھینکتا اس کا ہاتھ رکا' وہ ٹھہر کر اس لڑکی کو دیکھنے لگا۔

"مگر میرا تو کوئی بھائی نہیں ہے' پھر میرا کیپر (رکھوالا) کون ہو گا؟"

وہ لڑکی ہلکا سا ہنسی' پھر بازو اس کے کندھے کے گرد پھیلا کر اس کے قریب جھک کر کے بولی۔ "تمہاری Keeper میں ہوں۔ میں تمہیں ہمیشہ پروٹیکٹ کروں گی۔ ہمیشہ۔" آوازیں مدھم ہوتی گئیں۔ جیسے کا منظر وقت کے آسمانوں میں گھلتا گیا' گھلتا گیا اور نیچے لیٹے مریض کی بند آنکھوں کے پیچھے اندھیرا چھانے لگا۔

☼ ☼ ☼

جس سے پہلے بھی کئی عہد وفا ٹوٹے ہیں

اسی دوراہے پہ چپ چاپ کھڑا ہو جاؤں

باہر رات گہری ہو رہی تھی۔ سیاہ اور خوف ناک' ایسے میں سڑک کنارے کھڑی گاڑی کی پچھلی سیٹ پہ بیٹھا ہاشم کاردار فکر مندی سے بند آنکھیں مل رہا تھا جب دوسرا دروازہ کھلا۔ اس نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ خاور اندر بیٹھ رہا تھا۔

"کیسا ہے وہ؟" ہاشم نے بے قراری سے اس کا چہرہ کھوجا۔

خاور نے گہری سانس لی۔ "اچھی خبر نہیں ہے۔"

ہاشم کا دل ڈوب کر ابھرا۔ آنکھوں میں کرب سا اترنے لگا۔ "کیا وہ... مر جائے گا؟" الفاظ کہنا بھی تکلیف دہ تھا۔ خاور نے گویا ملامت سے اسے دیکھا۔

"خبر یہ ہے کہ وہ بچ جائے گا اور میرا خیال ہے' یہ ہمارے لیے اچھی خبر نہیں ہے۔"

"وہ بچ جائے گا؟" وہ ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

"جی... میں نے معلوم کیا ہے۔ ایک گولی کندھے میں لگی ہے' دوسری پیٹ میں اور تیسری ٹانگ میں' کوئی بھی گولی مہلک نہیں ثابت ہو گی۔ نوشیرواں کا نشانہ اچھا ہے' مگر ظاہر ہے وہ ڈر گز کے زیر اثر تھے اور غصہ میں بھی... اس لیے۔" اس نے تاسف سے سر جھٹکا۔

"وہ... وہ بچ جائے گا نا۔" ہاشم نے بے چینی سے بات کاٹی۔

"جی... میں لکھ کر دے سکتا ہوں' وہ بچ جائے گا اور اگلے دو تین گھنٹوں میں ہوش میں آ کر سب کو بتا دے گا کہ اسے کس نے گولی ماری تھی اور صرف یہ ہی نہیں' وہ یہ بھی بتائے گا کہ ہم نے اور کیا کیا ہے۔" پر بھی سے وہ کہہ رہا تھا۔ ہاشم نے تکلیف سے آنکھیں بند کر لیں۔

چند لمحے کار میں خاموشی چھائی رہی' گہرا سکوت۔

"ہو سکتا ہے' وہ نہ بتائے۔" ہاشم نے تنکے کا سہارا لینے کی کوشش کی۔ خاور نے بے یقینی سے اسے دیکھا۔

"سر... میں آپ کی اس بچے کے لیے فیلنگز کی بہت قدر کرتا ہوں' مگر معذرت کے ساتھ' وہ آپ کے لیے ایسی کوئی فیلنگ نہیں رکھتا ہے۔ ہوش میں آتے ہی سب بک دے گا اور اس کے بعد فارس اپنی ہی گولیاں نوشیرواں کو مارے گا۔ کیا آپ کو لگتا ہے کہ وہ لوگ ہمیں چھوڑ دیں گے؟"

"تو پھر کیا کروں؟" وہ بے زار ہوا' مگر اس بے زاری میں تکلیف تھی۔

"کیا مطلب کیا کریں؟ ہمیں اس وقت ایک ہی چیز کرنی ہے' سرجری ختم ہوتے ہی میرا کوئی لڑکا اسے ایک ذرا سا انجکشن لگا دے گا' وہ..."

"خاور!" وہ بے یقینی سے اسے دیکھتا غرایا تھا۔ "میں سعدی کو نہیں ماروں گا... وہ... وہ ایک چھوٹا بچہ ہے۔"

"آپ کچھ مت کریں' میں کروں گا جو کرنا ہے' اس

کا مرنا ضروری۔"

"اگر تم نے اسے ہاتھ بھی لگایا تو میں خدا کی قسم تمہیں اپنے ہاتھ سے گولی مار دوں گا۔" انگلی اٹھا کر سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتا وہ اتنی سختی سے بولا کہ خاور ٹھٹک کر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

Love the boy. don t you "

You" خاور کو افسوس ہوا تھا' ہاشم نے سر جھٹکا۔

"میں قاتل ہو سکتا ہوں' مگر میں درندہ نہیں ہوں جو اس کو یوں مار دوں۔" نفی میں سر ہلاتے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

"دونوں... اور نوشیرواں کا کیا ہو گا؟ میرا خیال ہے اس وقت آپ کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ آپ کو ان دونوں میں سے کس سے زیادہ محبت ہے؟"

ہاشم نے سر سیٹ کی پشت سے ٹکا کر تکلیف سے آنکھیں موند لیں۔ وہ بہت ڈسٹرب نظر آ رہا تھا۔ خاور نے کلائی کی گھڑی دیکھی' وقت نکل رہا تھا۔

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مجھے شیرو سے کئی گنا زیادہ محبت ہے۔ سعدی کو خاموش کروانا ضروری ہے' او کے۔" اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ "اب تم وہ کرو جو میں تمہیں بتاتا جاؤں۔" خاور توجہ سے سننے لگا۔

٭ ٭ ٭

بچھڑنے والے کبھی بھی لوٹ کے نہیں آتے دوست
بس فقط یادوں کے کچھ نشان ہوا کرتے ہیں

سفید راہداری ابھی تک خاموش تھی۔ زمر ہنوز اسی طرح کھڑی آپریشن تھیٹر کے دروازوں کو دیکھ رہی تھی۔ حنین زمین پہ اکڑوں بیٹھی چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں گرائے دعا مانگ رہی تھی۔ فارس مخالف دیوار سے کمر ٹکائے ایک گھٹنا موڑے کھڑا تھا۔

ارد گرد پولیس اہلکار ہنوز پہرہ داری کر رہے تھے۔ وردی میں ملبوس سعد شاہ بھی وہیں تھا مگر ایک حد سے وہ آگے نہیں بڑھا تھا۔ بس فاصلے پہ کھڑا احتیاط سے فارس کو دیکھ لیتا' جو گاہے بگاہے اس پہ ایک تیز نظر ڈالتا تھا۔ اس نے زمر سے بات کرنے کی کوشش کی تو

فارس نے صرف ہاتھ اٹھا کر اسے رک جانے کا کہا اور وہ فوراً پیچھے ہٹ گیا۔

(سعد شاہ وہی اے ایس پی تھا جس نے فارس غازی کو چار سال قبل گرفتار کیا تھا۔ جو فارس کے گھر جا کر اس کی گاڑی سے ملنے والی وارث سے جڑی چیزیں اسے دکھا کر اس کیس سے علیحدہ رہنے کی دھمکی دے کر آیا تھا۔ اور حوالات میں تو اس سے روز کی ملاقات رہتی تھی اور اس ملاقات کے نشان فارس کی کمر پہ آج تک موجود تھے۔)

کتنے گھنٹے بیت چکے تھے کسی کو یاد نہیں تھا۔ جب دروازہ کھلا تو سب اُدھر ہی بڑھے' زمر سب سے آگے تھی۔

"وہ کیسا ہے؟" اس نے پریشانی سے سرجن کا چہرہ دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔ آواز اتنی ہی ہلکی تھی کہ بمشکل سنائی دیتی تھی۔

"آپ فکر مت کیجیے' وہ ٹھیک ہے۔ آپریشن ہو چکا ہے اور اب وہ Stable ہے (سٹیبل ہے)۔ کچھ دیر تک اسے وارڈ میں شفٹ کریں گے۔"

کیا وہ صرف الفاظ تھے یا کوئی روح تھی جو ان میں پھونک دی گئی تھی۔ حنہ نے ہاتھوں میں چہرہ چھپا لیا۔ اس کی ہچکیاں سنائی دینے لگی تھیں۔ فارس نے نڈھال ہو کر دیوار سے کمر لگا کر آنکھیں بند کیں اور زمر۔ وہ بس یک ٹک ڈاکٹر کو دیکھ رہی تھی۔

"کیا میں اس سے مل سکتی ہوں؟"

"ایک دفعہ وارڈ میں شفٹ ہو جائے تو آپ مل سکیں گی۔" وہ آگے بڑھنے لگے' زمر فوراً ان کے پیچھے لپکی۔

"تب... کب شفٹ کریں گے وارڈ میں؟"

"بس تھوڑی دیر تک۔"

زمر نے ہلکے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔ حنہ اور فارس کے برعکس' اس کے چہرے پہ اطمینان نہیں اترا تھا۔ وہ وہیں کھڑی' بے چین مضطرب نگاہوں سے تھیٹر کے بند دروازوں کو دیکھنے لگی۔

کافی دیر بیت چکی اور وہ سعدی کے باہر لانے کا

انتظار کرتے رہے۔ فارس اب اِدھر اُدھر ٹہلتا بار بار کلائی کی گھڑی دیکھ رہا تھا۔

حنین گیلا چہرہ صاف کیے ہکا بکا سی ساکت آئی اب کھڑی ہوئی تھی۔ زمر ویسی ہی گم صم دیوار سے لگی تھی۔

تھیٹر کے دروازے کھلے اور ایک سسٹر باہر نکلی تو فارس اس کی طرف لپکا۔

"اب شفٹ کریں گے سعدی کو؟ اسے ہوش آیا؟"

نرس نے رک کر اس کا چہرہ دیکھا۔ "وہ مریض جس کو گولیاں لگی تھیں؟ اس کو تو شفٹ کر دیا گیا ہے کب کا۔"

فارس کے ابرو تعجب سے اکٹھے ہوئے۔ "ہم تب سے یہیں کھڑے ہیں، اسے تو باہر نہیں لایا گیا۔"

"ارے وہ بیک ڈور سے لے کر گئے ہیں نا وارڈ میں۔" اس نے راہداری کے دوسرے دروازے کی سمت اشارہ کیا جو کوریڈور کا موڑ مڑ کر آتا تھا۔ یہاں سے دکھائی نہ دیتا تھا۔ فارس اور حنہ مڑ کر اس طرف دیکھنے لگے۔ زمر بے چینی سے آگے بڑھی۔

"کس وارڈ میں؟ پلیز مجھے اس طرف لے جائیں۔"

"آئیے۔" وہ اپنا کام چھوڑ کر آگے چل دی تو زمر اس کے پیچھے لپکی۔ فارس اور حنین ساتھ ساتھ چلتے پیچھے آ رہے تھے۔

"یہ اُدھر ہے آپ کا مریض۔" وارڈ میں آ کر نرس نے اِدھر اُدھر گردن گھمائی۔ آگے پیچھے گھومی اور دفعتاً ٹھہر گئی۔

زمر نے چہرہ موڑ کر اطراف میں دیکھا۔ اجنبی چہرے غیر شناسا لوگ۔

"ابھی ون سے جو بلٹ انجریز والا مریض ڈاکٹر بخاری نے بھیجا ہے وہ کدھر ہے؟" کسی کو روک کر پوچھ رہی تھی۔ زمر کا چہرہ زرد پڑنے لگا۔ اس نے ویران نگاہیں اٹھا کر حنین کو دیکھا جو اتنی ہی متعجب لگ رہی تھی۔

"یہاں تو کوئی مریض نہیں لایا گیا۔"

"کیا مطلب؟ میرے سامنے وارڈ بوائز اسے لے کر گئے تھے۔"

ہر چیز سلوموشن میں ہوتی نظر آ رہی تھی۔

"کیسے غائب ہو سکتا ہے ہمارا مریض؟ میں تمہاری جان لے لوں گا۔ اگر اسے کچھ ہوا تو۔" وہ غصے سے اس کی طرف لپکا تھا۔

اور پس منظر میں کوئی کہہ رہا تھا۔

"وہ ابھی کچھ دیر پہلے میں نے دیکھا تھا، دو وارڈ بوائز اسٹریچر پہ پیشنٹ کو لا رہے تھے، مگر وہ ریسپشن کی طرف جا رہے تھے۔"

اس نے دیکھا، فارس اس طرف بھاگا تھا، حنہ بھی پیچھے دوڑی تھی۔

سوالات، حساب کتاب، پولیس اہلکاروں کی بھاگ دوڑ، زمر ان سب میں اجنبیوں کی طرح قدم بہ قدم چلتی گئی۔ چلتی گئی۔ یہاں تک کہ ریسپشن ہال سامنے دکھائی دینے لگا۔ فارس تنی اور غصے سے بازو اٹھا کر دروازے کی طرف اشارہ کرتا پولیس آفیسر سے کچھ کہہ رہا تھا اور گرد و افراتفری سی مچی تھی۔ حنین حیران پریشان سی گردن گھمائے آس پاس دیکھ رہی تھی۔ اسے سست قدموں سے آتے دیکھا تو دوڑ کر اس تک آئی۔

"یہ کیا ہو رہا ہے؟ بھائی کہاں ہے؟"

زمر نے خالی خالی نظروں سے اسے دیکھا۔

"وہ اسے لے گئے ہیں۔" اس کی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دی۔ ہلکی سرگوشی کی طرح۔ "کون؟ کون لے جا سکتا ہے بھائی کو؟"

زمر نے نفی میں گردن ہلائی۔ "کون ہیں؟ مجھے نہیں پتا۔ مگر یہ وہی ہیں جنہوں نے اس کو گولی ماری ہے۔" اس کی ویران نگاہیں فارس پہ جا ٹھہریں جو ایک پولیس اہلکار کے ہمراہ تیزی سے باہر جاتا دکھائی دے رہا تھا۔ زمر نے یاسیت سے سر جھٹکا۔ "وہ ہمارے بچے کو ہمارے ہاتھوں سے لے گئے ہیں اور ہم کچھ نہیں کر سکے۔" وہ ہال کے کنارے نصب بینچ پہ بیٹھ گئی اور سر دیوار سے ٹکا دیا۔ حنین، جو ابھی تک حیران پریشان کھڑی تھی۔ ایک دم سے رونے لگی، پہلے ہلکی اور پھر

اونچی آواز سے۔

ان دونوں کا ردعمل دینے کا طریقہ اتنا ہی مختلف تھا جتنی وہ خود ایک دوسرے سے مختلف تھیں۔

☼ ☼ ☼

ہر کسی کے جینے کا اپنا انداز ہوتا ہے
پروانے جتنے بھی جلیں، کم دیا نہیں ہوتے

رات کی سیاہی نے صبح کی سفیدی کو جگہ دی اور نیلا ہٹ بھرا اندھیرا قصر کاردار پہ اترنے لگا۔ نوشیرواں کے کمرے کے پردے ہٹے ہوئے تھے۔ وہ تیز اے سی کی ٹھنڈ میں لحاف تانے سینے کے بل سو رہا تھا۔ دفعتاً" اس نے کروٹ لی اور چہرہ اوپر ہوا تو بند آنکھوں سے منہ بگاڑا۔ کچھ سونگھا۔ دھواں۔ بو۔ وہ آنکھیں چندھیا کر ادھر ادھر دیکھتا اٹھ بیٹھا۔ پلکیں جھپکائیں، ذرا بصارت واضح ہوئی تو اس کے چہرے پہ شاک ابھرا۔ منہ ذرا سا کھل گیا۔

سامنے صوفے پہ ہاشم بیٹھا تھا۔ ٹانگ پہ ٹانگ جمائے، کہنی صوفے کے بازو پہ رکھے، وہ سگریٹ انگلیوں میں پکڑے، منہ سے نکال رہا تھا۔ دھوئیں کا مرغولہ سانسوں سے نکلا اور اوپر اٹھتا گیا۔ میز پہ شیرو کے پستوں کے ساتھ اس کے سگریٹ اور منشیات کے پیکٹ پڑے تھے، ایک پیکٹ تازہ کھولا گیا لگتا تھا۔

نوشیرواں کی پریشان نگاہیں واپس ہاشم کے چہرے تک اٹھتی گئیں۔ وہ کھڑکی سے باہر دیکھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں گیلی تھیں، ناک سرخ تھی۔

"یہ وہ مر گیا؟" اس نے جلدی سے پوچھا۔ ہاشم نے چہرہ اس کی طرف موڑا۔ اس کی نیلی آنکھوں میں گلابی رگیں ابھری ہوئی دکھائی دیتی تھیں۔

"میں اسے نہیں مار سکتا تھا، اس لیے یہاں سے دور بھیج دیا ہے۔ بے فکر رہو، وہ اب کسی کو کچھ نہیں بتا سکتا۔" وہ بولا تو آواز زکام زدہ سی لگتی تھی۔ "پولیس ہماری، اسپتال کا عملہ ہمارا، قانون ہمارا۔ نہ تمہیں کسی نے اس کالونی میں جاتے دیکھا، نہ نکلتے۔ اسپتال میں کلفی شور ڈالا فارس نے، مگر اب تھک ہار کر وہ لوگ گھر

جا چکے ہیں۔ اب جتنا تلاش کر لیں، وہ انہیں نہیں ملے گا۔ مبارک ہو۔" نوشیرواں کی آنکھوں میں خفگی اتری۔

"کیا وہ ابھی بھی زندہ ہے؟ آپ نے اسے کیوں بچایا؟"

"تم فکر مت کرو۔ تم بس سو جاؤ۔ اسٹینفورڈ میں میرا ایک پروفیسر تھا۔" جھک کر ایش ٹرے میں سگریٹ کا ٹکڑا مسلا۔ "وہ کہا کرتا تھا، قاتلوں میں ایک قدر مشترک ہوتی ہے۔ قتل کرنے کے بعد ان پہ نیند ضرور طاری ہوتی ہے۔ مجرم کا کھوج لگانے کے لیے ہم پہلے اسی جگہ کا تعین کرتے ہیں جہاں وہ جا کر سویا تھا۔ تم بھی سو جاؤ۔ کیوں کہ یہ وہ آخری پرسکون نیند ہے جو تمہیں ملے گی۔"

"آپ اتنے اپ سیٹ کیوں ہیں؟ ایک بندہ مارنے سے کون سی قیامت آ جاتی ہے۔ آپ نے بھی تو..." حد ادب تھا کہ بے زاری سے کہتے کہتے بھی وہ رک گیا۔

"قتل چھوٹی بات نہیں ہوتی نوشیرواں۔" وہ ملامتی نظروں سے اسے دیکھتے نم آواز سے بولا تھا۔

"میں کاردار ہوں، مجھے کوئی پولیس نہیں گرفتار کر سکتی۔ چند دن بعد سب اسے بھول جائیں گے۔"

"کسی کا مرا ہوا بچہ بھی پیدا ہو تو وہ اسے نہیں بھولتا، تم کہتے ہو، وہ اسے بھول جائیں گے؟"

"کیا آپ نے دو لوگ نہیں مارے تھے؟ کیا ہوا؟ کچھ بھی نہیں!"

"ہاں سارا قصور میرا ہے۔ غلط کیا میں نے تمہیں بتا کر۔" غصے اور دکھ سے کہتے اس نے سگریٹ کھڑکی کی طرف پھینکا۔ "وہ دو اچھے مگر عام سے لوگ تھے۔ تم نے شیرو اس پہ گولی چلائی جو ان کے خاندان کا ہیرو تھا۔ ابھی وہ شاک میں ہیں۔ چوبیس گھنٹوں میں یہ شاک صدمے میں بدلے گا۔ اور پھر غصے میں۔ وہ اسے ڈھونڈیں گے اور اس کے مارنے والے کو بھی۔ مگر تم بے فکر رہو۔ تمہارا بھائی ہے نا! تمہیں بچا لے گا ہمیشہ کی طرح!" اس نے زکام زدہ انداز میں سانس ناک

سے اندر کھینچا۔

"آپ کو وہ اتنا پسند ہے کیا؟" نوشیرواں خفگی سے چہرہ جھکائے بڑبڑایا۔ جواب میں ہاشم نے میز پہ رکھے بڑے سائز کے فوٹو گراف اٹھا کر اس کی طرف اچھالے۔ ساری تصویریں بیڈ اور فرش پہ گر گئیں۔

"یہ دیکھو تم نے کیسے اس کے چہرے پہ مارا ہے۔ تین گولیاں مارنے کے بعد بھی تم نے اسے مارا۔ وہ انسان کا بچہ تھا نوشیرواں! ایسے تو کوئی جانور کو بھی نہیں مارتا۔" دکھ اور غصے سے اس نے شیرو کو ملامت کیا۔ وہ منہ میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔

"خیر۔ یہ سب اب ہمارا مسئلہ نہیں ہے۔ میں یہاں صرف ایک سوال کا جواب لینے بیٹھا ہوں۔" شیرو نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ اب خود کو سنبھالتے ہوئے سنجیدگی سے اس کو دیکھتے کہہ رہا تھا۔

"تم نے مجھے بتایا کہ کیسے تم اس کے پیچھے گئے 'اس کو تین گولیاں ماریں اور واپس آگئے۔ پولیس رپورٹ کے مطابق بھی اس کو تین گولیاں ہی لگی ہیں۔ مگر نوشیرواں کاردار! میں جانتا ہوں کہ یہ پورا سچ نہیں ہے۔"

"میں سمجھا نہیں۔" شیرو کے تاثرات بدلے' رنگ پھیکا پڑا۔

"تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے اور اب تم مجھے بالکل صاف صاف بتاؤ گے۔" کہتے ہوئے اس نے پستول کا میگزین نکال کر شیرو کے سامنے کیا۔ بیڈ پہ پیر اوپر کر کے بیٹھے نوشیرواں نے تھوک نگلا۔

"یہ نی فوری ون ہے۔ اس کے میگزین میں تیرہ گولیاں ہوتی ہیں۔ تم میگزین بھرے بغیر تو گئے نہیں ہو گے' سو اگر تیرہ میں سے تین گولیاں تم نے سعدی کو ماری ہیں تو باقی کتنی بچنی چاہئیں؟"

"دس۔" شیرو کی آواز ہلکی تھی۔

"مگر اس میں سات گولیاں ہیں۔ اور اگر تم نے مجھے نہ بتایا کہ وہ باقی تین گولیاں کہاں گئیں تو خدا کی قسم نوشیرواں! میں یہ ساتوں گولیاں تمہارے سر میں اتار دوں گا۔" وہ جس طرح چبا چبا کر اسے گھور کر بولا تھا'

نوشیرواں کے پاس پسپائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔

"جب میں نے میسری گولی مار کر اس کا فون اٹھایا اور جانے لگا تو..." کہنے کے ساتھ اس کی نگاہوں کے سامنے وہی خوف ناک منظر پھر سے تازہ ہوا۔

وہ اندھیرے پورچ میں کھڑا تھا' اس کے قدموں میں خون میں لت پت سعدی گرا پڑا تھا۔ آگاہی اس کے دماغ کو چھ می کی کسی ہرن کرنے لگی تھی۔ وہ تیزی سے جھکا' سعدی کا موبائل اٹھایا جس پہ خون کے محض چند قطرے لگے تھے اور اسے جیب میں ڈالے مڑ گیا۔

اب اسے جلد سے جلد یہاں سے نکلنا تھا۔

تب ہی... جب کہ وہ مڑنے لگا تھا' اس نے وہ آواز سنی۔ زیر تعمیر گھر کے اندر سے کوئی کھٹکا ہوا تھا۔ کسی بلی کے بچے کی سی آواز۔ ہلکی سی کراہ۔ وہ چونک کر واپس گھوما۔ اندھیرے میں آنکھیں سکوڑ کر دیکھا۔

"اے... کون ہے ادھر؟" پستول سیدھا تانے وہ احتیاط سے قدم قدم چلتا گھر کے اندرونی حصے تک آیا۔ وہاں گھپ اندھیرا تھا۔

"کون ہے؟ بولو..." اس نے پکارا۔ مگر خاموشی چھائی رہی۔ مگر وہاں کونے میں کوئی حرکت سی ہوئی۔ وہ کوئی ہیولہ سا تھا جو حرکت کر رہا تھا۔

نوشیرواں نے پستول تان کر کے بعد دیگرے فائر کیے۔ پھر قریب آیا۔ موبائل کی اسکرین روشن کر کے اس طرف ڈالی۔ وہ سیمنٹ کا ایک خالی پیپر بیگ تھا۔ جو سیڑھیوں کے ساتھ گرا تھا۔ وہ سر جھٹک کر مڑا اور باہر آیا۔ سعدی ہنوز وہیں گرا پڑا تھا۔ وہ ایک متنفر نگاہ اس پہ ڈال کر گیٹ کی طرف بڑھا' مگر... کسی احساس کے تحت اس نے گردن موڑی۔

بنا دروازوں کے اس گھر کے ڈھانچے کی کچی پکی سیڑھیوں کے اوپر... کوئی سایہ گم ہوا تھا۔ اسی وقت پس منظر میں پولیس کے سائرن بجنے لگے۔ وہ تیزی سے باہر کو دوڑا۔ چند منٹ بعد وہ بخیریت کافی دور کھڑی اپنی کار تک آچکا تھا۔

"مجھے شیور نہیں ہے' مگر شاید وہاں کوئی تھا۔ شاید نہیں تھا۔" اپنے کمرے میں بیٹھے سر جھکائے نوشیرواں کہہ رہا تھا۔

ہاشم ایک دم اٹھا۔ سارا نشہ ہرن ہوا۔ "کیا اس نے پچھلے قتلوں کا حوالہ دیا؟ میرا نام لے کر کچھ کہا؟"

"ہاں' بہت کچھ بولا تھا اس نے۔"

"تو پھر ظاہر ہے' وہاں کوئی تھا اور وہ جانتا تھا کہ وہاں کون ہے۔ او' میرے خدا!" بے اختیار اس نے ماتھے کو چھوا۔

"تمہیں کسی نے گولی چلاتے دیکھا ہے۔ یعنی کہ اب موقع کا گواہ بھی موجود ہے۔ لعنت ہے تم پہ نوشیرواں!" غصے اور پریشانی سے سر جھٹک کر اس نے ادھر ادھر دیکھا۔

"تمہارا پاسپورٹ کہاں ہے؟ مجھے دو۔ اور اپنا سامان تیار کرو۔ تم ابھی اسی وقت ملک سے باہر جا رہے ہو۔ تم اس وقوعے کے وقت بھی ملک میں نہیں تھے۔ میں پاسپورٹ پہ بیک ڈیٹ کی ایگزٹ اسٹیمپ لگوا دوں گا۔ پاسپورٹ لاؤ' جلدی!" آخر میں وہ غصے سے چلایا۔ تو نوشیرواں تیزی سے بستر سے اترا اور الماری کی طرف لپکا۔

ان چند گھنٹوں میں پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ وہ کیا کر چکا ہے۔

(باقی ان شاء اللہ آئندہ ماہ)

سرورق کی شخصیت

ماڈل ---------- سدرہ جبار
میک اپ ---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر ---------- موسیٰ رضا

فروا خان

میرا رانجھن



بالوں میں کیچو لگاتے ہوئے فری نے حیرانگی سے سعد کی جانب دیکھا جو ابھی تک سو رہا تھا اور اپنے پیچھے زور سے دروازہ بند کیا کہ شاید آواز سن کر جاگ جائے مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا جیسے گہری نیند میں ہو۔

"اُف سعد اب اٹھ بھی جاؤ اب تو ساڑھے پانچ ہو رہے ہیں۔" یہ ٹائم سعد کے ٹیوشن پہ جانے کا تھا مگر ادھر سے جواب ندارد۔

"طبیعت تو ٹھیک ہے۔" فری نے تشویش سے اس کے ماتھے کو چھوا اور دھپ سے بیڈ پر بیٹھ گئی۔ تب ہی سعد نے جیسے بمشکل آنکھیں کھولتے ہوئے اسے دیکھا اسے فری کے چہرے پہ کچھ غلط ہونے کا خوف نظر آیا۔

"یار... تھوڑی دیر آرام بھی نہیں کرنے دیتی ہو۔" سعد نے حتی اللامکان لہجہ پرسکون رکھنے کی کوشش کی جس میں وہ بری طرح ناکام رہا۔ فری کا دل زور سے دھڑکا۔

"آرام سے مطلب ٹیوشن ختم۔"

"آف کورس!" وہ دھیرے سے ہنسا اور فری کے دھواں دھواں ہوتے چہرے سے دانستہ نظر چرائی اور وہ جو وہاں سے اٹھ رہی تھی دوبارہ جیسے ڈھے سی گئی۔

"اب کیا ہوگا آج ہی تو ادھر سے ایڈوانس میں رقم منا تھی۔ تمہاری تنخواہ تو بچوں کی فیسوں اور بلوں وغیرہ پہ خرچ ہو چکی ہے۔ گھر کا باقی خرچا تو ٹیوشن کے پیسوں سے ہی چلتا تھا۔" وہ روہانسی ہو کر بولی۔

سعد کو اس پہ ڈھیروں ترس آیا۔

"کل کا اللہ مالک ہے۔" وہ اس کا ٹھنڈا ہاتھ تھام کر پرامید لہجے میں بولا۔

"میں کچھ پیسے حارث سے ادھار مانگ لوں گا پھر کچھ نہ کچھ نئی ٹیوشن کا انتظام ہو ہی جائے گا میں نے کچھ دوستوں سے کہہ رکھا ہے۔ تم پریشان مت ہو۔" سعد نے اسے بغور دیکھتے ہوئے کہا۔

"مگر گھر میں کھانے پینے کا تمام سامان ختم ہو چکا ہے۔" فری نے ایک لمبا گہرا سانس لیا۔ وہ جانتی تھی کہ سعد اللہ کی ذات پہ توکل رکھنے والا بڑا صابر و شاکر قسم کا بندہ ہے۔ مگر وہ کیا کرتی وہ ایک ماں بھی تھی۔ بچے جس عمر میں تھے۔ وہ صبر اور شکر کے معنی سمجھنے سے قاصر تھے۔ وہ مزید ایک لفظ کہے بنا وہاں سے چلی آئی کہ سعد کہیں اس کی آنکھوں میں اترنے والے آنسو نہ دیکھ لے۔

☼ ☼ ☼

ایسا نہیں تھا کہ وہ دونوں کسی بھوکے ننگے خاندان سے تعلق رکھتے تھے' سعد ایک خوش حال اور مضبوط زمین دار گھرانے کا چشم و چراغ تھا تو فری کا خاندان اس سے بڑھ کر جاگیر و جائیداد کا مالک تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ سعد کے ابا جان خود کماؤ اور کھاؤ جیسے محاورے پہ عمل پیرا تھے اور لڑکیوں کا کیا ہوتا ہے' وہ تو رخصتی کے وقت اللہ کے بعد شوہر کے سپرد کر دی جاتی ہیں' پھر وہ بے چاری بے خبری میں ہی تمام زندگی گزار دیتی ہیں یا پھر میکے والے سب کچھ جانتے بوجھتے کبوتر کی طرح آنکھیں بند رکھتے ہیں۔ بچے چھوٹے تھے تو مسائل بھی کم تھے' بڑھتے بچوں کے ساتھ سعد کو مجبوراً "ایک پرائیویٹ اسکول میں جاب کرنا پڑی' بعد میں وہ شام کو ٹیوشن بھی کرنے لگا' وہ دونوں میاں بیوی قناعت پسند تھے سو زندگی اگر بہت آسودہ حال نہیں تھی تو بہت بری بھی نہیں تھی' مگر بچوں کی اپنی ڈیمانڈز تھیں جو فری کے دل میں کسی کانٹے کی طرح چبھتی رہتی تھیں۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن جب سعد اور بچے اسکول چلے گئے تو فری نے کچن میں موجود چاول اور دالوں کے ڈبوں کو کھنگالنا شروع کیا تاکہ وہ سر میں کھچڑی بنا سکے' اپنی مطلوبہ چیزوں کو پانے کے بعد اس نے کچن کی ذرا تفصیلی صفائی کر ڈالی۔ ابھی وہ اس کام سے فارغ ہوئی ہی تھی کہ دروازہ بجنے لگا۔

"اوہو۔ بارہ بجے کون آ گیا؟" وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑائی۔ اس نے صوفے پہ پڑا دوپٹا اٹھایا اور بیرونی دروازے کی طرف بڑھی۔

"السلام علیکم!" پڑوس سے خالہ زبیدہ آئی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔ جیتی رہو۔" آنے والی نے پورے گھر کو نظروں کی گرفت میں لیا۔

"خالہ! آج ہماری یاد کیسے آ گئی ہے۔" فری نے ہنستے ہوئے ان سے ہلکا سا شکوہ کیا۔ خالہ زبیدہ جو صوفے پہ ذرا پھیل کر بیٹھ چکی تھیں' لگی لپٹی رکھے بغیر بولیں۔

"جھوٹے پہ اللہ کی مار ہو۔ میں تو تمہاری ساس سے ملنے آئی ہوں' مگر وہ ہے کہاں؟" خالہ نے جیسے ایک ایک کمرے میں جھانک کر کہا۔

"میری ساس تو نہیں آئیں' آپ کو کسی نے غلط بتایا ہے۔" فری نے مسکراتے ہوئے متانت سے جواب دیا۔

"اے ہے۔ کسی نے مجھے کیا غلط بتانا ہے' میں نے خود اپنی گناہ گار آنکھوں سے تمہارے ساس سسر کو گاڑی میں دیکھا تھا اور پھر ان کا ڈرائیور پھلوں اور سبزیوں کو یوں گاڑی کی ڈگی میں بھر رہا تھا جیسے کوئی مال گاڑی ہو۔" فری کا چہرہ ایک پل کو تاریک ہوا پھر وہ جیسے سنبھل کر بولی۔

"ہاں سعد نے ذکر تو کیا تھا کہ انہوں نے آنکھوں کا معائنہ کروانے ڈاکٹرز کے پاس آنا ہے' پھر شاید دیر ہونے کی وجہ سے سیدھا گاؤں نکل گئے ہوں گے۔" فری نے یونہی دائیں بائیں دیکھتے ہوئے خالہ کو جواب دیا۔ جواب اُنھی جہاں دیدہ نظروں سے میز پر پڑی ٹرے کو گھور رہی تھیں جس میں چاولوں کی کنکی اور پرانی سی پیلی دال۔ گھریلو حالات کا بھانڈا پھوڑ رہی تھی۔

فری نے شرمندہ ہوتے ہوئے نظریں اٹھائی اور بولی۔

"میں ابھی آپ کے لیے چائے لے کر آتی ہوں۔"

"ارے نہیں۔۔۔ نہیں بس چلتی ہوں سوچا تھا تمہاری ساس سے بھی ملاقات ہو جائے گی مگر۔" خالہ نے ایک ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے چپل میں پاؤں گھسائے۔

"یا نفسا نفسی کا دور آگیا ہے کوئی کسی کی خبر ہی نہیں رکھتا۔ جب دور اور نزدیک کی نظر کمزور ہو جائے تو پھر کچھ بھی صحیح نہیں دکھتا۔" خالہ جیسے خود کلامی کر رہی تھیں۔ انہوں نے فری کے سر پہ محبت سے ہاتھ رکھا۔

"اللہ پاک ہے نا۔۔۔ وہ بڑا ہی باخبر ہے۔" سست روی سے چلتی خالہ دروازہ پار کر گئیں تو فری نے آنکھوں میں آئی نمی کو زور سے مسلا اور دروازہ بند کر دیا مگر اس کے کانوں میں خالہ کا جملہ تادیر گونجتا رہا تھا کہ ڈھیروں گوشت، پھل اور سبزیاں دیکھ کر میں سمجھی تھی کہ دلوا دادی بچوں سے ملنے آئے ہوں گے۔

✡ ✡ ✡

اسکول سے واپسی پر اس نے سعد کے چہرے کو دیکھ کر جان لیا تھا کہ پیسوں کا بندوبست نہیں ہو سکا مگر وہ بچوں پر گھر کے حالات واضح نہیں کرنا چاہتی تھی۔ بچے کھچڑی دیکھ کر خوش ہوئے تو فری کے دل کو ذرا ڈھارس ملی جبکہ سعد بے دلی سے کھا رہا تھا۔ کھانے کے بعد حسب معمول وہ نیوز چینل لگا کر بیٹھ گیا تو وہ بھی وہیں چلی آئی اور سعد کے ہاتھ سے ریموٹ پکڑ کر ٹی وی کی آواز ہلکی کی اور بولی۔

"خالہ زبیدہ بتا رہی تھیں کہ کل تمہارے اماں ابا آئے ہوئے تھے۔"

"ہاں۔۔۔ تو پھر؟" سعد نے ابرو چڑھا کر اس کی جانب دیکھا اس کے اس انداز نے فری کے اندر جیسے مرچیں سی بھر دی تھیں۔

"تو پھر میرا سر پھاڑو۔" وہ تپ کر بولی۔

"سر پھاڑنے سے کیا سارے مسئلے حل ہو جائیں گے؟" سعد نے تحمل سے جواب دیا۔

"گھر میں ایک روپیہ تک نہیں اور تم یوں بنیں رہے ہو جیسے لاٹری نکل آئی ہو۔" وہ جیسے چلائی تھی اور ایک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ سعد نے اس کی کلائی تھام کر دوبارہ اسے اپنے پاس بٹھایا۔

"میں تمہاری بات۔۔۔ تمہارا غصہ سمجھ رہا ہوں مگر میں ابا سے کچھ بھی نہیں مانگوں گا۔ حضرت علی کا قول ہے کہ جو انسان تمہاری ضرورت جان کر تمہیں نہ دے اس سے مانگ کر شرمندہ نہیں ہونا چاہیے۔" سعد نے نرمی سے اس کی کلائی چھوڑ دی اور ٹی وی کا والیوم بڑھا دیا۔

وہ جانتا تھا کہ فری کے یہاں سے اٹھنے کے بعد بے چارے بچوں کی شامت آئے گی اور وہ بچوں کے لیے بس دعا کر سکتا تھا۔

"ایک تو تمہارے ٹی وی کی آواز اور دوسرا بچوں کا شور میں تو پاگل ہو جاؤں گی۔" وہ جھنجلا کر اٹھی۔

"لو تو میں۔۔۔ اف بے چارے میرے معصوم بچے۔۔۔ یا اللہ رحم کرنا۔" یہ فقرہ وہ با آواز بلند نہیں کہہ سکتا تھا۔

✡ ✡ ✡

آنے والے دو تین دنوں میں حالات مزید بگڑے تھے۔ روزانہ سعد کا ایک ہی جواب ہوتا۔

"تمام دوستوں کی تنخواہیں بھی بچوں کی فیسوں اور دیگر اخراجات پر خرچ ہو چکی ہیں اب ادھار نہ ملے تو میں کیا کروں۔"

"تو چوک میں بیٹھ کر صدا لگاتے ہیں۔" وہ تنتناتی ہوئی وہاں سے اٹھی۔

"رات کے پکانے کے لیے کچھ بھی نہیں ہے۔"

"صبر کے ساتھ شکر کا تڑکا لگاؤ۔۔۔ پیٹ بھر کر کھائیں گے۔" سعد گنگنایا۔

"پتا نہیں تم کس مٹی سے بنے ہو۔" وہ فوراً منظر سے غائب ہوئی مگر اس کی بڑبڑاہٹ سعد نے بخوبی سن

لی تھی۔ نکھٹوؤں کا سردار۔۔۔"

☼ ☼ ☼

رات کو فری نے بچوں کو سویاں بنا کر کھلا دیں اور کچن سمیٹ کر بیڈ روم میں چلی آئی۔ سعد نے اس کے اندر آتے ہی کتاب بند کر دی۔

"بھئی میں تو کب سے ہمہ تن گوش ہوں کہ بیگم کی سریلی آواز ابھی آئی کہ آئی۔۔۔ سرتاج کھانا نوش فرمائیں۔" سعد نے اپنی بات کا جیسے خود ہی مزا لیا۔

"صبر کے گھونٹ کے ساتھ شکر کا پانی پیو اور سو جاؤ۔" فری نے تکیہ درست کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئی۔

"یار! صرف روٹی ہی بنا کے دے دو' اچار کے ساتھ کام چلا لوں گا۔" وہ روہانسا ہو کر بولا۔

وہ سنی ان سنی کر کے پڑی رہی۔ سعد نے اس کے اوپر سے چادر کھینچی۔

"پرسوں آدھی رات تک محترمہ نے تمہارے ابا کہہ کہہ کر میری نیند برباد کی تھی تو سنو آج شام میں نے تمہارے ابا کو بھی دیکھا تھا۔ اشیائے خورد و نوش سے بھری گاڑی میں مزید پھل' سبزیاں اور مٹھائیاں ٹھونس رہے تھے۔"

فری ایک دم سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سعد نے اس کا چہرہ گہرا تاریک ہوتے دیکھا اس کے دل کو کچھ ہوا۔

"آئی ایم سوری میرا مقصد تمہیں ہرٹ کرنا تو ہرگز نہیں تھا۔" بھل بھل بہتے آنسو فری کے گالوں کو بھگوتے چلے جا رہے تھے۔ سعد نے اس کے ملگجے حلیے اور بکھرے بالوں کو پشیمانی سے دیکھا اور اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لے کر تھپتھپایا' پھر سرگوشی نما آواز میں دھیرے سے گویا ہوا۔

"ہم دونوں اپنے اپنے اباؤں پہ جھگڑنے کے بجائے اس اللہ کی طرف کیوں نہ دیکھیں' جو سب کا رازق ہے۔" اس نے فری کے آنسو پونچھے۔ "اور ہاں کل جب میں گھر آؤں تو یہ ماسی نما بیوی گھر سے غائب ہو اور میری اصلی والی دھلی دھلائی۔۔۔ اجلی اجلی مسز گھر میں موجود ہو۔" سعد نے اس کی گھنگھریالی اجھی لٹ کو کھینچا تو وہ روتے روتے ہنس دی' مگر دوسرے ہی پل اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

"سعد! تم مجھ سے وعدہ کرو کہ تم آمنہ کی طرف سے کبھی بے خبر نہیں رہو گے۔۔۔ کیا بیٹیوں کے چہروں پہ درج حالات کی تحریریں ان کے باپوں کو نظر نہیں آتیں؟"

"آتی ہیں' مگر بیٹی بیاہنے کے بعد کوئی بھی باپ ان کے چہرے غور سے نہیں دیکھتا۔ وہ باپ جو ان کے حالات سدھار سکتا ہے اور وہ جو بے بس ہے جس کے اپنے حالات بھی ٹھیک نہیں ہیں۔"

"تم وعدہ کرو کہ تم زین اور اسد کے ساتھ آمنہ کے چہرے کو بھی غور سے دیکھا کرو گے تو تمہیں اس کے چہرے پہ لکھا ہر دکھ نظر آیا کرے گا۔ آیا کرے گا نا؟"

اس نے جیسے تائید چاہی تو سعد نے سچے دل سے ہاں میں سر ہلایا تو فری نے مطمئن ہو کر اس کے شانے پہ اپنا سر ٹکا دیا۔

☼ ☼ ☼

دوسرے دن اس نے نئے سرے سے سارا گھر صاف کیا پھر نہا دھو کر سعد کی پسند کا سوٹ پہنا' بچوں کے لیے آلو کی بھجیا بنائی اور سعد کے لیے پودینے کی چٹنی بنائی۔ سعد کی بائیک کا مخصوص ہارن سن کر جب اس نے دروازہ کھولا تو وہ اسے وہیں سے ہاتھ ہلا کر چلتا بنا۔ "یہ کہاں گیا۔" اس نے بچوں سے پوچھا تو انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔

کھانے کی ٹیبل پہ آمنہ کی بڑبڑاہٹیں با آواز بلند جاری تھیں۔

"آج پھر آلو۔"

"آمنہ بری بات۔۔۔" فری نے اپنے لمبے گیلے بالوں کو سمیٹا اور بل دے کر پونی لگائی۔

"چھوٹے بھائیوں کے سامنے اس طرح ناشکری

نہیں کرتے پھر ان کو بھی عادت پڑ جائے گی۔"

"مگر ممار وز ایک سی سبزی۔" وہ منمنائی جبکہ اس کی آنکھ ا...م...نم...چمک رہی تھی۔

"... ... ...ہو گی۔"

... ...م خوش ہوئی۔

"ہاں بالکل سچ۔" فری کی ہنسی میں توکل بھری کھنکھلاہٹ تھی شام گہری ہونے لگی پتا نہیں سعد کہاں چلا گیا تھا۔ یونہی اس نے اپنا دھیان بٹانے کے لیے آپا کو مسڈ کال کی کہ باتوں باتوں میں آپا سے کچھ پیسے ادھار مانگ لے گی۔

کچھ لمحوں بعد ان کا فون آ گیا۔

"ہاں فری! کہو کیا بات ہے؟"

"بس ایسے ہی سوچا خیر خیریت پوچھ لوں۔" وہ کھسیانی ہو کر بولی۔

"سب ٹھیک ہیں۔ ابھی تو میں بے حد مصروف ہوں۔ لیاا کے گھر آئی ہوئی ہوں کیوں کہ رات کو دعوت ہے چھوٹے کے دوست کی فیملی اور بڑے بھائی کے سسرال والے آ رہے ہیں۔ بھابھیاں بریانی، قورمہ اور کھیر بنا رہی ہیں، میں چکن اور مچھلی میرینیٹ کر رہی ہوں۔ ابھی میکرونی اور رائتہ سلاد وغیرہ بھی تیار کرنا ہے پھر فرصت میں فون کروں گی۔ اللہ حافظ۔"

آپا نے خود ہی فون بند کر دیا۔ کتنی ہی کالی گہری راتوں کا سناٹا اس کے اندر اتر آیا، کسی عجیب سے دکھ نے اسے برف کے جنگلوں میں لا کھڑا کیا تھا۔ چہار سو سرد ہوائیں اس کا وجود چھید رہی تھیں ہاں مگر کہیں حرارت تھی وہ چونکی۔ گرم گرم آنسو اس کے لبوں کو چھونے لگے اس کے گلے میں جیسے پھندا سا پڑ گیا۔

"اللہ اکبر!" موذن کی آواز نے اس کے رگ و پے میں ایک نیا احساس جگا دیا۔ اس نے دوپٹا سر پہ لیا۔

"مما، مما دیکھیں نا۔ بابا اتنی چیزیں لائے ہیں۔" زین اس کی ٹانگوں سے لپٹا کہہ رہا تھا۔ برف پگھلنے لگی تھی تب ہی سعد نے قریب آ کر شاپر اس کے ہاتھ میں تھمائے۔

"بڑی تگڑی سی فیس پہ ٹیوشن ملی ہے۔ انہوں نے ایڈوانس بھی آج ہی دے دیا۔"

وہ بشاش لہجے میں بولتا ہوا اس کے اجلے اجلے روپ کو دیکھنے لگا۔ بچے آئس کریم کھاتے ہوئے اپنا فیورٹ کارٹون دیکھ رہے تھے۔ اسے خالہ زبیدہ کی بات یاد آئی۔ وہ بڑا ہی باخبر ہے۔ کیوں کہ وہ ہم سے محبت کرتا ہے اور محبت کرنے والے کسی رشتے سے بھی بے خبر نہیں رہتے۔ باخبر رہنا ان پہ لازم ہوتا ہے۔ ورنہ تمام رشتے محض پتھر کی دیواریں بن کر رہ جاتے ہیں۔

اس کی نظر بے ساختہ آمنہ کے بے فکرے ہنستے مسکراتے چہرے پہ ٹھہر گئیں۔

"سب کا اللہ مالک ہوتا ہے مگر جو ہمیں اس دنیا میں لانے کا موجب ہوتے ہیں ان کے بھی ہم خضر رہتے ہیں پتا نہیں کیوں؟"

فری کی آنکھ سے بہنے والا آخری آنسو اس بڑے ہی باخبر رہنے والے رب رحیم کی محبت میں ستارہ بن کر چمکا تھا اور وہ دل سے مسکرا دی۔



آج وہ لگ رہے ہیں اپنے سے
دل کو روکے کوئی دھڑکنے سے

منزلو! آؤ تھام لو ہم کو
اب تو ہم بھی گئے ہیں تھکنے سے

پھر تو لکھنا تمام عمر پڑے
ختم ہو جائیں غم جو لکھنے سے

تم مجھے مار کیوں نہیں دیتے
کیا ملے گا مرے تڑپنے سے

منتظر واپسی کا کوئی نہیں
اب میں ڈرتا نہیں بھٹکنے سے

اس کو دیکھا تو جیسے قاصر تھے
اس گھڑی آنکھ تک جھپکنے سے

رنگ، خوشبو، ادا، وفا، محبوب
ثانی اب لوٹ آؤ سپنے سے

وجیہہ حسن ثانی

نئی طرح سے نبھانے کی دل نے ٹھانی ہے
وگرنہ اس سے محبت بہت پرانی ہے

خدا وہ دن نہ دکھائے کہ میں کسی سے سنوں
کہ تو نے بھی غمِ دنیا سے ہار مانی ہے

زمیں پہ رہ کے ستارے شکار کرتے ہیں
مزاجِ اہلِ محبت کا آسمانی ہے

ہمیں عزیز ہو کیوں کر نہ شامِ غم کہ یہی
بچھڑنے والے! تیری آخری نشانی ہے

اتر پڑے ہو تو دریا سے پوچھنا کیسا؟
کہ ساحلوں سے اُدھر کتنا تیز پانی ہے

بہت دنوں سے تیری یاد اوڑھ کر اتری
یہ شام کتنی سنہری ہے، کیا سہانی ہے

میں کتنی دیر اسے سوچتا رہوں محسن
کہ جیسے اس کا بدن بھی کوئی کہانی ہے

محسن نقوی



بہت مصروف رہتی ہوں
ابھی آنگن میں بکھری دھوپ کے ٹکڑے
اُٹھانے ہیں
ابھی آکاش پر چڑیوں کے پرسے شام لکھنی ہے
ابھی تاروں کے جھرمٹ میں
تمہارے اور اپنے نام کے تاروں کو چُننا ہے
ابھی شاخوں کی تنہائی پہ تم سے بات کرنی ہے
بھٹکتی کشتیوں کو ساحل پہ لگانا ہے
پہاڑوں کی خموشی میں ہمیں بربات سنی ہے
لبوں سے جو پھسل جائے اچانک
وہ رسیلی بات سُننی ہے
ابھی سبزے کی مہکاروں سے سانسوں کو
جلانا ہے
ابھی خوش میں ملن رُت کی ہوائیں سرسراتی ہیں
تمہیں واپس بلاتی ہیں
چلے آؤ
بہت مصروف رہتی ہوں
مگر پھر بھی!
تمہیں واپس بُلاتی ہوں
نبیلہ نازش راؤ

ہم کو تو گردشِ حالات پہ رونا آیا
رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

کیسے مر مر کے گزاری ہے تمہیں کیا معلوم
رات بھر تاروں بھری رات پہ رونا آیا

کون روتا ہے کسی اور کے غم کی خاطر
سب کو اپنی ہی کسی بات پہ رونا آیا

سیف یہ دن تو قیامت کی طرح گزرا ہے
جانے کیا بات تھی ہر بات پہ رونا آیا

سیف الدین سیف

شگفتہ جاہ

رنگ رنگ پھول

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"کوئی شخص کسی دوسرے شخص پر فسق یا کفر کی تہمت لگائے کیونکہ اگر وہ ایسا نہ ہو تو یہ تہمت اسی کی طرف لوٹ آتی ہے۔" (بخاری)

فائدہ:۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی مسلمان کی بابت یہ کہے کہ وہ تو فاسق یا کافر ہے۔ درآں حالانکہ وہ فاسق یا کافر نہیں ہے تو خود کہنے والا عنداللہ فاسق یا کافر قرار پا جائے گا۔ اس لیے اس قسم کے دعووں سے بچنا چاہیے۔

اسلام:

اگر اسلام میں سے انسانیت اور خدمت خلق نکال دیا جائے تو باقی صرف عبادت بچتی ہے اور عبادت کے لیے اللہ تعالیٰ کے پاس فرشتوں کی کمی نہیں۔

فریحہ شبیر۔ شاہ نکدر

بولتے لفظ:

- خاموش انسان خاموش پانی کی طرح گہرے ہوتے ہیں۔ خاموشی ایک راز ہے اور ہر صاحب اسرار خاموش رہنا پسند کرتا ہے۔ خاموشی دانا کا زیور ہے اور احمق کا بھرم۔
- حال کے عمل سے ماضی کا عمل بدل سکتا ہے ماضی کفر ہو تو حال کلمہ پڑھ کے مومن ہو سکتا ہے حال مومن ہو جائے تو ماضی بھی مومن۔
- دریا عبور کرنے کے لیے کشتی ضرور سبب ہے لیکن گرداب سے نکلنے کے لیے دعا کا سفینہ چاہیے۔
- کسی آدمی کو اپنی بساط سے زیادہ مل جائے تو پھر لوگوں کے ساتھ اس کا برتاؤ برا ہو جاتا ہے۔
- کوئی شخص تمہاری پیٹھ پر سواری نہیں کر سکتا جب تک کہ وہ جھکی ہوئی نہ ہو۔
- ہر جملہ خوبصورت ہے اگر وہ تمہاری امیدوں کے مطابق ہو۔
- بعض لوگ جہاں جاتے ہیں اپنے ساتھ خوشیاں لے جاتے ہیں اور بعض لوگوں کے چلے جانے سے خوشی ہوتی ہے۔
- محبت اس سے نہیں کی جاتی جو خوبصورت ہو، خوبصورت وہ ہے جس سے محبت ہو۔

سیدہ نبہت زہرا۔ کبیر والا پکا

سیاست دان:

ستمبر 1960ء میں نیویارک ریڈیو ٹی وی سے خروشچیف کا انٹرویو مشہور براڈکاسٹر اور کمنٹیٹر ڈیوڈ سیکنڈ نے براڈکاسٹ کیا۔ اسے صرف اس وجہ سے اس کام پر مامور کیا گیا تھا کہ وہ بہت چالاک تھا۔ وہ مسٹر خروشچیف کو غصہ دلا کر اس سے کچھ نازیبا الفاظ کہلوانا چاہتا تھا۔

اس نے خروشچیف سے سوال کیا۔

"آپ کی شخصیت کے دو رخ ہیں۔ ایک لمحے میں آپ غرانے اور پنجہ مارنے لگتے ہیں۔ دوسرے لمحے میں چہرے پر ہنستے ہوئے اتر آتے ہیں۔ آپ کا کون سا رخ صحیح ہے؟"

خروشیف: "اگر بلی کو ٹھوکر مارو گے تو غرائے گی۔ اگر بھگا دو گے تو چلی جائے گی۔"

اس نے پھر تضحیک آمیز سوال کیا۔

"آپ کی تقریریں یا تو دھمکیاں ہوتی ہیں یا شیخیاں۔ کیا آپ چاند پر نہیں بھونک رہے ہیں؟"

ٹی وی دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ مسٹر خروشیف ڈیوڈ سسکنڈ پر برہم ہوں گے اور ڈیوڈ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جائے گا۔ لیکن خروشیف نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

"تم میرے بیٹے سے بھی چھوٹے ہو۔ تمہارے دعوت نامے پر میں ایک مہمان کی حیثیت سے یہاں آیا ہوں اور دنیا کی عظیم طاقت کا نمائندہ ہوں۔ اس صورت میں کیا تمہیں یہ زبان زیب دیتی ہے!"

ڈیوڈ سسکنڈ اپنے ناخن چبانے لگا۔

نمرہ اقرا۔ کراچی

ادیب اور ادب

- وہ بات جو ادیب کی بیوی کبھی نہیں سمجھ سکتی یہ ہے کہ جب ادیب کھڑکی کے باہر گھور رہا ہوتا ہے تو اس وقت بھی وہ کام کر رہا ہوتا ہے۔

(باسکو)

- مصنف انسانی سوچ کا مصور ہوتا ہے۔

(جوزف اسٹالن)

- کیا پروا ہے کہ میرے پاس عصائے سلطانی نہیں میرے پاس قلم تو ہے۔

(والٹیئر)

- زندہ تحریر وہ ہوتی ہے جس میں روح عصر ہو جس میں ابدیت ہو اور جو وقت گزرنے کے بعد زندہ رہے۔

(ارسطو)

- اعلا ادب وہ ہے جو انسان کے آفاقی مسائل کا ترجمان اور اس کے ذہن و شعور کا غماز ہو۔

(ٹالسٹائی)

گڑیا شاہ۔ کہروڑ پکا

انسان کے چہرے

ہر انسان کے تین چہرے ہیں۔

٭ پہلا وہ دنیا کو دکھاتا ہے۔

٭ دوسرا دوستوں اور خاندان کو دکھاتا ہے۔

٭ تیسرا وہ کسی کو نہیں دکھاتا۔

(جاپانی کہاوت)

بے چارگی

ایک آرٹسٹ حقیقت پسندانہ مصوری کرتے تھے۔ تجریدی تصویریں نہیں بناتے تھے لیکن ان کے ایک شناسا نے بہت اصرار کیا کہ وہ ان کی ایک تجریدی پورٹریٹ بنا دیں۔

انہوں نے پورٹریٹ تیار کر کے اسٹوڈیو میں رکھا ہوا تھا۔ ایک روز ان کا شاگرد اسٹوڈیو میں آیا تو اس نے دیکھا کہ آرٹسٹ صاحب پورٹریٹ سامنے رکھے سر پکڑے بیٹھے ہیں۔

"کیا بات ہے سر! کیا ان صاحب کو اپنی پورٹریٹ پسند نہیں آئی؟" شاگرد نے ہمدردانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں۔ پورٹریٹ تو پسند آ گئی ہے لیکن ان کا کہنا ہے کہ ناک کچھ ٹھیک نہیں بنی ہے۔ اسے ٹھیک کر دوں۔" آرٹسٹ صاحب نے مردہ سے لہجے میں بتایا۔

"تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے! ٹھیک کر دیجیے نا۔" شاگرد بولا۔

"ٹھیک تو میں کب کا کر چکا ہوتا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں نے ناک بنائی کہاں تھی۔" آرٹسٹ نے وحشت زدہ لہجے میں بتایا۔

اقصیٰ ناصر۔ کراچی

مرتبہ

حکیم لقمان ایک دن اپنے شاگردوں کو حکمت و دانائی کا درس دے رہے تھے۔ ایک شخص سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ دیر تک ان کی صورت پر غور کرتا رہا اور آخر پہچان کر بولا۔

"تم وہی ہو نا جو فلاں مقام پر میرے ساتھ بکریاں چرایا کرتے تھے۔"

"ہاں میں وہی شخص ہوں۔"

تب اس نے حیران ہو کر کہا۔ "تو یہ مرتبہ تمہیں کیونکر حاصل ہوا؟"

"دو باتوں سے۔ ایک سچ بولنا اور دوسرا بلا ضرورت بات نہ کرنا۔"

ندا، مدیحہ۔ فیصل آباد

صاحب اختیار احمق،

ایک ہزار قابل انسان مر جانے سے اتنا نقصان نہیں ہوتا جتنا ایک احمق کے صاحب اختیار ہو جانے سے ہوتا ہے۔

(مولانا جلال الدین رومی)

بینش مدثر۔ کراچی

قانون،

صحافیوں کی ایک ٹیم جیل کا دورہ کر رہی تھی۔ ایک کوٹھڑی میں ایک ایسے صاحب بند تھے۔ جو شکل سے خاصے شریف اور مسکین سے دکھائی دے رہے تھے۔ ایک صحافی نے ان کے بارے میں جیلر سے پوچھ لیا۔

"ان صاحب کا کیا جرم ہے؟"

"انہوں نے مشہور ڈاکو حنیف ٹنڈے کو ایک قتل کرتے دیکھا تھا۔ یہ اس قتل کے اکلوتے چشم دید گواہ ہیں۔ انہیں حفاظت کے خیال سے جیل میں رکھا گیا ہے۔"

"اور حنیف ٹنڈا کہاں ہے؟" دوسرے صحافی نے پوچھا۔

"وہ ضمانت پر رہا ہو چکا ہے۔" جیلر نے اطمینان سے بتایا۔

ترنم۔ خانیوال

معافی،

اللہ سے جن لوگوں کا تعلق زیادہ ہوتا ہے ان لوگوں میں معاف کرنے کی صلاحیت اتنی ہی زیادہ ہوتی ہے اور جن کا اللہ سے تعلق نہیں ہوتا وہ اپنا بدلہ آپ لیتا ہے۔

اگر آپ کو کبھی انتقام کا موقع ملے تو اس وقت اپنے رحم دل ہونے کا ثبوت دیں اور معاف کر دیں۔

(واصف علی واصف)

بدلہ،

جارج برنارڈ شا نے ایک مرتبہ امریکہ کی ہر چیز کا مذاق اڑایا۔ امریکی اخبارات احتجاجاً چیخ اٹھے۔ مگر ایک اخبار بالکل خاموش تھا۔ وہ برنارڈ شا سے بدلہ لینے کے لیے وقت کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جب شا اپنے ثقافتی دورے پر اپنی بیوی کے ہمراہ میامی آیا تو اسی اخبار کے ایڈیٹر نے مسز شا کی آمد کے بارے میں تفصیلی رپورٹ شائع کی۔

"مسز شا ڈنر میں گئیں۔ مسز شا نے فنکشن اٹینڈ کیے۔" وغیرہ وغیرہ۔

ایڈیٹر نے آخر میں ایک جملہ لکھ دیا۔

"مسز شا یہاں اپنے شوہر جارج برنارڈ شا کے ساتھ آئی تھیں جو ایک مصنف ہے۔"

عائشہ۔ گوجرہ

استغفار،

ابلیس نے طرح طرح کے گناہوں میں امت محمدؐ کو ملوث کیا۔ پھر بھی ملعون کہتا ہے کہ اس امت کے لوگوں نے میری کمر توڑ ڈالی ہے۔ جب یہ گناہ کرتے ہیں تو فوراً استغفار کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ سے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔

(حسن بصری)

خالدہ جیلانی

میری بیاض سے

ثناء عابد ــــــــ نارووال

آپ لوگوں کے کہنے پر ہی اُکھڑ جاتے ہیں
لوگ تو جھوٹ بھی سو طرح کے گھڑ جاتے ہیں
آنکھ کس طرح کھلے میری کہ میں جانتا ہوں
آنکھ کھلتے ہی سب ہی خواب اجڑ جاتے ہیں

نجمہ اکرم ــــــــ گاؤں گورائیکی

یہ کیسے کیسے ریاکار ہیں زمانے میں
سزا کے نام سے جھجکے، جزا کو سلطے ہیں

شائستہ اکبر ــــــــ گڈو کالونی

عادت ہی بنالی ہے تم نے تو منیر اپنی
جس شہر میں بھی رہنا اکتائے ہوئے رہنا

عاصمہ رمضان ــــــــ سرک کلاں گجرات

اُسے کہنا سدا موسم بہاروں کے نہیں رہتے
سبھی پتے بکھرتے ہیں، ہوا جب رقص کرتی ہے

مدیحہ نورین مہک ــــــــ برنالی

بات تو سچ ہے مگر دل مانتا نہیں
تیز بارش میں میرا آشیانہ جلا کیسے

مروہ، اقرأ ــــــــ کراچی

پہلے موم کے گھر بنانے نہیں جلتے
بچ جائیں تو سورج سے پگھلنے نہیں جاتے
مانا کہ جیت ہمارا مقدر ہے مگر
وہ سامنے آ جائیں تو ہرانے نہیں جاتے

حمیرا قریشی ــــــــ حیدر آباد

دلفگار کا بلکنا تم سنتے تو رو دیتے
اچھا ہوا درد میرے بے زباں تھے سبھی

رضوانہ شکیل تنولی ــــــــ سیالکوٹ

تم بھی خفا ہو لوگ بھی برہم ہیں دوستو!
اب ہو چلا یقیں برے ہم ہیں دوستو!

نفیسہ ثمر بٹ ــــــــ گجرات

یہ خلوص کوئی خوبی ہے کہ دلوں میں رابطہ باہم نہیں
تمہیں اعتراف ستم نہیں، نہ مجھے اعتبار کرم نہیں
یہ فقط عزیز کی بات ہے کہ زبان سے کچھ بھی نہ کہو
تمہیں ورنہ اس کی خلش تو ہے کہ تمہاری بزم میں ہم نہیں

شازیہ سعید ــــــــ شاہ نکدر

لفظوں سے لہجوں سے نیت کھل ہی جاتی ہے
شروع شروع میں تو ہر کوئی اچھا لگتا ہے

سعیدہ ــــــــ ستیانہ

تجھ سے بچھڑے تو عجب ڈھنگ پہ چل نکلی زندگی
تجھ سے ملنے کے بھی اطوار تھے نرالے

زوبار یہ خالد ــــــــ لاہور

میں چاہتا نہ تھا جواب دینا اسے
ورنہ جواب میرے پاس اس کے ہر سوال کا تھا
اس کی جیت سے ہوئی خوشی مجھ کو
بھی جواز میرے پاس اپنی ہار کا تھا

عظمیٰ شفیق ــــــــ جڑانوالہ

ناشناسا جس کی دیواریں ہیں، در بھی اجنبی
وہ ملا تھا مجھ کو ہمیشہ اک نئے گھر کی طرح

عذرا ناصر ــــــــ کراچی

کسی مفلس کسی نادار کے گلشن کی کلی
صبح کے وقت کبھی شبنم کو ترس جاتی ہے
ایک تو اُٹھتی نہیں ہے کبھی گھنگھور گھٹا
اور اُٹھتی ہے تو دریا پہ برس جاتی ہے

واصفہ کنول ــــــــ دائرہ دین پناہ

محبت میں ہوتی ہیں، انسان کو
شکستیں زیادہ، فتوحات کم



فنکاروں نے انکار کر دیا تھا کیا؟) جب آپ کسی کام کو کرنے کی ہامی بھر لیتے ہیں تو پھر اس میں آپ کی جانب سے تخلیقی مداخلت کی ایک حد ہوتی ہے۔ میری وجوہات سے قطع نظر میں نے فلم میں کچھ ایسا کیا ہے جو ان باتوں کے برخلاف ہے جن کا میں پرچار کرتا ہوں تو میں اس کی ذمہ داری لیتا ہوں۔" (اے مہ گل کی ہے نا شیراں والی)

شکست

ایک اور پاکستانی اداکارہ و ماڈل سعدیہ خان (جسے آپ ڈراما سیریل "خدا اور محبت" میں ایمان کا کردار کرتے دیکھ چکے ہیں) بھی بالی ووڈ کو پیاری ہو گئی ہیں، سعدیہ کو فلم میں کامیڈین کپل شرما کے مقابل ہیروئن کاسٹ کیا گیا ہے۔ (ہیں ہیں کپل شرما کی ہیروئن بس!

خبریں وبریں

صفیہ سہیل

ذمہ داری

پیارے افضل سے شہرت پانے والے حمزہ علی عباسی نے ہمایوں سعید کی آنے والی فلم میں ایک متنازع سین فلم بند کروا دیا۔ اس کے بعد سے ان پر ہر طرف سے تنقید کی جا رہی تھی۔ حمزہ علی عباسی اس بارے میں کہتے ہیں۔

میری نئی فلم کی کہانی اور ہدایت کار بہترین ہیں لیکن اس میں بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں میری رائے ہے کہ وہ ہماری ثقافت کا حصہ نہیں، میرا مقصد اس فلم کو کر کے پیسہ کمانا نہیں تھا میں نے وہ بھارتی فلموں کو ٹھکرا دیا کہ وہ ہماری اخلاقیات کے خلاف تھیں۔ (حمزہ آپ تو واقعی ہیرو ہو پھر... تو؟) یہ فلم میں نے اپنے دوستوں کے لیے کی (یقیناً" ہمایوں کے لیے...) جو میرے لیے جب موجود تھے جب میں کچھ نہیں تھا (پیارے افضل کا خراج؟) میرے دوستوں کو اس میں میری ضرورت تھی (ہمایوں کو بلی

فلم کیسی ہوگی لگ پتا گیا؟) اس فلم کے لیے سعدیہ کو آڈیشن کے انتہائی سخت مراحل سے گزرنا پڑا اور



بالا آخر وہ آٹھ سو لڑکیوں کو شکست دے کر یہ کردار حاصل کر پائیں۔ (بولی ووڈ میں کام کرنے کے لیے تو ہماری آرٹسٹ آٹھ ہزار لڑکیوں کو شکست دے سکتی ہیں؟) کیوں ٹھیک ہے نا سعدیہ!) یہ ایک میوزیکل کامیڈی فلم ہوگی (دیکھا ہم نے کہا تھا نا کہ۔۔۔؟) اور اسے تین زبانوں ہندی 'ناروجین اور انگریزی میں بنایا جائے گا۔

انداز

منی لانڈرنگ کیس میں گرفتار ایان علی جب عدالت میں پیشی کے لیے پیش ہوتی ہیں تو ان کا لباس و انداز بالکل ایسا ہوتا ہے کہ وہ کسی شو میں شرکت کے لیے آرہی ہیں۔ ایان علی کے بارے میں پتا چلا ہے کہ ان کے والدین کے درمیان نو سال قبل علیحدگی ہو چکی تھی۔ ایان اپنی والدہ کے ساتھ رہتی تھی۔ ٹاپ کلاس ماڈل کے بارے میں آئے دن کوئی نہ کوئی انکشاف ہوتا رہتا ہے۔ اب پتا چلا ہے کہ ایان علی نے لاہور سے 2009ء میں میٹرک ڈی گریڈ میں پاس کیا اور وہ مطالعہ پاکستان میں فیل ہوتے ہوتے رہ گئی تھی ایان نے سب سے زیادہ نمبر انگریزی میں حاصل کیے۔
(ہماری ذہنیت ہی یہ ہے کہ ہم انگریزوں کے۔۔۔؟)

کچھ ادھر ادھر سے

☆ میرا خیال ہے میرے دوستوں نے شعیب شیخ کی چکا چوند سے متاثر ہو کر اپنے سوالوں کی وہ تلوار نیام میں رکھ لی تھی' جس سے یہ پوری زندگی لوگوں کے سر قلم کرتے رہے 'انہوں نے اپنا وہ قلم بھی توڑ دیا تھا جس کے ذریعے یہ پوری زندگی دوسروں کی پگڑیاں اچھالتے رہے اور انہوں نے اپنی اس زبان پر بھی تالا چڑھا دیا تھا جس سے یہ غضب کرپشن کی عجب کہانیاں بیان کرتے تھے۔
(جاوید چوہدری۔۔۔ زیرو پوائنٹ)

☆ خود نمائی کا شوق خدا دشمن کو بھی نہ دے جسے لاحق ہو جائے عزت کی پروا نہیں کرتا ہے۔
(محمد اظہار الحق۔۔۔ تلخ نوائی)



☆ ذوالفقار مرزا کے اکثر الزامات درست' ساکھ کمزور اور حکمت عملی کمزور تر ہے۔
(ہارون الرشید۔۔۔ ناتمام)

☆ کیا آپ کو امید ہے کہ کراچی میں جلائی گئی ہونے والی بس کے بے گناہ مسافروں کے قاتل بھی پکڑے جائیں گے؟ مجھے تو کوئی امید نہیں۔۔۔ بے وسیلہ اور بے سہارا لوگوں کو گرفتار کر کے ان پر قتل ڈال دیے جائیں تو اور بات ہے لیکن اگر قاتل کسی دہشت گرد گروہ کے کارندے ہیں تو لیے اپنے مقتولوں کا خون معاف کر کے صبر و شکر سے کام لیں۔
(نذیر ناجی۔ سویرے سویرے)

☆ ایک طاقت کا پجاری کالم نگار اکثر طعنے دیتا رہتا ہے۔ تم لوگ اسپرو کی گولی تو ایجاد نہیں کر سکتے اور امریکا سے لڑنے چل پڑتے ہو کوئی پوچھے ذرا وہ تاریخ ہی بتا دیں جب ویت نام نے اسپرو کی گولی ایجاد کی تھی اور پھر اس کے نتیجے میں امریکا کو شکست دی تھی۔
افغانستان میں فتح ان فرزانوں کی تھی جن کا توکل صرف اللہ پر تھا۔ ایسی فتح جس کے نتیجے میں ایک عالمی طاقت زیرا زبر ہو گئی۔
☆
(اوریا مقبول جان۔۔۔ حرف راز)

ہلکے پھلکے انداز میں لکھا ان کا یہ ناولٹ ہمیں بھی بہت اچھا لگا۔ حیدر مسعود اور ایمن فرحت اشتیاق کے ناول "دل سے نکلے ہیں جو لفظ" کے کردار ہیں۔
عفت سحر طاہر از میرٹ کو کب لائیں گی اس کا جواب تو وہی دے سکتی ہیں' ہم بھی بے چینی سے انتظار کر رہے ہیں۔



نامۂ خاتون

خط بھجوانے کے لیے پتا
خواتین ڈائجسٹ، 37- اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
khawateendigest@hotmail.com

نوریہ جہانگیر چشتی ۔۔۔ نامعلوم شہر

سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" سے استفادہ کیا اور متعلقہ مسائل مزید مکمل کر سامنے آئے۔
"سروے" میں مصنفین کے جوابات پڑھ کر ہمیشہ ہی بہت مزہ آتا ہے۔ ہر ماہ اس کا انتظار رہنے لگا ہے۔ اب آتی ہوں اپنے موسٹ فیورٹ آب حیات اور ثمل کی طرف۔ ایک بہن نے مئی کے شمارے میں لکھا کہ "آب حیات" میں لگتا ہی نہیں کہ یہ سالار اور امامہ ہیں بلکہ وہ چاہتی ہیں کہ یہ وہ دونوں نہ ہوں۔ ٹھیک ہے ہم نے انہیں ان کی بہت اونچی مسند پر بٹھا رکھا ہے اور لیکن یہ بھی تو دیکھیں کہ "پیر کامل" میں ان دونوں کی زندگی کے ایک خاص پہلو کو فوکس کیا گیا ہے۔ لیکن یار وہ بھی ایموشنز رکھتے ہیں' ان چھوٹی موٹی رنجشوں اور نشیب و فراز کو اپنے کردار کے ساتھ لے کر چلتے ہوئے ہی تو یہ دونوں اپنی اصل خوب صورتی کو واضح کریں گے۔

"ثمل" خوب صورت کرداروں کا مرکب۔ کہانی ایک بہتے ہوئے دریا کی مانند قاری کو بھی بہا کر ساتھ لے جائے اور یہ ہی تو خوبی ہے آپ کی' آپ کی کہانی کا تسلسل ٹوٹا ہوا لگتا ہی نہیں۔ نمو آپی پلیز میں بھی بہت ساری قارئین کی طرح "سعدی" کے ساتھ کچھ برا نہ کرنے کا کہوں گی اور تنزیلہ آپی نے اس ماہ کا انتظار مزید بڑھا دیا۔ آپی آپ نے واقعی میں بہت گہرائی کے ساتھ لکھا ہے اور بہت خوب صورتی سے کرداروں کی گتھی کو سلجھایا ہے۔ بے شک یہ اردو ادب میں ایک خوب صورت اضافہ ہے۔
سحر ساجد جی کے ناولٹ نے ہنسا ہنسا کے پیٹ میں بل ڈال دیے۔ بہت بہت مزہ آیا آپ کا ناولٹ نمبر لے گیا بھئی۔ افسانوں میں "ہزار اور نمکین لہجے" پڑھا۔ دونوں ہی ہلکے پھلکے اور معاشرتی مسائل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تھے "خاتون کی ڈائری" سے سلیم کوثر کی غزل اور

زوباریہ خالد ۔۔۔ لاہور

سب سے پہلے "ثمل" پڑھا۔ آخر کار فارس اور زمر کی شادی ہو ہی گئی "احمر شفیع" کا کردار لاجواب ہے۔ سحر ساجد نے اتنی کمال کا ناولٹ لکھا کہ میری تو ہنسی ہی نہیں رک رہی تھی۔ شعمان عابد کے خطوط بہت زیادہ پسند آئے۔ حیدر مسعود اور ایمن والے جس ناول کا اس ناولٹ میں ذکر کیا گیا ہے اس کا نام بتا دیں؟ "دو پاگل سی" جیسی مزاحیہ تحریریں ہر ماہ ضرور شامل ہونی چاہییں۔
عفت سحر طاہر سے یہ سوال ہے کہ اکثر دیٹ اوہ۔۔۔ میرا مطلب ہے از میرٹ کب آئے گا؟ "غزال ایمان نے "دربار دل" کے بارے میں پوچھا یہ ناول فروری 2005ء کے خواتین ڈائجسٹ میں شائع ہوا تھا۔ سونیا حسین اور شاہ عابد کے اشعار پسند آئے۔
ج : پیاری زوباریہ! سحر ساجد نے بہت کم لکھا ہے لیکن جب بھی لکھا ہے مختلف اور متنوع موضوعات پر لکھا ہے'

"میری بیاض" میں پاکیزہ ہاشمی کا شعر پسند آیا۔

ج : پیاری زوبیہ! ہمیں بے حد افسوس ہے کہ آپ کے پچھلے خطوط شائع نہ ہو سکے۔ ہماری قارئین خواتین ڈائجسٹ سے اتنی محبت کرتی ہیں' اتنے خوب صورت خط لکھتی ہیں۔ اتنا جامع تبصرہ کرتی ہیں کہ ہماری دلی خواہش ہوتی ہے کہ تمام خطوط شامل کیے جائیں لیکن کیا کریں صفحات کی مجبوری کی بنا پر سارے خطوں کو جگہ دینا ممکن نہیں ہوتا۔ خواتین ڈائجسٹ میں بہت سے سلسلے ہیں اور تمام ہی سلسلے قارئین میں بے حد مقبول ہیں ان کو بھی جگہ دینا ہوتی ہے لیکن ایک بات کا یقین دلا دیں کہ ہم تمام خطوط پوری توجہ سے پڑھتے ہیں۔

مریم حمید' صدف آصف' آمنہ حمید۔۔۔ بدر کی کوسائیاں گوجرانوالہ کینٹ

مئی کا شمارہ بہت زبردست تھا۔ اس ماہ کی سب سے پیاری کہانی "وہ پاگل سی" بہت پیاری رہی۔ عمیرہ احمد کا "آب حیات" مزے کا رہا اور نمرہ احمد کا "نمل" زبردست ہے۔ پلیز نمرہ جی سعدی کو کچھ مت کیجئے گا۔ آپی پلیز ایک ریکوسٹ ہے F.M-103.6 کے آر جے آنسہ ملک' عائل زوہیب کا انٹرویو ضرور شائع کیجیے گا۔ آپی پلیز یہ بتا دیں کہ کرن میں شائع ہونے والا ناول "دردل" کتابی شکل میں آیا ہے یا نہیں پلیز۔

ج : مریم' صدف' آمنہ۔۔۔ خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔ نبیلہ عزیز کا ناول جلد کتابی شکل میں آنے والا ہے۔

اقراء حبیب۔۔۔ راولپنڈی

9 تاریخ کو دکان سے خواتین ڈائجسٹ خرید کر لائے۔ خیر سے آتے ساتھ ہی ماما صاحبہ نے ایسے کاموں میں پھنسایا کہ آنکھوں میں آنسو ہی آگئے۔ دل ہی دل میں اللہ سے شکوہ کیا۔ کیا تھا جو ہمیں بھی کسی امیر کبیر بندے کی بیٹی بنایا ہوتا۔ دس ملازم آگے پیچھے پھرتے۔ خیر رات کو جب سب سو گئے تو بیچارے ہم نے ڈائجسٹ اٹھایا سیدھا "نمل" نمرہ نے پھر ایسے گھمائے کہ رات کو جو ہمیں بے وقت کی بھوک لگتی ہے اس کو بھی بھول گئے سحر تو تب ٹوٹا جب آخری لائن پڑھی کہ سب اس بات سے بے خبر ہیں کہ ٹھیک 30 گھنٹے اور 12 منٹ بعد وہ سعدی یوسف کو کھو دیں گے ہائے نہ کریں یار نمرہ جی۔ سعدی کو مارنے لگی ہیں آپ مجھے لگتا ہے کہ سعدی کے مرنے کے بعد پھر حنین سعدی کی دی ہوئی فائلز کھولے گی۔ جواہرات کا بھانڈا میری اینجیو کے ذریعے نہیں بلکہ اس کی اپنی بدحواسی کی وجہ سے پھوٹے گا اور سعدی کے مرنے کے بعد زمر جانے کی کہ حلیمہ آخر ہے کون۔ خیر یہ تو میرا اندازہ ہے صرف آگے اللہ بہتر جانے۔ عفت سحر طاہر کا بن مانگی دعا بھی زبردست ہے اور عمیرہ احمد جی کے تو کیا ہی کہنے۔ تزئین ریاض کو نہ پا کر مایوسی ہوئی اور ہاں یاد آیا مجھے جنوری 2015ء اور مارچ 2015ء کا شمارہ ڈائجسٹ چاہیے مجھے پیسے بھیجنے کا طریقہ بتا دیں میں بھیج دوں گی۔

ج : پیاری اقراء! اللہ سے شکوہ نہیں شکر کرنا چاہیے۔ آپ بازار جا کر خواتین ڈائجسٹ خرید لائیں اور رات بھر جاگ کر پڑھا۔ یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ ایسے گھر میں پیدا ہوتیں جہاں پرچا خریدنے اور پڑھنے کی اجازت ہی نہ ملتی۔ خواتین ڈائجسٹ آپ کو پسند آیا یہ جان کر خوشی ہوئی۔ مارچ کا شمارہ خریدنے کے لیے آپ ہمیں اپنا ایڈریس بھجوا دیں۔ ہم آپ کو پرچے وی پی کر دیں گے۔ آپ کو پوسٹ مین کو فی پرچا 100 روپے ادا کرنا ہوں گے۔

نائلہ کنول۔۔۔ حافظ آباد

خط لکھنے کی وجہ سحر ساجد کا ناولٹ وہ پاگل سی اف میرا تو برا حال ہو گیا ہنس ہنس کر بہت مزا آیا۔ ہم بھی کچھ کچھ ایسے ہی ہیں۔ "نمل' یارم' عہد الست' آب حیات" بہت

اعتذار

پچھلے ماہ نمل میں صفحہ 221 پر سورہ کا نام نافر لکھا گیا۔ قرآن پاک میں اس نام کی کوئی سورۃ نہیں ہے۔ یہ سورہ فاطر ہے۔
اس سہو کے لیے اللہ تعالیٰ کے حضور معافی کے خواستگار ہیں۔ قارئین سے بھی معذرت خواہ ہیں۔

بہت اچھے ہیں۔ افسانے بھی بہت اچھے ہوتے ہیں۔ نمکین لہجہ پسند آیا۔

ج : پیاری نائلہ! آپ کی رائے ان سطور کے ذریعے متعلقہ مصنفین تک پہنچائی جارہی ہے۔

آمنہ ولید۔۔۔ ٹاؤن شپ لاہور

سب سے پہلے "کرن کرن روشنی" سے ایمان و دماغ منور کرکے آب حیات کی طرف بڑھی۔ زبردست عمیرہ جی! لیکن پلیز عمیرہ جی امامہ اور سالار کو کبھی جدا نہ کیجیے گا۔ نمل میں نمرہ احمد کی قرآنی معلومات قابل رشک ہیں۔ نمرہ احمد سے درخواست ہے کہ خدارا سعدی کے ساتھ کچھ برا مت کیجیے گا پلیز۔ افسانے سارے لاجواب ہوتے ہیں۔ "بخوارہ" "سبق آموز کہانی تھی۔۔۔ جیا بخاری آپ کا "ایک خط" بہت مزے کا لگا۔ ناولٹ میں سے "وہ پاگل سی" لاجواب۔ کافی عرصہ بعد ہنستا مسکراتا ناولٹ پڑھنے کو ملا۔ نعمان عابد کے پہلے خط نے ہنسا ہنسا کے دوہرا کردیا اور ڈائجسٹ قوم کی صفات پڑھ کر تو مجھے بھی اپنی کئی بوتلیاں یاد آگئیں۔ اپنی سات سالہ شادی شدہ سخت جاب کے باوجود اپنے شوق سے دست برداری اختیار نہیں کرسکی۔ بہرحال سحر ساجد کے ہنستے مسکراتے ناولٹ نے موڈ بے حد خوشگوار کردیا۔ "اف یہ ممی" بھی اچھا لگا۔ اور ثمرہ بخاری کے سادگی اور بے ساختگی لیے ہوئے جوابات بہت اچھے لگے۔ ثمرہ جی "ہم سے ہے زمانہ" کے ساتھ کب آرہی ہیں؟ اور سائرہ رضا آپ کہاں غائب ہوگئی ہیں۔

ج : پیاری آمنہ! یاد آوری کا شکریہ' سائرہ رضا کا مکمل ناول "خالی دامن" اس ماہ جون کے شمارے میں شامل ہے۔ ثمرہ جی کی کمی تو ہمیں بھی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ٹی وی نے ہماری ان بہت پیاری مصنفہ کو ہم سے دور کردیا ہے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

اسماء۔۔۔ ضلع میانوالی

خط لکھنے کی وجہ نمل ہے۔ بہت سی یادگار تحریریں پڑھیں اور کئی بار خط لکھنے کا سوچا مگر کبھی مصروفیت آڑے آتی اور کبھی سستی مگر نمل ایک یادگار ناول ہے جو کبھی بھی نہیں بھولے گا۔ پلیز پلیز نمرہ! سعدی کا بال بھی بیکا نہ کیجیے گا۔ ابھی عمر تھا تجیر کا غم تازہ ہے۔ ہائے اللہ پلیز نمرہ سعدی کو کچھ نہ ہو۔ وہ معصوم سا کیوٹ سا گھنگھریالے بالوں والا سعدی یوسف پہلے وارث کے مرنے پر میرا برا حال تھا اتنی دردناک موت' ہاشم تجھے اللہ غرق کرے۔

جہاں نمل کی آخری لائن کہ "تیس گھنٹے اور بارہ منٹ بعد وہ سعدی کو کھودیں گے" ساکت کیا وہیں سحر ساجد کی تحریر نے ہنسنے پر مجبور کردیا۔ ہنس ہنس کے برا حال ہوگیا۔ اف یہ ممی بھی بہت اچھی تحریر تھی۔ بن مانگی دعا بھی میرا فیورٹ ناول ہے اور بہت زبردست جارہا ہے اور آب حیات میں عمیرہ احمد سے شکوہ کرنا تھا کہ امامہ اتنی بے وقوف تو نہیں تھی اور سالار وہ تو پھر ہے ہی اپنا فیورٹ۔ اب زنائشہ ختم کردیں اس کی۔ بن مانگی دعا میں معیز اور ابیہا کے سین نے مزہ دیا ہاہاہا مجھے تو حیرت ہوتی ہے ان قارئین پر ہوتی ہیں کہ شعاع اور خواتین کا معیار پہلے جیسا نہیں رہا۔

سائرہ رضا کہاں غائب ہیں ان سے بھی زبردست ناول لکھوائیں نا۔

ج : پیاری اسماء! آپ نے خط لکھا بہت خوشی ہوئی آپ کے جذبات سے متاثر ہوکر کہ ہم نے نمرہ احمد سے سعدی کے لیے رحم کی اپیل کی ہے۔ اب یہ ان کے ہاتھ میں ہے کہ وہ سعدی کے ساتھ کیا کرتی ہیں۔

امامہ کے بارے میں ایک بات ذہن میں رکھیں' وہ فرشتہ نہیں ہے "انسان" ہے۔ امامہ آج بھی وہی ہے اللہ کو ماننے والی اور اللہ کی ماننے والی' ختم نبوت پر کامل یقین رکھنے والی باقی جو کچھ وہ کررہی ہے' وہ انسانی سرشت کے تحت ہے۔

عائشہ صدیقہ۔۔۔ گوجرہ

مسمرائز ہوجاتا ہے آب حیات بندہ پڑھ کے۔ باقی عہدالست اور نمل زبردست ہیں۔ بن مانگی دعا میں عفت جی پلیز ابیہا اور معیز کو جلدی ملادیں۔

ج : پیاری عائشہ! آپ کا ناولٹ ابھی پڑھا نہیں اس لیے کوئی رائے دینے سے قاصر ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ماہوش طالب۔۔۔ لاہور

ایک بات سمجھ میں نہیں آتی' آپ کے ناولز کی ہیروئن

سالوں میں بھی غضب ڈھا رہی ہوتی ہے تو پھر سرورق میں گرلز اتنی اوور ڈو کیوں؟ جو پھر بھی نہ تو نہیں بھلی کیا یہ غلط انتخاب نہیں؟

دوسری بات اتنی قسط وار کہانیاں۔۔۔؟ کوئی کیسے اتنا ٹائم نکالے اور پھر سے انتظار کرے۔۔۔ لیکن خیر پھر بھی میں ٹائم نکال ہی لیتی ہوں اور پڑھتی بھی ہوں مگر ایڈیٹر صاحب آپ کچھ تو رحم کیا کریں۔۔۔ پلیز میری موسٹ پسندیدہ رائٹرز عنیزہ سید، سائزہ رضا، فاخرہ جبیں، نگہت سیما، عائشہ نصیر ہیں۔ عمیرہ احمد بھی بلاشبہ ایک منجھی ہوئی لکھاری ہیں۔ پیر کامل اور امربیل ان کی سب سے عمدہ کہانیاں ہیں نمرہ احمد نیلی راجپوتاں کی ملکہ، قراقرم کا تاج محل اور مصحف امیزنگ کہانیاں ہیں۔ انگلش زبان کا استعمال اب رائٹرز غیر ضروری اور ضرورت سے زیادہ کرنے لگی ہیں خصوصاً قسط وار کہانیوں میں اور یقین جانیے کہانی پڑھتے ہوئے ایسا ہی لگتا ہے جیسے لکھاری اپنی ذاتی اور ایکسٹرا معلومات کا امپریشن جمانے کی کوشش کررہی ہے۔ (معذرت کے ساتھ)۔ افسانوں کا معیار بھی وہ نہیں رہا جو پہلے تھا۔ ایک ہی موضوع مصنف اور عنوان مختلف۔ تنزیلہ ریاض کی مرگ برگ بہت اعلا کاوش تھی اور اب "عہد الست" بھی زبردست جارہا ہے۔

ج۔ پیاری ماہ وش! ہمیں تو ساری ہی پسند ہے لیکن کیا کریں ہماری ڈیزائنر شاید آپ سے مطمئن ہی نہیں ہوتیں۔ قسط وار کہانیوں پر آپ کا اعتراض بجا ہے لیکن آپ خود ہی فیصلہ کریں کہ آب حیات اور عہد الست جیسی کہانیوں سے صرف اس بنا پر کہ قسط وار ہیں قارئین کو محروم رکھنا زیادتی نہیں ہوگی؟ اور آپ جانتی ہیں کہ اتنی طویل کہانیاں ایک قسط میں شائع کرنا ممکن نہیں۔۔۔

تحریم شاہد بخاری۔۔۔ نامعلوم شہر

میں میٹرک کی اسٹوڈنٹ ہوں میں اپنی تمام مصروفیات کو پس پشت ڈال کر سب سے پہلے نمرہ احمد کی کہانی نمل پڑھتی ہوں۔ نمرہ احمد بہت اچھا لکھتی ہیں۔ نمل میں میرے فیورٹ کردار سعدی یوسف اور ہاشم کاردار ہیں۔ پلیز آپی سعدی کے ساتھ کچھ برا نہ کیجیے گا اور "عفت سحر طاہر" کا ناول "بن مانگی دعا" میرا فیورٹ ہے۔ اس میں مجھے عون کا کردار اچھا لگتا ہے۔

ج۔ پیاری تحریم! خواتین کی پسندیدگی کا شکریہ۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

صبا علی۔۔۔ چنیوٹ

میں خواتین ڈائجسٹ کی تقریباً بارہ سال سے خاموش قاری ہوں' پر آج خط لکھنے کی وجہ نمرہ احمد کا ناول "نمل" ہے۔ بہت بہت ہی زبردست ہے۔ نمل میں مجھے سعدی اور زمر کا کردار بہت پسند ہے۔ پھپھو' بھتیجے کا پیار دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ عمیرہ احمد بھی بہت اعلا لکھ رہی ہیں۔ "پیر کامل کا" سیکوئل آب حیات۔ بہت ہی زبردست ہے اور سالار کے بارے میں کیا ہی کہنا۔ عفت جی کا ناول "بن مانگی دعا" بھی بہت اچھا ہے۔ باقی کے تمام ناولٹ' افسانے اچھے تھے۔ تقان وحید قریشی سے مل کر اچھا لگا۔ پلیز عمران عباس کا انٹرویو ضرور شائع کیجیے۔

ج۔ پیاری صبا! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے بارے میں جان کر خوشی ہوئی۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جارہی ہے۔

انا حسب۔۔۔ گجرات

میں شعاع' خواتین کی اس وقت سے قاری ہوں جس وقت میں جماعت ہشتم کی طالبہ تھی۔ پڑھنے کی اجازت نہ تھی مگر جانے کیا طلسم تھا ان اوراق میں۔ جو ہمیں بلاتا اور پھر خود میں گم کرتا اور پھر سالوں بیت گئے' لیکن یہ خواب نگری آج بھی ہماری ہے۔ آج جب ہم دو بیٹیوں مطرب اور عنایہ کی مائیں بن گئے ہیں تو بھی کچھ لمحے اس کاروان وقت سے چرا ہی لیتے ہیں۔ عنیزہ سید' نمرہ احمد' عمیرہ احمد' راحت جبیں' فائزہ افتخار' عفت سحر اور تمام رائٹرز بہت اچھا لکھتی ہیں۔

ج۔ پیاری انا! بہت خوشی ہوئی کہ آپ نے خواتین کی اس بزم میں شرکت کی۔ خواتین ڈائجسٹ کے ساتھ اتنی طویل رفاقت کے لیے شکریہ۔

یمنیٰ ملک۔۔۔ جام پور

جب سے پیدا ہوئی ہوں اور ہوش سنبھالا ہے تب سے گھر میں کتابوں سے زیادہ شعاع اور خواتین ڈائجسٹ دیکھے ہیں۔ پہلے میری سب سے بڑی آپی پڑھا کرتی ہیں پھر ان کے ساتھ ساتھ میری دوسری آپی جن کو آٹھویں کلاس سے ہی رسالوں میں بہت دلچسپی ہوگئی تھی۔ 12 اکتوبر 2014ء کو جب ان کی عمر 25 برس تھی' وہ اس دنیا سے اور ہم سب سے دور اپنی اصلی دنیا میں چلی گئیں۔ مجھے آپ سے پوچھنا تھا کہ اگر میں کوئی افسانہ آپ کو لکھوں تو کیا آپ اس کو شائع کریں گی۔

ج۔ پیاری یمنیٰ! آپ کی بہن کی وفات کے بارے میں جان کر بہت افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔ آمین۔ افسانہ ضرور لکھیں' پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

اسما خان۔۔۔ کے جی ایم

پچھلے چودہ سال سے خواتین کی خاموش قاری ہوں ارے نہ نہ مجھے کوئی ایجڈ سنجیدہ ٹائپ عورت مت سمجھیے گا' مابدولت کی عمر تیئیس سال ہے' 6th کلاس سے شعاع خواتین پڑھنا شروع کیے اگرچہ تب لفظوں کے مفہوم سے آشنا نہ تھے' پھر رفتہ رفتہ یہ پڑھنا شوق سے جنون اور جنون سے زندگی بن گیا۔ خواتین کے سب سلسلے اچھے ہیں' پر آب حیات میں جب امامہ کو سالار کے سامنے پامسٹ نے دوسری شادی کی لکیر کا بتایا تو دل دھڑکنا بھول گیا' نجانے سالار نے کیا محسوس کیا ہوگا۔ غزالہ روشن کا خسارے کا سودا پڑھ کر بہت اچھا لگا۔

ج۔ پیاری اسما! پامسٹ خدا نہیں ہوتے۔ غیب کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے آپ پریشان نہ ہوں۔
خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

اقصیٰ قریشی۔۔۔ نامعلوم شہر

6th کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی تب سے پڑھنا شروع کیا کیوں کہ کتابوں کو ہمیشہ اپنے آس پاس دیکھا پھر ماہوار ان ڈائجسٹ کو بھی۔ تو شوق چرایا کہ کیوں نہ پڑھ کے دیکھا جائے اور یقین جانیے کہ پھر تو ایسا نشہ ہوا کہ کبھی کسی ڈائجسٹ کو چھوڑا ہی نہیں' جب ملا جہاں ملا اول تا آخر پڑھ کے ہی چھوڑا۔ ہاں میٹرک تک مما سے چھپ کے پڑھا پھر مما نے خود ہی اجازت دے دی۔ خط لکھنے کی بنیادی وجہ نمرہ احمد کا "نمل" بنا۔ بہت ہی خوب صورت ہمیشہ کی طرح۔ نمرہ جی! آپ سے بس ایک ہی گزارش ہے کہ سعدی کو کچھ نہ ہونے دیجیے گا۔ باقی کا پورا شمارہ ہی ہمیشہ کی طرح بہترین تھا۔

ج۔ پیاری اقصیٰ! خواتین کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ اپنے شہر کا نام لکھنا بھول گئی ہیں۔ آئندہ خط لکھیں تو

شہر کا نام ضرور لکھیے۔

خواتین کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ثریا راجپوت۔۔۔۔ کاتری ننکانہ صاحب

میری خواہش ہے کہ نمو احمد "نمل" میں کسی جگہ یہ شعر شامل کریں۔

بیدار اہل قافلہ سونے کے دن گئے
ہشیار آگ سے ہے جنگل گھرا ہوا

ج۔ ثریا! آپ کی فرمائش نمو تک پہنچا رہے ہیں۔

فریحہ شبیر۔۔۔ شاہ نکدر

"سروے" کے مستقل سلسلہ بننے پر بس خوشی سے جھوم اٹھا' اب ہر ماہ کسی نہ کسی رائٹر سے ملنے کا موقع ملے گا۔ پلیز آپی حیا بخاری اور کنیز نبوی ادی کو ضرور شامل کیجیے گا۔ اور ادی کنیز سے کوئی زبردست اور ایمان تازہ کرنے والی تحریر لکھوائیں اور سحر ساجد کو بھی لازمی شامل کریں۔ اس دفعہ اقبال بانو آپی' سائرہ اور سمیرا حمید کو پڑھ کر اچھا لگا اور پلیز اقبال بانو آپی سے بھی کچھ لکھوائیں اب انہیں جانے نہ دینا۔ پرانی رائٹرز کو ہم پھر سے پڑھنا چاہتے ہیں۔ آب حیات اور نمل تو آل ٹائم فیورٹ ہیں' بہت زبردست۔ تنزیلہ آپی "عہد الست" کی تو بات ہی الگ ہے۔

ج۔ فریحہ! خواتین کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ کنیز نبوی کا سروے اس ماہ شامل ہے۔ ناولز کی فرمائش ان تک پہنچا رہے ہیں۔

ماہم علی۔۔۔ اٹک

ٹائٹل اس بار اچھا تھا۔ بالکل میری طرح ہاہاہا۔ واقعی نا! اف امامہ ہی وہ لڑکی ہے جس نے ہاسٹ کو ہاتھ دکھایا۔ ہائے عمیرہ احمد جی اور دو شادیاں۔ مطلب سالار سے علیحدگی۔ بن مانگی دعا۔ معذرت کے ساتھ اس بار کچھ خاص نہیں لگا۔ وہی ہزار دفعہ پڑھے ہوئے واقعات۔ ویسے باقی اقساط اچھی تھیں' اور نمل وغیرہ نے محفل لوٹ لی۔ اتنا زبردست لکھنے پر مبارکباد قبول کریں۔ زہرہ بی بی اب مزہ چکھائیں گی فارس کو۔ بہترین لکھیں اس بار باقی سب تحریریں بھی۔ آفاق وحید سے ملاقات بہت اچھی لگی۔ ایک درخواست جو کر کر کے تھک گئی۔ شاہین رشید اب پوری کریں۔ راجہ رضوان علی احمد کا انٹرویو لے لیں۔

ج۔ پیاری ماہم! خواتین ڈائجسٹ کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔ شاہین رشید کو ایک بار پھر یاد دہانی کرا رہے ہیں۔ متعلقہ مصنفین تک آپ کی رائے ان طور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

قارئین متوجہ ہوں!

1- خواتین ڈائجسٹ کے لیے تمام سلسلے ایک ہی لفافے میں بھجوائے جا سکتے ہیں، تاہم ہر سلسلے کے لیے الگ کاغذ استعمال کریں۔

2- افسانے یا ناول لکھنے کے لیے کوئی بھی کاغذ استعمال کر سکتے ہیں۔

3- ایک سطر چھوڑ کر خوش خط لکھیں اور صفحے کی پشت پر یعنی صفحے کی دوسری طرف ہرگز نہ لکھیں۔

4- کہانی کے شروع میں اپنا نام اور کہانی کا نام لکھیں اور اختتام پر اپنا مکمل ایڈریس اور فون نمبر ضرور لکھیں۔

5- مسودے کی ایک کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں، ناقابل اشاعت کی صورت میں تحریر واپسی ممکن نہیں ہوگی۔

6- تحریر روانہ کرنے کے دو ماہ بعد صرف پانچ تاریخ کو اپنی کہانی کے بارے میں معلومات حاصل کریں۔

7- خواتین ڈائجسٹ کے لیے افسانے، خط یا سلسلوں کے لیے انتخاب، اشعار وغیرہ درج ذیل پتے پر رجسٹری کروائیں۔

خواتین ڈائجسٹ
37-اردو بازار کراچی



دھنک سیریل سے شہرت پانے والی

نازلی نصر سے ملاقات

شاہین رشید

آج کل ماضی کی حسین فنکارائیں ماں کے کردار میں آرہی ہیں اور وہ "ماں" کے کردار میں بھی اتنی ہی کامیاب ہیں جتنی وہ نوجوانی کے رول میں تھیں۔ کیونکہ ٹیلنٹ تو ہر روپ میں سامنے آتا ہے اور ہر روپ میں اپنے آپ کو منواتا ہے۔ "نازلی نصر" کو بھلا کون بھول سکتا ہے۔ اپنی بھولی بھالی صورت کے ساتھ جب یہ فنکارہ اسکرین پہ آتی تھی تو ان کی پرفارمنس سے ہر کوئی متاثر ہوتا تھا اور اب یہ ماں کے رول میں آتی ہیں' تب بھی اپنی پرفارمنس سے متاثر کرتی ہیں' تو اس بار آپ کی ایک چھوٹی سی ملاقات "نازلی نصر" صاحبہ سے۔

"کیا حال ہیں اور آج کل آپ کے کتنی سیریلز اور سوپ چل رہے ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے اور ہاں جی کافی کام میرا آن ایر ہے' اور انڈر پروڈکشن بھی کافی کام ہے' جس میں علی بھاد تو چل ہی رہا ہے۔ اس کی شوٹ بھی چل رہی ہیں کیونکہ وہ سوپ ہے۔ لاہور کا ایک سوپ ہے اور اس کے لیے سوچ رہی ہوں کہ کروں کہ نہ کروں کیونکہ سوپ کے لیے بہت ٹائم دینا پڑتا ہے تو لاہور جاکر رہنا یہ ذرا مشکل لگ رہا ہے۔ مگر دیکھیں کہ کیا کرتی ہوں میں اور سیریل کرنا مجھے بہتر لگتا ہے کہ ایک تو جلدی ہو جاتا ہے' پھر اس کی پے منٹ بھی اچھی مل جاتی ہے۔ لمبی کمٹمنٹ بھی نہیں ہوتی اور سوپ میں ایک ہی چیز بار بار دہرائی جارہی ہوتی ہے۔"

"تو پھر کیوں لیتی ہیں سوپ آپ؟"

"ایسے ہی جیسے آپ نے انٹرویو کے لیے کہا تو میں آپ کو تو انکار نہیں کرسکتی۔ اسی طرح کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں' جنہیں میں انکار نہیں کرسکتی تو ان کے سوپ مجھے لینے پڑے۔ کچھ لوگوں کو نظرانداز نہیں کرسکتے۔ مروت آڑے آجاتی ہے۔"

"جنگ اسٹیج میں بھی آپ نے کام کیا اور اب بھی کررہی ہیں۔ درمیان میں کچھ عرصہ غائب رہیں تو اس کی کیا وجہ ہے؟"

"اس کی کئی وجوہات ہیں۔ ایک تو یہ کہ شادی کے بعد کام کی اجازت نہیں ملی۔ پھر ماشاء اللہ سے بچے ہوگئے تو پھر مجھے ہی کام کی فرصت نہیں ملی' پھر شادی شدہ زندگی کرائسس کا شکار ہوگئی تو میں اپنے والدین کے پاس امریکہ چلی گئی اور تقریباً" تین' چار سال کے



بعد واپس آئی اور واپس میں آئی 2007ء میں۔ تو تب سے ہی کام کر رہی ہوں۔ مگر زیادہ نہیں کیا۔ اب کچھ عرصے سے زیادہ کام کرنے لگی ہوں۔"

"تو ازدواجی زندگی کے حالات ٹھیک ہوئے یا سب کچھ ختم ہو گیا ہے؟"

"سب کچھ ختم ہو گیا ہے اور میں نے دوسری شادی بھی کر لی اور زندگی میں سب کچھ چینج ہو گیا اور 2013ء میں میں نے "محسن مرزا" صاحب سے شادی کی۔"

"بچے آپ کے پاس ہیں؟ اور خوش ہیں اپنی زندگی سے؟"

"جی بچے میرے پاس ہی ہیں اور ماشاء اللہ میں اپنی زندگی میں اب بہت خوش ہوں۔ کیونکہ اب زندگی میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا ہے' سکون ہے اس لیے اب مسلسل کام بھی کر رہی ہوں۔"

"ماں کے رولز میں آپ آ رہی ہیں اور سمیع خان جیسے آرٹسٹ کی ماں آپ بن رہی ہیں تو کچھ عجیب سا تو نہیں لگتا؟"

"اگر میری ذاتی رائے پوچھیں تو مجھے تو بالکل بھی عجیب نہیں لگتا۔ میں نے ہمیشہ کردار لیتے وقت یہ ہی دیکھا ہے کہ اس میں پرفارمنس مارجن کتنا ہے اور مجھے تو لگتا ہے کہ جیسے میں نے اب اداکاری کرنی شروع کی ہے۔ جب اپنی عمر سے تھوڑا مختلف رول کر رہے ہوتے ہو تو اصل اداکاری تو وہی ہوتی ہے۔ مجھے کئی لوگوں نے کہا کہ آپ اتنی جلدی ماں کے رول میں کیوں آنے لگیں' تو میں نے کہا کہ ہماری ہیروئن بیس بائیس سال سے زیادہ کی نہیں ہوتی' تو مجھے کچھ تو کرنا ہی تھا اور میں کون سی سچ مچ اتنے بڑے بچوں کی ماں ہوں۔ مجھے بھی تو اداکاری ہی کرنی ہے۔"

"بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں' مگر کچھ لوگ تو خود سے ہی ہضم نہیں کر پا رہے ہوتے کہ میں اتنے بڑے بچوں کی ماں کے رول کروں؟"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں' کئی آرٹسٹوں نے صرف اس وجہ سے اس فیلڈ کو چھوڑ دیا کہ ہم تو اتنے بڑے بچوں کی ماں کے کردار نہیں کریں گے۔ اگر ہم ینگ ایج میں اولڈ کردار کر رہے ہیں تو اولڈ تو نہیں ہو جائیں گے یا ایک پاگل عورت کا رول کر رہے ہیں تو پاگل تو نہیں ہیں نا۔ وہ تو بس ایک کردار ہے' اگر بری عورت کا کردار ہے تو وہ محض کردار ہے' تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

"آپ نے اس دور میں بھی کام کیا جب بجیا' حسینہ معین' اشفاق احمد جیسے رائٹر لکھا کرتے تھے اور آج کے دور میں بھی تو کیا فرق لگتا ہے۔ اچھا چینج ہے؟"

"میں آپ کو فرینکلی بتاؤں۔ بہت اچھا نہیں لکھا جا رہا ہے۔ آج کل تو پروڈیوسر سستے سے سستا رائٹر پکڑ لیتے ہیں اور ہر سین کو اتنا دہراتے ہیں کہ ہم خود کہتے ہیں کہ ارے یہ سین یا یہ ڈائیلاگ ابھی تو بولے تھے۔ تو اس وجہ سے ہماری دلچسپی بھی بالکل ختم ہو جاتی ہے کیونکہ مزہ ہی نہیں آتا۔ اگر شوہر کے ساتھ کچھ سین ہیں تو مسلسل وہی سین مختلف ویری ایشن میں ہم کیے جا رہے ہوتے ہیں۔ گزرے زمانے میں جو کام ہم کرتے تھے وہ بہت انجوائے کر کے کرتے تھے اور



کردار اتنے اچھے ہوتے تھے کہ وہ ہم پہ حاوی ہو جاتے تھے اور اپنی نارمل لائف میں بھی ہم اسی کردار میں رہتے تھے مگر اب ایسا نہیں ہوتا۔ اب تو مسلسل گھریلو جھگڑوں کو دکھایا جا رہا ہے۔ اس کی اس سے شادی ہوئی۔ فلاں کو طلاق ہو گئی' رونا دھونا اتنا زیادہ ہو گیا ہے کہ اچھا نہیں لگتا۔ سچ بتاؤں مجھے تو بالکل بھی مزہ نہیں آتا' کبھی کبھی تو اپنے آپ سے کہتی ہوں کہ ارے کیا بکواس ہے یہ تو بہت بور تنگ ہو گیا ہے۔"

"آج کل جو کردار آپ نے کیے کچھ کردار اچھے بھی تو لگے ہوں گے۔ جیسے "پیا من بھائے" ملکہ عالیہ وغیرہ؟"

"ہاں... مجھے "پیا من بھائے" میں کام کر کے اچھا لگا۔ مزہ آیا تھا۔ کردار بھی اچھا تھا اور اسٹوری بھی اچھی تھی۔ پیوند میں بھی میرا کردار اچھا ہے اور ملکہ عالیہ کی بات آپ نے کی تو بس کہیں باہر جاؤ تو لوگ آگے بڑھ بڑھ کر پوچھتے ہیں کہ اب آپ کیا کریں گی' ملکہ عالیہ کا تو میں لوگوں کا انٹرسٹ لیول دیکھتی ہوں تو مجھے بہت ہنسی آتی ہے۔ کہ حقیقی زندگی میں ایسا ہوتا نہیں ہے مگر یہ سب کیا ہو رہا تھا' بہت عجیب سا تھا' اب تو خیر ختم ہو گیا ہے۔"

"سازشیں بہت تھیں؟"

"اور اس چیز کو لوگ بہت پسند کر رہے تھے اور یہی مجھے مزے کی بات لگتی تھی۔ انڈین ڈراموں کو ہی ہم اکثر اوقات فالو کرتے ہیں اور ہم لوگ ابھی تک ان ہی میں اٹکے ہوئے ہیں۔ بہت پسند کیا اس سوپ کو اور کچھ اور ڈرامے بھی اچھے ہو رہے ہیں۔"

"کچھ مختلف قسم کے کردار کرنے کو دل نہیں چاہتا جیسے پاگل' فقیرنی' مینٹل ٹائپ یا اسی طرح کے دیگر کردار؟"

"بہت دل چاہتا ہے اور پہلے زمانے میں تو ایسے ڈرامے بنتے بھی تھے کہ جن میں اس طرح کے کردار بھی ہوتے تھے اور انہیں کرنے میں مزا آتا تھا۔ اب تو ایک دکھیاری ماں' ایک دکھیاری لڑکی' جو بس رو رہی ہو۔"

"گزرے زمانے میں ہر رائٹر کا اپنا ایک الگ انداز تھا۔ جیسے بجیا کے ڈرامے میں شادی لازمی ہوتی تھی۔ حسینہ معین میں ایک چالاک لڑکی' بانو قدسیہ کے ڈراموں میں سنجیدگی' اب ہر کوئی ایک دوسرے کی نقل میں ہوتا ہے ایسا ہے آپ کے خیال میں؟"

"جیسے ہمارے پاس چند رائٹر تھے اور جتنے بھی لوگ تھے سب انہیں جانتے تھے۔ حسینہ معین کا ڈرامہ ہو یا بجیا کا' سب کھانا وغیرہ کھا کر آٹھ بجے ڈرامہ دیکھنے بیٹھ جایا کرتے تھے۔ اب پہلے والی بات بھی نہیں رہی۔

کمرشلز بھی بے حساب ہو گئے ہیں۔ اب اپنے ملک میں ڈرامہ اتنے شوق سے نہیں دیکھا جاتا جتنا باہر کے ملکوں میں دیکھا جاتا ہے۔ مجھے فیڈ بیک باہر کے ملکوں سے ہی ملتا ہے۔"

"ثانیہ! آپ دبلی پتلی تو خیر کبھی نہیں تھیں، مگر اسمارٹ تھیں اب کیا ہوا ہے آپ کو؟"

"ہاں۔ بس ویٹ مسلسل بڑھ رہا تھا تو سارے ٹیسٹ کرائے تو ایسا کوئی خاص مسئلہ تو نہیں تھا۔ تو اب ویٹ کم کرنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ ان شاء اللہ جلدی قابو پالوں گی۔"

"بے شمار چینلز، بے شمار ڈرامے، کیا ان سے ملک میں انقلاب لایا جا سکتا ہے؟ اور کیا ہر چینل کے ڈرامے دیکھے جاتے ہیں؟"

"ہر چینل کے دیکھنے والے مختلف ناظرین ہیں اور میرا نہیں خیال کہ ہمارے ڈرامے انقلاب، کیا انقلاب لائیں گے؟ ہم دکھا ہی کیا رہے ہیں؟ پہلے تو ہر ڈرامے میں ایک سبق ہوتا تھا۔ آج کل برائیوں کو ہی پروموٹ کر رہے ——— ہیں۔ بے شک ہمارے معاشرے میں برائیاں ہیں، مگر کیا ضروری ہے کہ بڑھا چڑھا کر دکھائیں۔ ہمارے زمانے کے ڈراموں میں لڑکیوں کو اسٹونگ دکھایا جاتا تھا۔ اب رونے دھونے والی لڑکیاں دکھائی جاتی ہیں، جبکہ آج کی لڑکی زیادہ اسٹونگ ہے۔ بس بہت زیادہ ڈریسنگ ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔ نیوز میں بھی ڈپریشن ہر چیز میں۔ مجھے زیادہ پریشانی اپنے بچوں کی ہوتی ہے کہ وہ اس معاشرے سے کیا سبق سیکھیں گے۔ کیا حاصل کریں گے۔"

"بچے ماشاء اللہ کتنے بڑے ہو گئے ہیں؟ پڑھ رہے ہیں؟ اور اس فیلڈ میں آئیں گے؟"

"میرے ماشاء اللہ دو ہی بچے ہیں۔ بڑا بیٹا ہے جو اٹھارہ سال کا ہے اور بیٹی چودہ سال کی ہے۔ جی پڑھ رہے ہیں اور اس فیلڈ میں نہیں آئیں گے کیونکہ میرے بچے کہتے ہیں کہ جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے، وہ اس فیلڈ میں آتے ہیں اور جو بالکل فارغ لوگ ہوتے ہیں وہ اس فیلڈ میں آتے ہیں۔ میری بیٹی تو جیسے پیدائشی اداکارہ ہے، میں نے ایک ڈرامہ بنایا تھا۔ "میرے تمہارے ہمارے" کے نام سے اور اس میں میرے دونوں بچوں نے کام کیا تھا۔ یہ "اردو ون" پہ چلا تھا اور دونوں نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ خاص طور پر بیٹی نے اس کا کام دیکھ کر اسے آفر بھی آئیں، مگر اس کو کوئی دلچسپی ہی نہیں ہے۔"

"پیسہ ہے اب اس فیلڈ میں؟"

"پیسہ تو ہے، مگر بہت رل رل کر ملتا ہے۔ (دھکے کھا کر) مثلاً" اگر آپ کو ایک پروجیکٹ کے چھ لاکھ مل رہے ہیں تو گننے کو وہ چھ لاکھ ہوتے ہیں، مگر وہ اس قدر مشکل سے ملتے ہیں کہ اگر آپ اسے ماہانہ کے حساب سے سوچیں تو آپ خود کہیں گے کہ یہ تو کچھ بھی نہیں ہیں۔ ہمارے پیسے میں برکت نہیں ہے، کیونکہ ٹوٹ ٹوٹ کر ملتے ہیں۔"

"اور کیا کر رہی ہیں اداکاری کے علاوہ "ماڈلنگ، فلم، وائس اوور وغیرہ وغیرہ۔"

ہنستے ہوئے۔ "میری حالت ایسی ہے کہ ماڈلنگ کر سکوں۔ فلم کا مجھے پہلے بھی شوق نہیں تھا اور "میرا سلطان" کا وائس اوور کیا تھا۔ مگر ٹائم بہت لگ جاتا ہے تو اب بلاتے بھی ہیں تو نہیں جاتی۔"

"ڈراموں میں بڑے اور چھوٹے دونوں گھر دکھائے جاتے ہیں، کہاں شوٹ کر کے اچھا لگتا ہے؟ یا آسانی ہوتی ہے۔"

"بڑے گھروں میں اس لیے آسانی ہوتی ہے کہ وہاں صفائی ہوتی ہے اور چھوٹے گھروں میں سوچیں کہ کون سے کیڑے مکوڑے نہیں ہوتے؟ کون سے چوہے نہیں ہوتے؟ اور کس طرح کی گندگی نہیں ہوتی، آج کل ایک سوپ چل رہا ہے۔ "دل برباد" تو اس کے لیے میں اپنے ڈائریکٹر سے کہتی ہوں کہ میرا کردار لمبا نہ کریں، کیونکہ جس گھر میں ہم یہ ڈرامہ کر رہے ہیں اس میں اتنی گندگی ہے کہ آپ سوچ

نہیں سکتیں۔ جالے لٹک رہے ہیں۔ ایک ہی واش روم ہے' جس میں سب جاتے ہیں۔ پانی کا پرابلم' صبح گیارہ بجے سے رات گیارہ بجے تک وہیں ہوتے ہیں۔ اور تقریباً" بیمار ہوگئے ۔۔۔ ہیں سب۔ میں نے تو پروڈیوسر سے کہا کہ کم سے کم ایک دن آپ بھی ہمارے

ساتھ گزاریں' تاکہ آپ کو پتا چلے کہ ہمیں کتنی مشکل ہوتی ہے۔ صفائی کرواتے نہیں ہیں۔ پیسہ بچا رہے ۔۔۔ ہیں کہ یہاں نہ خرچ ہوجائے' وہاں نہ خرچ ہوجائے۔"

"بیڈ روم کے سین کہ جہاں کبھی لیٹنا پڑتا ہے۔ ڈرائنگ روم کے سین کس طرح کرتی ہوں گی؟"

"ہمارے یہاں تو یہ مسئلہ ہے کام کے لیے کوئی سنجیدہ نہیں ہے۔ کوئی ذمہ داری کے ساتھ کام نہیں کرتا۔ پانچ سو وہاں سے بچالوں' یہاں سے بچالوں اور آپ بیڈ کی بات کررہی ہیں۔ بیڈ بہت گندے ہوتے ہیں اور بہت مشکل ہوتی ہے۔ اس لیے غربت والے



ڈرامے نہیں کرنا چاہتی اور میں ہی کیا بہت سے لوگ اسی گندگی کی وجہ سے بھاگتے ہیں' غربت والے ڈرامے کرنے سے۔"

"کچھ گھریلو ذمہ داریوں کے بارے میں بتائیں؟"

"ہاں ماشاءاللہ سے گھریلو ذمہ داریاں بڑے احسن طریقے سے نبھا رہی ہوں اور آپ کو بتاؤں کہ اب میں کافی مذہبی ہوگئی ہوں اور ابھی حال ہی میں' میں نے "عمرہ" کی سعادت بھی حاصل کی اور تین چار سال سے مذہب کے بہت قریب ہوگئی ہوں۔"

"تو کوئی خاص وجہ تھی کہ آپ مذہب کے قریب ہوگئیں؟"

"کچھ حالات ایسے ہوگئے۔ اور میں ہمیشہ سے خود مختار رہی' جس نے کبھی کسی سے مدد نہیں لی گھریلو زندگی میں پہلے علیحدگی ہوئی۔ پھر طلاق ہوئی۔ میرے بہن بھائیوں کو کسی کو میرے حالات کا پتا نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہی میں بتاتی تھی۔ تو بس اللہ کی طرف رجحان ہوا۔ سارے مسائل اللہ سے ہی ڈسکس کرتی تھی تو یقین جانیے کہ نماز میں اتنا سکون ملتا تھا' بنیادی طور پر میں ایک ڈرپوک خاتون ہوں۔ فیصلہ کرتے وقت بہت ڈرتی تھی کہ غلط نہ ہوجائے اور اس کشمکش میں' میں نے سترہ سال گزار دیے اور ان سترہ سالوں میں اتنے اتار چڑھاؤ آئے کہ میں بہت پریشان ہوگئی اور پھر میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا کہ جو میرے حق میں

بہتر ہے وہ کردے اور پھر سب کام اتنی آسانی سے ہوگئے کہ میں حیران رہ گئی کہ یہ سب کام کیسے ہوگئے۔"

"بچے خوش ہیں آپ کی نئی لائف سے؟"

"الحمدللہ۔ میرا بیٹا زوہیب او لیول کررہا ہے اور بیٹی زویا گریڈ 9 میں ہے۔ دونوں میرے ساتھ ہیں اور بہت خوش ہیں۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نازلی نصر سے اجازت چاہی۔

امت الصبوح

خیالوں کی ڈائری

افضل ناصر کی ڈائری سے

ایوب خاور کسی تعارف کے محتاج نہیں ان کی یہ خوبصورت غزل آپ سب قارئین بہنوں کے لیے۔

اک خواب ہے اس خواب کو کھونا بھی نہیں ہے
تعبیر کے دھاگے میں پرونا بھی نہیں ہے

لپٹا ہوا ہے دل سے کسی راز کی صورت
اک شخص کہ جس کو مِرا ہونا بھی نہیں ہے

یہ عشق و محبت کی روایت بھی عجب ہے
پایا نہیں جس کو اسے کھونا بھی نہیں ہے

جس شخص کی خاطر ترا یہ حال ہے خاور
اس نے ترے مر جانے پہ رونا بھی نہیں ہے

کلثوم رائے کی ڈائری سے

منور جمیل کو میں نے بہت کم پڑھا ہے لیکن جتنا پڑھا وہ اپنی ڈائری میں محفوظ کر لیا۔ ان کی ایک غزل جو مجھے بہت پسند ہے۔ آپ سب کی نذر۔

اب کس سے کہیں اور کون سنے جو حال تمہارے بعد ہوا
اس دل کی جھیل سی آنکھوں میں اک خواب بہت برباد ہوا

یہ ہجر ہوا بھی دشمن ہے اس نام کے سارے رنگوں کی
وہ نام جو میرے ہونٹوں پر خوشبو کی طرح آباد ہوا

اس شہر میں کتنے چہرے تھے کچھ یاد نہیں سب بھول گئے
اک شخص کتابوں جیسا تھا وہ شخص زبانی یاد ہوا

وہ اپنے گاؤں کی گلیاں تھیں دل جن میں ناچتا گاتا تھا
اب اس سے فرق نہیں پڑتا ناشاد ہوا یا شاد ہوا

بے نام ستائش رہتی تھی ان گہری سانولی آنکھوں میں
ایسا تو کبھی سوچا بھی نہ تھا دل اب جتنا بے داد ہوا

سیدہ نسبت زہرا کی ڈائری سے

آج کل جس طرح کا دور ہے اور ہر طرف افراتفری ظلم و ستم اور خون ریزی ہے۔ دل دہل سا جاتا ہے جب بھی کچھ برا سننے کو ملتا ہے۔ موجودہ حالات کی عکاسی کرتی ہوئی مبشر حسین تابش کی یہ غزل قارئین کے لیے۔ اس میں شاعر نے بہت کچھ کہا۔ اگر سمجھا جائے تو غزل میں جو سوال پوشیدہ ہیں، وہ میرے بلکہ ہم سب کے دلوں کی آواز لگتے ہیں۔ آپ بھی پڑھیے۔

لرزاں ہے تخت و تاج کیوں، کچھ تو پتا چلے
سازش زدہ سماج کیوں، کچھ تو پتا چلے

پہلے ہی کمر خم تھی، سو اب ٹوٹنے کو ہے
جاری ہوا خراج کیوں، کچھ تو پتا چلے

زرخیز ہے، سرسبز ہے شاداب ہے وطن
مہنگا ہوا اناج کیوں، کچھ تو پتا چلے

جن بام و در پہ کھیلتی تھیں مسکراہٹیں
اب وحشتوں کا راج کیوں، کچھ تو پتا چلے

جھرنے وہی، چشمے وہی، بادل وہی بارش
دریا ہیں خشک آج کیوں، کچھ تو پتا چلے

حزبِ اختلاف میں ہوتے ہیں مسیحا
حکومت میں سب ہم مزاج کیوں، کچھ تو پتا چلے

بھیک ہے، خیرات ہے، امداد ہے یا قرض
درپیش احتیاج کیوں، کچھ تو پتا چلے

مفلس کی بے بسی کا کسی تولنے میں تابش
ہوتا نہیں اندراج کیوں، کچھ تو پتا چلے

آپ کا باورچی خانہ

سحر نعمان

1 ۔ کھانا پکانے کے لیے کیا ضروری ہے پسند یا غذائیت؟ تو جناب جب آپ گھر میں محبت اور لگن سے صاف ستھرے کچن میں کچھ بھی بنائیں گی تو غذائیت تو آہی جائے گی نا' تو بس اسی لیے ہم پسند کو ترجیح دیتے ہیں۔ ویسے بھی ابھی میں اتنی سگھڑ تو ہوئی نہیں کہ دونوں چیزیں ساتھ لے کے چلوں' حالانکہ شادی کو پانچ سال ہوگئے ہیں اور ایک مزے کی بات یہ ہے کہ میں نے شادی سے پہلے کوکنگ نہیں کی تھی۔ امی نے سب کچھ بنانا سکھایا مگر شادی سے پہلے کھایا ان کے ہاتھ کا ہی ہے۔ ہاں اب کرتے کرتے ہاتھ میں ذائقہ آگیا ہے اور میرا بنایا ہوا کھانا سب کو پسند بھی آتا ہے۔

2 ۔ ویسے تو زیادہ تر مہمان بتا کر ہی آتے ہیں' لیکن اگر اچانک آبھی جائیں تو کوئی مسئلہ نہیں۔ تبھی چکن زندہ باد جو بھی ڈش بناؤ جلدی بن جاتی ہے۔ مہمانوں کو کمپنی دینے کے لیے امی (ساس) ہیں اور پھر میری بیٹیاں کسی کو بور نہیں ہونے دیتیں خاص کر چھوٹی والی۔ اب ہم بتاتے ہیں' چکن کا اسپیشل سالن جو میں نے اپنے شوہر سے سیکھا ہے۔

اجزا :

چکن	ایک کلو
پیاز	چار سے پانچ بڑے سائز کے
لہسن پیسٹ ادرک	ایک چمچہ
نمک' سرخ مرچ	حسب ذائقہ
ہلدی	ایک چمچہ
پسا گرم مسالا	ایک چمچہ
کلونجی	آدھا چمچہ
سونف	آدھا چمچہ
اجوائن	ایک چٹکی
سبز مرچ	دو سے تین لمبی کٹی ہوئی
دھنیا	حسب ضرورت

ترکیب :

کڑاہی میں ٹماٹر اور سبز مرچ کے علاوہ باقی تمام چیزیں ڈال کر دو کپ پانی ڈال کر ڈھک دیں اور خود مہمانوں کے پاس بیٹھ کر گپیں لگائیں۔ پانی خشک ہو جائے تو آئل ڈال کر بھونیں اور ٹماٹر' سبز مرچ ڈال کر پانچ منٹ کے لیے بھون لیں۔ جب آئل چھوڑے تو دھنیا اور سوکھی میتھی ڈال کر دم دے لیں۔ چاہیں تو پانی ڈال کر نرم سا مسالا بنالیں۔ گرم گرم روٹی یا نان کے ساتھ سرو کریں اور دعا پائیں۔

3 ۔ یہ تو ہے گندے کچن میں کام کرنے کو بالکل دل نہیں کرتا۔ اس لیے کوشش کرتی ہوں کہ ساتھ ساتھ کچن سمیٹ لوں۔ روز کے روز صاف کرتے رہیں تو زیادہ تردد نہیں کرنا پڑتا۔ ویسے بھی مجھ سے ایک دفعہ میں سارا کچن صاف نہیں ہوسکتا۔ اس لیے جب دل چاہا دیواریں صاف کرلیں۔ جب موڈ ہوا کیبنٹ اور فریج صاف کرلیے۔ ہاں عید یا بقر عید سے پہلے تفصیلی صفائی ضروری ہوتی ہے۔ ایک سویٹ ڈش ہے جو مجھے بہت پسند ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ وہ میں نے ڈائجسٹ کے کسی ناول سے ہی سیکھی ہے۔ آپ بھی ضرور ٹرائی کریں۔

اجزا :

سوجی	ایک کپ

انڈے	چار عدد
دودھ	چوتھائی کپ
چینی	ایک کپ یا حسب منشا
چھوٹی الائچی	دو سے تین عدد
آئل یا گھی	1/2 کپ
خشک میوہ چاندی کے ورق	حسب ضرورت

ترکیب :

انڈے، دودھ اور چینی کو گرائنڈر میں ڈال کر مکسچر بنالیں۔ آئل یا گھی گرم کریں۔ الائچی کڑکڑا لیں۔ سوجی ڈال کر بھون لیں۔ جب خوشبو آنے لگے تو آمیزہ ڈال دیں اور چمچہ ہلاتے رہیں۔ جب گھی چھوڑ دے تو پلیٹ میں نکال کر بادام وغیرہ ڈالیں اور پیش کریں، سب کو پسند آئے گی۔

4 ۔ ناشتا میرے لیے بہت ضروری ہے کیونکہ اس کے بغیر میں کام ہی نہیں کر سکتی۔ روز کا ناشتا مختلف ہوتا ہے۔ کبھی رات کا بچا ہوا سالن اور پراٹھا آملیٹ۔ کبھی پراٹھے کے ساتھ دم والے انڈے یا آلو انڈے کا سالن گرمیاں ہوں تو لسی، کبھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کے لیے حلوہ پوری۔ ارے بھئی بازار کے جیسی میں اتنی ماہر نہیں ہوئی۔

5 ۔ شادی سے پہلے جب امی کے ساتھ شاپنگ پہ جاتی تھی تو وہاں کے سموسے بہت مشہور تھے تو وہ ضرور کھاتے تھے۔ شادی کے بعد زیادہ تر گھر میں ہی منگوالیا جاتا ہے۔ باہر کھانے کا ذرا کم ہی رواج ہے ہمارے ہاں۔ پھر بھی بچوں کے ساتھ سال میں دو تین بار آؤٹنگ ہو ہی جاتی ہے۔

6 ۔ موسم کے بغیر تو کوئی چیز بھی مزا نہیں دیتی۔ اگر آپ گرمیوں میں سویٹر پہن لیں اور سردیوں میں اے سی چلائیں تو کیسا لگے گا۔ بالکل ایسے ہی کھانا بھی موسم کے لحاظ سے ہی اچھا لگتا ہے۔ گرمیوں میں دال چاول کے ساتھ اچار، سلاد اور دودھ کی کچی لسی۔ سردیوں میں نہاری، گرما گرم سوپ، سبز چائے، گاجر کا حلوہ، چنے کی دال کا حلوہ، یہ چیزیں اپنے موسم میں ہی مزہ دیتی ہیں۔

7 ۔ اچھا پکانے کے لیے محنت کے ساتھ محبت اور خلوص کی قائل ہوں۔ اگر اپنے گھر والوں کے لیے محبت سے پکائیں گی تو سب کو پسند آئے گا جیسے مجھے ٹنڈے بالکل نہیں پسند اور کھاتی بھی نہیں، مگر جب ٹنڈے گوشت پکاتی ہوں تو سب واہ واہ کرتے ہیں۔

8 ۔ ٹپ تو یہ ہے کہ بسم اللہ پڑھ کر پکانا شروع کریں اور پکاتے ہوئے درود شریف پڑھتی رہیں۔ آخر میں کھانے پر پھونک مار دیں۔ یقین کریں ان شاء اللہ برکت بھی ہوگی اور ذائقہ تو گارنٹی۔

سلور کے برتن صاف کرنے کے لیے ایک کپ کلا تیل لے کر ڈیڑھ لیٹر والی خالی بوتل میں ڈالیں اور اس میں باقی پانی ملالیں۔ ہفتے میں ایک دو بار اس سے برتن دھوئیں چمک اٹھیں گے۔

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

پاستا سلاد

اجزا :

چکن	آدھا کلو (بغیر ہڈی)
پاستا	ایک کپ
شملہ مرچ	دو عدد
ہری پیاز	چار عدد
گاجر	دو عدد
ٹماٹر' کھیرا	دو دو عدد
پیاز	ایک عدد (درمیانی سائز کی)
بند گوبھی	ایک درمیانہ پھول
سفید مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
چلی ساس' سویا ساس	دو دو کھانے کے چمچے
لہسن کا پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
تیل	آدھا کپ
زیتون کا تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

شملہ مرچ' کھیرا اور ٹماٹر کے بیج نکال دیں اور سب سبزیوں کو کاٹ لیں۔ پھر ابلا ہوا پاستا میں تھوڑا نمک' سفید مرچ اور زیتون کا تیل ملا دیں۔ فرائنگ پین میں آدھا تیل گرم کریں۔ اس میں لہسن کا پیسٹ اور پیاز کاٹ کر ڈالیں۔ پھر چکن ڈال کر ہلکا سا فرائی کر لیں۔ جب چکن پک جائے تو ایک ایک کر کے کھیرا' شملہ مرچ' بند گوبھی' گاجر' ہری پیاز' ڈالتے ہوئے ملاتے جائیں۔ باقی تیل بھی اب اس میں شامل کر دیں۔ سفید مرچ' نمک' سویا ساس' چلی ساس ڈال دیں۔ اب پاستا سرونگ ڈش میں نکالیں۔ ڈش کے درمیان میں جگہ بنا کر اوپر سبزیاں اور چکن ڈال دیں۔

بمبئی بھیل پوری

اجزا :

سیو	ایک پاؤ
چنا دال (بھنی)	ایک پاؤ
آلو	ڈیڑھ کلو
(ابال کر چوکور کاٹ لیں)	
ہرا دھنیا (چوپ کر لیں)	ڈیڑھ کپ
ہری مرچیں (چوپ کر لیں)	تین عدد
پاپڑی (کرش کر لیں)	آٹھ عدد
چھولے (ابلے ہوئے)	دو کپ
لیموں (رس نکال لیں)	دو سے تین عدد

دہی کی چٹنی :

دہی	ایک کپ
چینی	ایک چائے کا چمچہ
زیرہ (کٹا ہوا)	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن کا جوا (چوپ کر لیں)	ایک عدد
(سب کو ملا کر پھینٹ لیں)	

املی کی چٹنی :

املی کا گودا	ایک کپ
سفید زیرہ	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچیں (کٹی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
گڑ (پگھلا ہوا)	ایک کپ
ادرک	ایک انچ کا ٹکڑا
پانی	ڈیڑھ کپ
نمک	حسب ذائقہ
(سب کو ملا کر پیس لیں)	

ترکیب :

ایک ڈش میں سیو' چنا دال' آلو اور چھولے ڈالیں اور اسی طرح تہہ لگائیں۔ آخر میں پاپڑی ڈالیں۔ ہرا دھنیا' ہری مرچیں چھڑک دیں۔ الگ الگ پیالوں میں املی کی چٹنی' دہی کی چٹنی ساتھ میں پیش کریں۔ ایک پلیٹ میں بھیل پوری ڈالیں اور سب چٹنیاں اور لیموں کا رس ڈال کر

مزے دار بھیل پوری کا لطف اٹھائیں۔

لوکی پاکرا

اجزا :

لوکی	دو عدد
لہسن کے جوے	دو عدد (پیس لیں)
بیسن	ڈیڑھ کپ
میدہ	ڈیڑھ کپ
لال کٹی مرچ	ایک چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
ادرک (کش کرلیں)	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ہلدی پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
پانی	ڈیڑھ کپ
تیل	فرائنگ کے لیے

ترکیب :

لوکی کو چھیل کر سلائس کاٹ لیں۔ بیٹر تیار کرنے کے لیے پیالے میں بیسن اور میدہ ڈال کر مکس کریں۔ اس میں لہسن، ادرک، ہلدی پاؤڈر، نمک اور پانی شامل کر کے پیسٹ بنائیں۔ لوکی کے سلائسز کو بیٹر میں ڈپ کریں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے لوکی کے سلائس ایک ایک کر کے ڈالیں۔ ایک وقت میں تین سے زیادہ پکوڑے نہ ڈالیں۔ پکوڑوں کی رنگت سنہری ہو جائے تو نکال کر کچن پیپر پر رکھیں۔ گرم گرم سرو کریں۔ (آپ انہیں دو کھانوں کے درمیان اسنیک کے طور پر بھی سرو کر سکتے ہیں۔)

منس چیز رول

اجزا :

قیمہ	ڈیڑھ کلو
پیاز (چوپ کرلیں)	ایک عدد
لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچہ
ہری مرچیں (کٹی ہوئی)	ایک چائے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
ٹماٹر	دو عدد (باریک چوپ کرلیں)
زیرہ پاؤڈر	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
گرم مسالا پاؤڈر	آدھا چمچہ
ہرا دھنیا (چوپ کیا ہوا)	ایک چوتھائی کپ
روٹیاں (پتلی پھولی پکی ہوئی)	چھ عدد
موزریلا چیز (کدوکش کی ہوئی)	ایک کپ
نمک	حسب ذائقہ
تیل	چار کھانے کے چمچے

ترکیب :

ساس پین میں تیل گرم کر کے پیاز ڈال کر ساتے کریں۔ قیمہ، لہسن ادرک پیسٹ، نمک، کٹی ہوئی ہری مرچیں، لال مرچ پاؤڈر، ٹماٹر اور زیرہ پاؤڈر ڈال کر ڈھک کر پکائیں۔ ٹماٹر نرم ہو جائیں تو گرم مسالا پاؤڈر اور ہرا دھنیا شامل کر کے بھون کر چولہے سے اتار لیں۔ روٹیوں میں قیمہ ڈال کر رول بنائیں۔ بچا قیمہ بیکنگ ڈش میں ڈال دیں۔ اس پر رول رکھ دیں اور چیز چھڑک دیں۔ اوون یا مائیکروویو میں 200 ڈگری پر پانچ منٹ کے لیے بیک کریں کہ چیز پگھل جائے۔ سرونگ پلیٹ میں نکال کر گرم گرم سرو کریں۔ اوون نہ ہو تو ڈش میں تمام اجزا اس ترتیب سے ڈال کر توا گرم کر کے اس پر دم کی آنچ پر رکھ دیں۔ چیز پگھل جائے تو اتار لیں۔

آملیٹ پراٹھا

اجزا :

انڈے	تین عدد
پیاز	ایک عدد (باریک کٹی ہوئی)
ہری مرچ	چار سے پانچ عدد
ہرا دھنیا (باریک کٹی ہوئی)	آدھی گٹھی
کٹی مرچ	ایک چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
تیل یا گھی	حسب ضرورت

انڈوں میں اوپر دیے ہوئے تمام اجزا باریک کاٹ کر شامل کر کے پھینٹ لیں۔ گندھے ہوئے آٹے کا پیڑا بنا کر اسے پراٹھے کی طرح بیل کر توے پر ڈال دیں۔ جب ایک سائیڈ سنہری ہو جائے تو پراٹھا پلٹ دیں۔ اب پھینٹے ہوئے انڈوں کا آمیزہ چمچے سے پراٹھے کے اوپر والے حصے پر اچھی طرح سے پھیلا دیں۔ پھر پراٹھے کے چاروں جانب تیل ڈال کر پراٹھا پلٹ دیں۔ پراٹھے کو دھیمی آنچ پر پکائیں۔ دونوں طرف سے پک جائے تو اتار لیں اور گرم گرم پراٹھے کو دہی کے ساتھ نوش فرمائیں۔ (چاہیں تو اس میں قیمہ یا مرغی کو ریشہ کر کے بھی ڈال سکتی ہیں۔)

✡

عدسات

نفسیاتی ازدواجی الجھنیں

مہ ع ــــ کراچی

اچھی بہن! آپ نے لکھا ہے میرا مسئلہ پتا نہیں مسئلہ ہے بھی یا نہیں۔ ہمسئلہ تو یقیناً" ہے لیکن اتنا بڑا نہیں ہے جتنا آپ محسوس کر رہی ہیں۔

شادی کے بعد جب ایک لڑکی اپنا گھر چھوڑ کر بالکل نئے گھر میں جاتی ہے تو وہ خود کو بہت تنہا محسوس کرتی ہے' آنے والے حالات سے ڈر رہی ہوتی ہے۔ آپ کے معاملے میں تو بسم اللہ ہی غلط ہوئی۔ شادی ایمرجنسی میں ہوئی پھر سونے پہ سہاگہ ان سب کا رویہ' انہوں نے بہت بے دلی سے آپ کا استقبال کیا اور ایک ہفتہ بعد ہی آپ کو گھر کے کاموں میں لگا دیا۔ یہاں تک بھی خیر تھی' لیکن طنزیہ انداز میں باتیں' روک ٹوک' تنقید نے آپ کے حوصلے پست کر دیے۔ پھر آپ پر یہ بھی جتا دیا گیا کہ اس شادی میں گھر میں کسی کی بھی مرضی شامل نہیں تھی۔

کام کاج نہ آنا کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں ہے۔ زیادہ تر لڑکیاں سسرال جا کر ہی سیکھتی ہیں' کیونکہ ہر گھر کے طور طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اس لیے جو میکے سے سیکھ کر جاتی ہیں' انہیں بھی سسرال میں سیکھنا پڑتا ہے۔ اس پر تنقید کرنا بھی کوئی ٹھیک بات نہیں تھی۔

آپ کی ساس کا رویہ بھی سمجھ سے بالاتر ہے' ان کا آپ سے خون کا رشتہ ہے اور وہ اپنی مرضی سے آپ کو بیاہ کر لائی ہیں۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں کہ گھر سے ماسی کو نکال کر سارے کام آپ کے سپرد کر دیے ہیں۔ آپ سے بات تک نہیں کرتیں۔ جبکہ دوسری بہوؤں کے ساتھ ان کا رویہ بہت اچھا ہے۔

شوہر کا رویہ بھی غیر معمولی ہے۔ وہ گھر والوں کے سامنے نہیں بول سکتے تو کم از کم آپ کی دل جوئی تو کرنا چاہیے۔ اتنا گھر والوں کے کہنے میں' آپ سے جھگڑنا' زیادہ وقت گھر سے باہر گزارنا۔ گھر والوں کا یہ کہنا کہ وہ آپ سے خوش نہیں ہیں۔

اچھی بہن! اس میں شک نہیں کہ یہ ساری باتیں تکلیف دہ ہیں لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہمارے ہاں بیشتر گھرانوں میں شادی کے بعد لڑکی کو کم و بیش ان ہی حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ابھی شادی کو بہت کم عرصہ گزرا ہے' آپ کا جلد بازی میں کوئی فیصلہ کرنا درست نہیں ہوگا۔ اپنے حالات بدلنے کے لیے آپ کو خود کوشش کرنا ہوگی۔ اگر وہ لوگ آپ سے خوش دلی سے بات نہیں کرتے تو خود آگے بڑھ کر کوشش کریں۔ آپ نے سوچا ہے کہ آپ کی پھپھو آپ سے کیوں بے زار ہیں۔

آپ کے شوہر آپ کو وقت کیوں نہیں دیتے آپ نے خود لکھا ہے کہ سب کہتے ہیں۔ "شادی کو سال پورا نہیں ہوا اور تمہارا حال یہ ہے کہ جیسے دس سال ہو گئے ہیں' بدھی روح بنی ہو' ہر وقت اداس۔"

یہ درست ہے کہ اپنی ذات کی نفی برداشت کرنا آسان نہیں ہے' لیکن کم از کم شوہر کے سامنے خوش و خرم اور بنی سنوری ضرور نظر آئیں۔ روتی دھوتی' پریشان حال بیوی کسی مرد کو بھی اچھی نہیں لگتی۔

آپ کے لیے مشورہ یہی ہے کہ صبر و تحمل سے کام لیں۔ شوہر سے شکوہ شکایت کے بجائے محبت اور نرمی سے ان کے رویوں کا احساس دلائیں۔

اپنی ساس کو محبت اور توجہ سے رام کرنے کی کوشش کریں۔ اگر جاب یا کوئی کورس کرنے کی اجازت نہیں مل رہی تو فی الحال اس بات کو مسئلہ نہ بنائیں۔ آپ گھر پر بھی مطالعہ کر سکتی ہیں۔

اگر آپ نے اپنا رویہ مثبت رکھا تو ان شاء اللہ حالات میں بہتری ضرور آئے گی۔

س علی۔ گجر خان

"ان بہن نے لکھا ہے' میری سمجھ میں نہیں آتا میں کیا کروں میں انہیں بھولنا چاہتی ہوں مگر بھول نہیں پاتی۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں پھر گرا دیتی ہوں یہ سوچ کر وہ میری قسمت میں نہیں میں رو پڑتی ہوں۔"

اچھی بہن آپ بہت کم عمر ہیں۔ اس عمر میں صنف مخالف سے متاثر ہو جانا بہت عام سی بات ہے۔ سولہ سال کی عمر میں آپ کی خالہ نے ان کا ذکر کیا اور آپ نے ان کے ساتھ خیالوں کی دنیا آباد کرلی۔ آپ نے لکھا ہے۔

"عدنان بھائی چار سال میری خالہ میرے اندر ان کی محبت کا بیج بوتی رہیں مگر شادی کے بعد وہ ایسی غائب ہوئی ہیں' ایسی بدلی ہیں کہ اب وہ بھولے سے بھی میرا نام اپنے جیٹھ کے ساتھ نہیں لیتیں۔ وہ کہتی ہیں کہ وہ اپنے اسی جیٹھ کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی ہیں۔"

آپ خود سوچیں یقیناً" کوئی نہ کوئی وجہ ہوگی جو وہ آپ کے لیے اپنے جیٹھ کو مناسب نہیں سمجھتیں' ہو سکتا ہے انہوں نے اپنے جیٹھ سے آپ کا ذکر کیا ہو اور جیٹھ کی رضامندی نہ پا کر انہوں نے اس بات کو وہیں ختم کر دیا ہو آپ کے دل کی کیفیت کا تو انہیں اندازہ بھی نہیں ہوگا۔

آپ کی محبت یک طرفہ ہے۔ آپ دونوں کی عمروں میں بہت فرق ہے۔ وہ آپ کے دل کا حال ہی نہیں جانتے اور آپ ان کے حصول کو موت زندگی کا مسئلہ بنائے بیٹھی ہیں۔ عدنان بھائی سے مشورہ مانگا ہے اور ساتھ یہ بھی تاکید ہے کہ "مجھے انہیں بھولنے کے لیے نہیں کہیے گا۔"

اب یہی ہو سکتا ہے کہ آپ ایک بار اپنی امی یا خالہ سے بات کریں' آپ کو صحیح صورت حال کا اندازہ ہو جائے گا۔ ممکن ہے آپ کی خالہ آپ کی صورت حال جان کر آپ کے لیے کوئی راستہ نکال سکیں۔

ایک بہن

اچھی بہن! آپ ڈبل ایم اے' بی ایڈ' عالمہ فاضلہ کی ڈگری رکھتی ہیں' کمپیوٹر کورس بھی کیا ہوا ہے۔ پھر اتنی مایوسی کیوں ہے۔۔۔؟

تعلیم تو انسان کی شخصیت میں اعتماد پیدا کرتی ہے پھر آپ نے اپنی زندگی کو اس طرح دوسروں کے سپرد کیوں کر دیا ہے؟ کسی لڑکے نے اگر آپ کے لیے رشتہ بھجوا دیا تو یہ اتنا بڑا گناہ نہیں ہے کہ اس کی سزا میں آپ کی جاب چھڑا دی گئی ہے۔ آپ کو عبادت تک سے روکا جاتا ہے۔ باہر جانا بند' کسی سہیلی تک سے بات کرنے پر پابندی' ٹیوشن نہیں پڑھا سکتیں۔ اس کے باوجود ان کا رویہ آپ کے ساتھ صحیح نہیں ہے۔ وہ آپ کو طعنے دیتے ہیں۔ وہ آپ پر شک کرتے ہیں۔ آپ کے گھر والوں کا رویہ ناقابل فہم ہے۔

پھر ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ گھر والے چار سال سے آپ کا رشتہ تلاش کر رہے ہیں اور انہیں اب تک کامیابی نہیں ہوئی ہے تو کم از کم ان حالات میں انہیں اس رشتہ پر ضرور غور کرنا چاہیے۔ اور اگر اس میں کوئی خرابی نہیں ہے تو آپ کا رشتہ وہاں طے کرنے میں کیا قباحت ہے؟ ہو سکے تو کسی طریقے سے اپنے بھائی یا کسی بہن کے ذریعے اس طرف توجہ دلائیں۔

آپ نے لکھا ہے۔

"میں نے خود کو سر سے پاؤں تک بدل لیا ہے۔ عاجزی اتنی کہ ناک رگڑنے کو تیار ہوں' غصہ ختم' ضرورتیں تک ختم' خواہشات' خواب سب ختم کر لیے۔ دوستی' تعلیم' مسکراہٹ' جاب سب چھوڑ دیا۔ مگر میرے خونی رشتے پتھر کے پتھر۔ لڑ کر دیکھا' رو کر دیکھا' ہاتھ جوڑے' خاموشی اپنائی سب میں گھل مل جانے کی کوشش کی مگر لاحاصل۔"

اچھی بہن! آپ کو اپنی جاب نہیں چھوڑنا چاہیے تھی۔ گھر والے تو اب بھی خوش نہیں ہیں تو بہتر تھا آپ اپنی جاب جاری رکھتیں۔

ان حالات میں بہترین مشورہ یہی دیا جا سکتا ہے کہ آپ جاب دوبارہ جوائن کریں۔ کم از کم اتنی دیر گھر کے اس تلخ ماحول سے تو محفوظ رہیں گی۔ باقی سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیں۔ وہ وہ یقیناً" آپ کے لیے بہتر کرے گا۔

✡

امت الصبور

بیوٹی بکس

امامہ۔۔۔ٹنڈو جان محمد

س : میرے چہرے پر کچھ دھبے سیاہی مائل ہیں۔ خاص طور پر ہونٹوں کے گرد۔ انہیں چھائیاں تو نہیں کہہ سکتے لیکن کہیں کہیں سے رنگ خیالا سا ہے۔ میرا رنگ صاف ہے اس لیے یہ بہت نمایاں ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ چہرہ فریش بھی نہیں ہے۔

ج : چہرے کی فریش نیس اور تازگی کے لیے آپ ابٹن استعمال کریں۔ اس کے متواتر استعمال سے چہرے سے بال اور رواں ختم ہو جاتا ہے۔ چہرے کے داغ دھبے اور چھائیاں وغیرہ بھی ختم ہو جاتی ہیں۔

ایک آسان سا ابٹن لکھ رہی ہوں' اسے آپ گھر میں بھی بنا سکتی ہیں۔

جو کا آٹا گندم کی بھوسی اور پسے ہوئے بادام ہم وزن لے کر رکھ لیں۔ روزانہ رات کو سونے سے پہلے گائے کے بغیر ابالے ہوئے دودھ میں ملا کر پیسٹ بنائیں اور اسے چہرے پر لگائیں۔ تھوڑی دیر بعد جب خشک ہو جائے تو رگڑ کر اتار دیں اور صاف پانی سے چہرہ دھوئیں۔ چہرے کے علاوہ گردن ہاتھوں اور پیروں پر لگائیں۔

سیاہ دھبوں کے لیے تھوکے عرق میں وٹامن ای کا کیپسول مکس کرلیں اور جہاں دھبے ہیں خصوصاً" ہونٹوں کے گرد لگائیں۔ لیکن ایک ضروری بات یہ ہے کہ عموماً" یہ دھبے وٹامن سی کی کمی کی وجہ سے پڑتے ہیں۔ آپ کینو استعمال کریں' آج کل چونکہ کینو کا موسم نہیں ہے اس لیے ایک گلاس پانی میں ایک لیموں کا عرق اور شہد ملا کر استعمال کریں' آپ کو فائدہ ہو گا۔

عظمیٰ جبیں۔۔۔ میاں چنوں

س : میرا سب سے بڑا مسئلہ میری آنکھوں کے نیچے حلقے ہیں۔ آنکھیں بڑی ہیں لیکن حلقوں کی وجہ سے چھوٹی نظر آتی ہیں۔ صحت ٹھیک ہے۔ نیند بھی پوری لیتی ہوں۔ اس کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کیا مسئلہ ہے کیا یہ حلقے دور ہو سکتے ہیں؟

ج : عموماً" جگر کی کسی معمولی خرابی کی وجہ سے بھی آنکھوں میں حلقے پڑ جاتے ہیں۔ لیکن چونکہ آپ کا چہرہ فریش ہے' اس لیے ایسا نہیں لگتا کہ جگر میں خرابی ہے۔ بعض اوقات یہ حلقے موروثی بھی ہوتے ہیں بہت زیادہ مطالعہ کرنے کی وجہ سے بھی آنکھوں کے گرد حلقے پڑ جاتے ہیں۔

سیاہ حلقوں کو دور کرنے کے لیے کچھ تراکیب دی جا رہی ہیں۔ ان پر عمل کریں گی تو خاطر خواہ نتائج بر آمد ہوں گے۔

1 : روغن بادام ایک کٹوری میں لے کر انگلی ڈبو لیں پھر ایک انگلی کی مدد سے آنکھوں کے حلقوں پر لگائیں۔ یہ خیال رکھیں مالش بہت ہلکے ہاتھ سے کریں اور اس کا رخ باہر سے اندر کی طرف ہو۔

2 : تھوڑی سی گاجر لے کر عرق نکال لیں دو چمچ عرق میں ایک انڈے کی زردی ملا کر ان حلقوں پر دن میں دو بار لگائیں۔ آہستہ آہستہ یہ حلقے دور ہو جائیں گے۔

ان حلقوں کا فوری علاج یہ ہے کہ تازہ آلو کو کاٹ کر قتلے بنائیں اور اسے آنکھوں پر رکھیں۔ چند منٹ بعد ان ٹکڑوں کو ہٹا دیں۔ آنکھوں کے حلقے تین گھنٹے تک نظر نہیں آئیں گے۔